

علی اولڈ بکس اینڈ لائبریری
انصافی بکس اور ڈائجسٹس کی خرید و فروخت
محکمہ قدیم و جدید ادب و تاریخ

دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جنوری 2016

PDFBOOKSFREE.PK

مطلبی

دل کی آنکھوں سے پڑھی جانی
والی دل گداڑ تحسیر کے بیچ وچم
سپرینٹاراض 153



مدیر اعلیٰ
عذرارسل



تجیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبت اوچپ سلسلہ...
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی 164

آوارہ گرد

جنونی

ایک فٹس میں بچنے والی پراسرار اموات
عسلہ فیض سب اس سے پریشان تھے
مریم کے خان 195



معشر ب سے موصول شدہ ایک
تیکھے انداز و اطوار کی روداد...
عرفان اظہار 209

حقیقت

بے چارہ

ان رنگین پر نشاط لحوں کی سوغات...
جس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی
سکندر علیم 215



جندبوں... رشتوں اور نفس توں کی
زنجیر سے بندھی ایک متاثر کہانی
روبینہ رشید 225

دراز دست

اشارہ

آسمان کی بلند یوں پر پرواز کرتا سفر
نا تمام، سرورق کی پراثر کہانی
کاشف زبیر 258



اقتباسات گنگدیاں سکراشیروں قہقہے
سیکھ آپ کتنی تیرتے تھے اور تو آج کل
ادارہ وقارین 000

تراش خراش



قارئین کی کرم فرمایا کج ادائیغ
نامہ ویک آج تین عرصہ تیں اور شکایتیں
مدیر اعلیٰ 07

چینی نکتہ چین



مغربی ادب سے قارئین کے لیے ابھرنے کا
انتساب... ایک نئی نیر اور اعصاب شان شاہکار
امجد رئیس 14



پگھلتے لمحے



لالچ و ہوس کے کھیل میں زندگی
ڈاکٹر لکھنوی والے تحسیر کا نکتہ
تنویر ریاض 75

لالچ کا انجام

آشیانہ

محبتوں اور نفرتوں کی سر زمین کو لپیٹ
میں لیسنے والی نفرتوں کی چنگاریاں...
منظر امام 87



فرامانی موافقت کرنے والے
کھیل کا انوکھا اور دلچسپ انتخاب
سلیم انور 93

اٹی بازی

انگارہ

سطر سطر رنگ بدلتی...
ایک لہورنگ اور دل گداڑ داستان
طاہر جاوید منقل 98



سلیقہ شعار بیوی کے نقش قدم پر چلنے
والے شوہر کی فاش غلطی کا خیرازہ
بابر نعیم 143

سلیقہ شعار

وائٹ ہاؤس

اجنبی شہر میں اچانک ہی اس
کا سابقہ ایک لاش سے پڑ گیا تھا
جمال دستی 147



نصابی بکس اور انجمنوں کی خرید و فروخت
محکمہ قدیم نذر در حمانہ بیرونی

[illegible][illegible]

دوران کلاں سے مرحا گل کی گفتار ”حسب معمول اس شمارے کا بھی گیٹ آپ بہت دلکش ہے۔ دوستوں کی محفل شرکت کی۔ ایم عمران جوٹانی

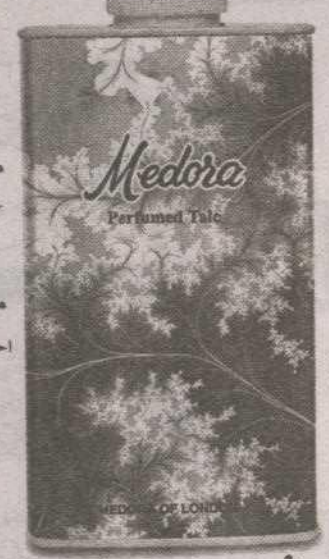
جاسوسی ڈائجسٹ 7 جنوری 2016ء



خوشبو جو دل کو پہنائے

تازگی جو ہر کوئی چاہے

Cherish



میں تو اپنی فریومڈ ٹالک
کی لازمی جگاتی
خوشیوں سے
میں آپ کو مکتا فریش
صاف جوڑے دن بھر
آپ کے ساتھ

8 مختلف و فریب خوشبہوں میں دستیاب ہے

Pleasure, Chersih, Joy, Season, Passion

Salute اور Dignity, Greetings شامل ہیں

MEDORA OF LONDON

بہت مبارک باد و یلڈن کا شی۔ دوسری کہانی بساط جھ فاروق انجم کی زبردست تحریر۔ شوبز کی دنیا کے رنگ لیے راشد کنیکا، کجراہی کے دلہا اور قاتل نکلا۔ کہتے ہیں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ سرمد نے راشد کو لے کر کہتا ہے کہ اس بار تو دونوں ہی روبرو کی کہانیاں لا جواب ہیں۔ فیوت رائٹر احمد اقبال کی ایک لازوال تحریر ہوتی جہاں جاسوسی کے پہلے صفحات کا قہقہہ ادا کرنے والی کہانی تھی۔ عورت کچھ بھی کر لے، مرد ذات کے قلم کے ہاتھوں سے کسی طرح کی نہیں کٹی چاہے وہ کتنی بھی چالاک ہو۔

ڈیرا اسماعیل خان سے عدنان کا اختصار یہ "جاسوسی دو ماہ سے پڑھنا شروع کیا ہے، وہ بھی اپنے پیارے دوست عبادت کی وجہ سے تو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ عبادت کا تیسرا بہت اچھا تھا۔ رضوان جلی کا تیسرا بھی زبردست تھا۔ انکار سے بہت اچھی کہانی ہے، کاشف زیر نے بہت اچھا لکھا۔"

ماتلی سے عابد حسین لغاری کی "جسارت" مخطوط میں عابد لغاری انصاری، محمد صفدر معاویہ، طاہرہ مجاز صاحبان کے تیسرے بہترین ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ امیر عمران جوناٹی، اسد عباس، مرزا گل ان کے تیسرے بھی جیت گئے۔ آوارہ گرد ہے پہلے پڑھی، ہر جگہ میر جعفر اور میر صادق جیسے غبار پڑے ہیں اور ان سے شہزاد عرف شہزی جیسے جواں مراد بھی لڑے ہیں، انکار سے اب رفتار بکڑ رہی ہے۔ ہوش و مدہوش احمد اقبال کے قلم سے لکھی گئی بہترین تحریر تھی اور ان کے علاوہ سرور کی پہلی کہانی حرم دوراں، کاشف زیر اور دوسری کہانی بساط جھ فاروق انجم بہت اچھی تحریر تھیں۔ کاشف زیر بھائی کو گلے کاٹنے کا، اللہ ان کو اور ترقی دے، میر احمد انجم کی بھی ڈائجسٹ کو پہلا خط ہے کیونکہ جاسوسی نے اتنا مجبور کیا کہ میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گیا، انشاء اللہ بایں نہیں کریں گے۔

شاہ گزہ سے فلک شیر ملک کی مبارک باد "6 دسمبر کا جاسوسی اچھی تحریروں سے مزین تھا۔ مائل آخری دو دنوں تحریروں کے مطابق تھا۔ مرحلہ وار بلند پائی انتہا ہوتے ہیں۔ اس دوران بھی لڑائی جھگڑا اور قتل کے کچھ واقعات ہو چکے ہیں، جو برا انتخاب پر ہوتے ہیں۔ مرتے تمام ہیں اور مرتے لیتے رہتے ہیں۔ محفل یار میں عمران جوناٹی کا تیسرا زبردست رہائش گاہ یہ ہے کہ جوناٹی نے اچھے تیسرے نگاروں میں میرا نام شامل نہیں کیا۔ کوئی بات نہیں بھول گئے ہوں گے یا پھر واقعی میں اس قابل ہی نہیں تھے۔ غلام حسین نوٹاری، عابد لغاری اور رضوان جلی کا تذکرہ سے منظر ہوں جنہوں نے میر سے تیسروں کو محفل کی جان کہا، دوستو! اب بھی بہت خوب لکھتے ہو۔ نوریال کنڈیاں کے والد کی منفرد کے لیے اور ان کی رہائی کے لیے دعا گو ہوں۔ وی سی جانتا ہے جسے جوت لگے۔ ہم آپ کے دکھیں برابر کے شریک ہیں، اللہ پاک آپ کو صبر عطا فرمائے۔ اب ذرا تحریروں پر تیسرا ہو جائے۔ مکمل تحریر ہوش و مدہوش، پڑی اچھی اور مطلق کہانی تھی۔ فونی رشتے جیسے بھی ہوں اچھے ہوتے ہیں۔ حسن بذات خود اچھا انسان تھا کہ مطلق ماحول نے اسے بھلا کر، شیا کا احساس اور حوصلہ قابل داد ہے جو اس کے شوہر پر گوارہ راست پر لے آئے گا۔ خطبہ انتقام بھی ہے جیکے انداز میں کسی ایسی اچھی کاوش تھی۔ انتقام لینے کے لیے بیوی نے شوہر کو ہزار لپٹوں کے دوران قتل کرنے کے لیے ایک گول پتھر کا استعمال کیا۔ یہ ایک اچھا طریقہ قرار دیا تھا۔ خطرہ نام نے خاموش جنت، کمال کی لکھی، ڈیکٹر اور گروہن کا منصوبہ کامیاب رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم لوگ اپنے بزرگوں کو اولاد ہمیشہ قید میں نہیں بھیجے۔ بس ایک خلش اور دکھ ہے کہ جہاز سے ملک کے اسپتالوں میں شکاری فری وارڈز کے مریضوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے یا دارالامان میں ادارت، جیم پیج کیوں پر جو کچھ ہوا ہے۔ انفس صدام انفس۔ کبھی کسی نے چیک نہیں کیا۔ یہ پردہ فرشی جیسے مکروہ وعدوں کو بند کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کچھ بار سسٹمز بھری تھیں۔ وہ عجیب عورت تھی جو اپنے سوتیلے بیٹے سے ناجائز تعلق استوار کیے ہوئے تھی۔ چمرا اپنے حاشیہ نام کو پکڑا بھی دیا تو سراسر زیادتی ہے۔ انکار سے کی چھٹی طبی شائد اداری۔ شاہ زیب کا جوہر کے بوسے کے نشے میں ہے۔ گلے سے جس یا سرتا میں فیض سے اس کی ملاقات ہونے والی ہے وہ بھی شاہ زیب کے گروپ میں شامل ہو جائے گا۔ کامیاب، شکاری کور یا اور چین کی دشمنی کے متعلق اچھی اسٹوری تھی مگر اینڈ پینڈنگ آیا۔ حالانکہ یونگ نے امریکن نرس کرڈ کی کویت سے رہائی دلوا کر کچھ نیک پنچا یا، مگر کرڈ کی صحبت ہو جانے کے بعد بھی اکیلا رہا کیونکہ امریکن کی ایک چھٹی سے کیسے شادی، جانی قوم پرست قومیں ہمیشہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ چمکرا میں شامل اور شہید نے رضوان سے چمکرا حاصل کر لیا مگر ایک بے گناہ فیض سلمان کو رہائی کا ٹکڑا بنا دیا بھی ایسی کہانی کا پڑ جائے۔ خوب صورت تحریر تھی۔ خام کوئی گلے، جمال دتی آج کل گواہی کے موضوع پر دل ہول کر لکھ رہے ہیں۔ کبھی موگ پہلی کی گواہی کبھی خام کوئی جعفر اور اچھے انداز میں لکھی گئی قتل کی داستان تھی۔ شرف کا بیٹا بڑا بین الاقوامی نے قاتل کا منصوبہ خاک میں ملا دیا اور رشتہ دوسرے قتل کا بیٹا بچھڑو یا آوارہ گرد سمجھتے ہیں۔ آوارہ گرد سمجھتے ہیں کہ وہ قابو آتا ہے یا نہیں۔ بھٹکری، قتل کی زبردست پلاننگ کی گئی تھی مگر قانون کے ہاتھ لیے ہوئے ہیں۔ ایک بریسلٹ کی وجہ سے کوٹنگ گرفتار ہوا۔ یہی ہے ہوس نے انسان کو بر باد کر دیا ہے، اچھی تحریر تھی۔ پریگٹ مرڈر چھوٹی سی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔ ایک ایسی خاموشی کے بارے میں بتایا گیا ہے جسے اس نے غلط فہم کر لیا اور ابرن کی ڈی ڈی باؤ کی گواہی کے بجائے حال میں بھیج دیا اور خود اپنی جان کو ایذا پہنچا۔ سرور کی پہلی کہانی حرم دوراں لکھنے کا اعزاز زبردست تھا جس موضوع پر تحریر لکھی تھی، اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس سے ملنی چلی کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ مثلاً کالے نایاب پھوڑوں اور چینی پتھروں کے متعلق پہلے ہی بہت لکھا جا چکا ہے اور جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی جائے، وہ دوبارہ مزہ نہیں دیتی۔ بساط سرور کا دوسرا رنگ بہت خوب صورت تھا۔ فاروق انجم نے ہر ہر سطر کو کشادگی میں لکھی۔ فارہ نے رات کو بہت لکھی مگر سرمد کی شریک حیات تھی۔ رات کو جونی اپنے انجام کو پہنچا۔ انیسٹر جلیس احمد بڑی طرح لیں ہو گیا اور اپنے بیٹے کی پٹائی کا بدلہ بھی ادا کر دیا۔ جس اور سسٹمز سے بھر پور داستان تھی بلکہ نمروں کی۔ کٹر نوں میں خیاں

بہت زیادہ نے خوب بنایا۔ رحیم الشائیکم کے دونوں سراسلے خوب تھے۔ ایک اچھا رسالہ پیش کرنے پر تمام اہل ادارہ کو مبارک باد۔

پشاور سے ناصر علی کا اعزاز تحریر "اس بار چھ پکڑ لگنے کے بعد 5 تاریخ کو جاسوسی ڈائجسٹ مل گیا۔ سرور قیانتا میں تھا۔ یہاں جاسوسی کی محفل میں پہنچا۔ محفل میں سرمد تیسرا و امیر عمران جوناٹی کا تھا۔ اس کے بعد میرا بیٹا دوست غلام حسین موجود تھا۔ موصوف نے اس بار جاسوسی اور سسٹمز دونوں میں حاضری لگائی۔ فلک شیر ملک کا تیسرا بھی اچھا اور بڑا اچھا تھا۔ چوہدری محمد رفیع صاحب آپ واقعی جیتیں ہیں۔ نوریال صاحب اللہ تعالیٰ آپ کے والد محترم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور آپ کو آزادی نصیب ہو جائے اس کے علاوہ عابد لغاری، مرزا گل، محمد صفدر معاویہ، رضوان جلی، سید عبادت کاظمی، معراج محبوب عباسی اور افتخار حسین انوان کے تیسرے اچھے تھے۔ ان کے علاوہ شاہزادہ کچھ دوست غائب ہیں جیسے عثمان غنی، انجم میر، میر شہزاد انجم اور احمد نے کراں سب کہاں غائب ہیں۔ سب حاضری لگاؤ کٹر نوں میں سید ممتاز علی، مرزا گل اور ہمدان کے انتخاب اچھے تھے۔ کہانیاں میں سب سے پہلے انکار سے پڑھی۔ شاہ زیب نے اس بار کمال کر دیا۔ ساجد سلوٹی اور عاصم کی تصویریں بھیج لیں اور ان کو نایاب حاصل صورت کے گھر تک پہنچا، اس بار انتہائی سسٹمز سے بھر پور قسط تھی۔ اگلی قسط کا شائد سے انتظار ہے۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ ایکشن ای ایکشن تھا۔ نیچے لکھا تھا اسٹیکلر کم کمال تم ہو گیا ہے۔ حرم دوراں بہت اچھی اسٹوری ہے، مگر کارکردار مجھے بہت پسند آیا۔ کئی خوب صورتی سے قاتلوں کو پکڑا۔ بساط میں راشد کے ساتھ نفسیاتی مسائل تھے۔ اس نے پہلے بیوی کے ساتھ برسلو کیا تھا سرمد جی وقت پر کچھ کارہی کو پہنچا۔ ہوش و مدہوش اچھی کہانی تھی۔"

جونی سے چوہدری محمد رفیع زکی قلم نگاری "۱۰ دسمبر کے جاسوسی ڈائجسٹ کے انتظار میں وہی حال تھا جو آج کل دبیر میں ہے چارے عاشقوں کا ہوتا ہے۔ انتظار، انتظار اور بس انتظار۔ محبوب کا وہ وعدہ ہی کیا جو قوت پر پورا ہو۔ سرور قیانتا کا جائزہ تو سرور کے بعد قابل ذکر ہے چرچہ صنف کثرت کا ذرا بہتر ماحول میں ہوا تھا۔ مگر تالیے ایسے تحریر کی آرٹ بناتے جاتے ہیں اس صنف کے کہ الامان انہیں۔ ایک اور قابل ذکر چیز مائل گرل کی گردن تھی جسے زور نے سے خمیرہ دیا تھا۔ نوگا، فیر چینی کتہ چینی کارخ کیا تو قتل میں امیر عمران جوناٹی کو ایمان پایا۔ بہت اچھا تیسرا تھا اور ان کی اس رائے سے پورا اتفاق کروں گا کہ اگر انکار سے اب سے کچھ تحریریں شامل کر لی جائیں تو حرم بہتر ہی کی۔ غلام حسین نوٹاری دوسرے نمبر پر تھے۔ آپ کے چار لفظ خوب صورت تھے۔ عابد لغاری انصاری نے کہانیاں کے ساتھ دوستوں کے خطوط پڑھی خوب تیسرا کیا۔ یاد کرنے کا شکر ہے۔ مرزا گل صاحب، جہادی کیا محال جو صنف نازک کی شان میں کثافت کرنے کا سوچیں بھی۔ وہ تو بس ایک مصومہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ سید عباسی نے ایمان چینی کتہ چینی کے لیے ایک لائن میں خوب پیغام دیا۔ آتش شریط ہے۔ محمد صفدر معاویہ صاحب، اگر وہ قادر ہے وہ قابل آنکھوں سے جھلکتی تو پھر شادی کی شخصیت دھوکا کھاتا۔ جنہیں دھوکا دینا وہ وہ آنکھوں سے تو کیا کہنا ہے جسے بھی نہیں ہونے دیتے۔ اپنے رضوان جلی کی بیوی کی لگائی کے تو کیا کہنے کہ تم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بیان کرنا کوئی ان سے کہیں سید گلہاں کا بھی کے شکوے اس لیے سر پر سے گزرتے کہ گلے گلہوں کے بعد کا بھی صاحب آخری لائن کچھ اس انداز میں لکھی کہ ان کے شکوے کو بھی منظر کو بنا ڈالا۔ نوریال! آپ کے والد محترم کی وفات کا پڑھ کر نہایت انفس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اسے نانا گناہوں کو خیر خیر عطا فرمائے۔ طاہرہ مجاز صاحبہ محفل سے غیر حاضر ہیں۔ ان کی طویل بیماری کو بہت زیادہ مس کیا۔ طاہرہ جادو میں صاحب کی انکار سے کہنا ہے ایک مرتبہ پھر دراب پہلی سے جا کر لے لگے ہیں۔ یہ چیز معاملات کو بٹھانے کے بجائے اور ابھارے گی اور شاہ زیب کو مکمل کر سنے آتا ہی ہوگا۔ رہی بات تاجور کی تو اس کا کردار ایک پہیلی کے مانند سامنے آ رہا ہے۔ کئی شاہ زیب کو لطف دینا اور کبھی بالکل ہی سائید لائن کر دینا اور تیسری طرف ایک نئے کردار یا سر بھائی کی نیواستری ہو رہی ہے۔ یہ ساری چیزیں لیں کہ اس تحریر کو مزہ چار چاند لگے گی۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کی ہوش و مدہوش کا اگر ایک سطر میں خلاصہ کیا جائے تو وہ کچھ یوں ہوگا۔ زندگی کیر و ماز کا دوسرا نام ہے۔ زندگی اتنی تیز ہو گئی ہے کہ یہاں قدم قدم پر کیر و ماز اور بڑا جھنڈن کر رہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت کٹائی ہاتھوں اور اموالوں کی رو جاتی ہے جن پر عمل کر کے مشکلات میں اضافے کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ نئے موضوعات پر لکھنا اور وہ بھی اس انداز میں کہ قلم کار پورا پورا حق ادا کیا جائے۔ اس معاملے میں کاشف زیر صاحب کا کوئی غائب نہیں۔ پہلا رنگ حرم دوراں میں انہوں نے اپنے اس شریک ریکارڈ کو برقرار رکھا۔ جیکھے لوں علی حلقہ جات میں جنوں کے ہاتھوں بچوں کے مارے جانے والے واقعات کی سیٹھ یا خوب کورنگ کی۔ یہاں تک کہ وہاں کے ایک کلونکی وزیر نے اس فرسودہ کہانی کی باگ و بیل دلی تائید بھی کی۔ کاشف زیر صاحب نے یقیناً اسی موضوع پر ریرینج کی اور اسے کہانی کی شکل میں حقائق کے ساتھ پیش کیا۔ دوسرا رنگ بساط گرد چرچہ رنگ کے مقابلے میں کچھ سولر ہا مگر کچھ بھی اسٹیکلر تحریر تھی۔ اس قسم کی تحریروں میں عموماً بہت ساری جھجکوں پر جمولہ دے جاتا ہے مگر رائٹر نے اس چیز کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے ہر جھجک کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ خطبہ انتقام کی انتقام سے زیادہ خود کوئی پر تیری تھی۔ جس میں خوش قسمتی سے خودی انتقام میں بدل گئی۔ مقررہ نام کی خاموش جنت میں اچھا خاصا سسٹمز تھا اور انتقام تک اندازہ نہ ہو سکا کہ کتنا ہوئے جارہا ہے۔ سلیم فاروق کی چمکرا کی ابتدائی اچھی مگر انتقام انتقامی اور غیر فطری سا تھا کہ سارا مزہ کر رہا ہو گیا۔ ایک دم سے ایک نئے کردار کو ال انتقام کرنا تحریر سے جیسے جان ہی نکل گئی ہو۔ جمال دتی کی خام کوئی مختصر مگر اچھی تحریر ثابت ہوئی۔"

ان دنوں کے اہل گرامی جن کے محبت نے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔
محمد اقبال، کراچی۔ میونسٹریز، لاہور۔ کاشف رفیق، کوٹری۔ انصا احمد، کراچی۔ وقار الحسن، میر پور خاص، مونیامین، حیدر آباد۔

امجد رئیس پگھلتے تمہ

تین افراد کے کنبے پر گزرنے والے قیامت کے وہ پگھلتے لمحے جب سفاک اور خون آشام درندوں نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے ہولناک مصائب کی بھٹی میں جھونک دیا تھا... آغوشِ اجل میں گھٹتے سانسوں کے ساتھ زندگی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی ہوش ربا کہانی جو پل پل سنسنی کے رنگ بدلتی ہوئی ایک تحیر خیز انجام سے دوچار ہوئی... گریگ آئیز کے جادو اثر قلم سے نکلنے والی ناقابل فراموش تحریر جس میں جرم و سزا کی ازل سے جاری کشمکش کے کئی ہیروپ کارفرما ہیں... ایک طرف گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے گھاگ مجرموں کا ہولناک ٹولہ اور دوسری طرف محبت کے مضبوط بندھنوں میں سمٹا ہوا ایک خاندان... جو اپنی بقا کے لیے ہر لہو رنگ معرکے سے نمٹنے کے لیے کمربستہ تھا... خون ریز اور روئنگتے کھنڈ کر دینے والی ہولناک پیکار کی یادگار داستان جو بھلائے نہ بھولے گی...

مغربی ادب سے قارئین کے لیے امجد رئیس کا انتخاب...
ایک سنسنی خیز اور اعصاب شکن شاہکار...

کل تک مارگریٹ نے اس آدمی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور آج وہ پوری طرح اس کے قبضے میں تھی۔ اس نے اپنا نام جو بتایا تھا۔ مارگریٹ کو یقین نہیں تھا کہ اس نے اپنا اصل نام بتایا ہے۔ جو کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، جلد کی رنگت زردی مائل اور بال گہرے سیاہ رنگ کے تھے۔ چمکدار آنکھیں، خیرہ کن شعاع کے مانند دماغ میں اترنے لگتی تھیں۔ مارگریٹ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے اجتناب برت رہی تھی۔ جو کہ مارگریٹ کی فیملی کے بارے میں تمام معلومات تھیں۔ وہ اس کا مظاہرہ بھی کر رہا تھا۔
”مجھے یقین نہیں آتا۔“ وہ سپاٹ لیجے میں بولی۔
”کیا میں نے کوئی بات غلط بتائی؟“ جو نے سوال کیا۔
”نہیں۔ لیکن تمام رات آنکھوں میں بیت گئی۔ تم نے میری جان نہیں چھوڑی۔ مجھے جانے دو۔“

”یہ تمہارے بیٹے پر منحصر ہے۔“ جو نے مارگریٹ کو گھورا۔

”تم مجھے مار دو، میرے بیٹے کو جانے دو۔“

”تم کیا جانتی ہو کہ دن دیہاڑے اور میکڈونلڈ کے سامنے میں تمہیں مارنے کی غلطی کروں گا؟“

اس وقت وہ جو نامی آدمی کے ساتھ اپنی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھی تھی۔ بی ایم ڈبلیو ایک

ایک سال بعد

ول جینٹک نے اپنی فورڈ ایکسپڈیشن ائرپورٹ روڈ پر ڈال دی۔ ائرپورٹ سے اڑنے والے جہاز درختوں کے اوپر نمودار ہو کر فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ ول جینٹک بھی جہاز اڑانے کے لیے لے کر تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی کیرین اور ساڑھے پانچ سال کی بیٹی ایسی بیٹھے تھے۔ "اپنی نگاہ منک پر رکھو۔" اس کی بیوی نے ٹوکا۔

"ڈیڈی، اڑتے ہوئے جہاز دیکھ رہے ہیں۔" ایسی کی آواز آئی۔

ول، عقی شیشے میں بیٹی کو دیکھ کر مسکرایا۔ وہ، کیرین کی نقل تھی۔ کیرین کا منی ورژن... بیورے بال، سبز آنکھیں، برخار پر تل...

ائرپورٹ کے قریب پہنچ کر ول نے ایکسپڈیشن، جنرل ایوی ایشن ایریا کی طرف موڑ دی۔ سنگریٹ کے فرش پر ایک انجن اور تینوں انجن والے چھوٹے جہاز کھڑے تھے۔ ول کا دل چل اٹھا۔

"میں جو بیئر لیک میں نہیں جاؤں گی۔ میں بڑے ہو کر پائلٹ بنوں گی۔" ایسی کی آواز آئی۔

"میں نے سوچا تھا کہ تم ڈاکٹر بننا چاہتی ہو۔" ول نے کہا۔

"فلاننگ ڈاکٹر۔" ایسی نے برجستہ جواب دیا۔ میاں بیوی بننے لگے۔ ول نے کیرین کا ہاتھ دیا اور گاڑی "پنج کرافٹ بیرن 58" کے قریب روک دی۔ وہ سیٹ بیلٹ کھول کر فورڈ سے باہر آ گیا۔ ول نے ایسی کو بھی باہر نکال لیا۔ "بیرن" دس سال پرانا ہونے کے باوجود ایک اچھا جہاز تھا۔

ول نے گاڑی کے عقب سے سوٹ کیس کے ساتھ ایک لیڈر کیس اٹھایا۔ کیرین دونوں چیزیں لے کر "بیرن 58" کی طرف چل پڑی۔ ول نے لیپ ٹاپ اٹھالیا۔ "کسا تمہیں صبح درد محسوس نہیں ہو رہا تھا؟" کیرین نے شوہر کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں۔" ول جینٹک نے جھوٹ بولا۔ عام حالات میں وہ ہوائی سفر ملتوی کر دیتا اور ایکسپڈیشن پر اٹھار کر تا لیکن تاخیر ہوئی تھی۔ ہوائی سفر کے بغیر "گلف کوسٹ" پہنچنا ممکن نہ تھا۔ کیرین اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ تاہم اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ "بیرن 58 کتناقت لگے گا؟" کیرین نے سوال

بھی تعریف کرتا تھا۔ "اچانک باسل چپ ہو گیا۔ بیئر دیوزاد باسل کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چپ ہونے پر اسے پھر ماما کی یاد آئی۔ "مام کہاں ہیں؟" "مجھے تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔" باسل پھر شروع ہو گیا۔ "تم چلے جاؤ گے، میں سمجھا تھا کہ تم میرے دوست بن جاؤ گے۔" باسل نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس مرتبہ اس نے جیب سے چھوٹا چاقو نکالا تھا۔ چاقو کی مدد سے اس نے بیئر کے ہاتھ آزاد کیے، پھر ہاتھ بڑھا کر پیچھے ڈور کھول دیا۔

"میکڈونلڈ کے لیے گراؤنڈ میں تمہاری ممانعت کر رہی ہیں۔ لڑکے، تم جانتے ہو۔"

بیئر کی حیرت دو چند ہوئی۔ تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ گاڑی کے دروازے سے کودا اور سرچٹ دوڑ پڑا۔

جو نے بی ایم ڈبلیو کا پیچھے ڈور کھول دیا۔ "تمہارا پیٹا میکڈونلڈ کے لیے لیڈ میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔"

مارگریٹ کا دل لیڈت بڑے زور سے دھڑکا۔ اس نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا، پھر واپس جو کی طرف دیکھا۔ جو بے نیازی سے اسٹیرنگ وھیل کے چری کور کو سہارا دیا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اتر گیا اور جاپان سیٹ پر ڈال کر چل پڑا۔

مارگریٹ کی سانس رکی ہوئی تھی۔ وہ زخمی ہرنی کے مانند تھی اور غیر قیمتی نظروں سے اپنے شکاری کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ماما اس کا سستہ نوٹ کیا۔ وہ گاڑی سے اتر کر میکڈونلڈ کی جانب بھاگی۔

جو سبز پیک اپ ٹرک میں سوار ہو رہا تھا۔ باسل نے اسے دیکھ کر مطمئن کی سانس لی۔

"تیس گھنٹے اور دس منٹ۔" جو نے گھڑی پر انگلی سے دستک دی۔ "بہلی مرتبہ 23 گھنٹے گزرے تھے۔ آخری گھنٹا اعصاب بن تھا۔ بہر حال شیل کورٹم مل گئی۔ کوئی مرانہ زخمی ہوا... کوئی پولیس، نہ ایف بی آئی... میں ٹینکس ہوں۔" ماسٹر آف دی یونیورس۔

"مجھے خوشی ہے کہ معاملہ ہمیشہ کی طرح منٹ گیا۔" باسل نے گہری سانس لی۔ "اس مرتبہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔" جو نے قہقہہ لگایا اور باسل کے بڑے سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "باسو! ایک سال تک موج کرو۔"

دیوزاد باسل کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے پیک اپ اسٹارٹ کی گیمز بدلا اور پارکنگ سے نکل کر ٹریفک کی روانی میں گم ہو گیا۔

ریسٹورنٹ پہچان کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔ وہ کچھ گیا کہ وہ اپنے گھر سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہے۔ بیئر نے آنکھیں مل کر ادھر ادھر دیکھا۔ خیال آیا کہ گاڑی سے کود کر بھاگ جائے لیکن وھیل تھا سے برابر میں جو آدمی بیٹھا تھا وہ بیئر سے زیادہ تیز تھا۔ اس کا نام باسل تھا۔ بیئر نے اپنی کلایاں دیکھیں جو پیک سے باندھ دی گئی تھیں۔

"مسٹر باسل، کیا اب اس کی ضرورت ہے؟" بیئر نے بندھے ہوئے ہاتھ اوپر کیے۔ بیئر نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے باسل کے سوانسی کو دیکھا تھا۔ باسل اس کے باپ سے بھی اچھا لگتا تھا۔ وزن تین سو پانچونڈ کے قریب تھا۔ اس نے گندہ سامستروں والا اور آلی پہنا ہوا تھا۔ آنکھیں چشمے کے پیچھے تھیں۔ موٹے پلاسٹک شیشوں والا عام سا چشمہ تھا۔ بیئر کے سوال پر باسل نامی شخص متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھیں بھی بڑی بڑی تھیں۔ کہا جاسکتا تھا کہ غیر معمولی بڑی آنکھیں تھیں جو حلقوں سے ابل پڑ رہی تھیں۔

"آئی ایم سوری، مجھے تم کو باندھنا پڑا۔ تم بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔" باسل کی آنکھوں میں معذرت تھی۔

بیئر کی آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔ "مام کہاں ہیں؟ تم نے کہا تھا کہ وہ یہاں آج آئیں گی۔"

"میں نے ٹھیک کہا تھا، سچے غالباً وہ یہاں پہنچ چکی ہوں گی۔"

بیئر نے گاڑیوں کی متعدد قطاروں میں بی ایم ڈبلیو کو کھوجنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ "مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔" بیئر نے شکوہ کیا۔

باسل نے اپنے ہاتھ کا بڑا سا پتھر اور آل کی جیب میں ڈالا۔ "دیکھو لڑکے۔" اس نے اپنی پٹکانا باریک آواز میں کہا۔ اس کی آواز بھاری بھر کم جسم کے برعکس سختی تھی۔ اس کا رویہ بھی پٹکانا معصومیت کا حامل تھا۔

بیئر نے اس کی موتی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں نے تمہارے لیے ایک چیز بنائی ہے۔ اس نے جیب سے ہاتھ باہر نکال کر بڑی سی مٹی کھولی۔ اس کی ہتھیلی پر ایک چھوٹی سی ترین رہی ہوئی تھی۔ اس نے یہ کھلونا نما ترین بیئر کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر رکھ دی، پھر بولا۔

"مجھے ترین اور اس کی سواری پسند ہے۔ جب میں تمہاری طرح چھوٹا سا تھا تو ماما فوت ہو گئیں اور جو ترین میں مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ جو بہت اسٹارٹ تھا۔ وہ امیروں کی طرح رہتا جانتا تھا جبکہ ہم امیر نہیں تھے لیکن جو نے ایک راستہ نکال لیا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ میری

شاپنگ سینٹر کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ جو میکڈونلڈ ریسٹورنٹ سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا... مارگریٹ کا شوہر ایک کامیاب سرجن تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ جو اور اس کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ سرجن گھر پر نہیں ہے۔ مارگریٹ کو اپنے بیٹے بیئر کی فکر تھی۔ سرجن میڈیکل ایسوسی ایشن کی سالانہ میٹنگ میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ "مجھے پروا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ تم بیئر کو چھوڑ دو، وہ ابھی صرف دس برس کا ہے۔" مارگریٹ نے پھر کہا۔ وہ گھنٹوں روتی رہی تھی۔ اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

"انہما بند رکھو۔" جو نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے بی ایم ڈبلیو کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے آئی آن کر کے بائی پر گرد یا پھر اس نے سنگریٹ سلگائی۔

"بیئر کہاں ہے؟" مارگریٹ کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

جو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیل فون پر نمبر پینج کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ زندگی کے سب سے خراب چوبیس گھنٹے تھے۔"

"جگہ پر ہو؟ اوکے۔ ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد شروع ہو جانا۔" جو نے سیل فون بند کر دیا۔

مارگریٹ کو جھکا لگا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ہر اسان نظروں سے اطراف میں گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ "اوہ، اوہ... اوہ گاڈ، بیئر! بیئر!"

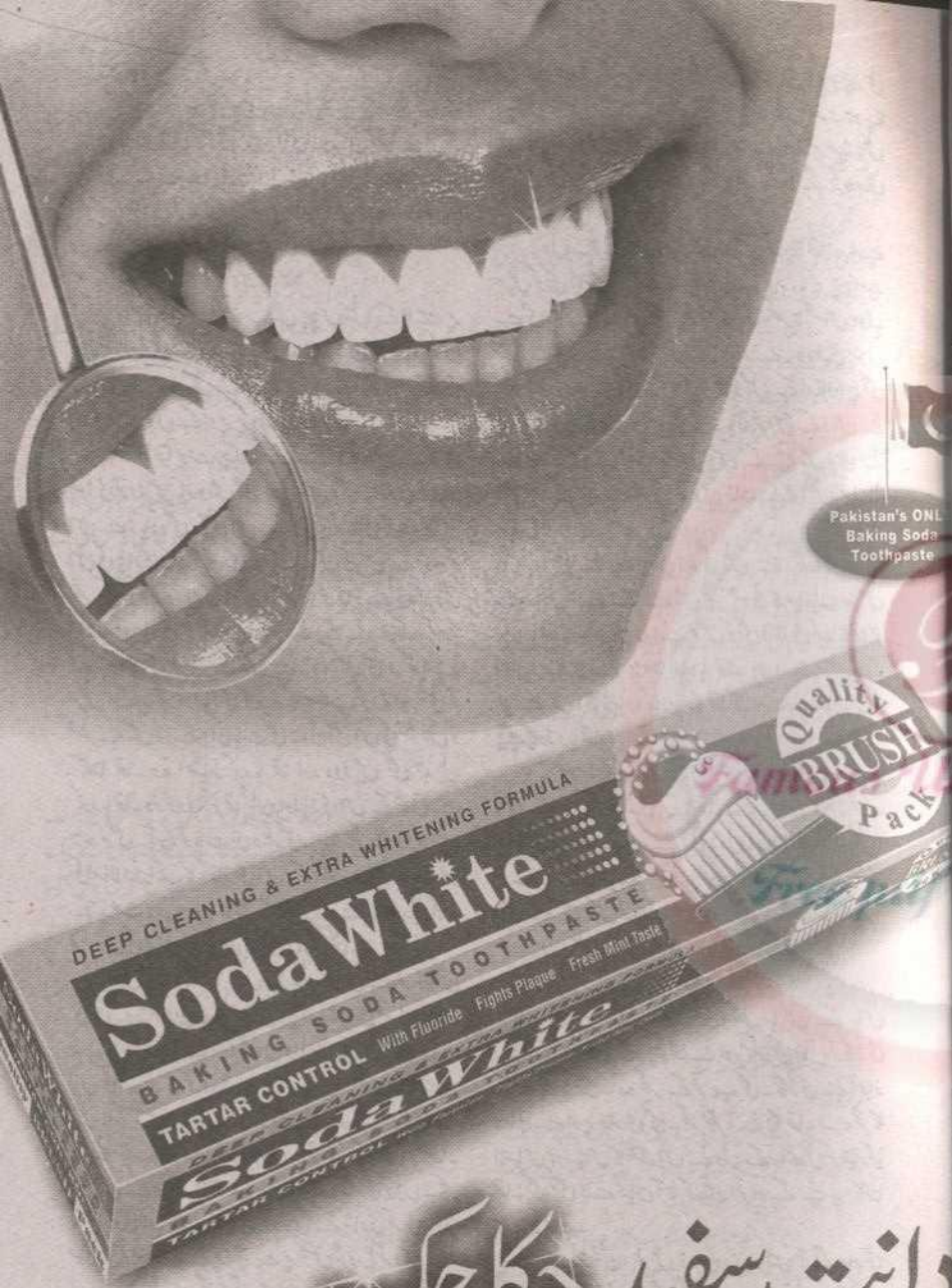
جو نے نشست پر سے گن اٹھا کر مارگریٹ کی گردن پر رکھ دی۔

"تم اب تک سب کچھ ٹھیک کرتی آئی ہو۔ اب آخری مرحلے میں سب کچھ تباہ نہ کرو... میری گفتگو کو یاد کرو۔"

مارگریٹ نے آنکھیں بند کر کے سر ہلایا۔ آنسو ایک بار پھر اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے تھے۔

بی ایم ڈبلیو سے سو گز دور وسیع و عریض پارکنگ میں آن گسٹ گاڑیوں کے درمیان بزرگ کا ایک پرانا پیک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ بیئر پیک اپ میں موجود تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ اس کے ساتھ اسٹیرنگ وھیل کے ساتھ ایک آدمی براجمان تھا۔

معا بیئر نے آنکھیں کھولیں۔ پہلی چیز جو اسے نظر آئی، وہ میکڈونلڈ ریسٹورنٹ تھا۔ رات سے اس نے ماں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔



دانت سفید چکا چک

اچھل رہی تھی۔

☆☆☆

اڑ پورٹ سے چندہ میل دور شمال کی سمت میں کروک مائل روڈ پر سبز رنگ کا پرانا پک اپ ٹرک موجود تھا۔ ٹرک درختوں سے بھری پہاڑی کے دامن میں آہنی میل باکس کے پاس رک گیا۔ باکس کے سر پر ایک چھوٹا سا جہاز نصب تھا۔ جہاز کے نیچے سنہری الفاظ میں لکھا تھا: JENNINGS

یہاں سے ٹرک نے پایاں موڑ کاٹا۔ سامنے ایک طویل اور ترچھا ڈرائیوے تھا۔ ٹرک وحشی رفتار سے ڈرائیوے میں اوپر جانے لگا۔ چوٹی پر ٹوربین اسٹائل کا بے حد خوب صورت و شاندار گھربنا ہوا تھا۔ گھر کے چاروں طرف لان کی بڑی مسکور کن تھی۔ خاصی بڑی جاندو بھی جس کی قیمت کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ پائن اور شاہ بلوط کے درختوں نے وسیع لان کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ گھر کے عقب میں نیلے رنگ کا سوئنگ پول، نیلے آسمان کے نیچے جھللا رہا تھا۔ ایک آپ نما ٹرک یا ٹرک نما پک اپ، منزل پر پہنچ کر رک گیا۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ ایک جو تھا اور دوسرا باسل۔ نیم نیم باسل فرط حیرت سے گلگ تھا۔ اس سے پیشتر اس نے ایسا عالی شان گھر نہیں دیکھا تھا۔ وہاں چار عدد گیراج تھے۔ اس نے باری باری وہاں جھانکا۔ ایک میں ٹویٹا ایولان کھڑی تھی۔ دوسرے میں ایک پاور بوٹ اسٹیج پر رکھی تھی۔

ڈرائیوے، گھاس کے اندر پچاس گز تک جا کر ختم ہو گیا تھا۔ جو نے ٹرک سے ٹول بکس نکالا۔ ”چلو، پہلے الارم سسٹم کی خبر لیتے ہیں۔“

تیس منٹ بعد دونوں مکان کے پچھلے دروازے سے باہر آئے۔

”ٹول بکس واپس ٹرک میں رکھ دو۔ ٹرک، ڈرائیوے سے نکال کر درختوں میں لے جاؤ۔“ جو نے باسل کو ہدایات دیں۔ ”ٹرک چھوڑ کر خود واپس آ جاؤ۔ مکان کے پیچھے کھڑکی کے پاس خاموشی سے انتظار کرو، سمجھ گئے؟“ جو نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں۔“ باسل نے بڑا سراسر ہلایا۔ جو بھی دروازے سے واپس اندر چلا گیا۔

☆☆☆

کیرین اور اسی واپسی پر پسندیدہ گیت دی ساؤنڈ آف میوزک سن رہے تھے۔۔۔ جینک ٹیلی کی رہائش گاہ

کیا۔

”پچاس منٹ۔ اگر میں نے زور لگا یا تو پینتیس منٹ۔“ بلوکی میں ”بیورج لیسینو“ میں دل کی آمد شام سات بجے متوقع تھی۔ مسی سپی میڈیکل ایسوسی ایشن کی سالانہ میٹنگ کا آغاز ول جینک کے بیکھر سے ہونا تھا۔

”میں بیکھر کے فوراً بعد تمہیں کال کروں گا۔“ پھر اس نے ٹیبلٹ کے ساتھ شلک بیکھر کے سپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر فلائٹ کے دوران تمہیں ضرورت پڑے تو ”اسکائی ٹیل“ استعمال کرنا۔ یہ نیا ڈیجیٹل ہے، بہترین اور ڈیڈ اسپاٹ سے عاری۔“

”میں پیغام ٹائپ کر کے ای میل کی طرح بھیج دوں گی۔“

”رائٹ۔ تم آئریگ مشین کو بھی کال کر سکتی ہو۔ وہ پیغام ریکارڈ کر کے مجھے روانہ کر دیں گے۔“ ول نے بتایا۔ اسی نے باپ کا ہاتھ کھینچا۔ ”آپ ہوا میں جا کر پروں کو ہلائیں گے نا؟“

”کیوں نہیں، تمہارے لیے میں ضرور ایسا کروں گا۔“

”ول، تمہارے ہاتھ کیسے ہیں؟ ٹھیک بتاؤ۔“ کیرین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں، کچھ اکڑن ہے۔“ ول نے تسلیم کیا۔

”تم کیسے لے رہے ہو؟“

”دروش اوویات۔“

”یہ گھٹیا علاج نہیں ہے۔“ کیرین نے اعتراض کیا۔

”ہاں، ٹھیک ہے لیکن یہ عارضی ہے۔ میں پرانی دوائی تبدیل کرنے والا ہوں۔ اور ہاں۔۔۔ مگر پیچ کر الارم سسٹم آن کرنا مت بھولنا۔“ ول نے تاکید کی۔

”ہاں، اسی، ڈیڈی کو گڈ بائے کہو، ان کو دیر ہو گئی ہے۔“

ول نے بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ ”نام کا خیال رکھنا، ان کو تنگ مت کرنا۔“ ول نے کہا۔ ”میں تم دونوں سے اتوار کے دن ملوں گا۔“ اس نے بیٹی کو نیچے اتارا اور ہاتھ ہلا کر بڑواں انجن والے بیرن 58 میں داخل ہو گیا۔ گراؤنڈ کنٹرول سے رابطہ کرنے کے بعد اس نے ائیرکرافٹ کو ٹیکس کرنا شروع کیا۔ جنوب کی طرف جانے کے بجائے وہ گھوم کر فورڈ ایکسپریڈیشن کے اوپر آ گیا۔ بلندی 600 فٹ ہوئی تھی۔ اس نے بیرن 58 کے بازوؤں کو اوپر نیچے حرکت دی۔ نیچے اسی دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے

میڈیسن کاؤنٹی میں تھی۔

گیت ختم ہوا تو کیرین نے سیل فون پر نمبر سچ کر کے پیغام ریکارڈ کر لیا۔ ”ہم تمہیں ابھی سے مس کر رہے ہیں۔ جلد آنا... بہت سارا پیار۔“

اسی کی فرمائش پر کیرین نے وہی گیت دوبارہ لگا دیا۔

☆☆☆

ول، جیکسن کے جنوب میں پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ جیکسن مسی کی کپیتل سٹی تھا۔ میڈیسن کاؤنٹی، جیکسن کے شمال میں بارہ میل کے فاصلے پر تھی۔ وہ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔

GPS یونٹ چیک کرنے کے لیے اس نے کلائی مووی تو دیکھی بازو میں لٹکی ہوئی تھی۔ اردو کی نوعیت اس سے زیادہ تھی۔ جتنی اس نے کیرین کو بتائی تھی۔ کیرین اس کی بیماری سے آگاہ تھی۔ ایک ماہ قبل کیرین نے شوہر کو تعمیر کی تھی کہ وہ ایوی ایشن اتھارٹی کو بتا دے گی کہ ول چیٹنگ ہوا بازی کا شوق پورا کرنے کے لیے چیٹنگ کر رہا ہے۔ وہ پوری طرح فٹ نہیں ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ کھانا پیسے مرض کے ساتھ ہوا بازی کرنے کا مطلب خود کو اور خلی کو خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ ول بھی اس کی تشویش کو سمجھتا تھا۔ وہ احتیاط کر رہا تھا اور دو ایمیں بھی تبدیل کر رہا تھا۔ وہ خود ڈاکٹر تھا لیکن ہوا بازی اس کے شوق سے بڑھ کر تھی۔ آج تو بات ہی دیگر تھی۔ میڈیکل ایسوسی ایشن کی سالانہ میٹنگ کا آغاز ہی اس کے لیچر سے تھا۔ تاخیر کے باعث وہ ”کیرین 58“ استعمال کرنے کے لیے مجبور تھا۔ اس کی خیالی روکیرین کی طرف چلی گئی۔

ول نے 1986ء میں میڈیکل اسکول سے گریجویشن کی تھی۔ وہ جیکسن کے یونیورسٹی اسپتال میں ہی شہر اہوا تھا۔ جب اس کی ملاقات ہزار آٹھ سو والی ایک نرس سے ہوئی۔ نرس کی شہرت تھی کہ وہ ڈیوٹ پر نہیں جاتی۔ تین ماہ کے صبر و تحمل اور مستقل مزاجی کے بعد ول، نرس کو بچے پر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر دونوں نے مڑ کے نہیں دیکھا۔ کیرین کے ساتھ ملاقاتیں دو سال تک جاری رہیں۔ پھر منگنی ہوئی اور ایک سال بعد دونوں نے شادی کر لی۔ مئی مہینے کے بعد ول نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔

دو سال بعد کھلیا کی علامات نے سر اٹھایا۔ تکلیف بڑھتی گئی۔ وہ آرام طلب شخص نہیں تھا کہ باپ کی دولت پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتا۔ دوست سے مشورے کے بعد ول نے

اپنا شعبہ تبدیل کر لیا۔ 1993ء کے دوران وہ یونیورسٹی اسپتال جیکسن کے اسپتال لوی ڈیپارٹمنٹ میں شفٹ ہو چکا تھا۔ اسی سال کیرین نے نرس کی جاب چھوڑ کر میڈیکل کورس جوائن کر لیا۔ وہ محنت اور کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

ول نے شعبے میں نہایت حاصل کر چکا تھا اور اپنے مرض کو بھی بہتر طریقے سے ہینڈل کر رہا تھا۔ کیرین امید سے تھی، جب اسے ڈاکٹر بننے کا خواب بکھرتا محسوس ہوا۔ تین ہفتے اس نے سخت کوشش میں گزارے۔ وہ اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ حتیٰ کہ اسکا حاصل کے امکان پر بھی غور کیا۔ وہ 33 برس کی ہو چکی تھی۔ بالآخر اس نے ذہن نے بے پی کے حق میں فیصلہ صادر کیا جس کے نتیجے میں اس نے جنم لیا۔ کیرین نے بخوشی خاتون خانہ کے فرائض نبھانے شروع کر دیے۔

اسی نے دونوں کی زندگی میں نئے رنگ بھر دیے تھے۔ ول اپنے نئے شعبے میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے مرض کو بھی اسٹیڈ کر رہا تھا جو دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے مرض کے بارے میں اتنا زیادہ جان چکا تھا کہ بہت سے ماہرین کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

معصوم اسی، بچوں کی فیاہٹس کا شکار تھی۔ ول اب اسی کے مرض کو اسٹیڈ کر رہا تھا۔ پھر کی تیز آواز اسے خیالات کی دنیا سے باہر لے آئی۔ ول نے ”نیا“ اسکا ٹیٹل“ بیٹ سے الگ کیا۔ ریسیوٹیشن دبا کر پیغام دیکھا۔ ”ہم ابھی سے تمہیں مس کر رہے ہیں۔ جلد آنا... بہت سارا پیار۔“ ول مسکرا کر نیچے بادلوں کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

کیرین نے ایکسیڈنٹ، میل باکس کے پاس روکی۔ باکس میں سے چند لفٹاٹے اور میگزین نکال کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ گھر کے قریب تھی۔ گاڑی بے آواز روانی سے اوپر جا رہی تھی۔ گھر نظر آنے لگا تھا۔ اسے فخر کا احساس ہوا۔ اس کا نقشہ اس نے ول کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ تین افراد کے لیے یہ مکان بہت بڑا ہے۔

ایکسیڈنٹ، طویل ڈرائیو سے آگے جا رہی تھی۔ کیرین گاڑی سیدھی گیراج پر لے آئی۔ ریسیوٹ کینٹرول سے دروازہ کھولا اور گاڑی گیراج میں داخل ہو گئی۔ اسی نے سیٹیفی بیٹ کھول دی۔ دونوں آگے پیچھے

پکھلتے لمحے

یاد رکھنا۔ کچھ گئے؟“ جو نے آخر میں سوال کیا۔ ”ہاں، مجھے سب خوب یاد ہے۔“ باسل نے جواب دیا۔

”گڈ، اب نکل چلو۔“ قوی پیکل باسل چلتے چلتے رک گیا۔ ”کیا ہوا؟“ جو نے سوال کیا۔ ”کیا وہ ایک گڈ نائٹ سا تھا جسے جاسکتی ہے؟“

جو کھڑکی سے ہٹا اور بیڈ کے سرہانے سے ایک بارلی اٹھا کر باسل کو پکڑائی۔ باسل نے بیٹی کو احتیاط سے اس طرح سینے سے لگا یا ہوا تھا جسے وہی بیٹی کی ماں ہو۔ وہ درختوں میں پوشیدہ ٹرک کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

کیرین کچن کاؤنٹر پر ”ہوا گھنٹہ“ جزل آف میڈیسن“ کے اوراق پلٹ رہی تھی۔ دو گلاس آکسٹی کے کاؤنٹر پر رکھے تھے۔ گلاس کے ساتھ، شوگر چیک کرنے والا پلاسٹک ڈیوائس رکھا تھا۔ اس نے میگزین سے نگاہ ہٹائے بغیر پھر آواز لگائی۔ ”اسی؟ تم ٹھیک ہو، مہوشی؟“ کوئی جواب نہیں آیا۔

کیرین نے مطالعہ کرتے ہوئے گلاس سے ایک سہ لیا۔

☆☆☆

جو کی ہدایت کے مطابق باسل نے انجن اسٹارٹ نہیں کیا تھا۔ بیٹی کو احتیاط سے لٹانے کے بعد اس نے پک اپ ٹرک کو دھکیلتا شروع کیا۔ وہ اسے اس طرح پیش کر رہا تھا جیسے عام آدمی بائیک کو لے کر پیدل چلتا ہے۔ پائن کے درختوں کے پیچھے سے ٹرک نکال کر وہ ڈرائیو سے پر لے آیا۔ ڈرائیو سے، پہاڑی پر اوپر سے نیچے جا رہی تھی لہذا ڈھلوان پر ٹرک نے خود ہی ریگنا شروع کر دیا۔ اس کی رفتار بڑھنے سے پہلے وہ ٹرک میں میں بیٹھ چکا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور کروک مائل روڈ پر آگیا۔ یہاں سے اس کو ہائی وے 463 پر پہنچنا تھا، پھر وہاں سے انٹر اسٹیٹ 55... ایک لمبی رات آگے تھی۔ اس نے بیٹی پر ہر شفقت نظر ڈالی اور سفر شروع کیا۔

☆☆☆

کیرین کی ساعت نے گاڑی کے انجن کی مدھم آواز اٹھائی تھی۔ دن کے اس وقت یہ آواز غیر متوقع تھی۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ شاید

گاڑی سے اترے۔ ”پہلے جانے بیوگی؟“ کیرین نے استفسار کیا۔ ”ہاں، ٹھیک ہے۔“ ”نہیں، پہلے میں تمہاری شوگر چیک کروں گی۔“ کیرین نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا۔ گھر میں داخل ہو کر وہ ہال دے میں رک گئی۔ دیوار پر ڈیجیٹل الارم پیش میں سیکورٹی کوڈ سچ کرنے کے بعد اس نے ریفریجریٹر کا رخ کیا۔

اسی نے اپنے بیڈروم کے پاس سے گزرتے ہوئے ادھ کھلے دروازے میں سے اندر نگاہ ماری۔ اس کی گڑیاں بیڈ کے سرہانے اسی طرح لٹکی ہوئی تھیں جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔ ہاتھ روم سے نکل کر اسی نے کچن کا رخ کیا۔ ایک بار پھر وہ بیڈروم کے سامنے سے گزرتی تو ناموس ی ٹوائس کے نقشوں میں تھی۔ اسی نے رک رک کر بیڈروم میں جانا چاہا لیکن ماں کی آواز سن کر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ کیرین اسے چائے کے لیے بلا رہی تھی۔ اسی نے بیڈروم کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ رخ بدلتے ہی کوئی گرے رنگ کی چیز اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اس نے اضطرابی طور پر ہاتھ اٹھایا، ہاتھ گرے رنگ کے پیچھے کسی شے سے ٹکرایا۔ وہ گرے رنگ کا تو لیا تھا، تو لیے کے اندر ایک ہاتھ۔

اسی نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن تو لیے والا ہاتھ مضبوطی سے اس کی ناک اور منہ پر جم چکا تھا۔ ناموس بو میں اضافہ ہو گیا جو تو لیے میں سے آرہی تھی۔ یواس کی ناک کے راستے پیچھے پڑوں میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

باسل نروس تھا۔ وہ اسی کے بیڈروم کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنے نزن کو دیکھا، جو بازوؤں میں کسی بچی کو اٹھا لے بیڈروم میں داخل ہو رہا تھا۔ بیٹی لائیں چلا رہی تھی، لیکن اس کی مزاحمت سرعت سے معدوم ہوئی چلی گئی۔

جو نے کھڑکی کی راہ بچی کو باسل کے حوالے کیا۔ باسل نے ڈھکی پرندے کے مانند بچی پر نظر ڈالی اور اسے اپنے چوڑے سینے سے لگا لیا۔

”دیری گڈ، باسو۔“ جو کے چہرے پر ہلکا سا مسکراہٹ تاج رہی تھی۔ ”معذرت خواہ ہوں۔ اوکے؟ یہ دو سے چار گھنٹوں کے لیے آؤٹ ہو گئی ہے۔ کافی ناگم ہے۔ تم ہر تیس منٹ بعد کال کرو گے۔“ ”ہیلو“ کے سوا کچھ نہیں بولو گے، جب تک میں خود کوئی سوال نہ کروں اور بیک اپ پلان کو

”اسی؟ کیا تمہیں مدد چاہیے، ہنسی۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اچانک خوف نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔ اسی کے شوگر لیول سے وہ ہر وقت محتاط رہتی تھی۔ وہ کچن سے نکل کر ہال میں آگئی۔ دفعتاً اس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے، وہ حیرت اور ہراس کے عالم میں وہ سیاہ بالوں والے اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کے ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ ٹیکٹت سر سے پاؤں تک کمر بن کے مسامات نے پسینہ اگل دیا۔

مینی کا نام سن کر کیرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
خوف اور دہشت نے اسے مفلوج کر دیا۔ اس نے چیخنے کی
کوشش کی مگر حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ اس کا منہ کھلا لیکن
کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔

کیرین ابتدائی شاک سے باہر آئی تو جسم نے جھٹکا لیا
ورجیٹ اٹھی۔ ”اسی... ی...“

کیرین نے توپ کر اسے راستے سے ہٹایا اور اسی
کے کمرے کی طرف بھاگی۔ کمرے کے بعد ہاتھ روم کو
لکھا، پھر تمام گراؤنڈ فلور چھان مارا۔ وہ اسی کو آوازیں
تیا جاری تھی۔ بعد ازاں وہ پہلی منزل پر آگئی۔ تاہم
وہ ایسی کواچھ ہاتھ نہ آیا۔ اسی غائب تھی۔ کیرین نے
اٹھا کر 911 ملایا۔ آپریٹر کے بجائے دوسری طرف
مناجات کی آوازیں آنے لگیں۔ یقیناً جو نے پہلی فون
مذہبی لائن ملا کر ریسور واپس نہیں رکھا تھا۔ اس نے فون

پنجا اور بیڈروم میں آکر پرائیویٹ لائن کو آزمایا۔ اس لائن پر موسم کا حال بتایا جا رہا تھا۔

نہ رونا دھونا کیا۔ تیرن کے سندرھوں کے چپ لیا۔
 ہزاروں موجود تھے۔ سنڈروا پس جگہ پر کر کے وہ کرسی
 سے نچے اتر آئی۔ پہلے ہاتھ میں آئی ہے اس کا حوصلہ بڑھ
 لیا۔ بیدروم کا دروازہ کھول کر اس نے چین کا رخ کیا۔ لیکن
 کے بارہوہر مکی اور اندر جھانکا۔ جو مین چین ٹیل کے
 ہاتھ اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیرن کا نکالا
 اس کی کانگاس تھا۔

”کیرین، تم مجھے شوٹ کرو گی؟ کیا میں تمہیں کیرین
سکتا ہوں؟“

ان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”دھیان سے سنو کیرن۔ یہ انخواب ہے تاوان کا
ہے اور کچھ نہیں۔ اوکے؟ پیسوں کا معاملہ ہے۔ اسی
وقت میرے کرن پائل کے پاس ہے۔ پائل کے
پل فون ہے۔ اگر میں نے تیس منٹ کے وقفوں سے
پل نہیں کی یا اس کی کال کا جواب نہیں دیا تو وہ اسی کو
سے گا۔ اگرچہ وہ اس میں کرتا جانتا لیکن، جیسے کہ،

ہو رہا ہے، نیز اسے کیا کرتا ہے
جو کی معلومات نے کیر لین کو مایوسی کے اندر سے
میں پھینک دیا۔ جو اور اس کے سامنے سب کچھ جانتے ہیں۔
وہ مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ وارد ہوئے تھے۔ وہ کیا کر سکتی
ہے۔ خوف اور اندیشے اسے سوچنے کا موقع نہیں دے رہے
تھے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ کیرین لرز اٹھی۔
 ”یہ آپریشن چوبیس گھنٹے کا ہے۔ ٹھیک چوبیس گھنٹے۔
 بیس گھنٹے باقی ہیں۔“

جوتے نمی میں سر ہلایا۔ ”تیر کیرن میں جانتا ہوں کہ تم ادا جی کر سکتی ہو لیکن یہ ہمارا طریقہ کار نہیں ہے۔ ہر کام ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوگا۔ کتنی خوب صورت جگہ ہے۔ ہم کھانا کھائیں گے۔۔۔ ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کریں

”میری بھی سنو، یوسن آف بیج۔“

مجھے کتابچے پر مجبور مت کرو۔“

”بکواس۔“
”بکواس نہیں ہے۔ اسی کو بچکا ناما زیا بیٹس کا مرض

”کونسی شہوت؟“

23 جنوری 2016ء

تم اسامیٹ حکومت ہو اور بائیں اچھا بندہ ہے۔ وہ بچوں سے پیار کرتا ہے، کیونکہ وہ خود بھی بچوں جیسا ہے۔ شروع شروع میں ہی واحد شخص رہا ہوں جس نے اس کا خیال رکھا ہے اس لیے وہ میری ہر بات مانتا ہے۔ لہذا تم یہ سُن استعمال کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔“

”تم خاصی سمجھ دار ہو۔ میری باتوں پر دھیان دو۔
جیسا کہ میں نے پہلے کہا، یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہے

یہی کہیں کر رہی تھی۔ اس کا سن والا ہاتھ میرے متوازن ہوتا
 چار ہاتھ۔

گزار رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ ان کی

کیرین گن چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ تاہم اسے شدید بے بسی کا احساس ہوا۔ اس نے گن کچن ٹیبل پر رکھ دی۔

اں ایسی صورت حال میں کر سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا
دوہر بھی تمہاری طرح ایک معقول شخص ثابت ہوگا۔“

جوںے ہڑی دیھی۔ ”تمہارا شوہر اس وقت فضا میں
 وگا، بلوکی کے قریب... وہ ”بیوریج“ کیسینور یسورٹ“

جاسوسی داجسٹ

بیٹھے تھے۔

”میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کل تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ کیرین بولی۔ ”تم اپنی رقم لو اور قصہ ختم کرو۔“

”پہلی وجہ یہ ہے کہ بیک بند ہو چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تادان کی رقم وصول کرنے کا ہمارا طریقہ کار مختلف ہے۔“

”کیا منصوبہ ہے تمہارا؟“

”تمہارا شوہر اپنے مالی مشیر... مگرے ڈیوڈن... کو کال کر کے ایک چھوٹی سی کہانی سنائے گا... تم لوگ، والٹر اینڈرن کے عاشق ہو۔ تمہارے گھر میں جگہ جگہ اینڈرن کی قیمتی پیشنگز آویزاں ہیں۔ تمہارا شوہر، مگرے ڈیوڈن کو بتائے گا کہ اس نے حال ہی میں والٹر اینڈرن کا بنایا ہوا ایک نادر مجسمہ دریافت کیا ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے میں یہ مجسمہ اینڈرن کے گھر سے چرایا گیا تھا اور اس کی مارکیٹ ویلیو...“

”اس کی مالیت، مگران قدر پیشنگز کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔“ کیرین نے جو کی بات کاٹ دی۔ ”کیونکہ والٹر اینڈرن نے فنی کے مجسمے تراشے تھے اور نوادرات کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔“

”گڈ، تم بہت سمجھ دار ہو۔“ جو نے دانت نکالے۔ ”میرا ہوم ورک مکمل ہے۔ تمہارے شوہر جیسے ڈاکٹروں کو کچھ نہ کچھ جمع کرنے کا خبط ہوتا ہے۔ کسی کو کتابیں، کسی کو گاڑیاں، آرٹ ورک وغیرہ وغیرہ...“

”مسٹر جو، تمہارا ہوم ورک مکمل نہیں ہے۔“ کیرین نے دل میں کہا۔ ”اگر مکمل ہوتا تو تمہیں ایسی کے مرض کا علم ہوتا... تم اور کہاں کہاں غلطی کر گئے ہو، جلد پتا چل جائے گا۔“

”تمہارا شوہر کل صبح ڈیوڈن سے کہے گا کہ وہ پانچ لاکھ ڈالرز بلوکی میں اسے وائر کر دے۔ کیونکہ مجھے کام موجودہ مالک کی پیش طلب کر رہا ہے اور وہ بھی تمہارا شوہر اس موقع کو گنونا نہیں چاہتا۔ اس طرح ڈیوڈن کو شک بھی نہیں ہوگا۔ مزید برآں، ڈاکٹرول کی بیماری ہوئی کیرین، تصدیق کے لیے ڈیوڈن کے آفس آسکتی ہے۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی مگر یہ ایک سوٹر ڈرک ثابت ہوئی۔ پھر ہم دونوں ڈیوڈن کے آفس جائیں گے، میں باہر رگوں گا اور تم اندر جا کر خطہ کروگی۔ فوراً پانچ لاکھ ڈالرز روٹی کی رفتار سے تیز، بلوکی پہنچ جائیں گے۔ میرا پانٹر بلوکی میں، دل کو لے کر

قطعے میں آ رہا تھا۔ سورج کی روشنی کم اور پرندوں کی آوازیں زیادہ تھیں۔

جنگل میں ایک نئی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ درختوں میں کچے راستے پر ایک گاڑی نمودار ہوئی جس کا رنگ سبز تھا۔ یہ پرانا ایک اپ ٹرک تھا، جو کمین کے پاس آ کر رک گیا۔ انجن بند ہو گیا اور گاڑی میں سے ہماری بھر کم باسل عرف باسو باہر نکلا۔ باربی ڈول اس کی جیب میں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے احتیاط سے ایسی کا بے حس و حرکت جسم بازوؤں میں سنبھالا اور کمین نما گھر میں لے گیا۔

☆☆☆

پیرن 58 نے گلف پورٹ۔ بلوکی کے انٹر پورٹ پر لینڈ کیا۔ گراؤنڈ کریو کے اشارے پر پیرن 58 جرنل ایوی ایشن ایریا میں خالی جگہ پر رک گیا۔ چھوٹی سی گردش بھی تو دل باہر نکلا۔ اس کا مختصر سامان اس کے ساتھ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کرائے پر حاصل کردہ فورڈ ٹیڈیو میں چوسر تھا۔

دوا کی خوراک لینے کے باوجود اس کے جوڑوں میں دکن تھی۔ کیسینو کے میٹنگ روم میں پہنچنے کے لیے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت بچا تھا۔ 90SU ہائی وے پر آ کر اس نے خطرہ مول لیا اور حد رفتار توڑ دی۔ وقت پر پہنچنے کے لیے وہ ٹریفک پولیس کا کلک لینے کے لیے تیار تھا۔ تاہم اس کی نویت نہیں آئی۔ بیرون کیسینو رپورٹ پہنچنے ہی لپ ٹاپ کے سوا، دوسرے بیگ اس نے تیل بوائے کو بٹھرائے...

چیک این ڈیک پر دل نے اپنا نام بتایا۔ فوراً ہی منجر آن دھمکا اور گرجوٹی سے مصافحہ کیا۔ اس کا نام کیوڑیو تھا۔

”ڈاکٹر جینگ، آپ کے ساتھی کچھ پریشان ہو چلے تھے۔“ کیوڑیو نے ہلکی سی شمر اہٹ کے ساتھ کہا۔

”سنارو لینے کے بعد میں تیار ہوں۔“ دل نے جواب دیا۔

”ڈاکٹر، آپ کا سوٹ اٹھائیں سو میں منزل پر ہے اور ہمارا آڈیو ویو کنسلٹنٹ، میکولیا پال روم میں آپ کا منتظر ہے۔ وی آئی ٹی ایلیوٹر، جیولری کے ساتھ ہے۔ کسی بھی ضرورت کے لیے مجھے یاد کرتے وقت ہتھیانے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے میرے نام سے بلا سکتے ہیں۔“

”اوکے، شکر یہ۔“ دل مسکرایا۔

☆☆☆

جو اور کیرین، کچن فیل کی کرسیوں پر آئے سانسے

”مجھے بات کرنے دو۔“ کیرین نے مگن کو حرکت دی۔ وہ مضطرب ہو گئی۔

جو نے ہاتھ اٹھا کر اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ”اسی بات نہیں کر سکتی۔ وہ بے ہوش ہے۔“

”کیا... کیا... کیا...؟“ کیرین چلا اٹھی۔ ”تم نے کیا دیا ہے، اسے؟“

جو، تھوڑا سا اٹھا اور کیرین کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ ضرب کی شدت نے کیرین کے پیچھے چھڑوں سے ساری ہوا نکال دی۔ وہ دہری ہو کر فرش پر گری۔ مگن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

”باسو، فورے سنو۔“ پیچی کو کوئی مٹھی چیز بت کھانا۔“

”اسے سیال ایشیا کی ضرورت ہے۔“ کیرین نے ہاتھ پٹے ہوئے کہا۔ ”پانی... زیادہ پانی۔“

”باسو، لڑکی کو پانی زیادہ پلاؤ۔ اوکے؟“

”ٹھیک ہے۔“ دوسری طرف سے بچوں جیسی الجھن زدہ آواز آئی۔

”شاید مجھے رات میں وہاں آنا پڑے۔“ جو نے عندیہ دیا۔

کیرین کو امید کی کرن دکھائی دی۔

”گاڑی کی رفتار کم کر دو۔“ جو نے ہدایت جاری کی۔

”اوکے۔“

”گڈ بوائے۔“ جو نے رابطہ منقطع کر دیا۔

جو، کیرین کے قریب بیٹھ گیا۔ ”میرا پانٹر تمہارے شوہر سے رابطہ کرے گا۔ آگے چلنے سے پہلے میں تمہارے شوہر کا رومیل دیکھنا ہے۔ آیا وہ ہمارے ساتھ ایک بیج پر ہے یا نہیں۔“ مگن نے ڈیپائٹس والا معاملہ اسے بھڑکا دے۔

تاہم میں امید کرتا ہوں کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔ اگر مسٹر دل نے کوئی غلط حرکت کی تو پھر ساری دنیا کی انوسلین بھی ایسی کو نہ بچا سکے گی۔“ جو دھمکی دے کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

جنگن کے خوب میں چالیس میل دور جنگل کا ایک چھوٹا سا قطعہ درختوں سے صاف تھا۔ اس صاف شدہ قطعہ اراضی میں ایک اے ایم سی ریمبلر کھڑی تھی۔ ریمبلر مسخ زمین کے بجائے پلاسٹک کے اوپر کھڑی تھی۔ ریمبلر کے قریب ایک چھوٹا سا کمین نما گھر تھا۔ اطراف میں درخت اور درختوں کے درمیان سے ایک تنگ کپارا سہ، صاف شدہ

ایک درجن کے قریب شیشے کی دائرہ نکالیں۔ جو نے ایک دائرہ اٹھا کر لیبل پڑھا اور اس کی پیشانی ٹھنک آلود ہوئی۔

”لخت ہے، ناقابل یقین۔“ پہلی بار اس کے اعتماد میں نظر کا عنصر دکھائی دیا۔ یہ انکشاف اس کے منصوبے سے متصادم تھا۔

”کچھ کرو۔ ایک گھنٹے کے اندر اسی کو ڈوز دینا ہے۔ وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟“ کیرین کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”میں ہم نہیں جاسکتے۔“ جو نے سپاٹ لیجے میں کہا۔ کیرین نے لپک کر مکمل 38 دوبارہ اٹھالیا۔ نشانہ جو کا سینہ تھا۔

”میں نے بتایا نہیں تھا، مگن استعمال کرنے کا نتیجہ؟“

”کیا فرق پڑتا ہے؟ اسی نہیں تو تم بھی نہیں۔“ کیرین نے فیصلہ کر لیجے میں کہا۔

جو نے دونوں ہاتھ بلند کیے۔ ”آرام سے، آرام سے... بیٹھ جاؤ۔ میرا مطلب تھا کہ ہم فوری طور پر نہیں جا سکتے۔ اسی محفوظ جگہ پر ہے۔ ہم بعد میں جاسکتے ہیں۔ اسے انوسلین دینے میں کتنا وقت ہے؟“

کیرین نے دماغ میں حساب کتاب جوڑا۔ اگر اسی مفاسد کم مقدار میں استعمال کرتی ہے تو رات نکال لے گی۔ لیکن کیرین رسک نہیں لے سکتی تھی اگر جو کے کزن نے اسے کوئی چیز بھیجی تھی...

”چھکاؤ ڈیپائٹس... چاکلیٹ کینڈی وغیرہ...“

”اگر ایسی نے زیادہ مٹھی خوراک لی تو وہ کوہے میں جاسکتی ہے۔ اس کے بعد موت کا سفر بہت تیزی سے مکمل ہوگا۔“

جو نے پچھلا ہونٹ چپایا۔ وہ دماغ میں اپنا حساب جوڑ رہا تھا۔ پھر وہ میز سے ہٹ کر دھکی ڈیک پر گیا جہاں مل اور رسالے پڑے تھے۔ وہاں سے کورڈ لیس فون اٹھا کر اس نے نمبر سچ کیے۔ کیرین نے قدم بڑھا کر اسٹیکر کے بن پر ہاتھ مارا۔ جو نے نیچے دیکھا۔ وہ اسٹیکر کا سوچ آف کرنا چاہ رہا تھا... اسی اثنا میں دوسری جانب سے مردانہ آواز آئی۔

”جو، نہیں منٹ ہو گئے کیا؟“

”نہیں۔ آئی ایم سوری... لیکن تم کو صرف ہیلو بولنا تھا۔“

”اوہ ہاں، معاف کرنا۔“ جو کے کزن کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بڑا بچہ بول رہا ہو۔

”پچی کا کیا حال ہے؟“ جو نے سوال کیا۔

”ٹھیک ہے۔ وہ سو رہی ہے۔“

جینک پہنچے گا۔ دل اندر جائے گا اور کیش لاکر میرے پارٹنر کے حوالے کر دے گا۔

”تم نے یہ اٹو کھانصوبہ 6 لاکھ ڈالرز کے لیے بنایا ہے۔ کیا ضرورت تھی اتنا کھڑا کر کے؟“ کیرین نے اظہار حیرت کیا۔

جوں نے قہقہہ لگایا۔ ”یہی میری انفرادیت ہے۔ عام کڈنپر ڈانوا کڈنگان کی کھوپڑیوں میں بھس بھرا ہوتا ہے۔ اسی لیے مارے جاتے ہیں یا پکڑ لیے جاتے ہیں۔ ایف بی آئی کے نزدیک تادوان کی رقم اٹھانے کا کوئی بھی طریقہ محفوظ نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے۔ تمہارا شو ہر خود میرے لیے تادوان کی رقم وصول کرے گا۔ تم بھجواؤ گی اور وہ نکالے گا۔ میرا انکیش ذکر نہیں ہے۔ کتنی خوب صورت بات ہے؟ دوسروں سے بالکل مختلف۔ کوئی کسی کو کال نہیں کر سکتا۔ کال صرف میں اور میرے ساتھی کریں گے۔ ہر مینٹ بعد۔ جب تک ہم یہ کرتے رہیں گے، سب شیک رہے گا۔ کوئی زخمی ہوگا نہ کوئی مارا جائے گا اور نہ ہی کوئی سلاخوں کے پیچھے جائے گا۔ تادوان بھی میرا کس ہوتا ہے۔ مجھے قناعت پسند کچھ لو... میں واردات بھی سال میں ایک بار کرتا ہوں۔ تادوان ادا کرنے والوں کو رقم دینے میں کوئی تکلیف نہیں اور بچہ بھی بجزیرت انہیں واپس مل جاتا ہے۔“

”تم شیخی خود معلوم ہوتے ہو۔“ کیرین نے طنز کیا۔ جوں نے کندھے اچکائے۔ ”ممکن ہے ایسا ہو لیکن میرا کلین ریکارڈ میری باتوں کا گواہ ہے۔ اوپر تلے پانچ مرتبہ میں بے عیب وارداتیں کر چکا ہوں۔ کچھ نہ کچھ خیر تو میرا حق بنتا ہے یا نہیں؟“

”یہ کوئی دغا داری یا کاروبار نہیں ہے۔ کیا تمہیں بچوں کے احساسات کا خیال نہیں آتا، ان پر کیا گزرتی ہو گی؟“

”بچے جو پیش گئے کے لیے کچھ بھی فیس کر سکتے ہیں جب میں بچہ تھا تو میں نے کئی سال اس سے زیادہ خراب حالات کا سامنا کیا تھا۔“

”لیکن جلد یا بدیر تو غلطی کرو گے۔ ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔“

”میں غلطی نہیں کروں گا۔ ہو سکتا ہے، میرا کوئی ساتھی کر جائے۔ جیسے پاسو، پاسو ایک بڑا بچہ ہے۔ بہت بڑا بچہ۔ دیکھنے میں گوریلا لگتا ہے لیکن اندر سے بچہ ہے۔“ کیرین نے آنکھیں بند کر لیں۔

”ذرا مت۔ وہ بچوں سے زیادتی نہیں کرتا۔ وہ تو بچوں سے محبت کرتا ہے۔ ان کا خیال رکھتا ہے۔ جب ہم بچے کو واپس کر دیتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ ہاں اگر بچہ بھانگنے کی کوشش کرے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔“

”کیا ہم رات میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے؟ اسی کو انسولین کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ شام کے کھانے کے لیے کچھ کرو۔“

”سنو...“

”کچھ نہیں، کھانا۔“ جوں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

☆☆☆

دل کا لیکچر اور وڈیو ڈیو، نہایت کامیاب رہا۔ سامعین کی تعداد ہزار سے اوپر تھی۔ تقریباً سب پروفیشنل تھے۔ اس کی ملاقات چند پرانے ساتھیوں سے بھی ہوئی ان میں اس کا عزیز دوست جیکسن ایورٹ بھی تھا۔... دل کی تین سالہ تحقیق اور نئی دوا کے وڈیو مظاہرے نے سامعین و ناظرین کو خوب متاثر کیا۔

وہ نازنین و ناز آفریں مختصر سی سیاہ لباس میں جلوہ افروز تھی۔ اس کے گلے میں ڈانڈا ٹیکس چمک رہا تھا۔ وہ خاموش اور بظاہر خیا تھی۔ جہاں دل کھڑا تھا، وہاں سے نازنین کی شکل قریب تھی۔ سامعین میں موجود خواتین میں وہ سب سے کم عمر تھی۔... نسوانی حسن کے تمام لوازمات سے سجا۔ اس کی سیاہ آنکھیں لیزر کے مانند مستقل دل کے اوپر مرکوز تھیں۔

دل کی نظریں حاضرین پر سے گھومتی ہوئی جب بھی نازنین پر آئیں، وہ اسے اپنی جانب گمراہاں پاتا۔ وہ سیاہ بالوں والی حینہ کا فوش لینے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم اس کی توجہ اپنے اصل ٹاسک کی جانب رہی۔...

جب وہ تقریر ختم کر کے اپنے کاغذات اور دیگر اشیا سمیٹ رہا تھا، اس وقت نازنین کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

دل، ہاتھ ملاتا اور تینتی کلمات وصول کرتا ہوا ایلیوٹر کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں دو ڈاکٹر سمیت تین افراد اور تھے۔ ایلیوٹر کا دروازہ بند ہونے جا رہا تھا، تب ایک نسوانی آواز بلند ہوئی۔

”رکو... ذرا۔“

دل کا ہاتھ اظہار ادبی طور پر ڈور کو بند ہونے سے روکنے کے لیے اٹھا۔ اچانک حرکت سے ہاتھ کے جوڑ میں

پگھلتے لمحے

”تمہیں معلوم ہو جائے گا، جلدی کرو۔“

”میں اندر نہیں جا رہا، مجھے پتا چلتا چاہے کہ مسئلہ کیا ہے۔“ دل دیوار پر فون کی طرف بڑھا۔ ”میں فرنٹ ڈیسک کو فون کر رہا ہوں کہ پولیس کو کال کریں۔“

”فون کو ہاتھ مت لگانا۔“ لڑکی کا انداز بدل چکا تھا۔

”شیرل، تم مجھے شوٹ نہیں کر سکتیں۔“ دل نے مضبوطی سے کہا اور فون اٹھا لیا۔

”تم نے کوئی کال کی تو پھر میں بھی اسی کو مرنے سے نہیں روک سکتی۔“

دل کے دماغ میں دھماکا ہوا اور ہاتھ منجمد ہو گیا۔ ”کیا کہا تم نے؟“

”ڈاکٹر، تمہاری بیٹی دو گھنٹے پہلے اغوا ہو چکی ہے۔ تم اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے اندر لے چلو۔ جلدی کرو۔“ اس کی آواز میں سنجیدگی اور اثرات میں بے یقینی تھی۔

دل کے سینے میں دھواں سا بھر گیا۔ کان شاخیں شاخیں کر رہے تھے۔

”ڈاکٹر، اگر کوئی آگیا اور مجھے گن کے ساتھ دیکھ لیا تو کہانی ختم ہو جائے گی۔ میں تمہاری بیٹی کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔ وقت ضائع نہ کرو، اندر چلو۔“ شیرل نامی حینہ کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔

دل نے چند سیکنڈ اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شیرل بھی اس کے پیچھے آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ پہلے اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نشست گاہ سے گزر کر بیڈروم میں چلی گئی۔

”میری بیٹی کے بارے میں بتاؤ؟“

”تادوان کے لیے تمہاری بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے۔ میرا ساتھی، میڈیسن کاؤنٹی میں، اس وقت تمہاری بیوی کے ساتھ ہے۔ یہ دوسری لوکیشن ہے جبکہ ایک لوکیشن یہاں ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہمارا تیسرا ساتھی، تمہاری بیٹی کے ساتھ تیسری لوکیشن پر ہے۔...“ شیرل نے دل کو مقصد اور پلان مختصر الفاظ میں سمجھایا۔

دل کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جو سچویشن تخلیق کی گئی ہے، اس میں وہ شیرل کے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔ شیرل کی گن صرف اس کی ابتدائی بدحواسی کو قابو میں کرنے کے لیے تھی۔ اصل پریشانی ابھی کی نامعلوم تیسری لوکیشن تھی۔ تینوں کارابیطب منٹ منٹ کے وقفوں کے ساتھ تھا۔... اگر وہ پولیس کو فون کر دیتا اور پولیس شیرل کو گرفتار کر بھی لیتی تو تین منٹ میں اسی کا خاتمہ یقینی تھا۔

میں ابھی۔

”شکر ہے۔“ سیاہ لباس والی نازنین نے ایلیوٹر میں قدم رکھا۔ دل نے ایلیوٹر کے آئینے میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ ہینڈ بیگ تھامے فلور کو تک رہی تھی۔ آٹھویں منزل پر دونوں ڈاکٹر نکل گئے۔ بارہویں پر تیسرا فرد بھی ایلیوٹر چھوڑ گیا۔ دل نے کچھ بے یقینی محسوس کی۔

”آپ کا لیکچر متاثر کن تھا۔“ حینہ نے خاموشی کا قتل توڑا۔

”شکر ہے۔“

”آپ کا فلور کون سا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”اٹھائیس۔“ دل کو احساس ہوا کہ وہ مین رہنا بھول گیا تھا۔ لڑکی نے مین دہرایا۔ ”میں بھی اٹھائیس پر ہوں۔“

”تم ڈاکٹر ہو؟“ دل نے سوال کیا۔

”نہیں، میں تو سیکرٹری ہوں۔“ اس نے بہم جواب دیا۔

دل نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اٹھائیسویں منزل پر دونوں ایلیوٹر سے باہر آ گئے۔

”ہائے۔“ لڑکی مسکرا کر داہمیں جانب چل پڑی۔

دل اس کی سمت خرابی کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور بائیں طرف مڑ گیا۔ وہ سوئٹ نمبر 28021 کے سامنے رکھا اور کریڈٹ کارڈ کی ٹکالی۔ لڑکی کی جلوہ افروز یوں کے علاوہ کوئی اور ہی چیز میچو جوں کے دماغ میں اٹک رہی تھی۔

”کارڈ کی استعمال کرتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا اور دنگ رہ گیا۔ لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ دل کے دماغ میں گھنٹی بجی، یہ کیا اسرار ہے؟ وہ کار پینڈ فلور پر دبے قدموں اس کے پیچھے آگئی تھی۔

”میرا نام شیرل ہے، ڈاکٹر۔“ لڑکی دل کا انداز میں مسکرائی۔

”میں سمجھا نہیں، کیا چاہتی ہو؟“ دل کی آواز میں الجھن تھی۔

”اندر چل کر بتاتی ہوں۔“

”تم ہوش میں ہو؟“ دل کو غصہ آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر غیر یقینی چھا گئی۔ لڑکی کے ہاتھ میں آٹو بیگ پہلے تھا جس کا رخ دل کے سینے کی طرف تھا۔

”یہ کیا ہے؟ میرے پاس کیش زیادہ نہیں ہے۔“

”مجھے کیش نہیں چاہیے، مجھے اندر جانا ہے۔“ لڑکی نے ایلیوٹر کی طرف نگاہ مارتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”مگر کس لیے؟“

پولیس تیس منٹ میں دوسری لوکیشن پر نہیں پہنچ سکی تھی مزید یہ کہ تیسری لوکیشن دریافت کرنا تو محال تھا۔ قسمت یاوری کرتی تو تیس منٹ میں زیادہ سے زیادہ وہ شیرل کو گرفتار کر سکتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”کیا ضمانت ہے کہ اگر میں تمہارے کہنے پر چلوں تو اسٹی ہمیں واپس مل جائے گی؟“

”کوئی ضمانت نہیں ہے۔ تمہیں بھروسہ کرنا پڑے گا۔“ شیرل نے کہا۔

”یہ کافی نہیں ہے، کچھ اور بتاؤ۔“

”تمہاری بیوی اور بیٹی کو پبلک پلیس پر اتنے فاصلے پر چھوڑ دیا جائے گا، جہاں سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہوں۔“ شیرل نے اضافہ کرتے ہوئے گزشتہ پانچ ”کارناموں“ کے بارے میں بھی بتایا۔

دل اپنی حیرت اور ہراس کو سنبھالنے پر آنے سے روکنے میں کامیاب رہا اور بولا۔ ”اسی کی واپسی کے بعد کون سی چیز ہمیں پولیس کے پاس جانے سے روکے گی؟“ دل سمجھ رہا تھا کہ وہ اور اس کی بیوی اور بیٹی، پیشہ ور تادان خوروں کے ہاتھوں بے بس ہو چکے ہیں۔ یہ پیشہ ور مغز و انداز کے مجرم تھے۔ وہ اس بات پر بھی الجھ رہا تھا کہ ہر مرتبہ ان لوگوں نے ڈاکٹر زکوئی نشانہ کیوں بنایا تھا؟

”اس صورت میں ہمیں پتا چل جائے گا کہ پولیس ہمارے پیچھے ہے۔ ہم میں سے ایک واپس آ کر اسی کو ختم کر دے گا اور وہ ایسا کر سکتا ہے۔ میرا یقین کرو۔ پہلے بھی کسی نے رپورٹ نہیں کی۔ سادہ سی بات ہے، تم پانچ لاکھ ڈالرز کے لیے یوں اتنا بڑا ریسک لوگے جبکہ اپنی رقم تمہارے لیے بڑا مسئلہ نہیں ہے۔“ شیرل نے جواب دیا۔

اپنی مایوسی چھپانے کے لیے دل کو دوسری طرف مڑنا پڑا۔ وہ کھڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ زندگی میں اس نے بھی ایسی بے بسی محسوس نہیں کی تھی، اس حقیقت نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔

”لیڈی، تم سمجھتی ہو کہ میں تمام رات گن کے سامنے آرام سے بیٹھا رہوں گا جبکہ میری بیٹی انٹو ہو چکی ہے۔ بیشتر اس کے کہ اس کی کوئی نقصان پہنچے، میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

”آرام سے رہو، ڈاکٹر۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شیرل نے پلٹ کر جھنجھکی دی۔

”کیا تم ابھی تک ماں نہیں بنیں؟ بچوں کے معاملے میں اتنی بے حس؟“

”میرے احساسات کی بات نہ کرو۔“ شیرل نے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”تو تم بتا دو اپنے بارے میں۔“ دل کی آواز میں کڑواہٹ تھی۔

”میں خبردار کرتی ہوں، میری ذات کے بارے میں کوئی بات نہ کرو۔“

دل جواب دینے والا تھا کہ اس کے دماغ میں شرارہ لپکا۔ ”اوہ تو، اس کی انسو لین کا کیا ہوگا؟“

”کیا مطلب؟“

”اسے بچوں کی ذیابیطس ہے۔ تم بے خبر ہو؟“

”سکون سے رہو۔“ شیرل کے چہرے پر ابھرنے لگی نظر آئی۔

”اپنے پانشر سے فوراً میری بات کراؤ۔“

شیرل کے چہرے پر کھٹکھٹ کے آثار نظر آئے۔ عین اسی وقت بستر کے سرہانے رکے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

دونوں نے ایک ساتھ فون کو دیکھا۔ شیرل فون کے پاس آئی اور گھڑی دیکھی۔

”تم بات کرنا چاہتے ہو؟“ وہ بولی۔ ”تمہارا موقع ہے لیکن ڈاکٹر، جھنڈے رہتا۔ بالکل جھنڈے۔“

”فون تمہارے سیل پر کیوں نہیں آیا؟ یہ کال کوئی اور بھی سن سکتا ہے؟“ دل نے اعتراض کیا۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ شیرل نے جواب دیا۔

”ڈاکٹر کو دلچسپ بات کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، ڈاکٹر۔“ دوسری جانب سے مردانہ آواز آئی۔ ”تم غیر متوقع طور پر اس وقت اپنے شاندار سوئٹ میں تنہا نہیں ہو؟“

دل نے شیرل کی جانب دیکھا۔ ”ہاں، ایسی ہی بات ہے۔“

”سیاہ لباس میں وہ کسی لگ رہی ہے؟“

”سنو، مجھے تم کو کچھ سمجھانا ہے۔“

”نہیں، کچھ نہیں۔ تم صرف جواب دو، تمہارا جواب اگر صحیح کر گیا تو بات آگے بڑھے گی۔ سوال یہ ہے کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کوئی خفیہ میڈیکل پریلبر ہے؟“

دل کو امید کی کرن نظر آئی۔ ”ہاں، اسے پچکانا ذیابیطس ہے۔“

”اوکے، گڈ۔“

”اسی کو انسو لین کی فوری ضرورت ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”ہاں، سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب تمہارا کوئی مریض ٹیبل پر مر رہا ہوتا ہے تو تم ایسی کوشش کرتے ہو؟“

”مغز، میں ابھی تھکا ہوا ہوں۔ میرے کام کے بعد معاملہ سرجن کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“ دل کو غیر متعلق سوال پر حیرت ہوئی تھی۔

”تو تمہاری وجہ سے ٹیبل پر کوئی مریض نہیں مرا؟“

”یقیناً نہیں۔“

”جب تم دوسرے شعبے میں تھے؟“

”اس وقت بھی میری وجہ سے کوئی مریض نہیں مرا۔ بعض کیس بہت بگڑے ہوئے ہوتے تھے تو میں لواحقین کو مریض کے بیچے کے امکانات کے بارے میں بتا دیتا تھا۔“

دل کو شک ہوا کہ دوسری جانب بولنے والے کا کوئی نہ کوئی تعلق اس کے پرانے مریضوں سے ہو سکتا ہے۔

”تم مریض کو نہیں بتاتے تھے کہ وہ مرنے والا ہے؟“

”ڈاکٹر زکیا نہیں کرتے۔ کیا تم اپنا نام بتاؤ گے؟“

”جو کتنی۔“

”کیا تم میرے پرانے مریضوں میں شامل رہے ہو یا میرے مریضوں سے تمہارا کوئی رشتہ رہا ہے؟“ دل نے سوال کیا۔

”فی الحال اس موضوع کو ختم سمجھو۔ میں جہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کتنا معقول بندہ ہوں۔ میں اس کی لیے انسو لین کا بندوبست کر رہا ہوں۔ تم میرے پانشر سے بات کراؤ۔“ جو نے کہا۔

”کیا میں ایک منٹ کے لیے اپنی بیوی سے بات کر سکتا ہوں؟“

”شیرل کو فون دو، ڈاکٹر۔“ جو نے روکھا جواب دیا۔

دل نے گہری سانس لے کر شیرل کو اشارہ کیا۔

”میری گفتگو کے دوران میں تم ہاتھ روم میں رہو گے۔“ شیرل نے مطالبہ کیا۔ دل خاموشی سے ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔ اندر جا کر اس نے دروازہ بند کیا اور ڈور ٹاب گھما کر پچھلے رکھی۔ تیس منٹ گزشتے گئے کہ اس نے دروازے میں معمولی جبری پیدا کی۔ شیرل کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”اسی کی میڈیکل پریلبر ہمارے ہوم ورک میں کیوں نہیں آئی؟“ وہ جو سے استفسار کر رہی تھی۔ ”اوکے، ہاں... لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوا... ہاں... ہاں... وہ تو ٹھیک ہے لیکن... اوکے میں سمجھ رہی ہوں۔ دوسری بات

”ہاں، سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب تمہارا کوئی مریض ٹیبل پر مر رہا ہوتا ہے تو تم ایسی کوشش کرتے ہو؟“

”مغز، میں ابھی تھکا ہوا ہوں۔ میرے کام کے بعد معاملہ سرجن کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“ دل کو غیر متعلق سوال پر حیرت ہوئی تھی۔

”تو تمہاری وجہ سے ٹیبل پر کوئی مریض نہیں مرا؟“

”یقیناً نہیں۔“

”جب تم دوسرے شعبے میں تھے؟“

”اس وقت بھی میری وجہ سے کوئی مریض نہیں مرا۔ بعض کیس بہت بگڑے ہوئے ہوتے تھے تو میں لواحقین کو مریض کے بیچے کے امکانات کے بارے میں بتا دیتا تھا۔“

دل کو شک ہوا کہ دوسری جانب بولنے والے کا کوئی نہ کوئی تعلق اس کے پرانے مریضوں سے ہو سکتا ہے۔

”تم مریض کو نہیں بتاتے تھے کہ وہ مرنے والا ہے؟“

”ڈاکٹر زکیا نہیں کرتے۔ کیا تم اپنا نام بتاؤ گے؟“

”جو کتنی۔“

”کیا تم میرے پرانے مریضوں میں شامل رہے ہو یا میرے مریضوں سے تمہارا کوئی رشتہ رہا ہے؟“ دل نے سوال کیا۔

”فی الحال اس موضوع کو ختم سمجھو۔ میں جہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کتنا معقول بندہ ہوں۔ میں اس کی لیے انسو لین کا بندوبست کر رہا ہوں۔ تم میرے پانشر سے بات کراؤ۔“ جو نے کہا۔

”کیا میں ایک منٹ کے لیے اپنی بیوی سے بات کر سکتا ہوں؟“

”شیرل کو فون دو، ڈاکٹر۔“ جو نے روکھا جواب دیا۔

پگھلتے لمحے

مجھے جو غلط لگ رہی ہے وہ کیرین کا شوہر ہے... میرا مطلب... جو، یہ ڈاکٹر دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ چالاک بھیڑیے کی طرح ہے جو اپنے موقع کا انتظار کرتا ہے... تیس منٹ... ہاں ٹھیک ہے... میں خیال رکھوں گی۔“

دل نے شیرل کو فون رکھتے دیکھا تو رختہ بند کر دیا۔ پندرہ منٹ گزشتے گئے کہ اس نے دروازہ کھولا سا کھول کر کہا۔

”بات ختم ہو گئی؟“

”ہاں، باہر آ جاؤ۔“

”کیا بات ہوئی؟“

”جو تمہاری بیوی کو اس کی پاس لے جا رہا ہے تاکہ اسے دوا دی جاسکے۔ ڈاکٹر یہ ہمارے پلان کے خلاف ہے۔ اس میں رسک ہے۔“

”نہیں، جو ٹھیک کر رہا ہے۔“ دل نے لہجہ متوازن رکھا۔ ”رسک اس میں ہے، نہیں اسی رات میں کسی وقت کو ماں میں نہیں چلی جائے۔ اس صورت میں، تم لوگوں کو تادان کی رقم ملنے کا امکان صفر ہو جائے گا۔ کیا میں غلط ہوں؟“

”ڈاکٹر تم ہوشیار آدمی ہو۔ ہم نے کسی واردات میں کسی بچے کی جان نہیں لی۔ لیکن تم نے اگر کوئی ہوشیاری دکھائی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

دل نے بیوی اور بیٹی کے لیے اٹھنے والی خوف کی لہر کو دباتے ہوئے کہا۔ ”آخر یہ جو ہے کون؟“

شیرل نے دل کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میرا شوہرا“

☆☆☆

اسی کہین کے اندر ایک پرانے صوفے پر جو خواب تھی۔ بائل اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نروس تھا۔ اسے علم تھا کہ چھوٹی بیٹی بیدار ہوتی ہی خوف زدہ ہو جائے گی۔ بائل اس صورت حال سے پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی کے بجائے لڑکا ہوتا تو بہت تھا۔ لڑکوں کے ساتھ نسبتاً سہولت رہتی ہے۔ بائیں میں پانچ میں سے تین لڑکے تھے۔ لڑکیوں کی صورت میں اسے بہت زیادہ سوچنا پڑتا تھا۔ زیادہ سوچنے سے وہ اداس ہو جاتا تھا۔ اسے اپنی بہن یاد آ جاتی... اس کی بہن ایلین اس وقت محض چار برس کی تھی، جب وہ خناق کے مرض میں زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ اس نے جو کے ساتھ مل کر ایلین کو بچانے کی اپنی ہی کوشش کی۔ حالات نامساعد تھے۔ بالآخر ایلین ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا لیکن وہ تاخیر کر بیٹھے تھے... اس کی اس کے طے سے آواز برآمد ہوئی۔ اس بار آواز پہلے

سے پھلتی تھی۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ باسل نے جلدی سے باربی ڈول اٹھالی۔

”ماما؟“ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ ”ماما؟“

”اسی، ماما ابھی یہاں نہیں ہیں۔ میں باسل ہوں۔“

اچانک اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ صوفے کے قریب نیچے بیٹھے ہوئے عجم باسل کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”نیری ماما کہاں ہیں؟“ اس نے کمزوری آواز میں پوچھا۔

”وہ، ڈیڈی کے ساتھ کہیں گئی ہیں۔ مجھے تمہاری دیکھ بھال کے لیے چھوڑا ہے۔“

اسی نے نظریں گھما کے بوسیدہ کئین کا جائزہ لیا۔ اس کے رخسار لال ہونے لگے۔ ”ہم کہاں ہیں؟ یہ کیسی جگہ ہے؟“

”ہم جنگل میں ہیں۔ تمہارے گھر کے قریب۔ ماما جلد واپس آئیں گی۔“

اسی نے سسکی بھری۔ وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ باسل نے فی الفور باربی ڈول اسے پکڑا دی۔ ”تمہاری ماما یہ گڑی تمہارے لیے چھوڑ گئی ہیں۔“

اسی نے گڑیا لے کر سینے سے لگا لی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

باسل نے ہمدردی سے بڑا سا سر ہلایا۔ ”ڈر مجھے بھی لگ رہا ہے۔“

”تمہیں بھی؟“ اسی کا منہ تھوڑا سا کھل گیا۔

باسل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسی نے باسل کی سب سے چھوٹی انگلی دبا کر، گویا اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”تم بہت بڑے ہو، تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔“

”ہاں، شاید۔“ باسل نے مشکل سے کہا۔

☆☆☆☆

جیکسن کے قلب میں، اس کئین سے چالیس میل دور شمال میں سفید رنگ کی ایک قلعہ نما عمارت اسپاٹ لائٹس کی روشنی میں دمک رہی تھی۔ اندر ڈیمبل کی کرسیوں پر ڈاکٹر جیس مکڈیل اپنی بیوی مارگریٹ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر مکڈیل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی سبکی میڈیکل ایسوسی ایشن کا سالانہ اجتماع جوں جوں قریب آ رہا تھا، ڈاکٹر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہفتوں کی ذہنی کھٹکھٹ کے بعد

اس نے دل کی بات زبان پر لانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس کوئی چانس نہیں تھی۔ سالانہ میٹنگ سر پر تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ٹھیک سوچ رہا ہے۔

اس نے کاغذی پلیٹ میں رکھ دیا۔ ”مارگریٹ، ڈیڈی میں جانتا ہوں کہ تم اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ لیکن میں بے بس ہو گیا ہوں۔“

مارگریٹ کے ہاتھ سے چپچہ کر گیا۔ ”کیوں؟“ اس نے شوہر کو گھورا۔ ”کس چیز نے تمہیں بے بس کر دیا ہے؟ کیا مجبوری ہے؟“

ڈاکٹر نے ہنسنی سانس بھری۔ ”شاید اس لیے کہ یہ حادثہ ٹھیک ایک سال پہلے وقوع پذیر ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ بتایا تھا، اس پر مجھے یقین تھا اور ہے۔ میں اس کو ذہن سے مٹانے میں ناکام رہا۔ اس حادثے نے ہماری گھر فیضاً کو مسموم کر کے رکھ دیا۔“

”ہماری نہیں، صرف تمہاری...“

”ادھ خدا کے لیے مارگریٹ... سالانہ میٹنگ، بلوکی میں شروع ہو رہی ہے اور ہم شریک نہیں ہو رہے ہیں۔ وجہ نہیں معلوم ہے۔ جو کچھ گزشتہ برس ہوا، اس کے اثرات ابھی تک ہمیں کنٹرول کر رہے ہیں۔ ہم نے پولیس کو نہ بتا کر غلطی کی۔ اس عورت نے جو کچھ بتایا تھا، مجھے اس پر یقین ہے۔ وہ پہلے بھی ڈاکٹروں کو نشانہ بناتے رہے تھے۔ سالانہ میٹنگ کے موقع پر انہوں نے ہماری میٹنگ کی کاغذہ اٹھایا تھا۔ اب ایسی ہی ایک اور واردات پھر سے ہونے جا رہی ہے، میں اس اندیشے سے کئی ہفتوں سے لڑ رہا ہوں لیکن یہ پختہ تر ہوتا جا رہا ہے...“

”چپ ہو جاؤ، بس کرو۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بعد میں پولیس سے رابطہ کرنے پر پتہ نہ پڑے گا۔“

”لیکن تم سوچو، ایسا ہی حادثہ کسی اور کیس کے ساتھ ہونے والا ہے۔ میں چاہے کسی طرح اسے روکیں۔“

”کیا تمہیں پیڑ کی کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ کتنی مشکل ہے اس حادثے کے مابعد اثرات سے باہر آیا ہے۔“

مارگریٹ کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے پیڑ کی ہمیشہ فکر رہی ہے لیکن ہماری بزدلی کے باعث ایک اور بچہ شکار ہونے والا ہے۔ مارگریٹ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک دونوں خاموش ہو گئے۔ ان کا گیارہ سالہ بیٹا ڈانگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ مضطرب لگ رہا تھا۔

”کیا ہو گیا؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”آپ لوگ

زور زور سے باتیں کر رہے ہیں؟“

”ادھ مائی سن، کچھ نہیں... کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ یہ بتاؤ تم جی کے گھر کب جا رہے ہو؟“

”اس کے ڈیڈی چند منٹ بعد مجھے پک کرنے آ رہے ہیں۔“

”اوکے... اپنا خیال رکھنا۔“

ڈاکٹر جیس مکڈیل پلیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بھوک اچڑکی تھی۔

☆☆☆☆

فورڈ ایکسپریشن مناسب رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اسٹیرنگ وھیل جو کہ ہاتھوں میں تھا۔ جو کہ برابر میں اگلی نشست پر کیرین بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں پر بیٹی بندھی ہوئی تھی۔ نیچے فلور پر اس کی ناگوں کے درمیان آنسو باکس رکھا تھا۔

آخری موڑ کاٹنے کے بعد جو نے اسے اپنی ہٹانے کی اجازت دے دی۔ کیرین نے آنکھیں چمک کے ادھر ادھر دیکھا۔ گاڑی درختوں میں داخل ہو چکی تھی۔

”اس راستے کے اختتام پر ہم اسی اور باسل سے ملاقات کریں گے۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی بیٹی کو پرسکون رکھنے کے لیے اس سے مکمل سکتی ہو پھر اسے انسولین لگانے کے بعد تم ایک بار اور مکمل سکتی ہو، بس آخری بار۔ اوکے؟“

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔“

”باسل نے اسی کو جو بتایا ہے، تم بھی اس کی تصدیق کرو گی اور اسے کہو گی کہ تم صبح میں اسے لینے آؤ گی۔ اسی کو بتاؤ گی کہ ہم تمہیں دوست ہیں، تم نے باسل کو اس کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑا ہے اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو پھر...“ جو نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ کیرین نے یقین دہانی کرائی۔

چند منٹ بعد ایکسپریشن درختوں سے نکل آئی۔ جو نے دوسرے ہینڈ لائٹس بند کر کے کھولیں اور انہیں کھلا چھوڑ کے انجن بند کر دیا۔ پچیس بیس گز دور کیرین نے سبز رنگ کی گاڑی اور کئین دیکھا۔ کئین کے قریب ایک اور گاڑی کا سائبہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک پکڈیشن کی تیز روشنی میں کیرین نے کئین کے قریب ایک دروازہ قامت پہلوان نما آدمی کو دیکھا۔ کیرین تعجب میں تھی کہ دوسری سفید رنگ کی کار زمین

پگھلتے لمحے

کے بجائے بلاکس پر کھڑی تھی۔

جو، گاڑی سے اتر گیا۔ کیرین نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کی رفتار قلب میں اضافہ ہو گیا۔ سناٹے میں معا ایک بچکانہ چہچہائی ہوئی۔ ”ماما؟ ماما؟“

اسی، عجم عجم آدمی کے عقب سے برآمد ہوئی تھی۔ کیرین آنسو باکس چھوڑ کر آگے لپکی اور کھٹکھٹ کے بل کھڑی ہو کر اسی کو دو بچ لیا۔

”میں یہاں ہوں، مہنی۔“ اسی کہنے سے لگا کر اس نے لرزیدہ آواز میں کہا اور آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی کانپ رہی تھی، رو رہی تھی... وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن ہر بار اس کے الفاظ ادھر سے رہ جاتے تھے۔ کیرین اس کے چہرے کو جگہ جگہ سے چوم رہی تھی۔

”ماما آگئی ہے، تمہارے پاس ہے، بے بی۔ ایڈی ناؤ، میں سن رہی ہوں۔“ کیرین نے خود کو پرسکون رکھنے کی بھرپور سعی کی۔ ”میں مجبور تھی، مہنی۔ مجھے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ ایک میٹنگ میں جانا تھا۔ ہم میٹنگ کو بھلا بیٹھے تھے۔ وہاں بچے نہیں جاسکتے... بس ایک رات کی بات ہے۔“

”کیا آپ پھر مجھے چھوڑ جائیں گی؟“ اسی کی آنکھوں میں الجھن اور اذیت تھی۔ کیرین کی برداشت ختم ہونے لگی۔

”ابھی میں تمہارے پاس ہوں، بے بی۔ تمہاری شوگر چیک کرنی ہے۔“

”وو... وو... وو...“ اسی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“

جو سر پر کھڑا تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور آنسو باکس لاکر کیرین کے قریب رکھ دیا۔ بعد ازاں وہ کچھ فاصلے پر باسل کے پاس چلا گیا۔

کیرین نے باکس کھول کر اسپرنگ لوڈڈ ڈیوائس نکالا، جس میں سوئی پہلے سے لگی تھی۔ یہ قلم کے مانند تھا۔ کیرین نے بیٹی کی درمیانی انگلی پکڑ کر آخری پور پر قلم کی نوک رکھ کر ٹیکر دیا۔ اسی نے سسکی بھری۔ اوپر تلے خون کے قطرے لے کر مخصوص کاغذی پٹی پر رکھے اور پٹی کو چھوٹی سی مکین میں رکھ دیا۔ مکین میں ایک مائیکرو چپ لگی ہوئی تھی... پندرہ سیکنڈ بعد مکین میں سب کی آواز آئی۔

”دوسو چالیس۔“ کیرین نے ریڈنگ کی۔ ”سوئی، تمہیں انسولین کا شات چاہیے۔“ کیرین نے ایک واٹر سے شارٹ ایکٹنگ انسولین کے تین یونٹ لیے، دوسری

”ایک سال بعد تمہارے دامخ پر کیا بھوت سوار ہو گیا ہے؟ لگتا ہے، تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔“

”مارگریٹ رنج ہو گئی تھی۔“

”پلیز مارگریٹ... کہیں اس آدمی نے تم پر تشدد تو نہیں کیا تھا؟“ ڈاکٹر نے فریادی انداز میں استفسار کیا۔

”تشدد؟“ مارگریٹ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”کیا کہا تم نے؟“

”میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”مارگریٹ کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔“

”ٹھیک ہے، تم یہ جانتا چاہتے ہو کہ میں نے رپورٹ کرنے کی مخالفت کیوں کی تھی؟ تو سنو اچھی طرح سن لو... تشدد نہیں کیا تھا۔ اس نے تمہاری بیوی کے برقعے کی گئی۔“

”جیسے مکڈیل کا منہ کھلا رہ گیا۔“

”جیسے، مجھ میں آیا اور کھول کر بتاؤں۔ جو وہ کہتا گیا، میں کرتی تھی۔ میں مجبور تھی، بیڑی وجہ سے... جاؤ بتا دو، پولیس کو... مجھے وہ کرنا پڑا، جو میں نے زندگی میں نہیں سوچا تھا۔“

”مارگریٹ کی آنکھوں سے آنسو پرتا لے کی طرح بہہ نکلے۔ وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ دونوں ہاتھ چہرے پر تھے۔“

ڈاکٹر مکڈیل لنگ رہ گیا۔ معاً اس کا سکتہ ٹوٹا اور اس نے لپک کر مارگریٹ کو ہاتھوں میں بھر لیا۔ مکڈیل نے اسے بچوں کی طرح سینے سے لگا لیا۔

”مارگریٹ، ٹھیک ہے... سب ٹھیک ہے۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ آئی لو یو۔“ وہ خود بھی آبدیدہ ہو گیا۔

”مارگریٹ نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔“

”مارگریٹ، ایک اور عورت کی عزت خطرے میں ہے۔ ایک اور بچہ... ایک اور خلی، کرب و ذلت کی بجلی میں پسے والی ہے۔“ اس نے بیوی کا آنسوؤں میں ہچکا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ ”میں جانتا ہوں تم کبھی نہیں چاہو گی کہ ایسا ہو۔ بتاؤ مارگریٹ، کیا میں غلط ہوں؟“

”مارگریٹ نے آہستہ سے لٹی میں سر ہلایا۔“

”میں ایف بی آئی کو کال کروں گا۔ مجھے ساری تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ جو ہوا، وہ غیر متعلق ہے۔ مارگریٹ، آئی لو یو... ہمیشہ سے زیادہ...“

شیرل نے گن سیدھی کر لی۔ ول اسے دبوچنے کے لیے تیار تھا۔ خود کو روکنے کے لیے ول نے قوتِ ارادی کا ایک ایک ذرہ خرچ کر دیا۔

”کوئی غلطی مت کرنا۔“ شیرل نے پھر تنبیہ کی۔

شیرل کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ول نے گہری گہری سانس لے کر مٹھیاں کھول دیں۔ چند منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو نگاہوں میں تو لے رہے۔ ول خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔

”کیا تم دل سے انہی کی وارداتوں میں شامل ہو؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔“ ول نے سوال کیا۔

شیرل کی خاموشی برقرار رہی۔

”میرا خیال ٹھیک ہے۔“ ول نے گہری سانس لی۔

”جو تمہیں استعمال کر رہا ہے۔“

”وہ میرا شوہر ہے۔“ شیرل کے تاثرات میں عدم سی الجھن تھی۔

”تم تمہیں سمجھتی ہو۔ کیا وہ تمہیں اپنی بیوی سمجھتا ہے؟ نہیں، وہ تمہیں محض ایک پارٹنر تصور کرتا ہے۔“ ول نے پنی تلی جھٹ لگائی۔ وہ پُراعتاً تھا کہ شیرل کو ساتھ ملا لے گا۔ جو نامی شخص نے جو پلان بنایا تھا۔ اس کے توڑ کے لیے شیرل ہی تپ کا پتا تھی۔ شیرل کو ساتھ ملائے بغیر ول کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”تم خاموش نہیں رہ سکتے؟“ شیرل کا گن والا ہاتھ جھکنے لگا۔

”میرے خاموش رہنے سے حقائق تبدیل نہیں ہوں گے۔ تم سوچو، میں دوبارہ بات کروں گا۔ فی الحال مجھے شاور لینا چاہیے۔“ ول ابتدائی کمالہ نگاری سے مطمئن تھا۔

مارگریٹ اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ ٹیبل کے آئینے میں اسے شوہر کا عکس نظر آیا۔ ڈاکٹر جیسے مکڈیل کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔

مارگریٹ غم و غصے کی جلی کیفیت میں مزی۔

”کتنی مرتبہ کہوں کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔“

ڈاکٹر نے ہنسی سانس بھری۔ ”میں سمجھے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ تم کیوں نہیں چاہتی؟“

ڈاکٹر مکڈیل بھی اڑ گیا تھا اس کے ذہن پر یہ خدشہ سوار ہو گیا تھا کہ ایسی ہی ایک اور واردات ہونے والی ہے۔

کی آواز آئی۔

کیرین اندر سے تپ نہی۔ اس نے اٹھنا چاہا تو اسی جگہ نہی۔

”ہی، میں جلد آؤں گی۔“ کیرین نے کریناک آواز میں کہا۔ وہ دونوں ماں بیٹی کے پاس آگئے تھے۔

”اگر اسی کی طبیعت خراب ہو تو مجھے کال کر دینا۔“ کیرین نے باسل سے کہا۔

باسل کے چہرے پر حیران کن خوف تھا۔ ”میں... میں... میں...“

”شٹ آپ۔“ جو کی غراہٹ بلند ہوئی۔ اس نے اسی کا بازو پکڑ لیا۔ اسی جگہ ہی تھی۔ کیرین کا ضبط جواب دینے لگا۔ وہ منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔ آزمائشی آزمائش ہے، وہ، ماما بے آب ہے۔ زندگی بقوت ہی سہی لیکن یہ سزائے ناروا کبھی ہے؟ کیرین کے حلق میں جیسے گولہ سا پھنس گیا۔ منہ پھیرتے ہی رکے ہوئے آنسو رخساروں پر پھسل گئے۔

بلیو کی میں بیوروٹج رپورٹ کے سوئٹ نمبر 28021 میں فون کی گھنٹی بجی۔ ول نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔

”جو؟ تم جرات کر رہے ہو؟“

”ول؟“

”کیرین!“ ول کے جڑے پہنچ گئے۔ دوسری جانب سے کیرین کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

”تم نے اسی کو دیکھا؟“ ول نے بدقت تمام خود پر قابو پایا۔

”وہ خوف زدہ ہے، ول۔“ کیرین کی سوگواہی آواز آئی۔

”میں نے آٹھ یونٹ کا شات لگایا ہے اسے... چند وائل اور سرخ وائل چھوڑ دی ہیں۔“

ول کے کچھ کہنے سے پہلے کیرین کی چیخ سنائی دی اور جو کی آواز آئی۔ ”کان بوائے، شکر کہ تمہاری بیٹی کو دوائل مٹی ہے۔“

”روک بات سنو...“

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ ول نے آہستہ آہستہ سانس خارج کی۔ سینے میں ابھرنے والا پیش کا لاوا اس کے سر کو چھوئے لگا۔ فون رکھ کر وہ آہستہ سے مڑا۔

”ہے... ہوش میں رہو۔“ شیرل نے کہا۔

ول نے شعلہ پار نظروں سے اسے کھورا۔ اس کی دونوں مٹھیاں پھٹی ہوئی تھیں۔

وائل سے لاگ ایک ٹینک کے پانچ یونٹ لیے۔ یہ شات معمول سے ہٹ کر تھا، لیکن کیرین کو شک تھا کہ اسی نے قدرتی نیند نہیں لی ہے اور کچھ کھایا بھی ہے۔

”تمہارے سامنے باسل نے تمہیں کچھ کھلایا تھا؟“

”چندر کیریز ماما۔“

”بس؟“

اسی نے زمین کی طرف دیکھا۔ ”اور ایک پیپر منٹ۔“

”ٹھیک ہے، ہی۔“ کیرین نے انسولین شات اس کے پیٹ میں کپڑوں کے اوپر سے ہی لگا دیا۔ اسی نے پھر سسکی لی اور ہاتھیں ماں کے گلے کے گرد ڈال دیں۔ کیرین نے گھٹنوں پر کھڑے کھڑے اسے گود میں لے لیا۔ وہ اسی کا پندیدہ گیت گنگناتے ہوئے اسے دائیں بائیں جھلار رہی تھی۔

”آئی لو یو، سوئی۔“ کیرین نے سرگوشی کی۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ماما، گاتی رہیں۔“ اسی نے کہا۔

کیرین کے کان جو اور باسل کی آوازوں پر لگے تھے۔ اس نے گاتے گاتے اپنے ہونٹ اسی کے کان سے لگا دیے۔

”بے بی، تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں پولیس کے بارے میں کیا سکھایا تھا؟ ضرورت کے وقت کون سا نمبر ڈائل کرتے ہیں؟“

”نانن۔“ اسی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”نانن، ون ون؟“

”گڈ، ہی۔“ دھیان سے سنو، مسٹر باسل کے پاس سیل فون ہے۔ اگر وہ واش روم کے لیے تمہارے پاس سے ہٹے تو وہ فون بھول سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو تم نانن ون ون چیخ کر کے کہنا کہ تمہیں مدد چاہیے۔ اگر تم نہ کہہ سکو تب بھی نمبر ملا کے سیل فون آف مت کرنا اور خود نہیں چپ جانا۔ وہ لوگ آکے تمہیں ماما اور بابا کے پاس لے آئیں گے... او

”کیرین پھر گنگناتے لگی۔“

اسی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”کیا پولیس، باسل کو مارے گی؟“

”نہیں، بے بی۔ پولیس باسل کو کچھ نہیں کہے گی۔ لیکن تم اس سے چپ کر نمبر ملانا۔ یہ ایک ہی نم کی طرح ہے۔“

”ٹھیک ہے؟“

”شہزادی کو بائے بائے کرو۔ واپس جانا ہے۔“ جو

”میں کیسے یقین کر لوں؟“
”آہستہ آہستہ تمہیں یقین آجائے گا۔ یہ موقع تمہیں
پھر نہیں ملے گا۔“ دل کے لہجے میں اعتماد تھا۔

☆☆☆

جو نے ایک سیڈیشن گیراج میں داخل کر کے انجن بند
کر دیا۔ انجن بند ہوتے ہی سکوت طاری ہو گیا۔ کیرین کو لگا
جیسے یہ خاموشی نہیں، سنائے کی چیخ ہے... آنے والے
لحاح کی دہشت نے اس کے دل میں سکونت اختیار کر لی
تھی۔

”پارٹی ٹائم۔“ جو نے گاڑی کا دروازہ کھولا...
کیرین وزنی قدموں اور پکڑاتے ہوئے ذہن کے ساتھ جو
کے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ وہ بھرپور کوشش کر رہی تھی کہ
دامغ سوچنے کے قابل ہو جائے۔ داخلی دروازے پر جو
نے چابیاں کیرین کے حوالے کر دیں۔

”تم کھولو، تمہارا گھر ہے۔“ وہ بولا۔
ہاں اس کا گھر ہے لیکن شاید آج کی رات یہ گھر جو کا
ہے۔ کیرین نے لاک کھولا۔ اسے خیال آیا کہ دروازہ تھوڑا
سا کھول کر اندر گھسنے اور عقب میں دروازہ بند کر دے...
پھر پولیس کو فون کر دے۔ تاہم یہ مشکل تھا، اگر ممکن بھی ہوتا
تو جب بھی خطرناک حماقت ثابت ہوتی۔ سن فون جو کے پاس
تھا۔ وہ فوراً ہاسل سے رابطہ کرتا اور پھر... آگے کیرین نے
سوچنا بند کر دیا... جو کی ہدایت پر عمل کرنے کے سو کوئی
چارہ کار نہ تھا۔ تاہم وہ مایوس نہیں تھی۔ اسے موقع ملے گا۔
کیرین نے اپنے ذہن کو فیڈ کیا۔

جو اسے ماسٹر بیڈ روم میں لے آیا۔ کیرین کے قدم
بھاری ہوتے جا رہے تھے اور بمشکل اٹھ رہے تھے۔ خوف
اس کے ذہن کو کھینچ کر بے بس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
خوف کے خلاف کیرین کی مزاحمت جاری تھی۔ یہ اس کا گھر
تھا، اس کا بیڈ روم تھا۔ لیکن آج کی رات سب کچھ جو کی
دسترس میں تھا۔

”پہلے یورین کا جام ہو جائے۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ
بستر کتنا آرام دہ ہے اور تم کیسا پر فارم کرتی ہو...“ جو کے
چہرے پر خباثت ناز رہی تھی۔ کیرین کے اعصاب ٹوٹنے
لگے۔ کچھ کرنے کے لیے اس کے پاس مہلت تھی مگر اسے
ضروری تھا کہ وہ دامغ کو خوف کے چنگل سے آزاد رکھے۔
اس نے یورین کی بوتل جو کو پکڑ لی۔

”میوزک بھی ہونا چاہیے۔“ جو نے بوتل کھولی۔
”تمہیں ڈانس تو آتا ہو گا لیکن کپڑوں کے ساتھ مزہ نہیں

سے مطمئن تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر اس نے
جھانک ڈاکٹر، ڈرنکس لے کر بیڈ روم کی جانب آ رہا تھا۔
شیرل واپس بیڈ پر آگئی۔

دل نے نرمی کے ساتھ شیرل کے جذباتی احساسات کو
بیدار کرنا شروع کیا۔ شیرل دم کی چمکیاں لیتے ہوئے
دھیرے دھیرے کھٹکتی۔ اس نے جو لگائی بیان کی، اس کا
لب لباب کچھ یوں تھا۔ شیرل کا باپ آدمی میں تھا، لہذا وہ
لوگ ایک جگہ مستقل نہیں کھتے تھے۔ شیرل کو یاد نہیں کہ غلطی
کس کی تھی۔ تاہم اس کی ماں نے باپ کو چھوڑ دیا۔
بعد ازاں اس کا باپ کسی اور عورت کی زلفوں کے پھندوں کا
اسیر ہو گیا۔ اس وقت شیرل دس برس کی تھی۔ سوتیلی ماں کی
حرکتوں سے تنگ آ کر پانچ چھ سال بعد وہ گھر سے بھاگ گئی
تھی۔

وہ اپنی سبیلی کے گھر گئی۔ جس کے ساتھ اپارٹمنٹ
میں دو اور لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کلب میں ڈانس
کرتی تھی۔ ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے شیرل نے بھی
کلب میں آنا جانا شروع کر دیا۔ بات بڑھتے بڑھتے،
عریاں ڈانس سے ہوتی ہوئی جسم فروشی کی طرف نکل گئی۔
شیرل کا ہاتھ بھی کھل گیا۔ تاہم جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ
وہ ایک خیر نفس دلدل میں پھنس چکی ہے۔ پھر اس کی ملاقات
جو سے ہوئی۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ تاہم جو نے شیرل کو
وہاں سے نکال لیا اور بعد ازاں شادی کر لی۔ جب جو کی
مجرمانہ سرگرمیاں شروع ہوئیں تو شیرل کو احساس ہوا کہ وہ
آسان سے گر کر مجبور میں آن آگئی ہے۔ شروع میں جو شیرل
کو دوسرے کلب میں لے گیا تھا جہاں وہ صرف ڈانس کرتی
تھی۔ شیرل کے بیان کے مطابق سابقہ کلب والوں نے
ایک بندہ شیرل کی واپسی کے لیے متعین کیا، اور وہ جو کے
ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد ایسی کوئی دوسری کوشش نہیں کی
گئی۔

”اور میں آزاد ہو گئی۔“ اس موقع پر شیرل نے تبصرہ
کیا۔

”تم آزاد نہیں ہو گئیں۔ صرف تمہارا “ماسٹر“ تبدیل
ہوا تھا۔“ دل نے لہجہ دیا۔ ”اگر تم ایسی کو بچانے میں میری
مدد کرو تو تانوان کی ساری رقم میں تمہارے حوالے کر کے
تمہیں یہاں سے نکال دوں گا تب تم حقیقی معنوں میں اپنے
خوابوں کی تعمیر پانے کے لیے آزاد ہو جاؤ گی۔“ دل نے
خلوص سے کہا۔
شیرل کی آنکھوں میں امید کا دیا جا ل کر بچھ گیا۔

”میرے ماضی کے بارے میں جان کر تمہیں کیا
فائدہ ہوگا؟“ بالآخر وہ بولی۔
”کم از کم وقت ہی کٹ جائے گا۔ اس میں ہرج مہج
کیا ہے؟ مجھ پر شک مت کرو، میں تمہارے لیے کچھ منگوا تا
ہوں۔“ دل کھڑا ہو گیا۔

شیرل کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیں لہرائی...
دل فون کی جانب گیا۔

”کیا کر رہے ہو؟“ شیرل بھی کھڑی ہو گئی، اس کا
ایک ہاتھ گھٹن پر تھا۔

”ڈرنک منگوا رہا ہوں، کیا پسند کرو گی؟“
شیرل کے چہرے پر شک کے آثار نمودار ہوئے۔

”دم اور کوک۔“ شیرل نے گہری سانس لی۔
دل نے روم سے دوسری کمرہ کی طرف دوڑ کر ایک

ایک کپ چائے کا آرڈر دیا۔ وہ گھوڑی سوئٹ میں نظر آ رہا
اکیلا تھا۔ لہذا یہ آرڈر کچھ بے مکا معلوم ہوا۔ تاہم وہ
”سائپرس“ سوئٹ کی مراعات سے واقف تھا۔ وہ اپنے

آرڈر کی باتیں بھی منگوا لیتا تو کوئی اعتراض نہ کرتا۔
شیرل نے کن پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ دل نے نرمی کے
ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔ ”شیرل، تمہاری عمر زیادہ نہیں ہے
جبکہ جو کی آواز سن کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کم از کم

بھی 45-40 کا ہے؟ اگر تم پرانے مانو تو...“
”وہ بچا دس برس کا ہے۔“ شیرل کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”اور تم؟“
”26۔“ شیرل نے لاشعوری طور پر نظریں چرائیں۔

”چوبیس سال کا فرق؟“ دل کے لہجے میں ہلکی سی
چھین تھی۔

شیرل نے ڈاکٹر کو گھورتا ہوا لب لباب بستر رہی۔
”تم کس علاقے سے تعلق رکھتی ہو؟“

”انٹرویو کا مقصد؟“

”پھر کیا کریں۔ خاموش بیٹھ کر ایک دوسرے کو
گھورتے رہیں؟“ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

شیرل چونک اٹھی۔
”کچھ نہیں... ڈرنک آئی ہے۔“ دل اٹھ کر

دروازے کی طرف گیا۔ شیرل گھٹن سے کمر آڑ میں ہو گئی۔
حالانکہ وہ بیڈ روم میں تھی اور بیرونی دروازے سے اسے
دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

دروازہ کھلا، پھر بند ہوا۔ ڈاکٹر باہر نہیں جاسکتا تھا۔
تیس منٹ کے اندر وہ کچھ نہیں کر پاتا۔ شیرل اس جانب

جو کے کہنے پر کیرین نے آنکھوں پر سے پٹی ہٹا
دی۔ واپسی کے سفر میں اچھی وہ راستے میں ہی تھی۔ کیرین
نے شیشے سے باہر جھانک کر کیرین نے جو کا منہ بہتر رکھنے کی
غرض سے اس کا شکر یہ ادا کیا۔

”اسی سے ملوانے اور دوای پینچانے کا شکر یہ۔“
جو نے شیشے کی پٹی کے سرگرمی کا ٹوٹا ہوا پھملا۔

”تفکر۔“ ہاں میں اس کا منتظر تھا۔ آج کل اکثریت
ادب و آداب بھول گئی ہے۔ تم نے بھی دیر کر دی، بہر حال

مجھے خوش ہوئی۔ ذرا سوچو، ابھی پوری رات پڑی ہے۔ میں
دوستوں کی طرح وقت گزارنا چاہیے۔“ جو کے انداز میں
خفگی سی ڈومستوتی تھی۔ کیرین چونک اٹھی، اس کے ذہن

نے ”ارٹ“ کا اشارہ دیا۔
”تم ایک خوب صورت عورت ہو، میں بھی اتنا

بد صورت نہیں ہوں... ایک خوب صورت رات ہماری منتظر
ہے۔“ جو نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ سے ہٹا کر کیرین کے کھٹنے

پر رکھ دیا۔
کیرین کی آنکھیں پٹ میں الجھنے لگیں۔ اعصاب

ترختے لگے۔ جو کے ارادے عمل کر سائے آگئے تھے۔ اس
کے چوبیس کھٹنے کے منصوبے میں رات کی پارٹی شامل تھی۔

کیرین، ماؤڈ ذہن کے ساتھ خود کو سنبھالنے کی کوشش
کر رہی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پچھلی وارداتوں

میں ماؤڈ نے اپنے بچوں کی خاطر جو کی ناپاک خواہشات
کے سائے جسم و جان کی پامالی منظور کر لی تھی۔ اب کیرین کی

باری تھی۔ کیا ایسی کے لیے وہ یہ آگ کا دریا پار کر لے گی؟
☆☆☆

سوئٹ نمبر 28021 میں سناٹا تھا۔ فون بھی خاموش
تھا۔ شیرل نامعلوم سوچ میں غلطان تھی۔ دل کا ذہن برق

رفتاری سے ممکنہ امکانات پر غور کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے
شیرل کو ٹھونکنے کا فیصلہ کر لیا۔

”میں جب تمہاری ذات کے بارے میں بات کرتا
ہوں تو بد مزہ ہونے لگتی ہو؟“ دل نے سوال کیا۔ آدھا ڈاکٹر

آدھا نفسیات داں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ مرلیض کی رائے بھی
مرلیضانہ ہوتی ہے اور مرلیض بھوت بھی ہوتا ہے... دل نے

محسوس کر لیا تھا کہ شیرل کے ماضی میں کوئی گرہ ہے۔ اسے دو
کام کرنے تھے۔ کسی طرح شیرل کے ماضی کے بارے میں
معلوم کرے اور تانوان کی رقم جو کے بچائے شیرل کو دے کر

اسے تحفظ کی یقین دہانی کرائے۔ شیرل اچھی ادا کار نہیں
تھی۔ دل کے سوال پر وہ خاموش رہی۔

آئے گا۔ اس نے کیرین کے لباس کی طرف فحش اشارہ کیا۔

کیرین کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی لہر اٹھی۔ اس نے میوزک آن کر دیا۔ تاہم لباس کو ہاتھ نہ لگایا۔ ”دیکھو ڈیئر، اس طرح رنگین شب، بے رنگ ہو جائے گی اور تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ پارٹی تو ہوتی رہی ہے اور آج بھی ہوگی۔“ جو کے تاثرات میں سختی محسوس ہوئی۔ کیرین نے سوچا کہ جو جیسے کیسے فطرت محض کو متاثر کر کے وہ کچھ بھی نہ کر پائے گی۔ بہتر ہے کہ اسے خوش فہمی میں رکھا جائے۔

”میں بھی سوچ رہی ہوں کہ خواہ مخواہ رات کیوں خراب کی جائے۔“ کیرین نے بمشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ کھینچی۔

”گنڈ، ویری گنڈ... مجھے تم سے یہی توقع تھی۔“ جو نے بورن کی بوتل منہ سے لگائی۔

جو کے کمروہ مطالبات کے سامنے اس نے نیم برہنگی کی حالت میں موسیقی کی لہروں پر تھرکننا شروع کیا۔ جو کرسی میں نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھوں میں بدمستی اور گرگشتی کارنگ گہرا ہونے لگا۔

کیرین سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کر سکتی ہے؟ تاریکی بار بار اس کے ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ کیا وہ کسی کرشمے کی منتظر ہے۔ ایک خیال ذہن میں تھا کہ وہ جو کو برہم نہ ہونے دے اور زیادہ سے زیادہ پلا دے۔ اٹھلائے ہوئے ایک اور بوتل اس نے جو کے حوالے کر دی۔ دوسری بوتل بھی تیزی سے خالی ہو رہی تھی۔ جو کی دست درازیاں بڑھنے لگیں۔ بوتل اس نے ایک طرف صوفے پر ڈال دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی پولوشرٹ اتار کر جو نے ایک طرف اچھال دی۔ پھر وہ اپنے زیریں لباس کی طرف متوجہ ہوا۔ کیرین کی نظریں قالین پر گر گئیں۔ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بدترین تھا۔ کہیں سے کوئی مدد نہیں آ سکتی تھی۔ کیرین کا گلا خشک ہو گیا، سر گھومتے لگا۔ معاً اسے دل کا خیال آیا۔ غصے نے پھر ذہنی خوف کو پھیلایا۔

دفعتاً وہ مومومی امید نے سراٹھایا۔ ایک موقع تو اسے ملے گا...

☆☆☆

باسل، اسی کے سامنے فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک پرانا کبل بیڈروم سے لے آیا تھا اور کہیں کے فرش پر ڈال دیا تھا تاکہ اسی کو کہیں کے چوبی فرش پر نہ بیٹھنا پڑے۔ خود وہ

لکڑی کے ٹکڑے سے کھلونا تراشنے میں مصروف تھا۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ باسل نے سوال کیا۔

”بہتر ہے۔“

”بھوک تو نہیں لگ رہی؟“

”ہاں، بھوک سے پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔“ اسی نے منہ بنایا۔

باسل کے چہرے پر پریشانی ظاہر ہوئی۔ ”میں تمہارے لیے ”کپکپ کرک“ بنا کر لاتا ہوں۔“ باسل نے اٹھ کر چکن کارخ کیا۔ اسی اسے بتائی نہیں سکی کہ ”کپکپ کرک“ اس کی شوگر میں اضافہ کر دے گی... باسل چکن کی طرف جاتے جاتے اچانک رک گیا اور پلٹا، وہ اپنے سر پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس نے اسی کے قریب سے اپنا فون اٹھایا۔

”جو نے کہا تھا کہ یہ میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں۔“ اس نے مجھے ایک فالو پیڈی بھی دی تھی۔“

اسی نے فون کو دیکھا، اسے ماں کی بات یاد آئی کہ موقع ملے ہی پولیس کو فون کر دینا۔ لیکن باسل فون کے معاملے میں محتاط تھا۔ ”تم انتظار کرو۔ میں کچھ بنا کر لاتا ہوں۔“ باسل چکن میں چلا گیا۔

اسی کین کی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ باہر گھوراندہ سیرا تھا۔ اسی کو اندر جیسے سے نفرت تھی۔ لیکن اس کی ماں کی ہدایت اس کے ذہن میں موجود تھی۔ وہ بھاگ کر سکتی تھی۔ تاہم فون کیسے حاصل کرے؟ باسل کے رویے نے اسی کے دل میں پسندیدگی کے چند بات بیدار کر دیے تھے لیکن اسے ڈیڈی کی بات بھی یاد تھی کہ اچھی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ اچھی کاروبار اچھا ہی کیوں نہ ہو۔

اسی نے باری ڈول کو اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے ماں کا تصور کیا۔ وہ بھاگنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ باسل ابھی تک چکن میں تھا۔ اسی نے ناں کا چھوڑا ہوا ”آئس باکس“ بھی اٹھالیا اور تیزی سے دروازے کا رخ کیا۔

باسل، چکن سے باہر آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں کھانے کا برتن اور دوسرے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسی غائب تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کے مونے لیوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تم چور سا بھی کھینا چاہتی ہو۔“ کہیں کا کھلا ہوا دروازہ ہوا کے ساتھ با آواز بند ہوا۔ باسل کے چہرے پر اچھن نظر آئی۔ اس نے برتن اور سیل فون نیچے رکھ دیا اور باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

پگھلتے لمحے

اسی کوشش کر رہی تھی کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو، اگرچہ اس کی پٹلیوں میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ ”اسی تم کہاں ہو؟“ وہ بیس فٹ جا کر درختوں کی قطار کے ساتھ رک گیا۔

اسی کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ حشرات الارض کی آوازیں اسے اور ڈرا رہی تھیں۔ اس نے کہیں کی روشنی کی طرف دیکھا۔ باسل کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ سیل فون کہیں میں ہی تھا۔ اسی انتظار کر رہی تھی کہ باسل کچھ اور دور چلا جائے۔

☆☆☆

کیرین بیڈ کی طرف قدم قدم بڑھ رہی تھی۔ بیڈ کے قریب قالین پر اس نے دل کی گن۔ 38 پڑی ہوئی دیکھی۔ جو کو گن کی ٹکر نہیں تھی۔ اس نے جو جال پھیلایا تھا، اس پر اسے پورا اعتماد تھا۔ کیرین نے بستر پر جانے سے پہلے ٹانگ سے 38 بیڈ کے نیچے کھکا دیا اور بستر پر آ گئی۔ جو کی دست درازیاں اور خوش کوئی جلدی عروج پر پہنچ گئی۔ جس اور شراب کے دو اتھ نشے نے ل کر جو کو نیم بے ہوش کر دیا تھا۔ کیرین نے زیر جاموں کو بچایا ہوا تھا اور موقع کی تاک میں تھی۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کیرین طوعا و کرہا عریاں حرکت کی حدود کو بھولنا تک رہی تھی۔ نتیجتاً جو کے خمار میں اضافہ ہوتا گیا۔

”تمہارے اندر... بپ... بورن کی بوتل سے زیادہ نشہ ہے۔“ اس نے بھکی ہوئی آواز میں کہا۔ کیرین اس کے بے لباس جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ جو اس کے نیچے کچھ متحرک پڑے نوچنا جا رہا تھا۔

”جلد بازی مت کرو، میں تمہیں کچھ نیا کر کے دکھاؤں گی۔“ کیرین پلٹ کر اس کے اوپر آ گئی۔ ”ہاں... کیوں نہیں... جلدی کرو۔ تم کمال کی چیز ہو۔“

جو کا چہرہ کیرین کی نرم زلفوں میں چھپ گیا... کیرین نے احتیاط سے اسکیلپل (scalpal) انگلیوں سے نکالا اور پھر نیچے سے بیڈ سے اتر گئی۔ چھپ چھپا لے فولادی سرجیکل آلے کا چھوٹا سا انتہائی تیز دھار پھل اس نے جو کی ناف کے نیچے رکھ دیا۔ کیرین کی آنکھوں میں آگ اور نفرت تھی۔

”کوئی حرکت کی تو ساری زندگی پیشاب کرنے کے لیے کتھٹر (Catheter) کے محتاج ہو کے رہ جاؤ گے۔ وہ بھی اگر بروقت اسپتال پہنچ گئے۔“ کیرین کی آواز میں

جو کے بدن پر برائے نام لباس تھا۔ کیرین نے اس کی مدد ہوش، پھر ہوس آنکھوں میں جھانکا اور جی الامکان آواز کو تار مل رکھا۔ ”مجھے ہاتھ روم جانا پڑے گا۔“

”ہاتھ روم میں کیا ہے؟ ایک اور گن؟“ ”یہ کسی فوجی کا گھر نہیں ہے کہ ہر کمرے میں گن رکھی ملے گی... ہوگی بھی تو میں کیا کر لوں گی۔“ کیرین نے آواز کو تار مل رکھا۔

”فائن، میں منتظر ہوں۔“ جو نے بستر پر چھلانگ لگا دی۔

کیرین نے ہاتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ پہلے اس نے ٹیل کھول کر چھوڑ دیے۔ پھر آئینے کے عقب میں موجود کینٹ میں ہاتھ مارا۔ تاہم اسے مطلوبہ چیز نہیں ملی۔ اس کی نظر آئینے کے عکس پر پڑی۔ اسے لگا وہ کسی بھوت کو دیکھ رہی ہے۔ کیرین نے جھپٹنے مار کر چہرہ تولیے سے خشک کیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظر ٹوٹھ برش والے پلاسٹک کپ پر پڑی۔ تین برش کے ساتھ بظاہر نازک سا فولادی سرجیکل ہینڈ رکھا تھا۔ اس کی لمبائی چھ انچ تھی۔ اس کا مختصر پھل انتہائی تیز دھار تھا اور پلاسٹک کپ میں محفوظ تھا۔ سر جری کے دوران میں مطلوبہ مقامات کو وہ کہیں کی طرح تراشنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

کیرین نے آلاس جری کا محتاطی کیپ الگ کیا اور اسے احتیاط سے انگلیوں میں چھپا لیا۔ اسے ہاتھ روم سے نکلنے کے بعد بھی خاص احتیاط کرنی تھی، بصورت دیگر معمولی سی غلط حرکت خود اسے زخمی کر سکتی تھی۔ اس نے ٹیل بند کیے اور نئے حوصلے کے ساتھ ہاتھ روم کا دروازہ کھول دیا۔

”بہت تر پارہی ہو تم۔“ جو نے بستر پر کھینچ لگا کر گرسنہ لگا ہوں سے کیرین کے نیم پر ہینڈ شاف بدن کو گھورا۔ ”ترپے میں مزہ نہیں ہے؟“ کیرین نے ناز و انداز کے تیر پھینکے۔

”ہاں، ہے تو... لیکن اب بس کرو، تم میرے انداز سے زیادہ خوب صورت ہو۔“ جو نے بے قراری سے ہاتھ ہینڈ کیا۔

”تھے تو ایسا ترپاؤں کی کہ زندگی بھر عورت کے لیے ترپے گا۔“ کیرین نے نفرت ظاہر کیے بغیر دل میں کہا۔

☆☆☆

اسی، تاریکی میں جھانک جھانک میں چھپی ہوئی تھی۔ باسل چاند کی مدد روشنی میں اس کے پاس سے گزر گیا۔ ”اسی تم کہاں ہو؟ مجھے خوف زدہ مت کرو۔“

فیصل کن ملا برتی تھی۔

جو کی آنکھوں سے خمار اور مستی غائب ہو چکی تھی۔ اس نے دہشت سے زیریں بدن کی طرف دیکھا۔ اس کے بھر کے ہوئے جذبات سرد ہوتے چلے گئے۔ اس نے گھونسا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور رک گیا۔

”نہ... نہ... نہ... مسٹر جو کتنی۔ یہ دس نمبر کا اسکیل ہے اور میں نے بطور سرجیکل نرس چھ سال کام کیا ہے میری اچھٹی ہوئی حرکت بھی تمہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گی۔ اپنے قیمتی اوزار کی حفاظت مطلوب ہے تو بے حس و حرکت پڑے رہو۔ اب میرا حکم چلے گا۔“

”میں تمہیں اور تمہاری بیٹی دونوں کو ختم کر دوں گا۔“ کیرین نے ہاتھ کا دباؤ معمولی بڑھایا، جو گے زیر ناف خون چھوٹ پڑا۔

”زکو۔“ جو کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”اپنے کزن کو فون کرو کہ وہ اسی کو یہاں لے آئے۔“

”مت کرو... تم اپنی بیٹی کی زندگی سے کھیل رہی ہو۔“

”بیڈ سائڈ سے فون اٹھاؤ۔“ کیرین کے لہجے میں غصہ اور نفرت تھی۔ ”آہستہ سے حرکت کرنا، کوئی ہوشیاری نہیں۔“

جو نے نمبر ملایا لیکن دوسری جانب ہتھی بھتی رہی۔

”جواب نہیں آ رہا۔“

”بکواس مت کرو۔“ کیرین نے سرجیکل ہلیڈ کا دباؤ بڑھایا۔

”رک جاؤ۔“ جو چلانے لگا۔ ”میں پھر ملتا ہوں۔“

دوسری مرتبہ بھی رابطہ نہیں ہوا۔ ”مجھ پر شک مت کرو۔ خود مل کر دیکھ لو۔ کوئی گڑبڑ ہے، پہلے بھی ایسا نہیں ہوا۔“

”کیا مطلب؟ کیسی گڑبڑ؟“

”تم یہ ”خبر“ بتاؤ، مجھے خود تشخیص ہو رہی ہے۔“

”اپنا گنہہ بند کرکو، مجھے سوچنے دو۔“ کیرین کے چہرے پر اچھٹن تھی۔

”لہ بھر کے لیے اس کی توجہ دینی اور جو نے فون ریسیور سمجھ کر اس کی پکٹی پر مارا۔ کیرین کے دماغ میں سفید روشنی کا جھماکا ہوا، تاہم اضطرابی طور پر اس کے سرجیکل ہلیڈ والے ہاتھ نے جھکا لیا۔ جو کے حلق سے دلخراش قہقہہ بلند ہوئی... دونوں نے پیچھے دیکھا۔ جو کے زیر ناف خون ہی خون تھا۔“

☆☆☆

بائل، اسی کی تلاش میں کیرین سے دور چلا گیا تھا۔ اسی، کیرین سے آنے والی مدد سی آواز پر ساعت کو مرکوز کر رہی تھی۔ اچانک وہ آواز بند ہو گئی۔ اسی نے بائل پر نظر رکھتے ہوئے کیرین کی طرف حرکت کی۔ معاویہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ اسی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سیل فون کی آواز تھی۔ اسی بائل کی نظروں میں آئے بغیر کیرین میں کھس گئی۔ آواز پھر مٹی تھی۔

بیڈ روم کے دروازے کے قریب فرش پر کھانے کے برتن بڑے تھے، ساتھ ہی سیل فون بھی پڑا ہوا تھا۔ اسی نے لپک کر فون اٹھالیا۔ اسی وقت بائل کی آواز آئی۔

”اسی کہاں ہو؟ آ جاؤ۔ میرے لیے مشکل کھڑی ہو جائے گی۔“ بائل قریب ہی تھا۔ اسی ٹمہ ہو کر رہ گئی۔

اسے دوبارہ موقع نہیں ملے گا، اسے ہمت سے کام لینا چاہیے... وہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور باہر جھانکا۔ اس کا چھوٹا سا بدن کھڑکی سے نکل سکتا تھا۔ بائل کی آواز دوسری جانب سے آ رہی تھی۔ اس نے فون جیب میں ٹھونسا اور کھڑکی سے کود گئی۔ اس کی بائیں ٹانگ میں تکلیف ہوئی تاہم اس نے منہ سے آواز نہیں نکالی۔ البتہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ لگاتی ہوئی درختوں کے پیچھے چلی گئی۔

چاند کی روشنی درختوں کی وجہ سے کچھ اور مدہم ہو گئی تھی۔ اسی کے لیے یہ روشنی کافی تھی۔ اس نے 911 کال کیا اور فون کان سے لگا لیا۔

”سیل اسٹار، خوش آمدید کہتا ہے۔“ کمپیوٹر سے آواز آئی۔ ”آپ اس وقت نان۔ ایمر جنسی۔ سروس۔ زون میں ہیں، پلیز...“

”پولیس کہاں ہے؟“ اسی رو پڑی۔ ”مجھے پولیس کی مدد چاہیے۔“

اسی کی لڑکھائی آواز کا کوئی جواب نہیں ملا۔

☆☆☆

جو کا چہرہ خوف اور اذیت سے مسخ ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا خوف کچھ کم ہوا کہ اس کے بدن کا اہم عضو بال بائل قہقہہ نکالتا تھا۔ سرجیکل ہلیڈ نے اس کی ران کو چیر ڈالا تھا۔ خطرناک گھاؤ سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی دہشت کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس نے تکیہ اٹھا کر مضبوطی سے زخم پر جمادیا۔

”تمہیں کہا تھا کہ چالاکی مت دکھانا، اب تم جریان خون کے باعث مرو گے۔“ اسپتال جانا ضروری ہے۔“

☆☆☆

کیرین نے ساٹ آواز میں کہا۔ ایک ٹانگ سے وہ بستر کے نیچے گرنے کو تلاش کر رہی تھی۔

”مرے گی، تیری بیٹی مرے گی... ضرور مرے گی۔“ جو چوٹ کھائے کتے کی طرح بلبلایا۔

کیرین کو احساس تھا کہ اسی کو یہاں لانے کا اس کا منصوبہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ لیکن فون پر رابطہ کیوں نہیں ہوا؟ وہ جو جو جریان خون کے ذریعے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی تھی نہ ہی خود کو اس کے رحم و کرم پر... اب تو وہ بالکل ہی پاگل ہو جا رہا تھا۔

”بائل نے فون کا جواب کیوں نہیں دیا؟ کیا وہ دونوں کیرین میں نہیں ہیں؟“

”جنہم میں تھے دونوں، دیکھو کیا کیا ہے تم نے؟“ جو نے خراے کی کوشش کی۔ اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

”بک بک مت کرو، ہاتھ روم میں جا کر تو لیا کس کے لیٹو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔“ کیرین نے بستر کے نیچے گن گھوس کر لیا تھا۔ جو لڑکھاتا ہوا ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کیرین نے جھک کر گن اٹھالی۔ جلدی جلدی اپنے کپڑے پہنے اور میوزک بند کر کے ہاتھ روم کی طرف چل دی۔

جو بار بار مدد سکیں دے رہا تھا کہ وہ ایک فون کال کر کے اسی کو مردادے گا۔ تم مرس رہ چکی ہو۔ مجھے اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ٹانگے لگا کر زخم کی سلائی کر سکتی ہو۔

کیرین نے پھر کانپنا شروع کر دیا۔ جو کو زندہ رکھنا اس کی مجبوری تھی۔ جو کی برنگی اسے بڑی طرح حل رہی تھی۔ اس کا دل جو کے کندے جسم کو ہاتھ لگانے کے لیے آمادہ نہ تھا۔

”تم اپنا منہ بند کرکو اور خود پر قابو رکھو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔ تو لیا لیٹ کر رکھو، میں فرسٹ ایڈ کس لے کر آتی ہوں۔“

”یہ گن کیوں بجا رہی ہو؟ گولی مار دو مجھے...“

”گولی تو تیرا مقدر ہے مردو، تو اس مرتبہ غلط فیصلے سے ٹکرا گیا ہے۔ کیرین نے دل ہی دل میں اسے ایک مکروہ خطاب سے نوازا اور ہاتھ روم سے نکل گئی۔ جاتے جاتے اس نے بتایا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ پچاس ٹانگیں لگیں گے... پچاس ٹانگوں والی بات اس نے جھوٹ بولی تھی... جو دانت نہیں کے رہ گیا۔

☆☆☆

پگھلتے لمحہ

اسی بروقت درختوں میں چھپ گئی۔ اس مرتبہ اس نے گھر کا نمبر سچ کیا۔ کھنٹی بجنے لگی...

کیرین، دل کا میڈیکل کس تلاش کر رہی تھی۔ جب بیڈ سائڈ پر فون کی کھنٹی نے جتنا شروع کیا۔ جو، ہاتھ روم میں تھا۔ کیرین کو یقین تھا کہ مسز جو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس نے قدرے تر دوکے ساتھ فون اٹھالیا۔

”ہیلو۔“ کیرین نے کہا۔

ادھ کھلے ہاتھ روم سے جو چلایا۔ ”اے ایک منٹ کے لیے روکو۔“

”ماما؟“

کیرین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔

”اسی؟“ اس نے سرگوشی کی۔ ”تم ٹھیک ہو؟ تم کہاں ہو؟“

اسی جواب دینے کے بجائے سسکیاں لینے لگی۔

”خود کو سنبھالو، بتاؤ تم کہاں ہو؟ سب ٹھیک ہونے والا ہے۔“ کیرین نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

”میں کیرین سے باہر چھپی ہوئی ہوں۔“

”تم نے پولیس کو فون کیا؟“

”وہ کچھ اور کہہ رہے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا...“

ماما، میری مدد کرو۔“

”تم کیا کر رہی ہو؟ فون بند کرو۔“ جو لڑکھاتا ہوا ہاتھ روم سے نکل آیا۔ کیرین نے فون بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور دائیں ہاتھ سے اشاریہ یا ڈبیس سے نشانہ لے کر فائر کیا۔ جو دونوں ہاتھوں میں سر چھپا کر فرش پر اوندھا ہو گیا۔

”سن آف بی، میری بیٹی کہاں ہے؟“

جو نے جس وحشت چپ چاپ پڑا تھا۔ ران پر سے تو لیا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور خون رستا شروع ہو گیا تھا...

”جواب دے، مردود انسان۔“ کیرین نے پھر فائر کیا۔ گولی جو کے قریب فرش سے ٹکرائی۔

”ڈونٹ شوٹ، ڈونٹ شوٹ۔“ جو زخمی پلے کی طرح چیاؤں چیاؤں کرنے لگا۔ اس کی تمام ہوشیاری ران کے گھاؤ سے خون کی شکل میں بہہ رہی تھی۔ حسین، شبلی رات کا سپنا کروڑوں کچروں میں نسیم ہو گیا تھا۔

”تمہاری بیٹی ماری جائے گی۔“ وہ کراہا۔ اس کے پاس یہی تہہ کا تھا تھا۔

”ماری جائے گی لیکن تیرے ساتھ۔ تیرے بعد

”کیوں؟“ کیرین نے استفسار کیا۔
 ”سب کچھ نہیں ہے، یہ دراصل ایک قسم کا ریڈیو ہی ہے... متعلقہ سگنلز کی طاقت ٹاور پر منحصر ہے۔ کسی سبکی، ٹاورز کے مقابلے میں، ملک کی دوسری ریاستوں سے کہیں پسماندہ ہے... پانچ سال پیچھے ہے۔ بائبل جہاں ہے، وہاں سگنلز کے ذریعے لوکیشن ٹریس نہیں کی جاسکتی۔“ جو کے چہرے پر استہزاء سیہ سگرا ہٹ نمودار ہوئی۔
 کیرین شپٹا کے رہ گئی۔
 ”میں اسی لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے اب بھی بیسیوں کی ضرورت ہے۔“ جو نے کہا۔
 کیرین نے دوسرے سیل فون پر اسی کو ٹیلی دی اور ول کو جو کی انکیم کے بارے میں بتایا۔
 ”جو سے بات کراؤ۔“ ول نے خود کو سنایا۔
 ”ڈاکٹر، بائبل نے اسی کو ڈھونڈ لیا تو وہ ماری جاسکتی ہے۔“
 ”اور تم مرڈر چارج میں پھنسو گے۔“ ول کا جسم کانپ رہا تھا۔
 ”ڈاکٹر، تم بھول رہے ہو کہ اغوا کی سزا بھی موت ہے۔“
 ”کیا تم یقین کرو گے کہ تمہاری بیوی میرے قابو میں ہے... وہ بھی ماری جائے گی۔“
 ”تمہاری آواز کھوکھلی ہے ڈاکٹر۔“
 ”جنہم میں جاؤ... کیرین سے بات کراؤ۔“
 ”صورت حال اتنی بدتر نہیں ہے۔ میرا یقین کرو، ڈٹی رہو... تم اچھا جا رہی ہو... یہ بتاؤ کہ تم نے بائبل کو دیکھا ہے؟“
 ”نہیں؟“ کیرین نے دھمکے سے کہا۔
 ”جو کے کہنے پر کیا وہ اسی کو مار سکتا ہے؟“
 کیرین نے ماؤتھ پیس کور کے دھڑکے سے کہا۔
 ”مشکل سوال ہے... وہ دیکھا ہر دیوڑا ہے، لیکن اس کا دماغ بچوں جیسا ہے۔“
 ”کیا یہ ممکن ہے کہ اسی، صبح تک چھپی رہے یا سڑک تک پہنچ جائے؟“
 ”کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ کیرین کی آواز میں مایوسی در آئی۔
 ”حوصلہ رکھو۔“ ول نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم وہاں انسو لین چھوڑ آئی تھیں؟“
 ”ہاں لیکن ایک منٹ روک۔“ کیرین نے کہا۔

شوہر سے رابطہ کرو۔“
 جو نے بیوروٹج کا سوئٹ نمبر 28021 کا فون ملانا شروع کیا۔
 کیرین نے سیل فون (یہ دو طرفہ سیل تھا وہ ایک بین دہاکرول سے اور اسی دونوں سے بات کر سکتی تھی) پر اسی کی موجودگی کی تصدیق کی اور اسے پھر ہدایت کی کہ سیل فون آن رکھے... جو نے سوئٹ 28021 سے رابطہ ملا کر کارڈیس واپس بستر پر پھینک دیا۔ کیرین نے سیل فون شانے اور رخسار کے درمیان دبایا، اس کے دائیں ہاتھ میں اعشاریہ 38 تھا، بائیں ہاتھ سے اس نے کارڈیس اٹھایا۔
 کارڈیس پر شیریل کی آواز آئی۔ کیرین نے اختصار کے ساتھ شیریل کے شوہر کی پوزیشن بتائی اور اسے حکم دیا کہ فون ول کے حوالے کر دے۔ شیریل نے کیرین کا حکم تسلیم کرنے سے قبل تھوڑا وقت لیا۔ پھر فون ول کے حوالے کر دیا۔
 ”تھینک گاڈ، کیرین۔“ ول کی آواز آئی۔ ”وہاں کیا ہو رہا ہے؟ اسی خیریت سے ہے؟“
 کیرین نے شوہر کو صورت حال سے آگاہ کیا۔
 ”تمہارے خیال میں، اسی، جیسکس سے کتنی دور ہے؟“ ول نے سوال کیا۔
 ”میرے اعزاز سے کے مطابق فاصلہ ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے مساوی ہے۔“ کیرین نے تخمینہ بتایا۔
 ”یہ جانتا ضروری ہے کہ یہ لوگ کس پٹری کی سروس استعمال کر رہے ہیں؟“ سیل اسٹار“ کا نیٹ ورک بڑا ہے۔ جو کا سیل فون چیک کرو۔“ ول نے تیزی سے ہدایت دی۔
 ”پنا سیل فون بستر پر پھینک دو۔“ کیرین نے جو سے کہا۔ جو نے ”ٹوکیا“ بستر پر اچھا ل دیا۔
 ”اب اسٹار، 1، 8، 1، ڈائل کر کے جواب سنو۔“ ول نے ہدایت کی۔ کیرین نے گمن چھوڑے بغیر، ٹریگر والی انگلی سے بستر پر پڑے موبائل پر پریشر کر کے۔
 ”ویل کم تو“ سیل اسٹار“ کسٹمر سروس“، کمپیوٹرائزڈ جواب آیا۔ کیرین نے اینڈ کالشن دبا کر ول کو ”سیل اسٹار“ کی تصدیق کی۔
 ”گڈ۔“ ول کی آواز میں اعتماد تھا۔ ”میں سیل اسٹار“ میں اپنے بندے سے بات کرتا ہوں۔ وہ سیل اسٹار کا باس ہے۔“
 ”تم لوگ ٹریس نہیں کر سکتے۔“ جو نے تکلیف دہ تاثرات کے ساتھ یقین کا مظاہرہ کیا۔

”ڈاکٹر، تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ اس مرتبہ پھر اسی ہی واردات ہوگی؟“ شالر نے پیٹھ اور پینل سنبھالنے ہوئے سوال کیا۔
 ڈاکٹر میکڈیل نے ایک گہری سانس لی اور بتانا شروع کیا۔ شیریل نے جو معلومات سابقہ ”کارناموں“ کے بارے میں بتائی تھیں، نیز اپنے طریقہ کار کے اوپر جو روشنی ڈالی تھی۔ اس پر مجھے یقین ہے کہ اس سال بھی ایسا ہی ہونا ہے۔“
 ”اس نے یہ سب کچھ کیوں بتایا؟“ شالر نے اعتراض کیا۔
 ”ایک وجہ یہ تھی کہ ہم ان کے پلان کو سمجھ جائیں اور رپورٹ کرنے کی حافطت نہ کریں۔ دوسرے ان کا منصوبہ فون پر دفن تھا اور وہ حد سے زیادہ پراعتما تھے۔“
 ”وہ لوگ ڈاکٹروں کو ہی نشانہ کیوں بناتے ہیں؟“
 ”اس بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“
 ”ہوسکتا ہے، اس مرتبہ وہ واردات کسی اور علاقے میں کریں؟“ شالر نے ایک اور منطقی سوال اٹھایا۔
 ”ممکن ہے... تاہم میرا اندیشہ ہے کہ واردات یہی ہوگی بلکہ ہو چکی ہے... یہ میرا یقین یا چھٹی حس ہے، کچھ بھی کہہ لو۔ اگر وہ واردات نہیں اور کرتے ہیں تو ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم، البتہ ہم یہاں ٹرائی ضرور کر سکتے ہیں۔ میرے یقین کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب تک کسی نے رپورٹ نہیں کی اور وہ لوگ خوش بھی کا شکار ہیں۔“
 ”میں نے یقینی انداز میں سر ہلا کر پیٹھ پر چند گھبرائیں گھٹیں اور مارگریٹ کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”کیا جو اس کا اصل نام ہے؟“
 ”مجھے یقین ہے۔“
 ”اگر فوٹو سامنے آئے تو تم پہچان لو گی؟“
 ”بلاشبہ۔“ مارگریٹ نے پھر یقین دہانی کرائی۔
 ”اور تم شیریل کو پہچان لو گے؟“ شالر نے میکڈیل سے سوال کیا۔
 ”کیوں نہیں؟“
 ”تھینک ہے، ہم جیسکس پولیس ڈپارٹمنٹ کی ”سنگ بکس“ اور پینٹل کرائم انفارمیشن سینٹر کے کمپیوٹر سے آغاز کرتے ہیں۔“ شالر نے پینل رکھ کر فون اٹھایا۔
 ☆☆☆
 ”فون اٹھاؤ۔“ کیرین نے کارڈیس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ پرائیویٹ لائن ہے۔ بلوکی میں میرے

تیرے ساتھی بھی مارے جائیں گے۔“ کیرین نے مضبوط آواز میں کہا۔
 ”بے بی، فون مت بند کرنا، ماما ٹھیک ہیں۔ تم جنگل میں چھپی رہو۔“
 ”اندھیرا ہے ماما۔“
 ”ہاں، سنی۔ اس وقت یہ اندھیرا تمہارا دوست ہے۔ گھبراؤ مت سوئی، ماما تم کو لے جائیں گی۔“
 ”وعدہ؟“
 ”وعدہ، فون مت بند کرنا۔“
 ”لو، تم اٹھو۔“ کیرین نے جو کو حکم دیا۔
 وہ ہاتھوں اور ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا ہوا اور دیوار سے ٹیک لگائی۔ ”تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟“
 ”میں نے منصوبہ تبدیل کر دیا ہے۔“ کیرین نے سر آواز میں کہا۔
 ☆☆☆
 ڈاکٹر جیس میکڈیل اور اس کی بیوی مارگریٹ، اسپیشل ایجنٹ، شالر کے سامنے بیٹھے تھے۔ ریت کی رنگت والے بالوں کے شالر کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ شالر کا تعلق ایف بی آئی کے جیسکس فیلڈ آفس سے تھا۔
 میکڈیل تنہا آچا رہا تھا لیکن مارگریٹ ساتھ چلنے پر رضہ تھی۔ وہ اسپیشل ایجنٹ انچارج کے آفس میں براہمان تھے۔ آفس کے باہر تپتی پر ایجنٹ کا نام فریک زک لکھا تھا۔ شالر اپنے باس کی ڈیسک پر موجود تھا۔
 ”یہ اغوا ہائے تاوان کا کیس ہے، ٹھیک؟“
 ”نہیں۔“ میکڈیل نے جواب دیا۔
 ”اور یہ ایک برس قبل کی واردات ہے؟ ٹھیک؟“
 ”نہیں۔“
 ”بلوکی میں جو میڈیکل کانفرنس ہو رہی ہے، ایک سال پہلے ٹھیک اس موقع پر ہمارے ساتھ یہ واردات ہوئی تھی۔“ مارگریٹ نے تفریہ دیا۔
 ”آپ لوگوں نے رپورٹ کرنے میں ایک سال گزرا دیا، کیوں؟“
 ڈاکٹر میکڈیل نے وضاحت سے اپنے خوف اور واردات کنندگان کی دھمکیوں کے ساتھ پیٹریک پوسٹ ٹراک حالت کا بھی ذکر کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میاں بیوی رپورٹ کے بارے میں اتفاقی رائے پیدا نہیں کر پارے تھے۔

”اسی!“
”اما!“

”جی انولین کا پاس ہے تمہارے پاس؟“
”اما، میں فون لینے دو بارہ کمین میں ہی تھی تو انولین وہیں بھول گئی تھی۔“

”مہر اومت، میں ڈیڑی سے بات کر رہی ہوں۔“
حالانکہ کیرین خود ہراساں ہوئی تھی۔
”ول، انولین اس کے پاس نہیں ہے... ہوتی بھی تو وہ وہ خود سے استعمال نہیں کر سکتی۔“ کیرین نے وضاحت کی۔

☆☆☆

باسل نے آسمان کی جانب دیکھا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اندر سے میں گھورنے سے اس کی آنکھیں دھکنے لگی تھیں۔ اسے جو کہ غصے سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ وہ اسی کو کیوں نہیں ڈھونڈ پا رہا ہے... وہ واپس کمین کے قریب پہنچ گیا تھا۔ باسل نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہ جھکن محسوس کر رہا تھا۔ اچانک شہ تار کی میں کوئی زرد چیز چمک کر غائب ہوئی زور دوشی پھر نظر نہیں آئی۔ تاہم باسل کوست کا اندازہ ہو گیا تھا... اسی کو اندازہ نہیں تھا کہ باسل کہاں ہے... جب باسل نے اسے زنی سے دو چار تو اسی نے مسلسل چیخا شروع کر دیا۔ وہ متواتر چیخے جاری تھی۔

باسل کا دل کر رہا تھا کہ کان دونوں ہاتھوں سے بند کر لے لیکن اسے اسی کو اٹھا کر کمین تک بھی لے جانا تھا۔ اسی کی چیخ دیکار میں خوف تھا... دیہائی خوف جب باسل بچپن میں خوف زدہ ہو کر چلاتا تھا۔
باسل نے اسی کو باندھ دینا تھا۔ تاہم وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے چوڑے سینے کے اندر کوئی چیز لرز رہی تھی۔ شاید اس کے بچپن کے خوف کا ارتعاش تھا۔

☆☆☆

دفعہ کیرین کا رابطہ اسی سے منقطع ہو گیا۔ آخری آواز جو اس نے سنی وہ اسی کی چیخ تھی... کیرین کا دل پھڑپھڑا اور سینے میں برف سی جم گئی... دہشت نے اسے آکھٹا کے باندھ لیا۔ جو بغور کیرین کو دیکھ رہا تھا۔
”اسی!“ کیرین چلا اٹھی۔

”اسی، میرے پاس ہے... جو کہاں ہے؟“ باسل کی آواز آئی۔
”ویل، ویل... جو لنگڑا ہوا کھڑا ہوا۔“ بلاشبہ

باسل نے اسی کو پکڑ لیا ہے۔“

کیرین نے 38 جو کے سینے کی جانب کیا۔ ”اس کو کھو اسی کو واپس لائے۔“ کیرین نے دلیری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تاہم اس کی آواز مرتعش تھی اور چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

دوسری طرف ول دانت بھینچے خاموشی سے سب سن رہا تھا۔

”کھل ختم ہو گیا۔ سڑجینک۔“ جو بے خونی سے بستر کے گرد گھوم گیا۔ ”گولی چلی اور اسی مری۔“ جو نے گن کی پروا کیے بغیر سیل فون بھینچ لیا۔

”باسل، گولی کی آواز آئے تو اسی کو ختم کر دینا... اس کتیا نے پہلے ہی مجھے زخمی کر دیا ہے۔“ اس نے باسل کو حکم دیا۔ ”اسی کو باندھ دو، پھر کال کروں گا۔“
پھر جو نے گن کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا... کیرین نے خونی کیفیت میں گن چھوڑ دی۔

☆☆☆

کیرین، ول کا سیاہ رنگ کا بیگ اٹھا لیا تھی اور جو کی ران کے ذم پر ٹانگے لگ رہی تھی... نصف شب بیت گئی تھی۔ جینک ہاؤس پہاڑی پر تار کی میں خاموشی سی ایسا دہ تھا۔ پائن کے درختوں میں سے حشرات الارش وہاں ہونے والے دلغراش ڈراے سے بے خبر اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

جو کی ناف کے نیچے ایک تو لیا بندھا تھا۔ ران کے گرد کسا ہوا خون آدو تو لیا اس نے کھول دیا تھا... ہاتھ میں والٹڈ ٹری کی بوتل تھی۔ زخم کی سلائی کے دوران وقفے وقفے سے اس کی سکی نکل جاتی اور وہ بول منہ سے لگا لیتا تھا۔

کیرین نے بمشکل اسی کو ذہن سے نکالا تھا، ورنہ وہ باؤف ذہن کے ساتھ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خود کو مکمل مایوسی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”آخر ہم لوگ ہی کیوں؟“ وہ زنی سے بولی۔

”میری ماں کو طلق کا کثیر ہوا تھا، کیوں؟“ آخر میری

ماں کو ہی کیوں؟“ وہ بولا۔

کیرین اس کی بے مطلق کن کر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

اپنے لگژری سوٹ میں، ول کھڑکی میں کھڑا ہر گلف آف میکیک کو گھور رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ چٹلون کی جیبوں میں تھے۔ ذہن میں آگ بھری تھی... درواں درواں غیظ و غضب کا شکار تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ باسل نامی شخص نے

اسی کو قابو میں کر لیا ہے۔ کیرین نے جو بازی کھیلی تھی وہ پھر پلٹ چکی ہے۔

اگرچہ وہ شیر ل کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تاہم وہ، ول کی موجودہ خونی کیفیت سے گھبرا کر گن سمیت ہاتھ روم میں چھپ گئی تھی۔ گن دونوں کے لیے نا کارہ ہو چکی تھی۔

کئی سوالات اس کو ابھار رہے تھے... جو کا مسئلہ رقم تھی لیکن جو نے جو کھڑا کچھ بھیلایا تھا، ول کے نزدیک وہ تاوان کی رقم تک محدود نہیں تھا، بظاہر یہ تاوان کا معاملہ ہی نظر آتا تھا۔ تاہم ول کے نزدیک اس معاملے میں جو کے کچھ اور خباثت بھرے محرکات بھی شامل تھے۔ کیا وہ ڈاکٹروں سے انتقام لے رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ چوبیس گھنٹے میں ہر مرتبہ رات شامل ہوتی تھی کیوں؟ جو کی بیوی، رات میں تہا ڈاکٹروں کے ساتھ اور ڈاکٹروں کی بیگمات رات کی تنہائی میں جو کی دسترس میں...
منا اس کے دماغ میں بجلی لگزی۔ اس کا چہرہ انگارہ ہو گیا۔ ہاتھ جیبوں سے باہر نکال کر مٹھیاں اس نے اپنی سختی سے پٹی کہ ہر ایک جوڑ چوڑے کے مانند سفید پڑ گیا۔

شیر ل کا ماضی تو اس نے اگوا ہی لیا تھا۔ لیکن کیرین... اسے کوئی شک نہ رہا کہ اسی کی زندگی کے ساتھ کیرین کی عزت بھی خطرے میں ہے... ول کی دماغ کی نسین پھینچنے لگیں۔ اسے کچھ کرنا ہے، ہر قیمت پر کرنا ہے۔

شیر ل اس دوران ہاتھ روم سے نکل کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ گن اس نے ایک طرف ڈال دی تھی اور مستی خیز انداز میں بغور ول کو دیکھ رہی تھی۔ ول اسے نظر انداز کر کے ہاتھ روم میں محسوس کیا۔ اس نے کپڑے اتارے اور شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈا پانی سر پر کرتا ہوا سارے جسم کو جھگو رہا تھا۔ سر میں الاؤدک رہا تھا جو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا تو دماغ کام کرنے کے قابل ہو چکا تھا، بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے سر خشک کرنے کی کوشش نہیں کی۔

شیر ل اشتعال انگیز انداز میں بستر پر لیٹی تھی... وہ، ہم تو مائل یہ کرم ہیں۔ کوئی مسائل ہی نہیں کا، عنوان دکھائی دے رہی تھی۔

”پریشان لگ رہے ہو، لاؤ بال خشک کڑوں؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”مائش کر دوں۔“ وہ مسکرائی۔

پگھلتے لمحے

”شکر یہ۔“ ول نے کہا۔

”کچھ اور؟ تمہاری بیوی کو کیوکر پتا چلے گا؟“ وہ مسکرائی۔

ول نے اس مرتبہ جواب ہی نہیں دیا۔

شیر ل نے منہ بنا کر ٹی وی کی جانب پھیر لیا۔

☆☆☆

اسی، صوفے کے کونے میں دکی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، بارہی ڈول کو سختی سے اس نے سینے کے ساتھ بھینچا ہوا تھا۔

باسل فرش پر چھٹ دور بیٹھا تھا۔ حیرت ناک طور پر اس کی آنکھوں میں بھی ہراس تھا۔ جو کی ہدایت کے برعکس اس نے اسی کو بے دست و پا نہیں کیا تھا۔

”میں تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ وہ بولا۔

”جو نے مجھ سے جو کہا وہ میں نے کیا۔ میں مجبور تھا۔“

”اس نے مجھے ہی اور ڈیڈی سے چھین لیا ہے۔“ وہ کراہی۔ ”اور تم نے بھی۔“

”تم کہا کیوں نہیں؟ میں بد صورت ہوں نا اسی لیے تم بھاگ گئی تھیں۔ میں بھوت کی طرح لگتا ہوں۔“ باسل کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ ”مجھے مجھ سے ڈر جاتا ہے۔“

اسی کی آہ و زاری سن کر اسی نے اسے باسل کے تہرے پر ٹپکی میں سر ہلایا۔

”تم منہ سے نہیں بولو۔ میں جانتا ہوں۔ اسکول میں بھی بچے مجھ سے دور بھاگتے تھے... میں تمہیں دوست سمجھ رہا تھا۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ تم کیوں باہر نکل گئی تھیں؟“

”میں نے بتایا نا کہ تم نے می ڈیڈی سے مجھے چھین لیا ہے۔“ اسی نے متورم آنکھوں سے کہا۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے... میں عفریت کی طرح ہوں، میں تمہیں اچھا نہیں لگا۔“

”نہیں، صورت سے فرق نہیں پڑتا۔ بیلا نے مجھے بتایا تھا۔“ اسی نے ہلکی سی چپکائی۔

”کیا؟“ باسل الجھ گیا۔

”یہ بیلا ہے۔“ اسی نے بارہی کو آگے کیا۔ ”بیوٹی اینڈ بیسٹ“ بیلا از بیوٹی۔ بیلا نے مجھے بتایا کہ شکل سے زیادہ دل اہم ہوتا ہے... اور تمہارا دل اچھا ہے۔“

”لیکن میں ”بیسٹ“ ہوں۔“ باسل کا جیڑا لٹک گیا۔

”تم نے شاید ”بیوٹی اینڈ دی بیسٹ“ نہیں دیکھی۔

باسل نے نفی میں سر ہلایا۔

”دیکھو، میں بیلا ہوں اور تم بیٹھ، ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔“ باسل نے افسردگی سے کہا۔

”اوہ... ہو... تم اچھے والے بیٹھ ہو... گڈ

بیٹھ۔“ وہ صوفے سے اتر آئی اور باری، باسل کو دے

دی۔ کوئی اچھی بات کرو اور مجھے بیلا کے نام سے پکارو۔“

”کوئی اچھی بات کروں؟“ باسل نے باری کو دیکھا

پھر اس پر نظر ڈالی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں، تم ”بیٹی“ نہیں ہو۔“ وہ اچانک بولا۔

”کیا...؟“

”تم پری ہو، چھوٹی سی پری... پری کا نام بیلا

ہے۔“

اسی بے اختیار بننے لگی۔

”تھیک یو گڈ بیٹھ... اب تم ہو تو تھیک یو بیلا۔“

”تھیک یو بیلا۔“ باسل بچوں کی طرح کل اٹھا۔

☆☆☆

کیرین نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ڈھائی بج رہے

تھے۔ وہ کرسی میں بیٹھی تھی۔ جو، بستر پر لیٹا تھا۔ اس کی

مجرورج ٹانگ کے نیچے اور بغل میں ”وائٹ لٹری“ کی بوتل

تھی۔ اعشاریہ اڑتیس کی گھنٹہ اس کے پاس رکھی تھی۔ وہ

بڑے ٹی وی اسکرین پر ہنسنے والی گارٹ کی فلم دیکھ رہا تھا۔

کیرین آس لگائے بیٹھی تھی کہ جو کی مجروح ٹانگ،

خون کا ضیاع اور شراب کی زیادتی اسے سلا دے... وہ اس

سے ہاتھ کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ ڈاکٹروں کے پیچھے کیوں پڑا

ہے؟ پھر کیرین نے ارادہ مٹو کر دیا۔ اگر وہ سوئے لگا تو

گنگو اس کی نیند کا امکان ختم کر دیتی۔

☆☆☆

ول، صوفے پر لیٹا تھا۔ گیلیا تو لیا چہرے پر پڑا تھا۔

وہ بے بسی کے احساس کو فٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس

نے چہرے پر سے تو لیا ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

یہ محض تاوان کا معاملہ نہیں ہے۔ کچھ اور معاملہ بھی ہے... کیا

شیرل نے جھوٹ بولا ہے یا پھر اصل بات صرف جو کے علم

میں ہے... ڈاکٹروں کے خلاف تاوان کی وارداتیں اسے

ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ ول بیڈروم کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

کیرین، جو کے بستر کے قریب کرسی پر جمبول رہی

تھی۔ بظاہر وہ مرسکون تھی۔ تاہم دماغ میں جگولے چکرا

رہے تھے۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

اسے شک ہو چلا تھا کہ جو نے منصوبہ تبدیل کر دیا ہے۔

بالآخر وہ رہ نہ سکی۔

”تو تم تاوان وصول کر کے ہی اسے کو چھوڑو گے؟“

اس نے اچانک سوال کیا۔

جو نے چونک کر اسکرین پر سے نگاہ ہٹائی۔

”ضروری نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ کیرین کا دل زور سے دھڑکا۔

”ڈاکٹر جیننگ کا معاملہ کچھ اور ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“ کیرین کا رنگ فق ہو گیا۔

”اس نے ماضی میں میری ماں کا قتل کیا تھا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ کیرین چیخ اٹھی۔

”پرانی بات ہے۔ تم دونوں پہلے یونیٹی اسپتال

میں ملے تھے؟“

”ہاں۔“ کیرین اس کی معلومات پر ششدر رہ گئی۔

”وہاں میری ماں کا کینسر کا علاج ہو رہا تھا۔ بے ہوشی

کی حالت میں SCD کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔

SEQUENTIAL COMPRESSION

DEVICES... چنانچہ کلاٹ بن گیا اور وہ مر گئی، وہیں

آپریننگ ٹیمیل پر۔ اور یہ ول کی ذمہ داری تھی۔ میں نے

بعد میں آکر سرجن سے معلومات کی تھیں۔ اب وقت آ گیا

ہے... ول کو پورا پورا حساب دینا پڑے گا۔“

”بکواس، جھوٹ... یہ ول کی ذمہ داری نہیں

تھی۔ SCD پر نظر رکھنا نرس کا مسئلہ تھا۔“ کیرین پھر بچتی۔

”مجھے نہیں پتا، میں نے تصدیق کر لی تھی۔“

”مجھے بھی نہیں پتا یہ غلط فہمی یا جھوٹ کیوں بولا گیا...“

تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ کیرین کی آواز بھرا گئی۔

”کون روکے گا مجھے؟“ جو نے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

اسپیشل ایجنٹ شالمر دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس کے

ہاتھوں میں بگ بکس تھیں۔ ان کی اونچائی نصف فٹ سے

زیادہ تھی۔ بلا مبالغہ، ان میں ہزاروں تصاویر تھیں۔

ڈاکٹر میکڈیل اور اس کی بیوی، فیڈرل بلڈنگ سے

چند بلاک کے فاصلے پر پولیس ہیڈ کوارٹر میں تھے۔

”میں نے NCIC کے کمپیوٹر سے مدد لی ہے۔

ساؤتھ ایسٹ کے صرف افواہ کی وارداتیں سرچ کی ہیں اور

صرف تین نام ہیٹ کے ہیں... جو، شیرل اور باسل...“

”اتنی تصویریں؟“ میکڈیل اور اس کی بیوی ایک

دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

پگھلتے لمحے

ابھی اور واپس کرسی پر بیٹھ گئی... دونوں خاموش تھے۔ جو

نے گن ہاتھ میں لے لی اور دوبارہ فلم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

کیرین تاہم ابھی کی گھٹائی میں خود کو سنہال رہی تھی۔

سب سے پہلے، اسے کسی نہ کسی طرح شوہر کو خبردار کرنا

تھا... بیڈروم سے نکلنے کا ایک ہی معقول بہانہ تھا کہ وہ

کھانے کی ضرورت کے تحت کسی طرح بچن تک پہنچے...

لیکن کوئی حافض نہیں تھی کہ جو اس کے پیچھے نہیں آئے گا۔

وہ کسی کا اثر بھی جو پر ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دماغ ٹھارہ تھی

کہ جو نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔ کیرین

خیالات میں غلطیاں تھیں اس لیے جو کی بات سن نہ سکی۔

”کچھ کہا تم نے؟“ کیرین نے پوچھا۔

”بھوک لگ رہی ہے۔“ جو نے چیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

کیرین کی مشکل خود ہی آسان ہو گئی۔ تاہم اس نے

تاثرات سپاٹ رکھے اور ظاہر کیا کہ وہ بدلتی کے ساتھ اٹھ

رہی ہے۔ وہ بیڈروم سے نکل کر دے قدموں بھاگی۔ لیکن

میں پہنچ کر اس نے پھرتی سے آلیٹ تیار ہونے کے لیے رکھا

اور بچن وال کا فون اٹھا لیا۔

ول کے آفس کا نمبر ملا کر اس نے مدہم آواز میں

آپرینٹر کو بتایا کہ وہ کون بات کر رہی ہے... کیرین نے

جلدی جلدی ایمرجنسی کی وضاحت کی اور بتایا کہ وہ 911

کیوں فون نہیں کر سکتی... کیرین نے بتایا کہ جتنی جلدی ہو

کے اس کا پیغام ڈاکٹر ول کے اسکاٹی ٹیل جیکر تک پہنچا دیا

جائے... ”اوکے، مہم۔“

کیرین نے پیغام ریکارڈ کر کے فون رکھ دیا اور

ادون کی طرف پلٹی۔ اس کا لبو چند لمحوں کے لیے جم گیا۔ جو

بچن کے دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ سردنگاہوں سے

کیرین کو دیکھ رہا تھا... ”فون کے پاس کیا کر رہی تھیں؟“

اس نے سوال کیا۔

کیرین نے نظر چراتے ہوئے فون کی طرف دیکھا۔

فون کے آس پاس تصویریں اور فونو چپاں تھے۔ اس نے

ادون کا ٹائمر آف کیا اور فون کی طرف چل دی۔ کیرین نے

ایک تصویر... دیوار سے الگ کی اور اسے گھورنے لگی۔ یہ

اسی کی اسکول میں بنائی گئی تصویر تھی، جس کے ساتھ نوٹ

بھی لکھا ہوا تھا۔

”میں اس کی تصویر دیکھ رہی تھی... مجھے اب تک

لگ رہا ہے جیسے یہ سب ایک بھیا تک خواب ہے۔“ اس

نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

”وقت کم ہے، کام مشکل ہے... لیکن ہو سکتا ہے۔“

شالمر نے کہا۔ ”جو، تاہم بہت عام ہے لہذا اسے نظر انداز کر

دو... اس طرح صبح ہو جائے گی۔ البتہ باسل اور شیرل کی

تصویر ملنے کا چانس ہے... شروع ہو جاؤ۔“ شالمر نے گائیڈ

لائن دی۔

☆☆☆

میکڈیل نے کافی کی تیسری پیالی قسم کی اور آنکھوں کو

مسلا اور پھر سے تصاویر کو چھاننا شروع کر دیا۔ معاس کی

سائنس رک گئی... وہ شیرل کی کم عمری کی تصویر تھی۔

”شیرل ہے۔“ اس نے شالمر کو تصویر دکھائی۔

”شیدر؟“

”سوفیڈ۔“

شالمر تصویر لے کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا... ”

”معمولی وارداتیں ہیں۔ جسم فردی کا دھندلاہٹا بھی کرتی

رہی ہے... مگر قمار صرف ایک مرتبہ ہوئی ہے۔ تم ٹھیک کہہ

رہے ہو، ہبی ہے۔“

”اب کیا کرنا ہے؟“ ڈاکٹر نے سوال کیا۔

”تصویری کی باہر تین ریپورٹ جانے لگی۔ امکان

ہے کہ اسٹاف کے کسی ممبر نے اسے دیکھا ہو۔“

”پھر؟“

شالمر نے ایرواچ کا گھر اسائن لیا۔ اگر وہ وہاں ہے

تو نوڈیس کو کال کرنا پڑے گی... نیز میں یہ فرض کرنا پڑے

گا کہ جہاز اقیانوس درست ہے کہ افواہ کی واردات زیر عمل ہے

اور یہ ایک میجر جوشن ہے۔“

☆☆☆

”اگر تم اس الزام کو ٹھیک سمجھتے تھے تو تم ول پر مقدمہ

کر سکتے تھے؟“ کیرین نے سنجی ہوئی آواز میں کہا۔

”مقدمہ؟ مقدمے سے کیا ملتا، مجھے تو پوری قیمت

وصول کرنی تھی۔“

”یعنی تم ول کو مارو گے؟“ میرین کی آواز سرگوشی

میں وصل گئی۔

”یوں۔“ جو نے چٹکی بھائی۔ ”اور اسے کو بھی۔“ جو

نے سفاک نظروں سے کیرین کو گھورا۔

اچانک کیرین بستر پر پڑے ہتھیار پر چھٹی۔ تاہم جو

چوکس تھا۔ اس نے اپنی صحت مندا ٹانگ چلا کر کیرین کو دور

پھینک دیا۔

کیرین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ قاتلین پر پڑی

کھانسی رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی سانس بحال ہوئی تو وہ

”میں بستر پر ہوں، جو بنایا ہے لے آؤ“ وہ ٹوٹی چال کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اگر اس کی ایک ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ کم وقت میں چلن تک پہنچتا اور کیرین کو فون کرتے دیکھ لیتا۔ تاہم کیرین کو اندازہ ہو گیا کہ مردود نہایت کاٹیاں اور محتاط ہے۔ کیرین کو حد سے زیادہ احتیاط کرنی پڑے گی۔ اس نے کاؤنٹر کا سہارا لے کر کمری ہوئی سانس خارج کی۔

☆☆☆

ول ایک کھٹے سے شیرل کو ٹھول رہا تھا۔ وہ جواب دے رہی تھی لیکن اس نے ول کے مطلب کی کوئی بات نہیں بتائی۔ شاید وہ ابھی تک ول پر پوری طرح اعتماد نہیں کر پا رہی تھی۔

ول نے بیٹرا بدلا اور جو کے بجائے باسل کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ اچانک وہ اچھل پڑا۔ اس نے اسکاٹی ٹیل جھری کی جھنساہٹ محسوس کی تھی۔ ”کیا ہو گیا؟“ شیرل نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”کشن میں کوئی کوڑا ہے شاید۔“ شیرل ہنسنے لگی۔

ول بھیر چپک کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ کال پر نہیں تھا۔ لہذا یقیناً پیغام کیرین کی جانب سے آیا تھا۔ ”برانہ ماؤ تو باجھ روم ہواؤں؟“

شیرل نے شانے اچکائے۔ ول نائل رفتار سے ہاتھ روم کی طرف چلی دیا۔ اگرچہ اندر سے وہ سخت بے چین تھا۔ پیغام جو بھی تھا۔ غلطی غیر متوقع تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے بیٹ سے بھیر الگ کیا اور شیخ کی۔ ہزر روشنی میں پیغام نمودار ہوا:

”صبح تک کچھ نہ کچھ کر وہ... ابھی مر سکتی ہے... کچھ بھی کر دو... اپنی حفاظت کرو... معاملہ تاوان پر ختم نہیں ہو گا جو، تمہیں اپنی ماں کا قاتل سمجھتا ہے۔ کیرین۔“

ول نے پیغام دوبارہ نمایاں کیا۔ اس کا دماغ آندھیوں کی زد میں تھا۔ وہ بار بار پیغام کا ایک ایک لفظ پڑھ رہا تھا۔

کیا کیرین کو جو کے پلان کی کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟ کیرین نے ول کے تحفظ پر تشویش کیوں ظاہر کی؟ سب سے بڑھ کر جو معنویت اجاگر ہو رہی تھی، وہ بھی کی ول کو ابھی کو بچانے کے لیے رسک لینا پڑے گا۔ رسک کی نوعیت کچھ بھی ہو... اچانک اسے باہر سے فون کی آواز سنائی دی۔ ول نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ یقیناً یہ 30 منٹ کے وقفے سے جو کی چپک ان کال تھی۔ شیرل نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا۔ ول کے دماغ کے

مرکز میں ایک ہی بات تھی۔ کچھ کرنے کے لیے اس کے پاس اب مکمل اور محدود دس منٹ تھے یا پھر وہ انکی چپک ان کال کے بعد والے تیس منٹ کو استعمال کرے؟

اسے فلک ہو رہا تھا کہ شیرل نے اسے پوری باتیں نہیں بتائیں۔ ممکن ہے کہ وہ اسی کی لوکیشن سے بھی وقت ہو... جب سے شیرل اس کے کمرے میں آئی تھی، ول بہت کچھ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں کافی کچھ معلوم بھی کر چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیرل، جسم فروشی اور جرائم پر ارتقا کے لیے دل سے تیار نہیں ہے۔ وہ بانی ووڈ کے خواب دیکھتی ہے... پھر کیوں وہ اب تک جو کے ساتھ تعاون کر رہی ہے؟ کیا محض اس لیے کہ جو نے اسے جسم فروشی کے دھندے سے نکال کر اس سے شادی کر لی تھی۔

جو سے جان چھڑانے کے لیے شیرل کو گارنٹی چاہیے تھی، جو خطرات سے پاک ہو۔ اس کے بعد ہی وہ جو کے ساتھ دغا بازی کرے گی۔ شیرل کو پتا تھا کہ جو اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے اور اسے استعمال کر رہا ہے۔

تاوان کے معاملے میں بھی کوئی غلطی ہوتی ہے تو جو نہیں شیرل بھنے کی اور جو بروقت نکل جائے گا... جو کے متعلق اس کا تجربہ صحیح تھا۔ اس لیے وہ بھی باوقاف بننے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ بھی شیرل نے ول کو مہی خیر پیشکش کی تھی۔ یقیناً وہ جاتی تھی کہ جو، وارداتوں کے دوران ڈاکٹروں کی پیگمات کے ساتھ کیا کرتا رہا ہے... یہ وہی ڈاکٹر تھے جو کسی نہ کسی طور جو کی ماں کے دل میں ملوث تھے۔ شیرل کو جو سے غداری کے لیے گارنٹی چاہیے تھی اور گارنٹی کے لیے مونی رقم چاہیے تھی۔ اتنی رقم کہ وہ بھاگنے کے بجائے غائب ہی ہو جائے اور شناخت بدل کر نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔

ول نے نوائلٹ میں پانی بھایا اور باہر نکل آیا۔ ”جو کی کال تھی؟“ اس نے شیرل سے سوال کیا۔ ”ہاں، سب ٹھیک چل رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایک بات کہوں۔“

”ہاں، بولو۔“ ”تم پہلے آؤ ہو جس نے مجھے ٹھکرایا ہے۔“ ”تمہیں برا لگا؟“ ”نہیں، تم مختلف ہو۔“ ”اگر تم اعتراض کرتی ہو کہ میں مختلف ہوں تو بھرنا کیوں نہیں کرتیں کہ میں جو سے تمہاری جان چھڑا سکتا

پگھلتے لمحے

تھے... آٹھ بجے سے قبل ٹریڈنگ اسٹارٹ کرنا محال تھا۔ چند لمبے سکوت کی نذر ہو گئے۔ پھر فیرس کی آواز آئی۔ ”میرا ایک رینارڈ دوست، انجینئر ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ہمارے لیے کام کرتا ہے۔ اس کے گیراج میں خاصا ضروری سامان ہے۔ وہ اپنا ٹرک استعمال کرتے ہوئے شاید کچھ کر جائے۔“ فیرس نے رائے دی۔ ”وہ اپنے کام کا ماہر ہے۔“ ول کی دم توڑتی امید نے پھر انگڑائی لی۔ اس نے فیرس کو اسکاٹی ٹیل لائن کے ڈائریکٹ نمبر دیے اور شیرل کا سل نمبر دیا اور کہا۔ ”مجھے یہیں ہونا چاہیے لیکن کچھ بھی ہو جائے، بات پھیلنی نہیں چاہیے۔ جیسے ہی کوئی کلیو ملے... فوراً مجھے کال کرو۔“ ول نے فون بند کیا تو اپنے شانے پر شیرل کا ہاتھ محسوس کیا۔ شیرل کی آنکھوں میں ہمدردی کا ہلکا سا عکس تھا۔

ول نے پیشانی رگڑی۔ ”بینک سے تاوان کی رقم وصول کرنے کے بعد تمہاری کیا ذمہ داری ہے؟“ ول نے استفسار کیا۔ ”میں جو کال کروں گی۔ پھر ہم بروک ہیون کے موشل میں ملیں گے۔“ ”تم مجھے ساتھ رکھو گی؟“ ”ہاں۔“

”گزشتہ وارداتوں میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے؟“ شیرل ہچکچائی۔ ”شیرل وقت حیزی سے گزر رہا ہے۔“ ول نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”نہیں ایسا پہلی مرتبہ ہوگا۔“ بالآخر شیرل نے کہا۔ ”کیا تم یقین کرو گی کہ اس مرتبہ صورت حال مختلف ہے، قطعی مختلف؟ جو چاہتا ہے کہ کیرین اور ابھی کو میرے سامنے ختم کرے۔“ ”نہیں ایسا نہیں ہے۔“ شیرل نے تردید کی۔

”ایسا ہی ہے... وہ بہت مکار ہے اسی لیے آج تک بچا ہوا ہے۔ اس نے عدا تمہیں ٹرک ریٹ موشل، بروک ہیون کا نام بتایا تھا... اس کے خیال میں، میں تم پر تشدد کر کے جانے مقام اگوا لوں گا اور ایف بی آئی وہاں عذاب بن کر ٹوٹ پڑے کی جگہ وہاں ہو گا ہی نہیں۔“ ول پورے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ ”سوچو، شیرل سوچو... ہم دونوں کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔“

”تم تاوان دو اور دینی کو بچاؤ، جیسے دوسروں نے کیا۔“

”ہوں۔“ تم نے مجھ سے کوئی بات چھپائی ہے؟“ ”نہیں۔“ شیرل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ ڈاکٹروں کو کیوں نشانہ بناتا ہے؟ اور میرے ساتھ وہ کیا کرنے والا ہے؟“ ”میرا یقین کرو۔ مجھے ہر بات نہیں معلوم... وہ بہت مکار ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔“ ☆☆☆

شیرل صوفے پر نیم دراز کوک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ول، سوئٹ کے فرنٹ روم میں ڈائنگ ٹیبل پر لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف کار تھا۔ اس کو ”فیرس“ اور فون ٹریڈنگ کے بارے میں کیرین کو پیغام دینا تھا۔ لیکن ول کو کوڈ کی ضرورت تھی۔ خطرہ تھا کہ ای میل کہیں جو کی نظروں میں نہ آجائے... اس نے کیرین کے ساتھ ان گنت فلمیں دیکھی تھیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ول نے ”کوڈ ڈیل“ تاپ کر دی۔ ”اسی بج جائے گی۔ میرا بھروسہ سا کرو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ ”کوڈ ڈر“ کتنا خطرناک ہے؟“ ای میل روانہ کرتے ہی، جو کی چپک ان کال موصول ہوئی۔ چارنچ کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ کیا جو نے پندرہ منٹ قبل کال کی ہے؟ نہیں، یہ یقیناً فیرس کی کال ہے۔ ول نے فون اٹھایا۔

”ول جینک۔“ ہارلے فیرس سیل اسٹار کا پاس تھا۔ کسی وقت ول نے اس کی بیوی کی میڈیکل پراہم لسل کی تھی۔ ”ہارلے فیرس۔“ ڈاکٹر، ہمارے کمپیوٹر نے صبح چار بجے کے بعد کال شو کی ہے... ہیزل ہرسٹ ایریا کو جو ٹاور سرور کر تا ہے، اس کی پروسیسنگ کے مطابق کال تمہارے گھر کی لینڈ لائن سے آئی تھی۔“

”ابھی آئیڈیا؟ کال کہاں ریسیو ہوئی؟“ ول نے سوال کیا۔ ”نہیں۔ حتیٰ کہ ہماری ٹریڈنگ وین بھی علاقے میں ہے لیکن مذکورہ کال پندرہ سیکنڈ میں ہی بند ہو گئی تھی۔ پندرہ سیکنڈ بہت کم وقت ہے... میرا خیال ہے کہ اب ایف بی آئی سے رابطہ کر لیتا چاہیے۔“ فیرس نے اظہار خیال کیا۔

”نہیں، ابھی نہیں... فیرس، تمہاری ٹریڈنگ وین کہاں ہے؟“ ”یونٹ کا کوئی۔“

ول دانت چیر کے رہ گیا۔ اس کا مطلب وین کو ہیزل ہرسٹ تک پہنچنے کے لیے مزید تین گھنٹے درکار

”اوہ گاڈ، میرا کیس دوسروں کی طرح نہیں ہے، وہ جنونی مجھے اپنی ماں کا قاتل سمجھتا ہے... بہت ممکن ہے کہ یہ اس کی آخری واردات ہو... جس کے بعد تم بھی اس کی شکل نہ دیکھ سکو۔“

”تم بہکا رہے ہو مجھے۔“ شیرل نے غیر یقینی سے اسے دیکھا۔

”تمہاری عقل پر منحصر ہے... میرا پاس تو دو ہی راستے ہیں۔ اپنی پہلی کو بچا لوں یا تم تینوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دوں...“ ول کے تاثرات پھرا گئے۔ ”تم اگر کیسوٹی سے میرا ساتھ دو تو چاہئے کہ جو کی کہانی ختم ہو جائے اور تم بھی بچ جاؤ۔“ ول کی آواز میں فلوادی سختی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ ”مارو یا مر جاؤ“ کا فیصلہ کر چکا ہے۔ شیرل کمری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

صبح کے تقریباً چار بجے جو سوچا تھا بے ہوش تھا... بہر حال وہ طبعی غافل ہو چکا تھا۔ کیرین نے اسٹڈی میں آکر ول کی سیل چیک کی۔ وہ پیغام کو گھور رہی تھی۔ پہلا حصہ تو واضح تھا لیکن دوسرا حصہ بالائے فہم... یقیناً یہ کوڈ ہے۔ کیرین نے سوچا۔ ”کوئڈوز“ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ ذہن میں کئی بار اس نے کوئڈوز کا لفظ دہرایا... معاً اسے رابرٹ ریڈ فورڈ کی مودی یاد آئی۔ فلم کا نام تھا تھری ڈیز آف کوئڈوز... کوئڈوز، ریڈ فورڈ کا کوڈ نیم تھا۔ ریڈ فورڈ کی فلمیں، ول کے ساتھ اس نے بار بار دیکھی تھیں۔ ”تھری ڈیز آف کوئڈوز“ کے اسے تقریباً تمام ڈائلاگ یاد تھے۔

مذکورہ ڈائلاگ ”کوئڈوز“ (رابرٹ ریڈ فورڈ) نے فون پر میکس وان سینٹ سے کہا تھا۔ میکس، مودی میں کرائے کے قاتل کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس ڈائلاگ کے بعد فلم نے فیصلہ کن موڑ لیتا شروع کیا تھا اور ”کوئڈوز“ نے اپنے ممکنہ قاتل ”میکس“ کو ناکامی سے دوچار کیا تھا... کیرین نے ول کا پیغام سمجھ لیا تھا جس کے مطابق ول نے کوئی تو تلاش کر لیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر میکڈیل اور اس کی بیوی، جیننگ ہاؤس سے محض پندرہ میل کے فاصلے پر جینکین میں، ایف بی آئی کے فیلڈ آفس میں موجود تھے... انجیل ایجنٹ فریک زک تھا۔ وہ چالیس سے اوپر، درمیانے قد کا ایک چوکس آدمی تھا۔ فریک پچھلے نصف گھنٹے سے فون پر مصروف کار تھا۔ اس دوران میں اس نے مختلف چیک پر ریزولوشن، ہیلی کاپٹر

پائلٹس اور چند دیگر افیشلو سے بات چیت کی۔ دوران گفتگو وہ متواتر اپنے سیاہ بالوں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں سے سنوارتا رہا تھا۔

شالر سے بات کرنے کے بعد فریک نے دونوں مہاں بیوی کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا تھا۔ وہاں خاصی سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ فریک کے دفتر میں آٹھ عدد مزید فیلڈ ایجنٹ موجود تھے۔

فریک زک، ان آٹھوں سے مخاطب تھا... ”بلوکی سے تیس سیل کے اندر اندر تمام فٹنس کو ہدایت کردی گئی ہے کہ پچیس ہزار ڈالرز سے بڑھ کر کوئی بھی رقم، کہیں سے بھی وائرڈ اسفر کی جاتی ہے تو اس کی فوری اطلاع فراہم کی جائے۔ تم لوگ جانتے ہو کہ یہ تاوان کا کیس ہے۔ کچھ مختلف ضرور ہے، تاہم بنیادی طور پر ”غوراً برائے تاوان“ ہی ہے۔ اکیس جوانوں کی ٹیم نیو آرلینز سے آرہی ہے جو براہ راست ”بلوکی“ کی نگرانی کرے گی۔ تیسری بات فضائی نگرانی کے لیے ہیلی کاپٹرز ہوں گے، یہاں، اور بلوکی میں بھی۔ ٹیلی ویژن حرکت پذیری کے لیے ایک انجیل مسلح ٹیم الگ ہوگی۔ جارحانہ کارروائی کے لیے چار بجی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔“

”کوئی سوال؟“ فریک نے سب پر فرداً فرداً نظر ڈالی۔

ایجنٹ شالر نے کہا: ”سیرا! شیرل لین ٹل کو بیوروچ ریسورٹ میں ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر میکڈیل نے شیرل کو گینگ بس سے شناخت کیا تھا۔ وہ پرانی تصویر تھی۔ جو تائی ٹیکس کی تصویر نہیں ملی۔ یعنی اس کا کوئی کرمینل ریکارڈ نہیں ہے... ہم کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ گزشتہ برس کی طرح اس مرتبہ بھی واردات ہو رہی ہے؟“

فریک نے مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”جینٹلمین، گلف پورٹ کے ریڈیڈنٹ ایجنٹ نے میں منٹ قبل اطلاع دی ہے کہ بیوروچ کے تیل ہوائے نے وہاں شیرل کو دیکھا ہے، ہمارے مذکورہ ایجنٹ نے اسٹاف کے متعدد اراکین کو فٹنس فوٹو دکھایا تھا اس وقت جب ہم بات کر رہے ہیں تو وہ دونوں، سیکورٹی پکس کی جانچ میں مصروف ہوں گے... سیکورٹی کیمروں میں جیسے ہی شیرل اسپاٹ ہوئی، ویڈیو اسٹش یہاں ای میل کر دیا جائے گا... جسے میکڈیل کو دکھایا جائے گا اور رہا سہا شک بھی دور ہو جائے گا۔ چند منٹ کی بات ہے۔ اس وقت تک ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے علاقے میں واردات شروع ہو چکی

ہے۔ یہاں میں سر آر تھر کا نون ڈائل کے لافانی کردار کا مختصر فقرہ دہرائوں گا کہ ”شیل شروع ہو چکا ہے۔“

☆☆☆

صبح کے چھ بج چکے تھے۔ متواتر دباؤ سے ول کا دماغ ترخا شروع ہو گیا تھا۔ پانچ بجے تک اس کی امید جوان تھی لیکن پانچ بجے کوئی کال نہیں آئی۔ فیرس کا ریٹائرڈ دوست کامیابی سے دور تھا۔ ول، جینرے میں بند نیو کے مانند چکر رہا تھا۔ اس نے ہیشکل دس منٹ اور انتظار کیا، پھر گھر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ غلاف تو فح، جو کہ بجائے کیرین نے فون اٹھایا۔

ول کی آواز سنتے ہی وہ سسکیاں لینے لگی اور ول کے حلق میں کانٹے اٹھنا شروع ہو گئے۔ کیا ابھی کو... وہ آگے نہیں سوچ سکا۔ کیرین کی وضاحت نے اس کا تئو کم کر دیا۔ وہ فٹنس کے باعث رو پڑی تھی۔ اس نے ول کو بتایا کہ جوئے خواب غفلت کے باعث سائز سے چار بجے کی کال مٹ کر دی گئی تھی۔ غالباً جریان خون اور شراب کے باعث وہ خود کو بیدار رکھنے میں ناکام ہو گیا تھا... ”تم اسی کے لیے کیا کر رہے ہو؟“

”میرا فیرس سے رابطہ ہو گیا تھا۔ ہم لوگ ہاسل کا فون ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہاسل نے جو کلام نہیں کی تو ہم اس کا فون ٹریس نہیں کر سکیں گے۔“ ”میں جو کلام کر رہی ہوں کہ مجھے اسی سے بات کرنی ہے۔“

”کیا وہ مان جائے گا؟“ ”وہ تو اٹھنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے لیکن ہمارے پاس اور چانس ہے بھی کیا؟“ کیرین نے کہا۔

”کیرین، ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ شیرل میرا ساتھ دے رہی ہے۔ کیوں؟ یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے جو پیغام مجھے بھیجا تھا، اس کی بنیاد کیا تھی؟“

”جو، مجھتا ہے کہ ماضی میں تم اس کی ماں کو قتل کرنے کا سبب بنے ہو۔ اس کا سیل منصوبہ کچھ اور ہے، وہ ہم لوگوں کو مار کر ملک چھوڑ دے گا۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں، شیرل کو یہ بات نہیں معلوم نہ اسے یقین آ رہا کہ وہ ابھی کے ساتھ ہم دونوں کو بھی مار دے گا۔“ ول نے بتایا۔ ”اے اٹھا کر کہو کہ تاوان کی رقم وائر نہیں ہو گی، جب تک تم اسی سے بات کر کے یقین نہ کر لو کہ وہ زندہ ہے... اور ہاں حوصلہ رکھو۔ تم نے اسے زخمی کر کے بڑا کام

پکھلتے لمحے

کیا ہے۔“ ”اور تم نے شیرل کو مار کر زیادہ بڑا کام کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم آدمی جنگ جیت چکے ہیں۔“

”ہم پوری جنگ جیتیں گے۔“ ول کی آواز میں فلواد کی سختی تھی۔

”گڈ لک۔“ ”گڈ لک۔“

☆☆☆

چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ول نے شیرل کو جھنجھوڑا۔ وہ آنکھیں سستی ہوئی ابھی اور فون پر سب ٹیک ہے کا سگنل دے کر پھر غافل ہو گئی۔ چند منٹ بعد پھر گھنٹی بجی... شیرل نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ لیکن ول نے جھجٹ کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف فیرس تھا۔

”کیا خبر ہے، فیرس؟“ ول کی آواز میں بے چینی مترشح تھی۔

”مجھ بچے سے ذرا دیر بعد تمہارے گھر سے لینڈ لائن کے ذریعے کال کی گئی تھی۔ جو ہیزل ہرسٹ کے ناور کے تھرڈ آگے گئی تھی۔ کال کا دورانیہ 16 سیکنڈ تھا۔ میرا دوست سرج ایریا کو سائٹ میل کے احاطے تک محدود کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ فون کرنے والا مارک ہے۔ اگر وہ 30 سیکنڈ بھی بات کر لے تو ہمیں زیادہ قریب پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔“ فیرس نے کہا۔

”تم نے کسی اور کو تو نہیں بتایا؟“ ول نے پوچھا۔ ”نہیں۔ ابھی تک نہیں۔ لیکن میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ایف بی آئی سے رابطہ کر لیں۔“

”نہیں ابھی نہیں۔“ ول نے انکار کیا۔ ”اگر ہمیں ایک اور کال مل جائے تو کیا امکان ہے؟“

”بلاشبہ ہم کافی قریب پہنچ جائیں گے۔“ فیرس نے جواب دیا۔

☆☆☆

جو کی ہدایت کے مطابق کیرین روانگی کے لیے حلیہ درست کر رہی تھی۔

”اسی مل جائے گی؟“

”ہاں، اگر تم نے اپنا رول ٹیک ادا کیا۔“

”جھوٹ بول رہے ہو تم مار دو گے اسے۔ اس کے بجائے تم میری جان لے لو۔“ کیرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں جانتی ہوں، تم کیا کرنے جا رہے ہو۔“

”کیا کروں گا، میں؟“

”تم محض اپنی ایک غلط فہمی کی بنیاد پر دل سے انتقام لینے کا ارادہ رکھتے ہو۔“ کیرین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

جو خاموشی سے کیزین کو گھورتا رہا۔ اس کی آنکھیں ساکت اور سرد تھیں۔ بے پناہ سرد... یہ آگ نہیں تھی، سرد شعلے تھے۔ ان میں آگ سے زیادہ خطرناک ارادے کروٹیں لے رہے تھے۔

”آج کوئی نہیں مارا جائے گا۔“ اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایک چھوٹا سا راز بتا دوں۔“ اس نے آنکھیں کھینچ کر کہا۔ ”یہ میری آخری واردات ہے۔ پھر میں کوٹاریکا جاکر آرام کی زندگی گزاروں گا۔ آج میرا گریڈ ایگزٹ ہے۔“

”کتے، تیرا گریڈ ایگزٹ، عالم بالا میں ہو گا۔“ کیرین نے دل ہی دل میں نفرت سے سوچا۔

☆☆☆

دل اور شیرل ہلکا ہلکا ناشتا کر رہے تھے۔ چند منٹ قبل جو کی چپک ان کا آئی تھی۔ ٹھیک اٹھ بجے۔ کال کے بعد شیرل نے دل کو اطلاع دی کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر میکو لیا فیڈرل بینک کی بلوکی براچ جارہے ہیں۔

فیرس کی جانب سے ابھی تک کوئی رپورٹ نہیں موصول ہوئی تھی۔ تاہم دل نے امید کا دامن تھام رکھا تھا۔ کاؤنٹی سے فیرس ہیزل ہرسٹ تک آگیا تھا۔ وہاں سے سات میل کے دائرے میں۔ آٹھ بجے کے بعد غالب امکان تھا کہ جوئے ہائل کو کال کی ہوگی۔ دل دعا کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

”دل آئی ایم سوری۔“ فیرس کی آواز آئی۔

”کیوں؟“

”کال بہت مختصر ہوتی ہے... ہمیں قلیل وقفہ ملتا ہے۔ انتہائی ناگانی۔“ فیرس نے وضاحت کی۔ ”اگرچہ ہم واضح طور پر قریب ہیں لیکن سرکل اب بھی کافی وسیع ہے۔ مزید یہ کہ کسی کھلے میدان کی طرح نہیں ہے۔ کافی پیچیدہ علاقہ ہے... اس علاقے کو کھگانا کافی دشوار اور وقت طلب ہے۔“

دل نے دانت پیستے ہوئے کھڑکی سے باہر گلف کو گھورا...

”بائی گاڈ۔“ اس نے رکی ہوئی سانس چھوڑی۔

”شیرل!“

”کیا؟“ فیرس نے پوچھا۔

”ایک منٹ، ڈیئر۔“

”کیا مسئلہ ہے؟“ شیرل نمودار ہوئی۔

”ہائل کے پاس گاڑی کون سی ہے؟“

”ہیزل رنگ کی پرانی شیوی۔ رنگ ہیز ہے۔ اس کے ساتھ پیک اپ شلک ہے۔“ شیزی نے نقشہ کھینچا۔

”سنو، فیرس... ہیزل ہرسٹ میں اس بندے کے پاس پرانی شیوی ہے... ہیزل رنگ کا پیک اپ ٹرک۔ اگر ایف بی آئی کیلی کا پٹر استعمال کرے تو بہت جلد گاڑی کو تلاش کر لیں گے۔“

”شاندرا، اب مجھ پر چھوڑ دو۔“ فیرس کی آواز کھل اُٹی۔

”لیکن تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم موجودہ صورت حال کے بارے میں کوئی بات نہیں بتاؤ گے، وہ سیکڑوں سوال کریں... نہ تم میرا نام اور نہ بتاؤ گے... وہ دس منٹ میں میرے گھر پہنچ جائیں گے، پھر میری بیٹی کو کوئی نہیں بچا سکے گا... ایف بی آئی کو ہیز گاڑی اور کین تلاش کرتا ہے اور بس!! 90 منٹ کے اندر، تم انہیں سب کچھ بتانے کے لیے آزاد ہو گے۔ اس سے پہلے کچھ بھی نہیں۔“

دل نے زور دے کر کہا۔

”جینک...“

”ہیزل، میرا کوئی خبر مت دینا... اگر انہوں نے غلط وقت پر کال کر دی، تب بھی اسے ماری جائے گی۔ کچھ گئے۔“

”اگرچہ میرا دل نہیں مان رہا ڈاکٹر لیکن میں ایسا ہی کروں گا۔“

”گڈ اینڈ جھینکس۔“ ان کو بتا دینا کہ چارپڑ میں ہیرا میڈیکل اسٹاف ساتھ رکھیں۔ انسولین کا بندوبست ضروری ہے۔ میری بیٹی بچکانا ڈیپٹیس میں مبتلا ہے۔“

”اوہ گاڈ، میں سمجھ گیا۔“ جلد رابطہ کروں گا۔“ فون بند ہونے کی کلک سنائی دی۔

شیرل ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ ”مجھے غلو محسوس ہو رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”پریشان مت ہو، ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہم... ہم... ہم... ایک بات میں نے ابھی تک تمہیں نہیں بتائی۔“ شیرل نے انکشاف کیا۔

”وہاں؟“ وہ چونک اٹھا۔

”یہ جو کی آخری واردات ہے۔ سارا سال وہ اس بارے میں بات کرتا رہا ہے۔ اس نے کوٹاریکا میں ایک

ریخ خرید رکھا ہے۔ میں اسے بکواس سمجھتی رہی۔ لیکن اب مجھے یہ حقیقت معلوم ہو رہی ہے۔“

اس نئی اطلاع نے دل کے خدشات کی تصدیق کر دی۔ یہ واردات، گزشتہ وارداتوں جیسی نہیں ہے... جو، ابھی، کیرین اور دل کو ختم کر کے غائب ہو جائے گا۔ رقم بھی ساتھ لے جائے گا۔

”تم نے پولیس کو اطلاع دی؟“ شیرل نے سوال کیا۔

”نہیں۔“

”کیا ہم تباہی کی رقم لینے جا سکتے ہیں؟“

”یقیناً۔ اور یہ تمام کی تمام صرف تمہاری ہوگی۔“

”اس کے بعد کیا تم مجھے جانے دو گے؟“ شیرل نے وضاحت مانگی۔

”کیوں نہیں۔ لیکن شیرل، جو جیسے خطرناک اور ناقابل اعتبار شخص کے ساتھ بلف کرنے کے لیے کچھ دیر کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔“

”میں ماری جاؤں گی۔“

”نہیں، میرا وعدہ ہے۔ میں جو کی طرح نہیں ہوں۔“

شیرل نے کانتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ دل اس کا ذہن پر چڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”شیرل، اپنے خیالات کو صاف رکھو۔ میں تمہاری مدد کے لیے ہر حد تک جاؤں گا۔ لیکن ہے تم جو کے لیے اب بھی ہمدردانہ جذبات رکھتی ہو... تاہم جب تم نے اس کا اصل روپ دیکھ لیا تو صرف ہاتھ لٹی رہ جاؤ گی... تم نے اگر اسے خبردار کرنے کی کوشش کی تو اپنے لیے مشکلات کھڑی کر لو گی۔“

”میں کہہ سکتی ہوں کہ تم نے بذریعہ تشدد مجھ سے معلومات لی ہیں۔“ شیرل نے بھیجی ہوئی آواز میں کہا۔

”اسے بے وقوف بنانا اتنا آسان نہیں ہے اگر اسے ذرا بھی شک ہو گیا تو وہ ابھی اور کیرین کو ختم کر کے غائب ہو جائے گا۔ تم یہاں اکیلی رہ جاؤ گی۔ تمہاری جان موت سے چھوٹے گی۔ چاہے وہ پولیس کے ہاتھوں ہو...“

”شٹ آپ، اوکے، جٹ، ہٹ آپ۔“ شیرل کے رخساروں پر آنسو پھسلنے لگے۔

”یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ تمہارے پاس ایک معقول رقم ہوگی اور تم آزادانہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکو گی۔“ دل نے ایک بار پھر اسے ہمت دلائی۔

پگھلتے لمحے ☆☆☆

ڈاکٹر میکڈیل، میکینفا گلاس کے ذریعے شیرل کے فوٹو کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک گلاس کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم فرینک ڈک نے فوٹو کے ساتھ گلاس فراہم کیا تو ڈاکٹر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فوٹو میں شیرل نے سیاہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

”وہی ہے؟“ فرینک نے سوال کیا۔

”سوفیصد۔“ ڈاکٹر نے گلاس ایک طرف رکھ کر بیوی کی جانب دیکھا۔ ”میرا قیاس درست تھا۔ واردات شروع ہو چکی ہے۔“ وہ قدم بہ قدم چلتا ہوا مارگریٹ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہم نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔“

اسی وقت ایک عورت درانہ دار، دھماکا خیز انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔

فرینک نے ناگواری سے اسے گھور کر دیکھا۔

”ایجنٹ ہیری...“

ایجنٹ ہیری کے چہرے پر بھینائی تاثرات تھے۔ اس نے انچارج کی ناگواری کو نظر انداز کر دیا۔

”پریذیڈنٹ آف سیل اسٹار، ہارلے فیرس، لائن پر ہے۔ وہ تمہیں طلب کر رہا ہے۔“

”کیوں؟“

”غوا کی واردات کے سلسلے میں۔“

فرینک کے ساتھ ڈاکٹر میاں بیوی کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔

☆☆☆

گرے ڈیوڈسن، لیکن ڈیوڈسن کا فائونڈنگ پارٹنر تھا۔ یہ ایک خود مختار برادری فرم تھی جو شمالی جیکسن کے معمول کلائن کی رقم کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

کیرین نے آخری بار جو کو قاتل کرنے کی کوشش کی، پھر اس کے انکار پر گرے ڈیوڈسن کو فون ملایا۔

”معاف کرنا، تمہیں انتظار کرنا پڑا۔“ ڈیوڈسن کی آواز آئی۔

”کوئی بات نہیں، دل کی کال آئی ہوگی؟“ کیرین نے سوال کیا۔

”ایک سچی جگہ کے لیے اتنی رقم؟“

”وہ ایک نادر چیز ہے اور دل کی قیمت پر دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔“ کیرین نے کہا۔

ڈیوڈسن نے دے دے انداز میں اپنی حیرت اور ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ تاہم وہ اس سے زیادہ کربھی کیا سکتا

جھانکا۔

”اگر تمہارے شوہر نے وہی کیا، جیسا میں نے اسے سمجھا یا تھا تو پھر تم جلد اسی سے ملو گی۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو جائے گا۔“ چچے ایک اسکاؤڈ کار بھی آچکی ہے۔۔۔ تاہم وہ بار بار دور چلی جاتی ہے۔۔۔ مطلب وہ اس وقت تک قریب نہیں آئیں گے، جب تک ہم اسی تک نہ پہنچ جائیں۔“ جو دانت بیٹنے لگا۔ ”یہ میری آخری واردات تھی اور شروع سے کچھ نہ کچھ۔۔۔ لیکن میں بھی۔۔۔“ وہ چپ ہو گیا، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”ول تم نے یہ کیا کر دیا۔۔۔ میرا دل نہیں مانتا کہ تم نے ایف بی آئی کو لوٹ لیا ہے۔“ کیرن کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اچانک جو نے اسے ڈرائیونگ کے لیے احکامات جاری کرنے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک لینڈ ڈرائیو پر آئی۔ کیرن چونک اٹھی۔ ”یہ روڈ، انرپورٹ کی طرف جاتی ہے۔“

”ہاں۔“ جو مکروہ انداز میں ہنسا۔ چاہے ہم سب مر جائیں، لیکن یہ تیری آخری واردات ہی ہوگی، بلکہ آخری دن۔۔۔ کیرن نے شدید نفرت کے ساتھ سوچا۔

☆☆☆

ول، بینک کے وائس پریذیڈنٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اتنی بڑی رقم کی ڈیلنگ کے لیے اسے اعلیٰ سطح پر ہی ملاقات کرنی تھی۔۔۔ دونوں کے درمیان ملی جلی گفتگو کا آغاز ہوا۔ سوال جواب ول کی توقعات کے برعکس نہیں تھے۔ بات کرتے کرتے جبکہ مور (وائس پریذیڈنٹ) نے اپنے دائیں جانب دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا، ایک دراز قامت، نیلی آنکھوں والا آدمی اندر داخل ہوا۔

”ڈاکٹر جینک، میں اسپیشل ایجنٹ، شالر ہوں۔ مجھے تمام صورت حال کا علم ہے۔ میں یہاں آپ کی مدد کے لیے موجود ہوں۔“

ول ہکا بکا رہ گیا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں کیونکر علم ہوا کہ میں یہاں آؤں گا؟ ہارلے فیرس نہیں جانتا تھا کہ میں ہوں سے نکل کر کہاں جاؤں گا؟“ ”پلیز ڈاکٹر، وقت کم ہے، تمام سوالات کے جواب مل جائیں گے۔ کیا آپ کارڈیوجرن ڈاکٹر جینک میکڈیل سے واقف ہیں؟“ شالر نے بیٹھے ہوئے سوال کیا۔

”یقیناً۔“

شالر نے تیزی سے تمام ضروری باتیں گوش گزار کر دیں۔

ول خاموشی سے یہ حیرت ناک کہانی سن رہا تھا۔ ”ہارلے فیرس سے بات ہوئی؟ میری بیٹی کہاں ہے؟“

”مسٹر فیرس، ہمارے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ سیل اسٹار کا ٹریڈنگ کرپو SWAT ٹیم کے ساتھ ہے۔ بالآخر ہماری قسمت کام کر گئی۔ کچھ دیر پہلے ہمیں اہم ریکھرو ملا۔ جس آدمی کے پاس کال آئی تھی اور وہ سیل فون آف کرنا بھول گیا۔ SWAT ٹیم کے اندازے کے مطابق وہ لوگ مطلوب پولیشن سے دو منٹ کے فاصلے پر ہیں۔“

ول کے چہرے پر رونق چمکی اور معدوم ہو گئی۔ ”پلان کیا ہے؟“ اس نے قدرے غور سے سوال کیا۔

”ٹیم اپنے مخصوص طریقے سے اندر جائے گی اور اسی کو حاصل کرے گی۔ ٹیم کے پاس اسپیشل انٹری ڈیوائس ہیں۔ ہیپٹ سینرز اور وڈیو۔۔۔ اندر کون کہاں پر ہے ہمیں بالکل ٹھیک نظر آجائے گا۔ اس کے علاوہ اسٹن (STUN) گرینیڈ اور ٹینگو۔۔۔ پھر۔۔۔“

”لیگو؟“ ول نے بات کاٹ دی۔ ”یہ دہشت گردوں کے خلاف استعمال ہوتا ہے؟“

”ہاں، ٹیم کی بیشتر تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ دہشت گردوں کی گرفت سے بریغالیوں کو کبے رہا کرنا ہے۔“

”کیا اس آدمی سے بات نہیں ہو سکتی؟“ ”ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ زیادہ ہے۔ وہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔ لیڈر آزاد پھر رہا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اسے فون کر کے حکم دے سکتا ہے کہ تمہاری بیٹی کو ختم کر دے۔“ شالر نے کہا۔

”کیا فیرس، باسل کا سیل فون بند کر سکتا ہے؟“ ”کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ بینک ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے پاس پہلے سے آرڈر ہو کہ گیونیشن منقطع ہونے کی صورت میں اسی کو ختم کر دیا جائے۔“

”اس وقت باسل اور اسی اکیلے ہیں۔ جو اور ڈاکٹر کیرن گھر سے نکل چکے ہیں اور ہمارے زیر نگرانی ہیں۔ اس سے پیشتر کہ صورت حال میں خرابی پیدا ہو، ہمیں موقع سے فائدہ اٹھا کر اسی کو نکال لینا چاہیے۔“ شالر نے عندیہ دیا۔

”میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم اس بینک تک کیسے

پہنچے؟“

”بہت آسان۔“ شالر نے بتایا۔ ”ڈاکٹر میکڈیل کی کہانی کی روشنی میں ہم نے جو پلان بنایا تھا، اس کا ایک جز یہ تھا کہ اس علاقے کے بینکوں میں کہیں بھی بڑی رقم وائر کی جائے تو فوراً ایف بی آئی کو اطلاع پہنچے۔۔۔“

”فرینک ڈک۔ وہ SWAT ٹیم کے ساتھ ہے۔“ ”پلیز، کال کرو۔۔۔ اسے بتاؤ کہ انوائکنڈگان کی ایک ساتھی عورت بینک کے باہر کرائے کی گاڑی میں موجود ہے۔“

شالر نے سر ہلایا۔ ”ہم شیرل کو جانتے ہیں۔ اسے اس وقت تک چھپا رکھیں جائے گا جب تک SWAT ٹیم کیبن کو ہٹ نہیں کر لیتی۔ بینک پر ہم مزید ایجنٹ تعینات کر رہے ہیں۔۔۔ بظاہر وہ شیرل سے لاطعلق رہیں گے۔۔۔ پلیز، مسٹر مور کیا آپ کچھ دیر کے لیے۔۔۔“

”کیوں نہیں۔“ وائس پریذیڈنٹ شالر کا مدعا سمجھ کر کمرے سے نکل گیا۔

شالر نے اس کا فون اٹھا کر نمبر ملا نا شروع کیا۔ ”لیڈر کا نام جو کہتی ہے۔ میری بیٹی کو اس نے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ کیا تمہیں پتا ہے کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟“

”وہ دونوں اس وقت جیکسن انٹرنیشنل انرپورٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم نے پہلی کا پٹر کے ذریعے ان پر نظر رکھی ہے۔“

”وہاں؟“ ول ششایا۔ ”گھبراؤ مت، وہ کہیں نہیں جاسکتے۔“ مل نے تسلی دی اور فون پر بات شروع کر دی۔

☆☆☆

وہ آٹھ آدمی تھے، پروفیشنل، کیوفلانا۔۔۔ سروں پر کتوپ نما ہیلمٹ تھے، وہ بھی سیاہ تھے۔ وہ محض ہیلمٹ ہی نہیں تھے۔ ان کی اپنی افادیت تھی۔ درحقیقت وہ پنڈلی سے سرنگ سلج تھے۔ صرف سب مشین دکھائی دے رہی تھی جو ہاتھوں میں تھی۔ نواں ایجنٹ، مارٹن کوڈی پہلے ہی کیبن کی دیوار تک پہنچ چکا تھا۔

بظاہر انہیں تین تاروں کی عام سی واردات، انوکھے منصوبے کے ساتھ شروع ہو کر متواتر رنگ بدلتی، زنگ زنگ ہوتی ہوئی کلائیکس کی طرف جارہی تھی۔۔۔ ابھی چوبیس گھنٹے مکمل نہیں ہوئے تھے۔ کوئی ہاتھ پائی، دھماکا نہ کوئی لاش۔۔۔ پھر بھی ہر گھنٹہ تھل اور سپنس کا ایک نیارنگ لے کر طلوع

ہو رہا تھا۔ ول جینک فیملی اذیت میں تھی، جو فیملی خطرے سے دو چار نظر آ رہی تھی اور میکڈیل فیملی انتقام کی سولی پر لٹک ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کہانی یہ آسانی اختتام پذیر ہونے والی ہے۔ لیکن اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، یہ راز آنے والے وقت کی گود میں تھا۔

اسپیشل ایجنٹ مارٹن کوڈی انچارج تھا۔ غیر معمولی حساس مائیکروفون اور ہیڈ فون کے ساتھ وہ کیبن کی اندرونی صورت حال کو تازہ رہا تھا۔

”کوئی کلیو؟“ مامک کے اندر لگے مائیکروفون میں اس نے سوال کیا۔

”نہیں کچھ نہیں۔“ سم جیکسن کی سرگوشی، کوڈی کے کان میں گونئی۔ جیکسن کے پاس جھل ایجوگ کیسرا تھا۔ ”ایک ہاٹ واٹر ہیٹر کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔“ کوڈی بد مزہ ہو گیا۔ سبز پک اپ ٹرک موجود تھا لیکن اہداف ندارد تھے۔

”کوڈی ٹوٹرنگ وین۔“ وہ پھر مائیک میں بولا۔ ”سیل اسٹاروین ستر گز پیچھے تھی۔“ ”سیل فون کہاں ہے؟“

”اپنی جگہ پر، جوں کا توں۔“ وین سے جواب آیا۔ ”ہم اندر جا رہے ہیں۔“ کوڈی نے فیصلہ سنایا۔

”دھماکا خیز انٹری کے لیے تیار ہو کر پھیل جاؤ۔۔۔ کھڑکیوں سے اسٹن (Stun) گرینیڈ جھپک کر دروازہ توڑ دو۔ بچی کو بچانا ہے۔۔۔ شوننگ کی ضرورت پڑے تو برسٹ پانچ فٹ سے اوپر ہونا چاہیے۔ چاقو سے لے کر ہینڈ گرینیڈ تک تیار حالت میں۔۔۔ اس مفروضے پر نہ جانا کہ اندر ایک ہی آدمی ملے گا۔۔۔ بلف بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ اوکے۔۔۔ ریڈی۔۔۔ پانچ تک گنتی گنوں گا۔۔۔ مشن ریڈی۔۔۔ پانچ۔۔۔ چار۔۔۔ تین۔۔۔ دو۔۔۔ کو۔“

سب کچھ ہدایت کے مطابق ہوا۔ دن کی روشنی کے باوجود اسٹن گرینیڈ نے وقتی طور پر بینائی چھین لینے والی خیرگی پیدا کر دی تھی۔ کوڈی اپنے آدمیوں کے چچے اندر داخل ہوا تھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ دھواں بھی تیزی سے ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کے راستے باہر نکل گیا۔

”بیڈروم۔“ ”لوگڈ نیو؟“ مخصوص ہیلمٹ میں جواب آیا۔

”کیبن۔“ ”لوگڈ نیوز۔“ ”سیل فون یہاں ہے۔“ ”کوئی چیٹا۔“ ”لیڈ لائن ادھر ہے۔“ دوسری چیٹ ستانی دی۔

ہے۔

شالمر کارخ دوسری طرف تھا، وہ غور سے اپنے پاس کی ہدایات سن رہا تھا۔ دل نے لمحہ بھر سوچا اور خاموشی سے اس سے باہر نکل گیا۔

ہال میں رک کر اس نے تاوان کی رقم وصول کی اور تیز قادی سے باہر کارخ کیا۔

☆☆☆

پانچ میل مشرق میں۔ ڈاؤن ٹاؤن جیکسن میں جو گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا... وہ انرپورٹ کے قریب تھے۔

”کیا کر رہے ہو؟“

”دیکھتی رہو۔“

”ہمیں اسی تک پہنچنا ہے، اس کی شوگر بڑھ رہی ہے۔“

”اپنا منہ بند رکھو۔ سب کچھ میرے کنٹرول میں ہے۔“

کیرین نے سن روف سے باہر دیکھا۔ نیلی کا پٹر موجود تھا بلکہ اب وہ گاڑی کے اوپر تھا۔

جوئے بیریز کے پاس گاڑی روک کے نکلت لیا اور کنکریٹ کی چھت والی وسیع پارکنگ میں داخل ہو گیا۔

پارکنگ، گیراج نمائشی۔ نیلی کا پٹر غائب تھا۔ جو گیراج سے نکلتا تو نظر میں آتا۔ اس نے تیزی سے بے مقصد ایک دوسروں کاٹے پھر گاڑی ایک بڑی بی پر لٹریا چڑھا دی۔ بڑی بی اپنی سفید رنگ کی کسیر کی ٹرک سے ایک بیگ نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی بی نے ہنسنے کو بچایا۔ پیسے

چہ چرائے اور جوئے ایکسپڈیشن، کسیری کے پاس روک دی۔ اس سے پہلے کہ کسیر کی بڑی بی کچھ سمجھ پاتیں، جوئے نے ول کا اعشاریہ اڈیس نکال کر بڑی بی کے سر پر بچایا۔ چوٹ

بڑی بی کو لگی اور پتھ کیرین کی لگی... بڑی بی بے جان پتھر کے مانند زمین پوس ہو گئیں۔

”باہر نکل اور میری مدد کرو۔“ جوئے کیرین کو آڈر دیا۔ نیم بے ہوش بڑی بی کے ہاتھ سے کسیری کی چابی

جھپٹ کر جوئے کیرین کے ساتھ ل کر اسے ٹرک میں محسوس دیا۔

”تم پچھلی نشست پر بیٹھو، جلدی کرو۔“

کیرین سکتے کے عالم میں تھی۔ جوئے نے اس کی جانب دیکھے بغیر کسیری اشارت کر دی۔ کیرین کو ہوش آیا اور وہ

گاڑی میں سوار ہو گئی۔

”نیچے کارپٹ پر لیٹ جاؤ۔“ جوئے کسیری کو وسیع

دیا ہے۔“ شیرل کہاں ہے؟“

”وہ پارکنگ میں ہے۔ فون میں لے آیا تھا کہ تمہاری کال آئے تو تمہیں صورت حال سے آگاہ کر سکوں۔“

دل نے بات سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہونہ۔۔۔ پلان تبدیل ہو گیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہوائی سفر کرنے جا رہا ہوں۔

اگر ایک میل کے دائرے میں کوئی پولیس یا ایف بی آئی ایجنٹ نظر آ تو تم اپنی بیوی سے دوبارہ نہیں مل سکو گے۔ سمجھ میں آیا؟“

”میں تمہاری رقم کہاں پہنچاؤں؟“

”اس کا صلہ ہم بعد میں نکالیں گے۔ تب تک تم اس سنبھال کے رکھو اور اپنے نئے دوستوں کو خبردار کر دو کہ انرپورٹ سے دور رہیں۔“

”میں سمجھا نہیں... میری بیٹی کہاں ہے؟“

جوئے کے ہنسنے کی آواز آئی اور فون بند ہو گیا۔

دل نے فریک زک کو تازہ احوال سے باخبر کر دیا۔

”میں اپنے آدی پیچھے بھاٹتا ہوں۔ انہیں انرپورٹ میں جانے دیا جائے گا۔“

”کیوں؟“

”باہر ہم نے اسے چھاپنے کی کوشش کی تو وہ غائب ہو سکتا ہے۔ امکان یہ ہے کہ باسل اور امی پہلے ہی اندر اس کے منتظر ہوں... انرپورٹ کے اندر وہ عہدہ دو جانے گا۔“

”لیکن تم اسے روکو گے کیسے؟ اگر گن اسٹی کے سر پر رکھی ہوئی نظر آئی تو تم لوگ کیا کر لو گے؟“

”ڈاکٹر، میں وعدہ کرتا ہوں اگر امی اندر ہوئی اور جوئے نے ایسی کوئی حرکت کی تو ہمارے شارپ شوٹرز بے ہوش

کے بغیر جو کچھ بھی ہو پڑی سے نکال دیں گے۔ اب تم فون شالمر کو دے دو، مجھے ضروری انتظامات کرنے ہیں۔“

دل نے فون شالمر کو پکڑا دیا۔ وہ اپنے طور پر تیزی سے حالات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اس کی سوچ کبہ رہی تھی کہ

فریک، شالمر کے ذریعے، دل کو ایف بی آئی کے کنٹرول میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یقیناً وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ کام ایف بی آئی کر سکتی ہے جبکہ جو ایک ایک ایف بی آئی سمیت ہر ایک کو

کنٹرول کر رہا تھا... کیرین والے واقعے نے سب کو شاک پہنچایا تھا۔ فریک کی اہلیت تسلیم شدہ تھی لیکن دل کی چھٹی حس چلا رہی تھی کہ آنے والا وقت اتنا آسان نہیں ہے، جتنا فریک سمجھ رہا ہے... جوئے نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ

SWAT جمی پروٹیکشن ٹیم سے بھی دو قدم آگے چل رہا

پیدل نہیں نکل سکتے۔ دوسری گاڑی کے پیہوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔“

دل معاً ہڑک اٹھا اور شالمر سے فون چھین کر چٹا۔

”تم مشن انچارج ہو؟ یہی تمہاری اپنی کارکردگی؟“

”ڈاکٹر، دس از فریک زک۔ ٹیپر کھونٹے سے تمہاری بیٹی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔“

”تم مجھے نیا پلان بتاؤ۔ جو میری بیٹی کو فائدہ پہنچا سکے۔“

”کیا شیرل نے کسی ایسی منزل کی نشاندہی کی تھی، جس کے لیے ہوائی سفر کی ضرورت پڑتی ہے؟“

”کونسا ریکا۔“ دل نے اعصاب پر قابو پانے کی سعی کی۔

”جیکسن سے کونسا ریکا، کوئی فلاح نہیں جاتی اور جوئے یا جوزف کئی کی کوئی ریزرویشن بھی نہیں ہے۔ وہ جیکسن سے

نکلنا تو کوئی اور نام استیال کرے گا۔ پھر ساؤتھ امریکا کے لیے کنٹیکٹ فلاح پکڑے گا۔“

”مسٹر فریک، اگر جوئے تمہارے آدی کو کیمین میں فون کیا تھا تو وہ جانتا ہے کہ تم ملوث ہو... تم نے میری بیٹی کو

ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے، ڈاکٹر۔ جو کو دو چیزیں درکار ہیں۔ پیسا اور آزادی۔ اسی کو مارنے سے اسے کچھ بھی نہیں ملے

گا۔ اسی کی زندگی اب بھی اس کے نزدیک اہم ہے۔“

”فریک، تم نہیں سمجھ رہے ہو کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ یہ تاوان سے زیادہ انتقام کا کیس ہے... وہ برسوں سے اس

غلط فہمی میں جلا ہے کہ آپریٹنگ ٹیل پر اس کی ماں میری غلطی سے مرئی تھی... وہ مجھے سزا دینے کے لیے اسی کو مار

دے گا، جبکہ کیرین کی زندگی بھی خطرے میں ہے... مزید یہ کہ اسے موقع ملا تو وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔“

”میڈ، ویری بیڈ نیوز۔“

دل کو فون بچنے کی آواز آئی۔ آواز اس کی جیب سے آ رہی تھی۔

”فریک آن، میرے خیال میں جو کی کال ہے۔“ دل نے شالمر کو بھی اشارہ کیا۔

”لینڈ لائن؟“ کوڈی کی اطلاعات کے مطابق وہاں کوئی لینڈ لائن نہیں تھی۔ اسے باہر بھی کوئی تار نظر نہیں آیا

تھا۔ اگر ہے تو پھر زیر زمین بچائی گئی ہوگی۔ وہ چکن میں داخل ہوا اور اپنے آدی سے سیل فون لے لیا۔ اس کے ہاتھ

میں آتے ہی فون بجنے لگا۔ کوڈی نے ہیملٹ ہٹا کر فون کان سے لگایا۔

”میں؟“

”شہزادی تو محل میں ہوگی، مگر جنگل میں ڈھونڈ رہے ہو؟“

”ابنی مراد آواز آئی۔ آواز میں ٹھیک عیاں تھی۔“

”کون بول رہا ہے؟“ کوڈی کے جڑے پہنچ گئے۔

جواب میں قہقہہ سنائی دیا اور فون بند ہو گیا۔ کوڈی نے ہیملٹ واپس سر پر بچایا اور مائیک سیٹ کیا۔ ”ٹریسنگ

وین، تم نے کال کی؟“

”نہیں۔“

”کہاں سے آئی تھی؟“

”نامعلوم، ہم کوشش کر رہے ہیں۔“

کوڈی نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور جیکسن میں فریک زک کا نمبر ملایا۔

☆☆☆

دل بے قراری سے شکر کے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ شالمر دم آواز میں فریک سے فون پر بات کر رہا تھا۔

دفعاً شالمر کی پکارنے والے قدم جکڑ لیے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دل کی چھٹی حس نے تکلیف دہ ہنوکا

لگایا۔ وہ چپ چاپ ایجنٹ شالمر کو گھور رہا تھا۔ ہونٹ بھیچے ہوئے تھے۔ اس نے زبان کے بجائے آنکھوں سے سوال

کیا... جو بہت واضح تھا۔ شالمر کے چہرے کی زردی میں پوشیدہ جواب بھی عیاں تھا۔

”کیرین خالی تھا۔ SWAT ٹیم کو وہاں کچھ نہیں ملا۔“ شالمر نے ہنسی ہوئی آواز میں کہا۔

دل نے توقف کیا اور بولا۔ ”وہ غلط کیمین پر پہنچے ہوں

میں۔“

”نہیں، وہ ٹھیک مقام پر پہنچے تھے۔ انہیں سبز گاڑی

اور سیل فون بھی مل گیا تھا۔ سیل فون پر کسی نے کال کر کے

مشکل بھی اڑایا تھا۔ وہاں زیر زمین لینڈ لائن بھی ملی ہے۔“

دل ناقابل یقین انداز میں نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

”لینڈ لائن کا مطلب، وہ ہماری بے خبری میں خفیہ

ہدایات سیل فون پر نہیں دے رہا تھا۔ فون بچنے کے پاس

لائن کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ غالباً یہ غیر قانونی ٹیپ ہے۔ وہ

کے بیٹے کو تم نے گزشتہ برس اغوا کیا تھا۔“ خاموشی۔

”سرجن کے دماغ میں یہ بات گھس گئی تھی کہ اس سال بھی کوئی فیملی نشانہ بننے والی ہے... بالآخر اس نے کل رات ایف بی آئی کو بتا دیا۔“ خاموشی۔

”اس کے بعد ہی ساری گزشتہ شروع ہوئی۔“ خاموش۔

”جینک میں تمہارے خلاف انہوں نے مجھے کس طرح استہلال کرنے کی کوشش کی اور میں کس طرح وہاں سے نکلا... یہ کہانی شیرل سے سن لو۔“

گہری خاموشی... اچانک جو نے سرجن میکڈیل کی فیملی کی سرجری زبان سے شروع کر دی... نوکیا، ول نے شیرل کو پکڑا دیا۔

شیرل نے اس کی بغیر نقطہ والی زبانی سرجری کو لگام دے کر ول کی باتوں کی تصدیق کی۔ کچھ دیر بات ہوئی اور نوکیا ایک بار پھر ول کے ہاتھ میں تھا۔

”تم شیرل کو واپس بیوروچ لے جاؤ۔ فون اس کو واپس کر دو۔ تم بھی اس کے حوالے کر دو۔ بعد ازاں اپنے سوٹ میں میری کال کا انتظار کرو۔ اگلے چند گھنٹوں میں کال بار بار آئے گی اور تم جواب دو گے۔ کیونکہ میرے کال کرنے پر تم نے جواب نہیں دیا تو اس پر ختم سمجھو۔“

”سنو جو... میں جانتا ہوں کہ یہاں تمہیں صرف رقم سے مطلب نہیں ہے، اوکے؟ تم مجھے اور میری فیملی کو سزا دینا چاہتے ہو۔ میں نے رقم لنگوالی ہے اور یہ تمہاری ہے۔ لیکن ٹریڈنگ کے وقت مجھے سامنے ہونا چاہیے۔ جب میں میرین اور اس کی کو کچھ لوں گا تو چلا جاؤں گا۔ بیٹے تمہیں دے دوں گا۔ اس کے بعد جو تمہارا دل کہے کر دو۔ تم مجھے مار بھی سکتے ہو۔ لیکن ان دونوں کو جینے دو۔ مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔“

”قریبانی، عظیم قربانی... ابھی تک ہیر وینے کی کوشش کر رہے ہو... بھول جاؤ۔ یہ میرا طریقہ ہے، مانی دے، یا ہانی دے... بچے تمہارے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔“ جو نے فون آف کر دیا۔

ول کی گردن کی رگیں پھول گئیں، اس نے دونوں مٹھیاں اسٹریٹنگ واصل پر ماریں۔

”کیا غلط ہو گیا؟“ شیرل چلائی۔

”وہ شیطان صفت ہے۔“ ول نے بتایا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

دباے اور انسولین شات لگائی ڈالا۔

باسل کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ”بیلا، تم بہت باور ہو۔“ اسی حیران تھی ویونما باسل نے گاڑی کو کھلونے کے مانند اٹھایا تھا اور اسی کو بھارتیہ قرار دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ستر پھر شروع ہو گیا۔

”کیا ہوا؟ تم دور رہے ہو؟“ اسی نے باسل کو دیکھا۔

”نہیں۔“ باسل نے آستین سے آنکھیں صاف کیں۔

”تم گڈ میٹ ہو، جھوٹ مت بولو... بیلا سے جھوٹ بول رہے ہو۔“

باسل نے اسی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا پچھلا موٹا ہونٹ مل رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اسی نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

”تمہاری ماما تمہیں لے جا سکیں گی۔ میں تمہیں بھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔“ اسی نے اس کے بازو پر ہاتھ پھیرا۔

”ایسا ہی ہوگا... ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔“

اسی کے دل میں اداسی سراپت کرنے لگی۔ اس نے بیلا کو اٹھا کر باسل کے پاس رکھ دی۔ تاہم باسل نے گڑیا کو ہاتھ نہیں لگایا۔

☆ ☆ ☆

”پکڑو اسے۔“ ول چیخا۔ ”اسے جواب دو۔“

شیرل نے ترقیے ہو کر فون لے لیا۔

”ہیلو؟ یاہ، میں سمجھ گئی... وہ نہیں ہے... نہیں، نہیں میں نے نہیں دیکھا... ہم انٹراسٹیٹ دس پر ہیں۔ انٹر اسٹیٹ 55، راسٹ... تاتھ، اوکے... وہ گڈ... وکے۔ ایک سیکنڈ۔“ شیرل نے نوکیا دل کے حوالے کیا۔

”جو؟“

”تم نے ہیر وینے کی کوشش کیوں کی؟“

”جو، میں نے وہی کیا جیسے تم کہتے رہے، کیونکہ مجھے اپنی بیٹی عزیز ہے۔“

”جھوٹ۔ تم نے ایف بی آئی کو اطلاع دی۔“

”یہ غلط ہے، وہ جینک میں موجود تھے۔ میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان کو کال نہیں کی۔ یہ تمہاری غلطی تھی۔“

”میری غلطی؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟“

”ہارٹ سرجن جنس میکڈیل نے کال کی تھی۔ جن

بھی بلاکس پر سے اتار دیا۔

اسی حیرت اور خاموشی سے سب کارروائی دیکھ رہی تھی۔ باسل نے اسے ہنجر سیٹ پر بٹھایا۔ انسولین کا مخصوص باکس اور بیلا (باربی ڈول) کو وہ نہیں بھولا تھا۔ سفید کار درختوں میں سفر شروع کر چکی تھی۔

”روکو، روکو، گڈ میٹ۔“ اسی معاکراہ اٹھی تھی۔

باسل سمجھ گیا تھا۔ اس نے گاڑی روکے ہی ہاتھ بڑھا کر دروازہ بھی کھول دیا۔ اسی جلدی سے اتر کر درختوں کے پیچھے چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آتی دکھائی دی۔

باسل کے پیچھے سے پر توشیش تھی۔ اسی کی چال میں لڑکھٹاہٹ تھی۔ باسل نے ہاتھ لہرایا۔ اسی نے بھی ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی، تاہم وہ منہ کے مل کر پڑی۔

اسی کو احساس ہوا کہ اس کی شوگر خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ سر دکھ رہا تھا اور شدید ٹھنک کا احساس حاوی تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو دیکھا کہ باسل گھٹنوں کے مل اس کے قریب بیٹھا تھا۔ اس نے اسی کو سیدھا حالاکر منہ پر سے گند کی صاف کر دی تھی۔

”بیٹ، میری شوگر ہائی ہے... مجھے انسولین کا شات چاہیے۔“

”میں ابھی آیا، بیلا گھبراؤ مت۔“ وہ اٹھ کر بھاگا۔

بیم شیم باسل بھاگتا ہوا عجیب بے ڈول سالک رہا تھا۔ وہ انسولین باکس لے کر واپس آیا تو سزید پریشان لگ رہا تھا۔

شات کون لگائے گا؟

”تمہیں انسولین شات لگانا آتا ہے؟“ اس نے اسی سے پوچھا۔

”میں نے نمی، ڈیڈی کو یہ کام کرتے دیکھا ہے، خود میں نے بھی نہیں کیا۔ تم سرچ میں دو آئی پھینچو اور سوئی یہاں رکھ کر پلنگر (Plunger) کو دباؤ۔ تم کرو گے؟“

باسل کے تاثرات میں بھولکا ہٹ گئی۔ ”مم... مجھے سوئیوں سے ڈر لگتا ہے۔“

”لیکن میری حالت خراب ہو رہی ہے... شات لگانا پڑے گا۔“

باسل نے بے بسی اور شرمندگی سے اسی کو دیکھا۔

”اجتہاد یہ باکس کھولو۔“

باسل نے پیش بن کے ڈریپے باکس کھول دیا۔ اسی نے ہاتھ ڈال کر انسولین کی شیشی اور ایک سرخ نکالی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سرخ میں دو آئی بھرنے میں کامیاب ہو گئی۔... ان پر سے لباس ہٹا کر اس نے ہونٹ

”لیکن تم اس کیلے کیا کرو گے؟ جبکہ جو بروک ہیون سے ہمارے مقابلے میں بہت قریب پہنچ چکا ہوگا۔“

”ضروری نہیں ہے۔“ ول نے اشارے سے کاٹنی نینٹل 727 کی جانب اشارہ کیا جو انٹراسٹیٹ 10 کے قریب تھا اور نزدیکی آپڑ پورٹ پر لینڈ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

”اوہ گاڈ... تمہارا اپنا انٹرکرافٹ...؟“ شیرل کا منہ کھل گیا۔

”ہاں میں کار پر نہیں اپنے انٹرکرافٹ پر سفر کروں گا۔“

”لیکن وہاں تم کہاں پر لینڈ کرو گے؟“ شیرل نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ایک گھنٹا چاہیے مجھے، صرف ایک گھنٹا، مجھے جو کے ساتھ ہلف گھنٹا پڑے گا کہ تم میرے ہمراہ نہیں ہو؟“

اچانک فون کی گھنٹی نے دونوں کو خاموش کر دیا۔

ول نے ”نوکیا“ شیرل کی جانب بڑھایا۔

شیرل نے فون لینے سے انکار کر دیا۔

☆ ☆ ☆

اسی نے کئی حیرت انگیز مناظر دیکھے۔ باسل انسولین کا مخصوص باکس اور بیلا (باربی ڈول) کے ساتھ اسی کو لے کر کین چھوڑ چکا تھا۔ وہ بڑوک کے پاس آیا۔ لیکن اس میں بیٹھنے کے بجائے، ہڈا اٹھا کر بیٹری کھولنی شروع کر دی۔

بیٹری لے کر وہ سفید کار کے پاس آیا جو ٹنگریٹ کے بلاکس پر کھڑی تھی۔ بیٹری اس نے سفید کار میں فٹ کی اور گاڑی کے پیچھے مٹس گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی نے کھانسا شروع کیا، چند پتھیاں لیں، کچھ دھواں چھوڑا اور اسٹارٹ ہو گئی۔

باسل گاری کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ اسی کو لے کر واپس کین میں چلا گیا۔ پٹن میں اس نے سیل فون نکالا اور آن کر کے گاڈنر پر رکھ دیا۔ اسی کو گوڈ میں اٹھا کر وہ پھر باہر آ گیا تھا۔

سفید کار نے دھواں اٹھاتا بند کر دیا تھا۔ انجن روانی سے گھوم رہا تھا۔ باسل بلاکس پر کھڑی گاڑی کی پچھلی جانب چلا گیا۔ دونوں ہاتھ اس نے پیپر کے نیچے ڈالے اور یہ آسانی، کھلونے کے مانند گاڑی کا عقبی حصہ نیچے اتار دیا۔ پھر وہ گھوم کر آگے آیا۔ چابیاں نکال کر اس نے دروازہ کھولا، شیشہ نیچے کیا اور انجن بند کر دیا... ہونٹ کی جانب آ کر اس نے دونوں ہاتھ نیچے ڈالے اور گاڑی کا اگلا حصہ

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ ہمیشہ دو تین قدم آگے رہتا ہے۔“ شیرل نے ہنسی بھری آواز میں کہا۔
”دیکھو گا وہ کتنا بڑا شیطان ہے۔ ہم نہیں تو وہ بھی نہیں۔“ ول نے نشست سے ٹپک لگائی۔ اس کے ہاتھوں اور سر میں دھن ہو رہی تھی۔ چند گھنٹے کے لیے اپنے کسی بھی دوست کو سوئٹ میں بٹھا دوں گا۔ وہ اس کی کالز کا جواب دیتا رہے گا۔“

”صاف مت کرو، وہ ایک منٹ میں پہچان لے گا۔ کوئی بھی ایسا سوال کرے گا، جس کا صرف نہیں پتا ہوگا تمہارا دوست جواب نہیں دے پائے گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا۔ تم سمجھتے ہو۔“

ایک اور جہاز گرج وار آواز کے ساتھ سر پر سے گزرا۔ یہ جیٹ F-18 ہارنٹ تھا۔ کارلرز اٹھی۔ ول کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اس نے والٹ نکال کر ایک کارڈ برآمد کیا، شیرل کا فون لیا اور پوریج کیسٹنوریٹ کا نمبر ملا۔

آپریشی آواز سن کر اس نے ابرجیسی کا لفظ استعمال کیا اور گیورٹو سے بات کی خواہش ظاہر کی۔
”وس از گیورٹو، کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”میں ڈاکٹر ول جینک ہو۔ کل ہم ملے تھے جب میں چیک ان کر رہا تھا۔“

”ہاں، ڈاکٹر، مجھے یاد ہے۔“

”آج صبح ایف بی آئی وہاں تھی، رائٹ؟“

”ٹھیک بات ہے۔“ گیورٹو نے ہچکچاہے ہوئے کہا۔

”کیا وہ اب بھی ہوکل میں ہیں؟“

”چند منٹ پیشتر آخری اہلکار کل چکا ہے۔“ منجبر نے بتایا۔

”سنو، مجھے نہیں پتا کہ ایف بی آئی نے تمہیں کیا بتایا ہے۔ میں ہوکل میں نہیں ہوں۔ میری بیٹی اور بیوی اغوا کنندگان کے قبضے میں ہیں۔ مجھے ہر قیمت پر انہیں چھڑانا ہے۔ تمہاری تھوڑی سی مدد درکار ہے۔“

”ڈاکٹر، میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ ایف بی آئی کا کیس لگتا ہے۔“

”ایف بی آئی پہلے ہی میری تہ ناکام ہو چکی ہے۔۔۔“

”میں یہ کہتا ہوں کہ میرے سوئٹ میں جو کال آئے وہ اس نمبر پر فراسفر کر دی جائے، جو نمبر میں اس وقت استعمال کر رہا ہوں۔ کئی گھنٹے تک بار بار کال آئی۔“ ول نے نمبر بتایا۔

ول نے اس انتقام کے لیے ایف بی آئی کو کاؤنٹ کیا تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ ایف بی آئی کو آخری وقت تک الگ رکھنا ہی بہتر ہے۔
”گیورٹو، میں جواب کا منتظر ہوں۔“ ول نے کہا۔
”سنوڈاکٹر۔۔۔“

”پلیز صرف اتنا بتا دو کہ ٹیکسٹ کیا ہے؟“

”ڈاکٹر، یہ ممکن تو ہے، لیکن ہوکل کی پالیسی۔۔۔“

”منجبر، تم اپنی ذاتی پالیسی بتاؤ۔“ ول نے شیرل والی ترکیب آزمائے کا فیصلہ کیا۔

”کئی زندگیوں کا داؤ پر لگی ہیں اور میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔۔۔ پھر تعاون کے بدلے میں ذاتی طور پر تمہیں دس ہزار ڈالر ادا کروں گا۔“

”دس ہزار۔۔۔؟“ منجبر کا لہجہ بدل گیا۔

”پندرہ ہزار کرلو، چند گھنٹے کے پندرہ ہزار۔ لیکن کال کرنے والے کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ درحقیقت ہو کیا رہا ہے۔۔۔ اسے پندرہ ہزار کہہ دو۔“

”ڈاکٹر، معافی چاہتا ہوں۔ ضمانت کیا ہے اور رقم کیسے ملے گی؟“ منجبر کی کاروباری رگ پھڑکنے لگی۔

”معتول بات ہے۔ ڈاکٹر جینکس ایورٹ کے کمرے میں ملاؤ۔“ ول نے ہدایت دی۔ ”میرا نام لیٹا۔“

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر جینکس لائن پر تھا۔

”ول، اس وقت کیا اقدار پڑی؟ تم ہو کہاں؟“

ڈاکٹر جینکس ایورٹ کی آواز آئی۔

”غور سے سنو، وقت بہت کم ہے۔۔۔ یہ میری زندگی موت کا معاملہ ہے۔۔۔ تمہاری سببی اغوا ہو چکی ہے۔۔۔ کہانی بعد میں سناؤں گا۔ فی الحال یہ احسان کرو کہ شیجر کو دو ہزار ڈالر دے دو۔۔۔ آج کی تاریخ میں زندہ یا مردہ آجاؤں گا۔ زندہ نہ آیا تو تیرہ ہزار مزید شیجر کو دے دینا۔ پلیز کوئی سوال نہ کرنا۔ میں مصیبت میں ہوں اور وقت بالکل نہیں ہے۔“

”کام ہو جائے گا۔ اتنا کہہ دے کہ تو زندہ آئے گا اور کامیاب آئے گا۔۔۔ گڈ لک۔“ ڈاکٹر جینکس نے فون بند کر دیا۔

”میں سن لیا ہے، ڈاکٹر ول۔“ منجبر کی آواز آئی۔

”رازداری کا خیال رکھنا، جینکس۔“

”بے فکر ہو جاؤ۔“

ول نے فون بند کر کے ایئرپورٹ کا رخ کیا۔

☆☆☆

پگھلتے لمحے

کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک آف کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ بھی وہ اس ایئرپورٹ سے اڑنے کی اجازت حاصل نہ کر پائے گا بلکہ آئندہ وہ کسی بھی ایئرپورٹ سے نہیں اڑ پائے گا۔ یہ اس کا آخری مگر بہترین ٹیک آف ہوگا۔

ول نے بیرن 58 کے برٹیس پر سے توجہ ہٹائی۔

بیرن 58 آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار کو خاص حد میں رکھنے کے لیے، ول نے تمام مہارت اور تجربہ جموٹک دیا۔

ریڈیو پر کیا واویلا ہو رہا تھا، اسے کچھ سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں F-18 گرجتے ہوئے بیرن 58 پر چڑھے آ رہے تھے۔۔۔ شیرل نے کچھ ماری اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

ول کی تمام حیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کئی دنوں F-18 کے درمیان سے گزرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ دونوں بیرن 58 سے پہلے ہوا میں چلے جائیں۔ بصورت دیگر ایک قیامت خیز تصادم ہیسی تھا۔

ہارنٹ والے بھی اندھے نہیں تھے۔ انہوں نے رفتار مزید بڑھا دی، وہ رن وے پر جانے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ شیرل متواتر چیخ رہی تھی۔

سینکڑوں کے فرق سے ہارنٹ ہوا میں چلے گئے۔

بیرن 58 ہاپتا کا پتہ درمیان سے گزرا۔ ول نے رفتار بڑھائی اور ٹیک آف کر گیا۔

”تم پاگل ہو ڈاکٹر۔“ شیرل نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔

”اور جو؟“

”وہ جنونی ہے۔“

”کیا فرق ہوا؟“

”پتا نہیں۔“

فضائیں آنے کے بعد گزشتہ چوبیس گھنٹے کی تھکاوٹ جیسے تحلیل ہو گئی۔ ایک اہم اور خطرناک مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ ول نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔

کنٹرول ٹاور کا واویلا معدوم تھا۔ تاہم ول فضائیں ابھی ہزار فٹ ہی اٹھا تھا کہ ایک نئی کرحٹ آواز سنا دی۔

”بیرن 58، جوائنٹ، میں بیلی کا پٹر میں تمہاری اسٹار بورڈ سائڈ پر ہوں۔ میرا نام جان اسمتھ ہے۔ اسٹیشن ایجنٹ آف ایف بی آئی تم متواتر قانون شکنی کے مرتکب ہوئے آ رہے ہو۔ فوراً ایئرپورٹ کی طرف واپس چلو۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”کیا وہ ہمیں مجبور کر سکتا ہے؟“ شیرل نے استفسار کیا۔

”بیرن 58“ وہیں کھڑا تھا جہاں کل ول نے چھوڑا تھا۔ اپنی ایشن کی ریکی کارروائی اور گلف ٹاور سے رابطے کے بعد تھوڑی دیر میں ”بیرن 58“ فضا میں بلند ہونے والا تھا۔ شیرل ہمراہ تھی۔ تاہم چند قیمتی منٹ ضائع ہو گئے۔

وہاں خاصا ٹریفک تھا۔ F-18، C-130، F-18 ہارنٹ۔۔۔ انٹیکٹل گاڑو کا فلائٹ آپریشن جاری تھا۔

ول ذہن میں حساب کتاب کر رہا تھا۔ ساتھ شیرل سے بھی مشورہ کر رہا تھا۔ جو گاڑی بدل کر جینکس ایورٹ کی پارک سے نکلا تھا تو اس نے یقیناً انٹرنیشنل 55 پر جنوب کی سمت سفر شروع کیا ہوگا۔۔۔ وہ ہیزل ہرسٹ جاتا ہے یا بروک ہون، کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دونوں ٹاؤن ایک ہی لائن پر تھے۔ جس وقت وہ جینکس ایئرپورٹ سے نکلا ہے، تخمینے کے مطابق اسے 35 منٹ میں منزل پر ہونا چاہیے۔ ول بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ تاہم بیرن 58 کے ذریعے اب بھی وہ جو سے پہلے پہنچ سکتا تھا۔

ابھی اس نے بیرن 58 کے انجن اسٹارٹ ہی کیے تھے کہ ایئرپورٹ سکیورٹی ویمپل کا تیز سیٹی جیسا سائرن سنا دی دیا۔ گاڑی، بیرن کے پیچھے آ رہی تھی۔ گاڑی کی چھت پر سرخ جی جھلکارا رہی تھی۔

”لخت ہے۔“ ول نے حتمی فیصلہ کر لیا۔

جزل اپوی ایشن کے رن وے کے متوازی کیسی کرنا شروع کیا۔ سکیورٹی ویمپل تعاقب میں تھا لیکن انٹرکرافٹ کی بڑھتی ہوئی رفتار کو چھوٹا سی گاڑی کے بس کی بات نہیں تھی۔

معار یڈیو سے گلف ٹاور کی وارننگ جاری ہوئی جو بیرن 58 کو واپس لانے کے لیے تھی۔ وارننگ نظر انداز کر کے ول رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ کیسی دے سے ہی فضا میں بلند ہو جائے۔ اسے اپنی امید خاک میں ملتی نظر آئی جب سامنے ویو پیکل C-130 ہر کوئیں ٹرانسپورٹر نظر آیا۔۔۔ ایک امکان بچا تھا کہ وہ C-130 کے بازو کے نیچے سے ہو کر دوسرے کیسی دے پر چلا جائے۔۔۔ ریڈیو پر ٹاور سے برابر وارننگ نشر ہو رہی تھی۔ ول کمال مہارت اور جرأت کے ساتھ C-130 سے بچ کر دوسرے کیسی دے پر نکل آیا۔ وہاں آٹھ سو فٹ کے فاصلے پر دو F-18 ہارنٹ، ٹیک آف کرنے جا رہے تھے۔ ول کو ٹیک آف کے لیے وقت کی تفریق کا خیال رکھنا تھا۔ وہ چڑھتا تھا۔

ہارنٹ کی رفتار، بیرن 58 کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ رفتار کے فرق کی وجہ سے ول کو یقین تھا کہ دونوں ہارنٹ، بیرن 58 سے پہلے ہوا میں ہوں گے اور وہ خود ان دونوں

کر کے دل کو اشارہ کیا۔
”ہاں، کوئی مسئلہ نہیں ہے... وہ... وہ ہمارا ہوا
جواری لگ رہا تھا... ہاں مجھے یاد ہے... باسل کہاں
ہے... اوکے... اب مجھے کہاں جانا ہے؟... اوکے...
اوکے...“

”شیرل فور کر وہ باسل کس گاڑی پر سفر کر رہا ہے۔“
دل نے انہیں دوبارہ اشارت کر کے بیرن 58 کو اپراٹھانا
شروع کیا۔ ”کیا کب رہا تھا؟“

”اس نے مجھے ”پاکو“ پہنچنے کی ہدایت کی ہے۔
”.....“ پاکو کی جگہ کلب میں ہے... کلب کا نام
پیراڈائز ایلے ہے۔ میں وہیں ”کام“ کرتی تھی۔ کلب
پیش برک کے قریب ہے۔ میں وہاں قرض کرتی تھی۔
وہاں لڑکیوں کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جو نے
کلب کا نام لیا ہے... ”پاکو“ وہاں کام کرتا ہے۔“ دل نے
نقشہ کال کر پیش برک کی لوکیشن کا جائزہ لیا۔

”سن آف بی۔“
”کیا؟“ دل نے گردن گھمائی۔

”دی ریبلر۔ جو کی ماں کے پاس ایک AMC
ریبلر تھی۔ پرانی سلور رنگ کی۔ کلب کا نام آیا تو مجھے خیال
آیا۔ ایک رات ہم ریبلر میں پیراڈائز ایلے پہنچے...
واپسی پر ریبلر کی صورت اشارت نہ ہو سکی۔ نہ ہی بعد میں
جو اسے ڈرائیو کرنے میں کامیاب ہوا۔ دو سال وہ کھڑی
رہی پھر اچانک غائب ہو گئی۔ ممکن ہے کہ کہیں پر ریبلر ہی
موجود ہو...“

دل اپنی بیجانی کیفیت کو چھانہ سکا۔ ایسا ہی ہے تو
باسل اور ایسی ریبلر میں جو سفر ہوں گے۔ لیکن وہ کہاں ہوں
گے؟

”ایف بی آئی کو باسل کا سبیل فون کیبن میں ملا تھا۔“
دل نے با آواز بلند کہا۔ ”اگر باسل روڈ پر ہے تو جو اس سے
رابطہ نہیں کر سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ باسل کے پاس دوسرا
سبیل فون ہوگا۔“

”ہاں، اس کے پاس وہی فون تھا۔“ شیرل نے
تصدیق کی۔

”باسل کو پیراڈائز ایلے کے بارے میں پتا ہے؟ وہ
کیا ہے وہاں کبھی؟“

شیرل ہنس پڑی۔ ”مذاق کر رہے ہو، وہاں اگر وہ کسی
بے لباس لڑکی کو دیکھ لیتا تو سوسائٹ بن جاتا۔ ایک مرتبہ جو اسے
میراڈائز دکھانے وہاں لایا تھا، تو وہ اسے پڑھ گیا تھا اور

ساؤنڈ سٹائی دی۔ ”جو؟“

”ڈاکٹر، سو گئے تھے کیا؟“

”ان حالات میں کون سوسکتا ہے۔“ دل نے آواز
نارمل رکھی۔

”وہاں اوپر کیا کر رہے ہو؟“

دل کا دل زور سے دھڑکا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جو کا
اشارہ بلند والا ہوٹل کے اونچے سوئٹ نمبر 28021 کی
جانب تھا۔

”اسی کہاں ہے؟“ دل نے سوال کیا۔ وہ بیرن 58
کی گرتی ہوئی بلندی سے غافل نہیں تھا۔ جو 1000 فٹ فی
منٹ کے حساب سے نیچے جا رہا تھا۔ ”میں اسی سے بات
کرنا چاہتا ہوں۔“

”بات کرنے کا موسم ابھی نہیں آیا۔ دوبارہ فون
کروں گا۔“ دل نے فون، شیرل کی گود میں پھینکا اور تیزی
سے پینل بورڈ کو ریڈ جسٹ کر کے انہیں اشارت کیے۔

شیرل کا چہرہ ہڈی کے مانند سفید ہو رہا تھا۔
بیرن 58 نے پھر سے بلندی پہنچی شروع کر دی۔

”شیرل، باسل سبیشوی ٹرک چھوڑ کر ایسی کے ساتھ
پیدل نہیں نکل سکتا۔ وہ جس پلان بی کی بات کرتے رہے،
اس کے لیے دوسری گاڑی کی موجودگی وہاں لازمی تھی۔
سوچو باسل کون سی گاڑی استعمال کر رہا ہے... ڈرومٹ
بیرن 58 کیش نہیں ہوگا۔ ہم اب 7000 فٹ کی بلندی پر
ہیں۔ بہت نیچے بھی جانا پڑا تو میں سات منٹ انہیں کے بغیر
گلائڈ کر سکتا ہوں۔“

”باسل کی گاڑی کے سلسلے میں تم ایف بی آئی سے مدد
لے سکتے ہو۔“ شیرل نے شور دیا۔

”نہیں ابھی نہیں۔ دیے SWAT کی ٹیم وہاں
دوسری گاڑی کے پیہوں کے نشانات ملے تھے۔“ دفعتاً فون
کی گھنٹی بجی۔

”کون جواب دے گا؟“ شیرل نے پریشانی سے
پوچھا۔

”وہ مجھ سے بات کر چکا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس
نے ڈائریکٹ کال کی ہے۔“ دل نے پینل کی سیٹنگ میں
ضروری تبدیلیاں کیں اور انہیں بند کر دیے۔

بیرن 58 نے ایک بار پھر زمین کی جانب رخ کیا اور
شیرل نے فون پر بات شروع کی۔

”جو...؟“
”ہاں، تم میرے پاس ہے۔“ شیرل نے انگوٹھا بلند

دل نے جھلا کر پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ”ہاں تو ٹھیک
ہے نا... میں ٹریفک کا بہانہ کیوں بناؤں گا۔ کال ٹرانسفر ہو
کے آئے گی... میں وصول کروں گا... وہ یہی سمجھے گا کہ میں
سوئٹ میں ہوں۔ کیوں ٹھیک نہ کر رہی ہوں؟“

بیرن 58 بادلوں میں گھس گیا۔ اب دور رہ جانا والا
نیلی کا پترا سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس بات کا امکان کم تھا
کہ اس کے پاس ریڈار بھی ہوگا۔

”ایف بی آئی نے کہیں پر ریڈ کیا تو باسل کا سبزشرک
وہاں تھا۔ کیا وہاں کوئی دوسری گاڑی بھی تھی؟“ دل نے
پرسوج انداز میں پوچھا۔

”میں نے بتایا تھا کہ میں وہاں کبھی نہیں گئی؟“
”لیکن تم ہی جی نے باتوں کے دوران میں تو کچھ سنا ہو
گا؟“

شیرل نے انکار میں سر ہلایا۔
☆☆☆

بیورق کے سوچ بورڈ سینٹر پر موجود نو جوان آپریٹر
”اسٹیشننگ“ کے ناول میں کھویا ہوا تھا۔ ہوٹل کی مرکزی
لائن منگنی تو اس نے حسب معمول رٹارٹایا فقرہ نہرایا...
کال کرنے والا سوئٹ نمبر 28021 مانگ رہا تھا۔ آپریٹر
نے مخصوص بین شیج کیا اور فارورڈنگ نمبر ڈائل ہونے لگا۔
ڈیجیٹل لکشن اپنا کام کر رہا تھا... نیچر کی ہدایت کے مطابق
آپریٹر اپنا کام کر کے پھر ناول میں کم ہو گیا۔ فون کی گھنٹی،
ہوٹل کے سوئٹ کے بجائے بیرن 58 میں شیرل کے سبیل پر
بج رہی تھی۔

☆☆☆
گھنٹی کی آواز سن کر دل اچھل پڑا۔ اس نے گھڑی
دیکھی اور بولا۔ ”میں جواب دوں گا۔ فون میرے کان سے
لگا کر مٹن دیا۔“ شیرل نے ایسا ہی کیا۔ دفعتاً دل نے
اسے بین دبانے سے روک دیا۔ گھنٹی بج رہی... دل کو
اچانک احساس ہوا تھا کہ جو فون پر بیرن 58 کی گھن گرج
بے آسانی سن لے گا۔

”کیا ہوا؟“ شیرل نے پریشانی سے پوچھا۔ دل نے
پھرتی سے پینل بورڈ کو ریڈ جسٹ کیا اور انہیں بند کر دیے۔
پراسرار خاموشی... بیرن 58 نے زمین کی طرف گرنا
شروع کیا۔

”شٹ۔“ شیرل چیخی۔ دل نے ہونٹوں پر انگلی
رکھی۔ اور اسے فون آن کرنے کا اشارہ کیا۔ ہپ کی آواز
سٹائی دی اور اوپن لکشن کی مخصوص سنک (Hissing)

”تم بھول رہے ہو کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے
آئے گی۔ اگر تم ابھی راستے میں ہی ہو تو سوئٹ میں ہونے کا
جھانسا کیسے دے سکتے ہو اور اگر فون وصول نہیں کرو گے تو
کہانی ختم ہوجو۔“

”ناممکن۔ ہم 220 ٹاٹ کی رفتار تک جا سکتے ہیں۔
بادل آنے والے ہیں۔ اسے بھول جاؤ۔“ دل نے جواب
دیا۔ وہ بیرن 58 کو بادلوں کی سمت اوپر ہی اوپر لے جا رہا
تھا...
”ڈاکٹر جینگ۔“ ریڈیو پھر بڑبڑایا۔ ”دوز از
ٹریفک۔“ فریک زک... ہمیں سائنڈ لائن کر کے تم نے
اپنی بیٹی اور بیوی کے لیے خطرات میں اضافہ کر دیا ہے۔
”میں ہماری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ بصورت دیگر ایک
ایلی جیم لے سکتا ہے۔“

دل نے ٹائیک سنہالا۔ ”میں رسک لے چکا ہوں
اور ذہنی طور پر نہ صرف تیار ہوں بلکہ پرامید بھی۔ آفسیر میں
تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ تم میری مدد کرنا چاہتے
ہو تو چند ایجنٹ سادہ لباس میں بروک ہوں پچھا دو۔ میں جلد
رابطہ کروں گا۔“ دل نے ریڈیو آف کرنے کے بعد
ٹرانسپورڈر بھی بند کر دیا۔ ایئر ٹریفک کنٹرولر دو عام طور پر
طیارے کی پوزیشن براڈ کاسٹ کرنے کا کام ٹرانسپورڈر تائی
آکر ہی کرتا ہے۔

”نیلی کا پترا تو تمہیں چھو نہیں سکتا۔ لیکن تم نے اس سے
بڑا ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔“ معاشرل نے خبردار کیا۔

”وہاں؟“
”ہوٹل سے جو کی کال یہاں فارورڈ ہوگی، میرے
فون پر... وہ سمجھے گا تم ہوٹل سے جواب دے رہے ہو۔“

”ہاں تو پھر...“
”لیکن اگر اس نے براہ راست مجھے میرے نمبر پر
فون کر دیا تو کون فون وصول کرے گا۔ کیسے پتا چلے گا کہ کال
ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے آئی ہے یا وہ ڈائریکٹ مجھے فون
کر رہا ہے۔“

دل کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ شیرل کی بات سمجھ گیا تھا۔
اگر وہ فون اٹھانے میں غلطی کرتے تو سارا منصوبہ ہی درہم
برہم ہو جاتا... دل کچھ سوچ کر بولا۔ ”اگر کال آئی تو میں
وصول کروں گا۔“ پندرہ بیس منٹ اور گزاردیں گے... میں
کہوں گا کہ ٹریفک جام کی وجہ سے ہم ابھی تک ہوٹل نہیں پہنچ
سکے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے
آئے گی۔ اگر تم ابھی راستے میں ہی ہو تو سوئٹ میں ہونے کا
جھانسا کیسے دے سکتے ہو اور اگر فون وصول نہیں کرو گے تو
کہانی ختم ہوجو۔“

”تم بھول رہے ہو کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے
آئے گی۔ اگر تم ابھی راستے میں ہی ہو تو سوئٹ میں ہونے کا
جھانسا کیسے دے سکتے ہو اور اگر فون وصول نہیں کرو گے تو
کہانی ختم ہوجو۔“

”تم بھول رہے ہو کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے
آئے گی۔ اگر تم ابھی راستے میں ہی ہو تو سوئٹ میں ہونے کا
جھانسا کیسے دے سکتے ہو اور اگر فون وصول نہیں کرو گے تو
کہانی ختم ہوجو۔“

”تم بھول رہے ہو کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے
آئے گی۔ اگر تم ابھی راستے میں ہی ہو تو سوئٹ میں ہونے کا
جھانسا کیسے دے سکتے ہو اور اگر فون وصول نہیں کرو گے تو
کہانی ختم ہوجو۔“

”تم بھول رہے ہو کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے
آئے گی۔ اگر تم ابھی راستے میں ہی ہو تو سوئٹ میں ہونے کا
جھانسا کیسے دے سکتے ہو اور اگر فون وصول نہیں کرو گے تو
کہانی ختم ہوجو۔“

اپنا کوٹ اتار کر میرے بدن پر ڈال دیا تھا۔
”کیا اس نے پیش برگ کے آس پاس وقت گزارا ہے؟“

”میرے علم میں نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ باسل پا کو کے مکان پر نہیں جائے گا۔ وہ معمول کے بیک اپ پلان پر عمل کرے گا۔ مزید یہ کہ جو اسے فون کے ذریعے فی ہدایات بھی جاری نہیں کر سکتا۔ اور پیکل ”بیک اپ“ پلان کے تحت اسے کہاں کا رخ کرنا چاہیے؟“

”جو تکس چاہے گا کہ باسل اور اسی زیادہ دور جائیں کیونکہ ہائی وے پر ٹرول انہیں روک سکتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق باسل کو بروک ہونے جانا چاہیے۔ جو ہیزل ہرسٹ سے 20 منٹ کے فاصلے پر ہے۔ سین سے تقریباً 60 منٹ دور۔ جو، جیکسن ائربورٹ سے نکل کر 55 منٹ میں باسل اور اسی تک پہنچ سکتا ہے پھر ان دونوں کو لے کر پیش برگ میں نہیں مدعو کرے گا۔“

”اس کا مطلب جو اس وقت انٹر اسٹیٹ 55 پر ہے اور باسل بھی... ساؤتھ ہینڈ لینز پر دونوں کے درمیان تقریباً 20 منٹ کا فاصلہ ہونا چاہیے... بھول جاؤ ہائی وے 49 کو۔“

ول نے بیرن 58 کا رخ بدلنا شروع کیا۔

☆☆☆

کیرین نے کیری کے ٹرنک میں جھانکا۔ وہ محروم بڑی بی کوسفید کیری کے ٹرنک سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ لوگ جہاں تھے وہاں ویرانی اور سائے کا راج تھا۔ صرف ایک گیس اسٹیشن نظر آ رہا تھا۔

”نکل اس کے کہ اس کا ارادہ بدلے، نکلو یہاں سے۔“ کیرین اس کی مدد کو بڑی تھی۔ جو ڈرائیونگ سیٹ پر فون پر بات کر رہا تھا۔ کیرین بڑی بی کو سہارا دے کر سڑک کے کنارے درختوں تک لے آئی۔

”تم مجھے یہاں چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟“

”تم یہاں زیادہ محفوظ ہو... گو، رن... گو... گیس اسٹیشن میں چلی جاؤ۔“

☆☆☆

بیورج کے سوچ بورد سینٹر پر آپریٹر بدستور ”اسٹیشن کنگ“ کے ناول میں ڈوبا ہوا تھا... پراسمیری لائن کے آٹو پائلٹ پر کوئی کار سوئٹ نمبر 28021 کا رابطہ مانگ رہا تھا۔

”ون منٹ۔“ آپریٹر نے حسب عادت کہا اور کلکشن ملا دیا۔ اٹھائیس منزل اوپر ول کے سوئٹ میں فون کی گھنٹی بجی... آپریٹر دوسرا ایجر اگراف پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ وہ پلکیں جھپکا رہا تھا۔ کوئی غلطی ہوئی تھی۔ غلطی سمجھتے میں اسے چند سیکنڈ لگے۔ ناول اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنی غلطی اب بھی درست کر سکتا ہے۔ اس نے کمپیوٹر کی بورڈ ہسٹیاں کرکال ٹرانسفر کرنے کے لیے کمانڈ ٹائپ کی۔ تاہم سوئٹ 28021 میں فون بجنا بند ہو گیا تھا۔

”شٹ۔“ وہ بڑبڑایا۔ گیوٹرو نے اگلے تین گھنٹے تک کال ٹرانسفر کرنے کے لیے الگ سے 100 ڈالر معاوضہ دیا تھا۔

☆☆☆

بیرن 58 انٹر اسٹیٹ 55 پر 200 ٹائٹ کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔ ول کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریمپلر سے کتنے فاصلے پر ہے۔ اگر واقعی باسل ریمپلر، ڈرائیونگ کر رہا تھا تاہم وہ پُر امید تھا اور ساؤتھ ہینڈ لینز کی سڑکوں کے متوازی غلطی کر رہا تھا۔

معاصل فون بج اٹھا۔

”کون جواب دے گا؟“ شیرل نے ول کو دیکھا۔

”تم۔“ ول کی پیشانی پر سلوشن نمودار ہو گئی۔

”نہیں۔“ وہ گڑبگڑ کا ل میں مجھے بتا چکا ہے کہ کہاں جاتا ہے... لہذا یہ کال تمہارے لیے ہے۔“ شیرل نے بتایا۔

ول 300 فٹ کی بلندی پر انجن بند نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اور اک ہو گیا کہ ٹانگ اور دھواں ترین مرحلہ بالآخر آ کر پہنچا ہے۔ یہ ڈو اور ڈائی والی پیش کش تھی۔ شیرل کے چہرے پر بھی ہراس تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کوئی گزرب نہیں ہوئی تو جو جہاز انجنوں کی آواز سن لے گا۔ اگر ول فون سرے سے اسٹینڈ نہ کرتا تو بھی پھٹتا... تاہم روٹی کی ایک کرن اب بھی تار بجی سے لڑ رہی تھی۔ جو، باسل کو ہدایت جاری نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اسی کو مار دے۔ رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا... جو کو ڈرائیونگ کے ذریعے باسل تک پہنچنا پڑتا۔ ول کے خیالات برقی رفتاری سے ذہن میں چکر رہے تھے۔

مہیب خطرات کے حامل پرندے نے پر کھول دیے تھے۔ گھنٹی تیسری چوتھی بار بجی۔ ول نے کشتیاں جلا گئیں اور فون ریسیو کیا۔

”جو؟“

”شیرل کہاں ہے؟“

”بھول میں ہو گی۔“

”کیوں اس مت کرو۔“ جو دھاڑا۔ ”اوہ، تم اپنے طیارے میں سفر کر رہے ہو؟ خوب، بہت خوب۔“

”جو...“

”شیرل کو فون دو۔“ وہ شکاری کتے کے مانند غرایا۔

ول کی سانسیں اٹکنے لگیں۔

”تمہاری بیٹی گئی، ڈاکٹر... گئی... تم نے بہت ہوشیاری دکھائی۔ لیکن بھول گئے کہ تمہارا واسطہ جو سے پڑ گیا ہے۔ ماں میرے لیے اٹھو گئی، تم نے جین لی۔ اسی تمہارے لیے اٹھو گئی، میں جین لوں گا۔“

جو کے الفاظ، ول کی ہڈیوں میں اتر گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ گفتگوں کر کیرین کی بیچ ضرور ستانی دیتی... کیا وہ کیری میں نہیں ہے؟

”جو، کیرین کہاں ہے؟“

”تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

دفتراول کے جسم کا ہر خلیہ تنہے لگا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔

”جو!“

”بولو۔“

”تم نے کہا تھا کہ یہ تمہاری آخری واردات ہے؟“

”ہاں پھر؟“

”تو نے شیک کہا تھا لیکن تو یہ بھول گیا کہ دن بھی یہ تیرا آخری ہے۔“ ول کی آواز میں غم کا لاوا اٹل رہا تھا۔

شیرل نے حیرت سے ول کو دیکھا۔ آواز کے شدید غیظ و غضب نے چند لمحے کے لیے جو کی بولی بند کر دی۔

”ڈاکٹر، ہڈیاں بک رہا ہے... تیری بیوی، بیٹی کو تیرے سامنے ماروں گا... بعد میں تجھے...“ وہ بھی تو تراخ پر اتر آیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر سے اس ڈوبل کی توقع نہیں تھی۔

”میں ہڈیاں بک رہا ہوں... تجھے کہنے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔“ ول نے جواب سے بغیر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

کیرین نے کیری کا ٹرنک بند کیا اور مڑ کر گیس اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ چند قدم چل کر وہ پتھر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جو کا فون بند تھا اور وہ پلکیں جھپکا کر بغیر ونڈ شیلڈ کی دوسری جانب گھور رہا تھا۔

”ول سے بات ہوئی؟“

”ہاں۔“

”کیا کہہ رہا تھا؟“

”یہ پوچھو کہاں سے کہہ رہا تھا؟“

”کیا مطلب؟“

”وہ اپنے سوئٹ میں نہیں ہے۔“

کیرین کے دماغ میں الارم نے شور کیا۔ ”وہاں؟“

”وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور خطرناک ہے...“ جو نے بہت مشکل یوٹرن کیا۔ ٹائروں سے دھواں اٹھا۔ اس نے سمت ٹیمر تبدیل کر دی تھی۔

☆☆☆

ول نے اسپید مزید کم کر کے 100 ٹائٹ کر دیا۔ اب وہ شمال سے کافی فاصلے پر تھے۔ ”باسل اور اسی کی گاڑی ڈھونڈو۔“ یہی آخری روٹن کرن تھی۔ ول کے چہرے کے عضلات اکڑے ہوئے تھے حیرت انگیز طور پر گھٹیا کا درد غائب تھا۔ جب آدمی کرب واذیت کے سمندر میں تیر رہا ہو تو چھوٹے موٹے درد اور تکالیف کا احساس فنا ہو جاتا ہے... ول جانتا تھا کہ باسل بیک اپ پلان پر عمل کر رہے اور یہ بات جو کے علم میں بھی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کون پہلے باسل تک پہنچتا ہے... ڈراما سپر کلائیکس میں داخل ہو گیا تھا جس میں خطرات ہی خطرات تھے۔

شیرل اور ول نیچے روڈ پر ریمپلر کو اسٹین کر رہے تھے۔ ایف بی آئی سے مدد لینے کا وقت آ گیا تھا... ول نے ریڈیو آن کر دیا۔

”دس آ میرن دھسکی جولیٹ، اوور، امیر جنسی ہے، پلیز جواب دیں۔“

مختصر خاموشی کے بعد آواز آئی۔ ”ڈاکٹر جینگ، دس از فریک ڈک۔ تم کہاں ہو؟“

”فریک، وقت بہت کم ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میری گاڑی جیکسن ائربورٹ کی پارکنگ میں ہے۔ یعنی وہ ہوائی سفر کا دھوکا دے کر دوسری گاڑی کے ذریعے واپس ائربورٹ سے نکل گیا... میری مدد کرو، وہ کس گاڑی میں وہاں سے نکلا ہے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سفید ٹویوٹا کیری میں سفر کر رہا ہے۔ ہم نے سلیو رٹی پیپ چیک کر لی ہیں۔ ڈاکٹر پلیز اپنی لوکیشن بتاؤ، اس کے بغیر...“ ول نے ریڈیو آف کر دیا۔

”تم نے روڈ پر کچھ دیکھا؟“

”نہیں، ابھی تک نہیں۔“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

”فوکس مت کرو، اسٹین کرو اور پراسکون ر ہواور ہاں“

جوسفید رنگ کی ٹویٹا کسیری میں ہے۔
 ”اوہ گاؤں شاید میں نے ریمبلر کو دیکھ لیا ہے۔“ شیرل چلائی۔
 ”میں نے باسل اور اسی کو بھی دیکھ لیا ہے۔“
 دل کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی، تاہم ناکام رہا۔ اس نے ہیرن 58 کا رخ آسمان کی طرف کیا اور پھر کاکٹ کر چھپے کی جانب گیا۔

☆☆☆

دل کا رخ سامنے سے آنے والی ٹریفک کی جانب تھا۔ اس نے چھوٹی سی پرانی سفید ریمبلر دیکھ لی۔ دل نے رفتار اور بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ پھر سیٹ میں اسے چھوٹا سا سر نظر آیا۔ اسٹیرنگ ویل پر دیوار باسل موجود تھا۔ زندگی میں وہ ممکن اور مسرت اس نے محسوس نہیں کی تھی جو اسی کو زندہ دیکھ کر اس نے محسوس کی...
 جیسے ہی دل نے پھر کاکٹ کیا۔ ہیرن 58 مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک کی جانب جانے لگا۔ ریمبلر باکس نما سلور رنگ کی پرانی اور مسرت رفتار گاڑی تھی۔ دل رفتار کم کرتا گیا، حتیٰ کہ ہیرن 58 اڑنے کے بجائے تیرتا ہوا لگ رہا تھا۔ رفتار مزید کم ہوئی تو وہ کریش کر جاتا...
 اسی زندہ تھی اور اب دنیا کی کوئی طاقت دل کو اسی تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

☆☆☆

باسل اور اسی ایک ساتھ گا رہے تھے۔ ”بشی اسپائیڈ... بشی اسپائیڈ...“ جس وقت جہاز پہلی مرتبہ سامنے نمودار ہوا۔ بلند درخت کی چوٹیوں سے ذرا اونچا وہ سیدھا ان کی طرف آ رہا تھا۔
 ”وہ دیکھو۔“ باسل نے اشارہ کیا۔
 ”اے اتنا نیچے پرواز نہیں کرنا چاہیے۔“ میں جانتی ہوں، کیونکہ میرے ڈیڑی کی بھی جہاز اڑاتے ہیں۔“
 جہاز ان کے اوپر سے گزر گیا۔ اسی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بلند ہو رہا تھا۔

ان دونوں نے پھر گانا شروع کر دیا۔ دفعتاً باسل نے بریک پیڈل دیا۔ جھٹکا لگا اور اسی نے ڈش بورڈ پر ہاتھ رکھ کر پائرس پیچا۔ جہاز پھر نمودار ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ اس کی بلندی بہت ہی کم تھی اور وہ سیدھا ریمبلر کی جانب آ رہا تھا۔ انٹر اسٹیٹ پرموچر ٹریفک میں پھیل چکی تھی۔ اسی کی چیخ نکلی تھی... اسی پائلس جھپکائے بغیر جہاز کو گھور رہی تھی۔ اس کا تھما سا ذہن کنیڈز ہو رہا تھا۔ جہاز کے بازو تھوڑے سے ڈمگ گئے۔ پہلے دایاں بازو، پھر بایاں بازو

جاسوسی ڈائجسٹ 68 جنوری 2016ء

جھک کر سیدھا ہو گیا۔
 اسی کا منہ کھل گیا۔ ”وہ میرے ڈیڑی کی طرح کر رہا ہے۔“ اسی کا چہرہ تھما اٹھا۔ ”وہ میرے پاپا ہیں... بیٹ سے...“
 وہ میرے پاپا ہیں... اب سب ٹھیک ہو جائے گا...“ فریڈ ہیجان سے وہ بے قابو ہوئی جاری تھی۔ دو مرتبہ جہاز کے نمودار ہونے کے بعد انٹر اسٹیٹ کی ٹریفک یہی سمجھ رہی تھی کہ کوئی خرابی ہے اور جہاز وہاں اترا جا رہا ہے۔ ٹریفک کو بچانے کے لیے جہاز نے اچانک کریش لینڈنگ نہیں کی تھی۔

☆☆☆

ہیرن 58 دوبارہ ریمبلر کے پاس سے گزر گیا۔ اسی کا چہرہ گاڑی کے شیشے سے چپکا ہوا تھا۔ بے اختیار دل آبدیدہ ہو گیا۔
 ”کیا کرو گے؟“ شیرل نے پوچھا۔
 ”لینڈ کروں گا۔“
 ”روڈ پر؟“
 ”بے شک۔“
 شیرل کا چہرہ پھر سفید پڑ گیا۔
 ”سیٹ بیلٹ باندھ لو۔“ دل نے کہا۔
 دل نے 500 فٹ کی بلندی پر آ کر رفتار 180 ٹاٹ کر دی۔

”کیا ہولینڈ نہیں کر رہے؟“
 ”پہلے کسیری کو تلاش کرنا ہے۔“ دل نے دیکھ لیا تھا کہ ٹریفک کو گڑبڑ کا احساس ہو گیا ہے۔ گاڑیوں کی لمبی قطار لگتی تھی۔ بیشتر روڈ سے اتر گئی تھیں۔ دل نے اندازہ لگایا کہ اسے زیادہ سے زیادہ پانچ میل صاف طیس کے اور 90 سیکنڈ۔

”میں نے کسیری دیکھ لی ہے، وہی ہے... سلور رنگ کی۔“ ضروری نہیں تھا کہ وہ دل کی مطلوبہ کسیری ہو... بہر حال اس نکتے پر سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یہی کافی تھا کہ ریمبلر اور کسیری ایک روڈ پر تھیں۔ اتنی منطقی بھی حوصلہ افزا تھی۔

دل فل بائیں دار ہیرن 58 کو 1000 فٹ اوپر لے گیا۔ وہاں سے وہ مڑا تو ہماری پتھر کے مانند گر... ہر طرف سے دھیان ہٹ گیا تھا۔ اگر تازہ توجہ محفوظ ترین لینڈنگ پر تھا۔

اگر اسپید 85 ٹاٹ ہوتی ہے۔ روڈ کی سفید پٹی کو سینٹر لائن بنا کر اس نے رفتار گراتے گراتے 82 ٹاٹ کر دی۔

یوک (YOKE) کو نرمی سے آگے کیا اور پاور مزید گھٹا کر روڈ پر اتر گیا۔

☆☆☆

جو، ہیرن 58 سے تین میل پیچھے تھا۔
 ”من آف اے سچ، کریش لینڈنگ کرنی تھی تو ہائی وے پر جاتا۔“ جو کا منہ بند کیا۔
 کسیرین خاموش تھی۔ جس وقت جہاز آسمان سے گر کر انٹر اسٹیٹ کے متوازی ہوا تھا اس وقت سے اس کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اس کا دل نعرہ زن تھا کہ یہ اس کا شوہر ہے... یقیناً یہ دل ہے۔

”یہ خودی کے لیے اوپر کیا تھا۔“ جو نے تبصرہ کیا۔
 ”یا اس کا ایک الجھن مل ہو گیا ہے؟“ اس نے کسیرین کو دیکھا۔ کسیرین خاموش اور ساکت تھی۔ انٹر اسٹیٹ پر لینڈ کر کے دل نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا لیا تھا۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ اسی زندہ ہے...
 ”تمہیں کیا ہوا؟“ جو پھر بولا۔ ”دیکھ رہی ہو اس پاگل... CNN کو ایک بڑی اسٹوری مل گئی ہے... جن خاموش کیوں ہو... بتا رہے ہو؟ کیا مسئلہ ہے، خوف زدہ...“

چانک جو کے جڑے پیچھے گئے۔ ”مردود، ٹھیک جگہ پہنچا ہے۔“ کہیں مرے گا۔“ جو نے اسٹیکلر میز دیا۔ وہ آگے کیڑی لاک کو اور ایک کرنا چاہ رہا تھا۔

اسی نہ صرف زندہ ہے بلکہ تین آس پاس ہے۔ اسی لیے دل اور جو یہاں پہنچے تھے۔ چوبیس گھنٹے سے جاری بمباریک خواب کی تیسرا کا وقت آن پہنچا تھا۔ یہ زندگی کا طویل ترین اور ڈراؤنا خواب تھا۔ کسیرین اپنا کردار ادا کرنے کے لیے نئے سرے سے توانائی جمع کرنے لگی۔

اچانک کسیرین نے ویل پکڑ کر پوری قوت سے کھینچا۔ کسیری لڑکھوڑائی اور کیڑی لاک گھبرا کر سڑک سے اتر گئی۔ جو نے کسیرین کے سر پر گھونسا رسید کیا لیکن کسیرین اسٹیرنگ ویل چھوڑنے کے بجائے بری طرح ویل سے لپٹ گئی۔ کسیری نے بھی سڑک سے اتر کر درختوں کی جانب رخ کیا۔

جو کے حلق سے گالی برآمد ہوئی۔ اس نے کہنی کسیرین کے کان کے قریب ماری۔ چند لمحات کے لیے وہ اندھیروں میں ڈوب گئی۔ نگاہ کے سامنے سے تاریکی ہٹتی تو کسیرین نے دیکھا کہ کسیری واپس روڈ پر تھی اور دل کی گمن اعشاریہ اڑتیس کا رخ اس کے پیٹ کی جانب تھا۔ جو محتو اتر بائیں بٹی پر گاڑی بھگا رہا تھا۔

”کوئی غلط حرکت کی تو جان سے مار دوں گا۔“ جو نے سرد و سفاک آواز میں سنجیدہ دھمکی دی۔ کسیرین نے اسپید میٹر پر نظر ڈالی۔ سوئی 90 کے ہندسے پر لڑ رہی تھی... 90 سے اوپر ہوتی ہوئی وہ 100 تک چلی گئی۔ کسیرین نے جو کے ہاتھ میں گن کا جائزہ لیا۔ گولی کب چلے گی، کیا کرے گی؟ تاہم اپنی اسپید پر ہونے والے حادثے میں دونوں کی موت یقینی تھی۔ اگر صرف گولی چلی تو کسیرین مرے گی۔

جو کے حلق سے پھر گالی نکلی اور اسے بریک لگانے پڑے۔ سامنے گاڑیوں کی قطار ایک سرخ بیک لائٹس اشارہ کر رہی تھیں کہ وہ بریک لگا رہی ہیں۔ آگے کیا ہو رہا تھا کچھ پتا نہ تھا۔ جو نے بے حیا ابر بھٹی کے لیے ریزرو پٹی پر گاڑی ڈال دی اور کسیری کو دوڑاتا چلا گیا۔ اس کا چہرہ سرخ نہیں ہو رہا تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے چہرے پر آگ کے شعلے رقص کر رہے ہیں... اس کی یادداشت میں دل کے زہریلے فقرے پھریں کی طرح بیہوش تھے۔ ”تو نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ تیری آخری واردات ہے، مگر تو بھول گیا کہ دن بھی ہے تیرا آخری ہے...“ تجھے مرنے سے پہلے ہڈیاں کینے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“ جو کا تن بدن آگ میں جھپک رہا تھا۔ آخری واردات... آخری دن... آخری دن... ن... ن... ن...

کسیرین نے آنکھیں بند کر کے اسی کا تصور کیا۔ اس چھوٹی سی اسی کا جب وہ صرف چھ ماہ کی تھی۔ منی منی، مسکراتی ہوئی، گول منول... جس کے لیے کسیرین نے اپنا کیریئر قربان کر دیا تھا، سپنا بھلا یا تھا۔ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کا دل جیسے سرخ آنسو پکا رہا تھا۔ ادائی کی چادر نے اس کے وجود کو لپیٹ لیا... محاسب احساسات و جذبات ایک عمیق سکون کی نذر ہو گئے... نہ غم نہ خوف... وہ خود فراموشی کی حالت میں تھی۔ دل دھڑکنے سے تیری قربت کے لیے... قربان اک لمحے پر سارا جیون... اندیشوں سے آزاد ہے ہر دھڑکن...
 اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ ”آئی لو، اسی۔“
 اس نے خود سے سرگوشی کی۔ ”آئی ایم سوری، دل۔“
 ”وہاں؟“ جو نے پوچھا۔

جواب میں، سود و زیاں سے بیگانہ وہ خود فراموشی کی طرح چھپی۔ ایک ساعت کے فرق سے جو نے گولی چلا دی۔

☆☆☆

جاسوسی ڈائجسٹ 69 جنوری 2016ء

بیرن 58 تیر کی طرح، ریمبلر کی جانب جارہا تھا۔ درمیان میں اسکول وین دیکھ کر ول کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ کیا ڈرائیور بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ ول نے پاور آف کر کے بریک لگائے۔ فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ بیرن 58 بروقت نہیں رک بائے گا، اس نے دوبارہ ہوا میں جانے کے بارے میں سوچا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ ول کی سانس رک گئی۔

شیرل پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخنے لگی یہ اور بات کہ ول کو اس کی جی وپکار سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ول نے فیول بھی بند کر دیا اور انتہائی بائیں جانب جھکتے ہوئے وین کے قریب سے گزر گیا۔ آہ... بیرن 58 کے دائیں بازو کی ٹپ نے وین کو چھو لیا تھا۔ وین، پھر کی کے مانند گھومی اور دو تین دائرے بنا کر سڑک کے کنارے پر رک گئی۔ ول نے رکی ہوئی سانس خارج کی، یہ سنسنی خیز مرحلہ ایک منٹ سے پہلے ختم ہو گیا۔ ول کا چہرہ پسینے میں بھیجا ہوا تھا۔

”ول!“ شیرل پھر چیخی اور سانسے اشارہ کیا جہاں گاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہاں امبرجی پٹی پر سفید کیمری آکر رکی۔ امبرجی پٹی کو بلاک کرنا خلاف قانون تھا نہ کہ بلا جواز اس پر سفر کرنا۔ بیرن 58 ابھی قافلے پر تھا۔ کیمری میں کون ہے، چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم کیمری سے ایک ہی فرد برآمد ہوا۔ ”نہیں“ اس بار ول چلا یا۔ ایک نیکی مطلوبہ کیمری تھی تو کیمری کہاں ہے؟ اترنے والا یقیناً جو تھا۔ دوسری بات ول کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ریمبلر بڑھی کیوں چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ بیرن 58 کی رفتار کم ہو چکی تھی۔ تاہم اب بھی وہ ماحس کی ڈیبا جیسی ریمبلر کے پرچے اڑا سکتا تھا۔

گاڑیوں کی قطار کے آگے نولا اور مضبوط لکڑی کا پتا ہوا جگر ٹاٹ ٹرک کھڑا تھا جس پر درختوں کے موٹے، وزنی تنے لدے ہوئے تھے۔ کیمری سے اترنے والا ٹرک کے ڈرائیور کو باہر نکال کر خود اندر چلا گیا یقیناً جو کے پاس کوئی ہتھیار تھا۔

جگر ٹاٹ، اسٹارٹ ہو کر بیرن 58 کی جانب چل پڑا، اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے آگے ریمبلر تھی۔ ریمبلر کو رک کر بہت پہلے سائڈ میں ہو جانا چاہیے تھا۔ ول کو محسوس ہوا کہ 30 ثن وزنی ٹرک ریمبلر کو اڑانے جارہا ہے۔ ٹرک کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک ریمبلر بے ڈھنگے طریقے سے سڑک چھوڑ کر ڈھلوان میں اتر گئی،

گاڑی کا رخ درختوں کی جانب تھا۔ ول کا سکون عارضی ثابت ہوا۔

دفعتاً اس کی نگاہ پھر ٹرک کی جانب گئی۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ٹرک کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی۔ وہ سیدھا بیرن 58 کی جانب آ رہا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف جارہے تھے۔

ول نے پھرٹی سے دونوں سیٹ بیلٹس کھولیں اور شیرل کی جانب جھپک کر اس کی جانب کا ڈور بھی کھول دیا۔ ”باہر کودو“ وہ چلا یا۔ تاہم شیرل کو ول نے بجائے گیارے کے بجائے جسے میں جھانکنے لگی۔

”باہر کودو“ ول نے لوڈ ٹرک کی جانب دیکھا۔ بریف کیس میں رقم گیارے کے پچھلے حصے میں پڑی تھی۔ ”میرے پیسے...“ وہ چلائی۔

”اپنی جان بچاؤ، بائیں ہوئی ہو۔“ ول نے دھکیل کر اسے باہر پھینکا اور خود بھی نکل گیا۔ بیرن 58 کی رفتار کم ہو چکی تھی۔ ورنہ وہ اب تک ٹرک سے ٹکرا چکا ہوتا۔ شیرل اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ اب بھی کاک پٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھی یا شاید اگلی ہوئی تھی۔ ول نے دیکھا کسی نہ کسی طرح وہ دوبارہ اندر گھس گئی تھی، وہ آتی بڑی رقم چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ حالانکہ موت ٹرک کی صورت میں بڑھی چلی آ رہی تھی۔ خوفناک تصادم ناگزیر تھا۔ ول سڑک کے کنارے کی طرف بھاگا... بھاگتے ہوئے وہ ٹرک ڈرائیور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈرائیور بعد کوچ دارو کا سناٹی دیا۔ دھماکے سے چند سینکڑے پہلے ول نے مزے دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر کود رہا تھا۔

گھاس کے تریچے قطعاً عارضی پر ریمبلر درختوں کی طرف جارہی تھی۔ بائیں تواتر سے بریک پیڈل دبا رہا تھا۔ گاڑی برابر درختوں کی طرف بڑھ رہی تھی... اسپی بائیں کے کان کے پاس چلا رہی تھی۔ بائیں کا دماغ ماؤف تھا۔ ماحاس نے گاڑی روکنے کی کوششیں ترک کر دیں اور اسپی کو اٹھا کر عقبی نشست پر پیچنک دیا۔ ٹھیک دس سینکڑے بعد گاڑی ایک درخت سے ٹکرائی۔ اسپی اچھل کر اگلی نشست کی نرم پشت سے ٹکرائی۔

ونڈ شیلڈ ٹوٹ گئی تھی۔ بائیں کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔ اسپی پھر آگے آگئی۔ ”بیٹ“ اسپی نے بائیں کو ہلانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ کراہا اور ایک ہاتھ اپنی پسلیوں پر رکھ لیا۔

اسپی نے اس کا بڑا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلایا۔ ”بھو، بیٹ... بھو...“

”کیا تم بات کر سکتے ہو؟“

بائیں کی دائیں آنکھ پھڑکی۔ وہ پھر کراہا اٹھا۔

”بھاکو“ اس نے سرگوشی کی۔ ”تیل کی بو آ رہی ہے۔ تم بھاگ جاؤ۔“

”جاؤ، ڈیڈی کے پاس جاؤ۔ مجرا آدمی آ رہا ہے۔“

”ایلیں، بھاکو...“

اسپی کو یاد آیا کہ بائیں کی چھوٹی بہن کا نام ایلیں تھا۔ اسپی نے نیچے دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں پر گڑیا اور وہ بھالو پڑا تھا جو بائیں نے اسپی کے لیے تراشا تھا۔ اس نے گڑیا اٹھا کر بائیں کی گود میں ڈال دی اور بھالو کے لے گاڑی سے اتر گئی۔ ”گڈ بیٹ، میں ڈیڈی کے ساتھ واپس آ رہی ہوں۔“ وہ بھاگ اٹھی۔ وہ تھچی ڈھلان پر اوپر چڑھ رہی تھی... اوپر کنارے پر ایک دراز قامت بولہ نظر آیا۔

”ڈیڈی... ی... ی...“ وہ چلائی۔

دراز قامت بولہ نیچے کی جانب بھاگا۔

☆ ☆ ☆

شیرل کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ اس کے کھٹنے اور بائیاں بازو زخمی تھے۔ تاہم وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ لاکھوں ڈالرز والا بریف کیس بھی نکال لائی تھی۔ اس کے عقب میں دھواں اور شعل بلند ہو رہے تھے۔ چھوٹے موٹے دھماکے بھی جاری تھے۔ وہ گھاس پر لٹی تھی۔ گاڑیاں اور جہوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بریف کیس لے کر شیرل درختوں کی جانب چل پڑی... گاڑیوں کی قطار ایک میل تک چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کیرین کو پتھر ڈور کے ساتھ نیم دراز تھی۔ گولی اس کے پیٹ میں قدرے اوپر لگی تھی۔ جو جا چکا تھا۔ ونڈ شیلڈ سے کیرین کو بیرن 58 دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چند منٹ قبل اسے خاصا زوردار دھماکا سناٹی دیا تھا وہ امید ہی کر سکتی تھی کہ بیرن 58 سلامت ہو... اس نے دل اور اسپی کے لیے دعا کی۔ پھر گلو بائیں کھلا، بائیں میں اسے کلیٹکس کا پیڈ مل گیا۔ (نرم نشوونے والی کی طرح استعمال کیا جاتا ہے) کلیٹکس کا گولہ بنا کر اس نے گولی کے سوراخ میں گھسا دیا۔ درد و کرب کو برداشت کرتے ہوئے کیمری کا دروازہ کھولا اور باہر لڑھک گئی۔

☆ ☆ ☆

ول نے اسپی کو بوجھ کر اوپر اٹھالیا۔

”مام کہاں ہیں؟“ اسپی نے سوال کیا۔

ول کے پاس اس آسان سوال کا جواب نہ تھا۔

”سوئی، ہم کی کو ابھی ڈھونڈ لیں گے۔“

”رکے، بائیں گاڑی میں پھنس گیا ہے، وہ زخمی ہے۔“ اسپی نے کہا۔

ول، ریمبلر کے قریب چلا گیا۔ فضا میں بیٹرول کی بو تھی۔ اگر آگ لگ جاتی تو وہ زندہ بچل جاتا۔ ول نے اسپی کو نیچے اتارا اور ڈرائیونگ ڈور کی طرف بھاگا۔ ڈور جام نہیں ہوا تھا لیکن اسٹیرنگ کے ساتھ بائیں نالی بھاری جشہ پھنسا ہوا تھا۔ ول بمشکل اسے ہلایا۔

”ہیلپ...“ بائیں کی آواز آئی۔

ول نے دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو دو جا ایک ٹاٹنگ گاڑی کے فریم پر جھانکی، کچھ بائیں نے کوشش کی اور دونوں لڑھک گئے۔ اور کروٹیں بدلتے ہوئے ریمبلر سے دور ہو گئے۔

کیرین اور جو کا مسئلہ نہ ہوتا تو ول درختوں میں جا کر پولیس کا انتظار کرتا۔ اسے شیرل کی گن بھی یاد آئی جو یقیناً ٹرک اور بیرن 58 کے تصادم میں ضائع ہو گئی ہوگی۔ وہ اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انتظار کرنا بے سود تھا۔ اوپر سڑک کے کنارے کافی لوگ جمع تھے اور نیچے دیکھ رہے تھے۔ اگر جو ان میں شامل ہوا تو؟ کسی نہ کسی کے پاس تو گن ہوگی، آخر یہ میسی کس کی تھا... ول نے اسپی کو اٹھالیا اور روڈ کی طرف چل دیا۔

”پیچھے ہٹ جاؤ... پیچھے ہٹو۔“ کوئی زور سے چیخا۔

ول کا دھیان پولیس کی جانب گیا۔ وہ آدمی 30 فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں۔ اس کی پتلون کا ایک پائینچ خون آلود تھا۔

”جو!“ ول کے دماغ میں گھنٹی بجی۔ جو کے ہاتھ میں ول کی ہی گن تھی۔

”میرے پیسے کہاں ہیں، ڈاکر؟“

”ٹرک میں تم تھے؟“ ول نے سوال کیا۔

”اور کون ہو سکتا ہے؟“

ول ہنس پڑا۔ ”بہت چالاک ہو۔ تمہیں خیال نہیں آیا کہ ظاہر ہے پیسے جہاز میں ہوں گے۔“

جو نے ٹرک اور جہاز کے لیے کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے گولی چلائی اور ول کو لٹکا کر ایک کھٹنے سے تل پر گر گیا۔

”یہ تمہاری ہی گن ہے، کیا لگ رہا ہے؟“ جو نے

کہا۔

ول سوچ رہا تھا کہ اسی کو جو اس کے پیچھے تھی اور چلائے جا رہی تھی، بھاگنے کے لیے کہے لیکن خدا تھا کہ آڑ سے نکلے ہی جو اسی کو گولی مار دے گا۔ جو کی چلائی ہوئی گولی ول کی ران میں گھس گئی تھی۔

”شیرل کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ ول نے جواب دیا۔

جو مزید آگے آیا، ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظر باسل پر پڑی۔

”کم آن بوائے۔“ اس نے باسل کو پکارا۔

”تم نکل سکتے ہو جو، یہاں سے نکل جاؤ۔“ ول نے کہا۔

جو نے قہقہہ لگایا۔ ”ہاں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا لیکن تمہارے ساتھ کاروبار ابھی نامکمل حالت میں ہے اور وہ چھوٹی گڑیا جو تمہاری پشت پر ہے، وہ لیگل ٹینڈر ہے۔“ جو دو قدم اور آگے آیا۔ ول جانتا تھا کہ ران میں لگنے کے باوجود وہ ہمت کر کے بھاگ سکتا ہے اگرچہ یہ ایک فضول کوشش ثابت ہوتی تاہم اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ اسی کو اٹھا کر بھاگ نکلے۔ اسے حیرت تھی کہ پولیس اور ایف بی آئی اب تک کہاں ہیں اور روڈ پر موجود جم غفیر میں سے کسی نے جو پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ول بھاگنے کے لیے ذہن کو تیار کر رہا تھا، معاش کی نظر ایک قریبی پتھر پر پڑی۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اچانک ایک نسوانی آواز گونجی۔

”جو میں نے پیسے بچا لیے ہیں۔“ وہ شیرل کی آواز تھی۔ ”کم آن، نکلو یہاں سے۔“ وہ مسکرائی بھی تھی۔

”ویل ویل۔۔۔“ جو نے تعریف کے ساتھ شیرل کے لیے ایک قدرے نازیبا لفظ استعمال کیا جو اس کے بدقماش سے متعلق تھا۔ ”بے بی، مجھے اپنا کام تو پورا کرنے دو۔“

جو تومسٹی میں تھا لیکن ول نے تاڑ لیا کہ شیرل فطری انداز میں نہیں مسکرائی تھی۔ جو کا جواب سن کر اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”اس معصوم بچی کو نقصان پہنچانے کی اب کوئی وجہ نہیں رہ گئی ہے۔“ وہ بولی۔

”بہت اچھا مشورہ ہے۔“ جو کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے ول کی ناگوں کا نشانہ لیا کہ کسی طرح گولی اسی تک پہنچ جائے۔ یہ ایک مشکل نشانہ تھا۔

”جو، نہیں۔“ شیرل چیخی۔ اس نے بریف کیس کھول کر گن نکالی۔ ”اسی کو مارنے سے تمہاری ماں واپس نہیں آئے گی۔ اسی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے بلکہ ول بھی ہے۔“

”کونسا ریکا چلو تمہارا ریشہ تمہارا رشتہ ہے۔“

”کنتیا، میرے دشمن کی حمایت میں بول رہی ہے۔“

ایک رات میں بدل گئی۔ ”اس نے سرسری انداز میں شیرل کی جانب رخ کیا۔ ول کی چھٹی جس نے خطرے کا واضح سگنل نشر کیا۔۔۔ جو شتر اس کے کہ وہ شیرل کو خبردار کرتا۔ جو کا سرسری انداز بدل گیا۔ اس نے پھرتی سے فائر کیا اور کروہ قہقہہ بلند کیا۔

”یہ گندی گائے شروع سے اچھی تھی۔“ جو نے نفرت بھرا تبصرہ کیا۔ شیرل نیچے گری، بریف کیس کھلا تھا۔ لہذا ڈالرز کی گڈیاں اطراف میں بکھر گئیں۔

جو نے دوبارہ ول کی طرف توجہ دی۔ سر سے ناگوں تک وہ گن اوپر نیچے دایمیں بائیں کر کے اسی کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی ٹھیل، ٹھیل رہا ہے۔ آہ راحت جاں پشت پر تھی اور آفت جاں سامنے۔ ول نے گن نکھیل کے پتھر کو تازہ کیا۔

وہب، وہب، وہب۔۔۔ دور سے ایک اجنبی آواز ابھرتا شروع ہوئی۔ ول نے لمحہ بھر میں پہچان لیا کہ یہ روٹر بلڈ کی آواز تھی۔ بعد ازاں جو نے بھی بلی کا پٹر کی طرف ہوتی ہوئی آواز شاخت کر لی۔ اس کا ریول تبدیل ہوتا چاہیے تھا۔ لیکن وہ دو قدم اور آگے آگیا۔

”کونسا ریکا کے ریشہ میں کیا رکھا ہے، ڈاکٹر اسل مزہ تو یہاں ہے، اس جگہ۔۔۔“

”ڈیڈی، دیکھو۔“ اسی کی آواز آئی۔ جو نے نشانہ باندھا۔۔۔ ول نے اسی کو نیچے گرا کر پوری طرح چھپایا۔ اسی نیچے دی ہوئی تھی۔ موت کا سامنا کرنے کے لیے ول نے گردن موڑی۔ ایک قہقہہ تیز منظر سامنے تھا۔ ول پوری طرح گھوم گیا۔

درخت کی شاخ جیسا موٹا بازو جو کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ باسل نے گردن دیوچ کر جو کو اوپر اٹھالیا تھا۔ جو کی ناگھیں زمین چھونے سے قاصر تھیں۔

”تم اسی کو چھو نہیں سکتے۔ تم اسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔ وہ میری بیلا ہے۔۔۔ بیلا ہے۔۔۔“

وہب، وہب، وہب۔۔۔ جو بری طرح تڑپا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور دہشت تھی۔ اس کا زخرا دبا جا رہا تھا۔ آخری کوشش کے طور

پر اس نے ہاتھ گھما کر فائر کیا، لیکن گولی باسل کو چھو کر گزر گئی۔

وہب، وہب، وہب۔۔۔ گردن پر باسل کی گرفت ٹولادی تھی۔ اس نے جو کو مزید اوپر اٹھالیا۔ لگ رہا تھا جیسے جو کو پکائی پر چڑھا دیا گیا ہو۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی، لیکن حلق سے خرخرات ہی برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے گن نکل کر نیچے گر گئی۔

آنکھیں حلقوں میں ابل پڑیں۔

”وہ میری بیلا ہے۔“

اسی سامنے آگئی۔ ”مار دو، میٹ۔۔۔ اس کو مار دو۔“ وہ چلا رہی تھی۔

جو کے چہرے پر موت کا سایہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ ہاتھ پیر لٹک گئے۔۔۔ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی روشنی آنکھوں سے معدوم ہوتی چلی گئی۔ جو باسی مولی کی طرح باسل کی جان لیوا گرفت میں لٹک رہا تھا۔

باسل نے اسے نیچے لٹا دیا اور اس کے پاس بیٹھ کر سر سہلانے لگا۔ ”جو۔۔۔ جو؟“ وہ رو رہا تھا۔ ”تم نے بیلا کو مارنے کی کوشش کیوں کی؟“

”میں، اس کی مدد کرنی چاہیے، ڈیڈی۔“ اسی نے کہا۔

”پہلا ما کو تلاش کرتے ہیں۔“ ول نے بیٹل کھول کر ران پر باندھ لی، اور کھڑا ہو گیا۔ اسی، روتے ہوئے باسل کی طرف جاتا جا رہی تھی۔ تاہم ول نے روک لیا۔ ”بہن، ہمیں تمہاری ماما کو تلاش کرنا ہے۔“

”میں یہاں ہوں۔“

ول نے چونک کر سر اٹھایا۔ کیرین روڈ کے کنارے پر شیرل کی گن قہقہے کھڑی تھی۔ شیرل کھاس پر رہتے ہوئے ڈالرز کی گڈیاں بریف کیس میں جمع کر رہی تھی۔

کیرین نے شیرل کا نشانہ باندھا ہوا تھا۔

”ماما!“ اسی ماں کی طرف بھاگی۔ ول نے بروقت اسی کو پکڑ لیا۔ ول نے بے آسانی جانچ لیا کہ کیرین حواس میں نہیں ہے۔ وہ ناٹل حالت میں ہوئی تو بیٹی کو دیکھتے ہی اس کی جانب بھٹی جبکہ وہ ایک ہی جگہ کھڑی تھی۔

”گن مجھے دے دو۔“ وہ آہستہ آہستہ کیرین کی طرف بڑھا۔ کیرین نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس نے ہاتھ میں موجود گن کا رخ چندف دور زخمی شیرل کے سر کی جانب تھا۔ بیٹی کا پٹر تیار سر پر پہنچ چکا تھا۔

ول نے شیرل کے شانے پر خون دیکھا۔ اس کی

حرکات بتا رہی تھیں کہ جو اسے کوئی مہلک زخم لگانے میں ناکام رہا تھا۔

”کیرین اپلیز گن مجھے دے دو۔“ وہ پھر بولا۔ ”یہ بھی ان میں سے ایک تھی۔“ کیرین دفعتاً رو پڑی۔

”سب ختم ہو گیا۔ جو مر چکا ہے۔ شیرل نے ہماری بہت مدد کی تھی۔“

اچانک ول کا جسم سنستا اٹھا۔ اس کی نگاہ کیرین کے پیٹ پر پڑی تھی۔

”کیا ہوا تمہیں۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”مزاحمت پر جو نے گولی ماری تھی۔“

”تھپا کر دو۔“ کوئی چیخا۔ ”پولیس۔۔۔ ڈراپ اٹ ناؤ۔۔۔ تھپا کر چیک کر نیچے لیٹ جاؤ۔“

ول نے مڑ کے دیکھا۔ وردی میں دوا سیٹ ٹروپر ریوالتانے کھڑے تھے۔

”فائزمت کرنا۔“ ول چیخا۔ ”وہ شاک میں ہے۔“

”ڈراپ دی گن۔“ ایک وردی پوش پھر چلا آیا۔

کیرین، ٹروپر کی طرف مڑی لیکن گن نہیں چھوڑی۔ ول کو پتا تھا کہ ٹروپر کسی بھی لمبے فائر کر دیں گے۔ وہ زخم کی پروا کیے بغیر کیرین کے سامنے آگیا۔

وہب، وہب، وہب۔۔۔ ایک اور بیٹی کا پٹر آ رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو ول نے

ایف بی آئی کے چار کو پہچان لیا۔ بیٹی کا پٹر کے اترتے ہی دو آدمی کو در کھارے اور ہٹ کر بھاگے ہوئے ٹروپر کی طرف گئے۔ ان کے پیچ ہاتھوں میں تھے۔ چند منٹ دونوں نے ٹروپر سے گفتگو کی۔۔۔ پھر ول کی طرف آگئے۔

”تم یقیناً ڈاکٹر ول جیننگ ہو؟“

”ہیں۔“

”میں فریک ڈک۔“ دونوں نے مصافحہ کیا۔

”مجھے خوشی ہوئی۔“ فریک نے کہا۔ ”تم زندہ ہو۔“

”تمہاری مدد چاہیے، میری بیوی کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔“

”کیا تم گن اس کے ہاتھ سے لو گے؟“

”سوئٹ ہارٹ، یہ لوگ ہماری مدد کے لیے آئے ہیں، اسی تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ گن کی ضرورت نہیں ہے۔ پلیز گن مجھے دے دو۔“ ول نے نرمی سے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ماما!“ اسی چیخی۔ کیرین جیسے ایک دم ڈھس گئی۔۔۔

لالہ کا انجاء

وراثت کیسی بھی ہو... وارث کے لئے اپنے بزرگوں کا یادگار تحفہ ہوتی ہے... ہر کوئی اس سے دستبرداری کا سودا نہیں کرتا... اس کی زندگی میں بھی وہ نہایت اہمیت کی حامل تھی... مگر کچھ گرسنہ نگاہیں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں... شوق اور فرض کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داری نبھانے والے ایماندار دوستوں کا پُر فریب کردار...

لالہ کا انجاء

تویر ریاض



اس خوب صورت عورت نے کریم کلر کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ سرخ روشنی کے دائرے میں دھس کر رہی تھی۔ اس کے قبہ حصے پر سرخ رنگ کا ولیٹ بچھا ہوا تھا اور اس کے اطراف میں ہلکی روشنائی لگائی تھی۔
”کاش میں اس کی آواز سن سکتی۔“ چارلین کے اسارت فون پر ویڈیو ختم ہونے کے بعد میں نے کہا۔
وہ گاڑی چلاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، مجھے معلوم ہے کہ اس کے دور یکارڈ منظر عام پر آئے تھے لیکن مجھے ان

سے پوچھا۔

”تم میرا ہاتھ پکڑو رہو تو دور نہیں ہوگا۔“
”چلو۔“ فریک کی بلند آواز سنائی دی۔

”یہ رقم کس کی ہے؟“ ایک ٹروپر نے سوال کیا۔
”میری ہے۔“ شیرل جھجھکی اور ول کی جانب اشارہ کیا۔

”پوچھ لو اس سے۔“
”کتنی ہے؟“

جواب سن کر ٹروپر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ دوسرے نے دھیمی سی لہجی سٹیجائی...
”بائسڈ، تم نے جھوٹ بولا تھا۔“ شیرل، ول پر

چبھی۔

”میں بھولا نہیں ہوں، میں کورٹ میں آؤں گا اور گواہی دوں گا۔“ ول نے کہا اور ٹیلی کا پٹر میں سوار ہو گیا۔
اسی اس کے ہمراہ تھی۔

”ہاسل کا کیا ہوگا؟“ فریک نے سوال کیا۔ ہاسل ابھی تک جو کاسرا تھوں میں لیے بیٹھا تھا۔

”وہ کنٹری جیل کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ اگر تم اسے یونیورسٹی اسپتال پہنچا دو تو میں مدد کر سکتا ہوں۔“ ول نے کہا اور کیرین کا دوسرا

ہاتھ پکڑ لیا۔ کیرین کو ایک موٹے درمی نما کپڑے پر لٹایا گیا تھا۔ ول باتوں کے ذریعے اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

”ول کی کوشش جتنی کہ وہ بے ہوش نہ ہو۔ انہوں نے بلی کا پٹر کے کیوبیکیشن سسٹم کے ذریعے

اسپتال میں انرجی روم اور (آپریشن روم) تیار کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں کیرین کی حالت بھی بتا دی تھی۔ ول نے بلند

گروپ بھی بتا دیا تھا۔
کیرین نے کچھ کہا، لیکن روٹر کے شور میں ول کو سنانی

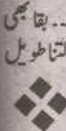
نہیں دیا۔ اس نے اپنا کان کیرین کے ہونٹوں سے لگا دیا۔
”بلی۔“ کیرین نے سرگوشی کی۔ ”گین۔“

”وی آر بلی اگین۔“ اسی زور سے بولی۔
”ہیں، اگیری۔“ ول نے کہا۔

تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرہ بنالیا۔ کیرین پھر ہولے سے مسکرائی۔ مسکراہٹ میں یقین کی

آمیزش تھی۔
یہ دن طویل تھا... کتنا طویل تھا یہ دن... بھابھی

ایک سراب اور فنا بھی ایک سراب... یہ دن طویل تھا، کتنا طویل تھا یہ دن...
تھکا ہوا دن...



وہ گھٹنوں کے بل بھی نہ ٹک سکی اور لیٹ گئی۔ مگر اس نے چھوڑ دی تھی۔ ول نے پیچھے کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر فریک نے اٹھالی۔

نبض دیکھنے کے بعد ول نے زخم کا جائزہ لیا۔ فوری طبی امداد ملتی تو کیرین کو بچایا جاسکتا تھا۔ ول نے فریک

زک کو ابھری منی سے آگاہ کیا۔ کیرین کی نبض کمزور تھی۔
”چند رہے تیس منٹ میں ایبولینس یہاں پہنچ رہی ہے۔“ فریک نے بتایا۔

”نو... نو... اپنے چار میں یونیورسٹی اسپتال پہنچانے میں تمہیں دس منٹ لگیں گے۔“ ول نے زور سے

کر کہا۔ ”ایک ایک منٹ جتنی ہے۔“
”مئی کو کیا ہوا؟“ اسی چلائی۔

”کسی بھی طرح کیرین کو دس منٹ میں اسپتال پہنچا دو۔“ ول کے لہجے میں اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔

”مئی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ول نے کہا۔ تاہم وہ دیکھ رہا تھا کہ زیادہ خون بہنے کی وجہ سے زخم ہلاکت خیز

صورت اختیار کر گیا ہے۔
”ہیرا میڈیک، ایبولینس کے ساتھ جلد پہنچ جائیں گے میں ان کو کال کرتا ہوں۔“ فریک نے کہا۔

”اول گاڈ فریک میں ڈاکٹر ہوں... دس منٹ میں کیرین کو اسپتال میں ہونا چاہیے آپریٹنگ ٹیبل پر...“

”لیکن یہ بلی کا پٹر“ ایبولینس“ نہیں ہے۔ اس میں صرف ششیں ہیں۔“ فریک نے وضاحت کی۔

”فریک کوئی فرق نہیں پڑتا... کچھ کرو... یہی چار استعمال کرنا پڑے گا... چاہے ایک آدھ نشست اکھاڑتی

ہی پڑے... وقت ضائع مت کرو... جلدی کرو...“ ول نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

فریک سر ہلا کر پائلٹ کی جانب دوڑا۔
”اسی کہاں ہے؟“ کیرین نے تھابت زدہ آواز

میں کہا۔
”آپ کے پاس۔“ اسی گھٹنوں کے بل ماں کے

پاس بیٹھ گئی۔ ول نے دوبارہ کیرین کی نبض چیک کی اور گہرا

گہرا۔
”ڈیڈی سب ٹھیک کر لیں گے ماما۔“ اسی نے تسلی

دی۔
کیرین نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”میں جانتی ہوں

ہتی۔“
”بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“ اسی نے مصہویت

میں سے کوئی بھی نہیں ملا۔
 ”تھیں یہ ویڈیو کہاں سے لی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نکل اٹھنے کے پاس ایک پرانی آٹھ فی میٹر کی
 مووی تھی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پیچھے بیٹھے ہوئے اٹکل
 کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے اسے ڈسک پر منتقل کر لیا۔“
 اٹکل ایلن اس کا موسیقی کا استاد تھا اور ماضی میں لوٹی
 کروم ویل کے ساتھ بچایا کرتا تھا۔ یہی اس عورت کی ویڈیو تھی
 جو چارلین کی دادی بھی تھی۔
 ”کیا اس ویڈیو کا تعلق لاروگ سے ہے؟“ میں نے
 پوچھا۔

اٹکل نے مسکراتے ہوئے صبح کی۔ ”لاروگ چولی۔
 اس زمانے میں وہاں ثقافتی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔
 سائتار، ڈینو اور سامی ڈیوس جیسے بڑے فنکار وہاں اپنے فن کا
 مظاہرہ کرتے تھے جبکہ لوگ ہماری اسٹار تھی۔ وہ اس علاقے
 میں واحد جگہ تھی جہاں ہمارے لوگ اپنا فن دکھا سکتے تھے۔
 ان دنوں سیاہ قام افراد کو بڑے پیمانے پر رشو کرنے کی
 اجازت نہیں تھی۔“

”یقین نہیں آ رہا کہ ساٹھ کی دہائی میں یہ سب کچھ
 ہو رہا تھا۔“ میں نے اپنا سہرا ہلاتے ہوئے کہا۔
 ”بہت جلد یہ یادگار عمارت مسمار ہونے والی ہے۔“
 ایلن نے کہا۔ ”نکسن تھی کا بیٹا اس جگہ پر ایک بڑی اور نئی
 عمارت تعمیر کرنے والا ہے۔“
 ”تمہارا مطلب ہے کہ ماضی میں لاروگ کو کبھی نہیں
 چھیڑا گیا۔“ میں نے پوچھا۔

ایلن ہنسنے بولا۔ ”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ولیم
 وارنر اب بھی اس جگہ کا مالک ہے۔ حال ہی میں اس کا
 انتقال ہوا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس عمارت کو فروخت
 کرنے سے انکار کیا۔“

”میں وہاں جاؤں گی تاکہ مسمار ہونے سے پہلے
 اسے دیکھ سکوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ عمارت کہاں ہے؟“
 ”مغرب کی جانب۔“ ایلن نے پتا بھجاتے ہوئے
 کہا۔ اس وقت ہماری گاڑی مارکیو پر ایڈیجنگ چکی تھی۔
 اس جگہ کی تجویز میں نے ہی دی تھی کیونکہ وہاں تمام خیمے
 پرانے دور کی عکاسی کرتے تھے۔ چارلین نے ادھر ادھر
 دیکھا۔ شادی کی تقریب میں آنے والے سب لوگ داخلی
 دروازے پر انتظار کر رہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھ کر
 ہاتھ بلایا اور تیزی سے ان کی جانب بڑھی جبکہ میں اور ایلن
 آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے صرف

چارلین کے گھر والے ہی وہاں آئے ہوئے تھے۔ میں
 حیران تھی کہ ابھی تک دولہا والوں کی طرف سے کوئی نہیں
 آیا۔ تاہم میں خاموش رہی۔ چارلین نے شادی کی شوٹنگ
 کی گھرائی کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں لیکن وہ میری
 دوست بھی تھی۔ اس نے مجھے گریگ پوئیر سے بھی ملوایا تھا
 جب تین ہفتے قبل ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور مجھے بڑی
 حیرانی ہوئی جب چارلین نے بتایا کہ گریگ نے اسے اٹکل
 ٹاور پر پھانسی دیا ہے۔ وہ ایک ہینڈم شخص تھا اور ایلن
 یارکر کی قانونی فرم میں جونیئر معاون کے طور پر کام کر رہا تھا
 لیکن مجھے اس پر حیرانی تھی کہ وہ کچھ تیزی دکھا رہے تھے
 لیکن یہ میرا نہیں بلکہ چارلین کا مسئلہ تھا۔

ایلن بھی شاید ایسی لیے حیران تھا۔ اس نے مجھ سے
 کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ بڑی وہ غلطی نہیں کرے گی جو لوٹی
 نے ایک سفید قام شخص سے محبت کر کے کی تھی۔“
 ”تم اس کی دادی کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے
 پوچھا۔

”وہ گلوکارہ تھی۔“ ایلن نے اپنا سہرا ہلاتے ہوئے
 کہا۔ ”بہتر ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔ ماضی کے
 بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔“
 چارلین کی نظر میں کمی کو تلاش کر رہی تھیں اور وہ کسی
 سے فون پر بات کر رہی تھی۔ ”تم کہاں ہو؟“ اس نے کہا۔
 ”ہم سب یہاں ریہرسل کے لیے کھڑے ہیں۔ تم فوراً مجھے کال
 بیک کرو۔“

جب اس نے فون بند کیا تو وہ کچھ خیمے میں لگ رہی
 تھی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ میں اندر جا کر آج رات کی
 ریہرسل کے بارے میں بات کرنا چاہیے کیونکہ تقریب میں
 صرف چند روز باقی تھے۔

جب سب لوگ اندر جا رہے تھے تو اس کا سیل فون
 بج اٹھا۔ میں نے سننے کی کوشش نہیں کی لیکن بتا سکتی تھی کہ وہ
 گریگ کا فون تھا۔ چارلین نے میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا
 اور مجھے اندر جانے کے لیے کہا۔ ایونٹ کو آؤری نیٹر
 مہمانوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں گیٹ کے پاس کھڑی
 ہوئی اور سلاخوں کے پار جھانک لگی۔ میں نے چارلین کو
 گریگ اور ایک لمبے بالوں والے سفید قام کے ساتھ دیکھا
 جس نے بالوں کی پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ وہ ایک گولڈن کلر کی
 نیکس کار کے پاس کھڑے تھے۔ چارلین خوش نظر نہیں
 آ رہی تھی۔ پونی ٹیل والے نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کچھ کہا جو میں
 نہیں سن سکی۔ اس کے بعد وہ اپنی نیکس کار میں بیٹھ کر چلا گیا

جبکہ گریگ اور چارلین کے درمیان اس وقت بھی بحث
 جاری رہی جب وہ داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہے
 تھے۔ جب وہ قریب آئے تو چارلین نے دوبارہ ہم دونوں
 کا تعارف کروایا اور بولی۔ ”ہی، تمہیں میری دوست
 اسٹیو ڈیٹس یاد ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“
 چارلین نے دوسرے لوگوں سے بھی گریگ کا
 تعارف کروایا۔ میں نے اسے بتایا کہ کون سے بورڈ استعمال
 کے جائز ہیں اور یہ کہ وہ فوٹو گرافی کے دوران پس منظر
 میں کون سا بورڈ چاہتی ہے۔

”میں جانتا چاہتی ہوں کہ ان کے پاس لاروگ جولی
 کا علامتی بورڈ ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے سرخ روشنیوں سے لکھے ہوئے
 الفاظ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور
 مجھے لگا کہ وہ رو دے گی۔ چارلین کے والدین وفات پا چکے
 تھے اور اس کے پاس یہی یادیں رہ گئی تھیں۔

”ہی، میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اسے دیکھو۔“
 چارلین نے کہا۔

گریگ نے برا سامنہ بنایا اور بولا۔ ”میں کیوں یہ
 کوئی نشانیاں دیکھوں۔“

مجھے بہت برا لگا۔ دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ مار
 دوں۔ اس کے بعد ریہرسل شروع ہوئی۔ گریگ نے زیادہ
 وقت ہم سے دور رہ کر گزارا۔ اس دوران میں وہ مگرینٹ
 پیتا اور سیل فون پر باتیں کرتا رہا۔ جب ہم نے ابتدائی
 ریہرسل ختم کی تو چارلین نے اچانک کہا کہ ہمارا کام ختم ہو
 گیا اور سب لوگوں کو ڈز کے لیے بلی کے اسٹیک ہاؤس پر
 پہنچنے کے لیے کہا۔ جب لوگ اپنی گاڑیوں کی طرف جانے
 لگے تو اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

”کیا تم کسی کی گاڑی میں بیٹھ کر ڈز کا انتظام کرنے جا
 سکتی ہو؟“ اس کے چہرے پر سختی چھائی ہوئی تھی۔
 ”یقیناً۔“ میں نے کہا اور اس کو غور سے دیکھتے ہوئے
 بولی۔ ”سب ٹھیک ہے نا؟“

اس نے ہونٹ پیچھے ہوتے کہا۔ ”مجھے اسے گھر
 چھوڑنے جانا ہے۔ اس نے بہت زیادہ ڈرنک کی ہے۔“
 میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ میں نے اس کا
 ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”پریشان مت ہو۔ تم میں سے بعد میں ملوں
 گی۔“

میں نے ریستوران والوں سے معذرت کی کہ گریگ

لاح کا انجام

کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور چارلین بہت جلد آجائے گی
 لیکن ایک گھنٹے بعد اس کا فون آیا۔ ”کیا تم مجھ سے باہر
 آ کر مل سکتی ہو؟“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی جیسے وہ روٹی
 رہی ہو۔

میں نے لیڈی رومز میں جانے کا بہانہ بنایا اور بیرونی
 دروازے سے باہر آ گئی۔ اس کی ٹوپوٹا کسیری پارکنگ
 لاٹ میں کھڑی تھی۔ جب میں قریب پہنچی تو وہ گاڑی سے
 باہر نکلی اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری طرف
 بڑھی جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔
 اس کا بایاں گال سرخ ہو رہا تھا۔ اس پر سوچن آ گئی تھی اور
 اس کے سفید بلاؤز پر سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”گریگ۔“ اس نے کہا اور گالوں پر آنسو بہنے
 لگے۔ ”اس نے مجھے مارا ہے۔“

میں نے اسے گلے لگایا اور اسے لے کر داخلی
 دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔
 وہ بولی۔

”اٹیشی، میں نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے اس حالت
 میں دیکھیں۔“

”تم اندر چل کر اپنا حلیہ درست کرو۔ باقی باتیں ہم
 بعد میں کریں گے۔“

ہم لیڈی رومز میں گئے اور میں نے تو لیا یا میں بیٹھو
 کر اس کے چہرے سے مسکار صاف کیا۔ اس نے کچھ کہنا
 چاہا لیکن ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ
 حائل سکیاں لے رہی تھی۔ اس نے مجھے پورا واقعہ سنایا۔
 اس کے اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہی ان
 کے درمیان جھگڑا ہوئی۔ وہاں پہنچ کر گریگ نے اصرار
 کیا کہ وہ اس کے ساتھ اوپر چلے۔ وہ کچھ کاغذات پر اس
 سے دستخط کروانا چاہتا تھا۔ وہ کچھ قانونی کاغذات تھے۔ جب
 اس نے انہیں پڑھنا چاہا تو وہ بھٹ پڑا، اور چلا تے ہوئے
 بولا کہ ان پر فوراً دستخط کرو۔

”اس نے میرے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے۔“
 چارلین نے شکایت آواز میں کہا۔ ”میں نے وہ کاغذات پھاڑ
 دیے تو اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ میں نے بھی اسے جواب
 میں تھپڑ مارا۔ پھر اس نے مجھے گھونے مارے اور نیچے گرا
 دیا۔“

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جو کچھ سن رہی تھی،
 اس کے بارے میں تصور کرنا بھی محال تھا۔

چارلین کے پاس تھیں۔ ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے لگتا ہو کہ کسی اور طریقے سے دروازہ کھولا گیا ہو۔ بہر حال میں اس پر غور کروں گا۔“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ اب مجھے اپنے طور پر ہی اس معاملے کو دیکھنا ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا چارلین سے ملاقات ہو سکتی ہے لیکن اس نے کہا کہ اس کی اجازت نہیں ہے۔ ابھی اس پر فردرجم عائد نہیں کی گئی ہے اور وہ اسے بہتر کھٹے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

”کم از کم میری اس سے فون پر بات کروادو۔“
”میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“
”شکریہ مائز۔ میں تمہاری احسان مند ہوں گی۔“
ایک گھنٹے بعد اس نے مجھے دوبارہ فون کیا لیکن اس کے انداز سے معلوم ہو گیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔

”اچھی خبر سننا چاہتی ہو یا بڑی؟“
”کہا اس کی کوئی اہمیت ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”پہلی بات تو یہ کہ تمہاری گرل فرینڈ کے دوست کو

بہت قریب سے گولی ماری گئی ہے۔ ایک پڑوسی نے انہیں لڑتے ہوئے سنا پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس نے فوراً ہی ٹائٹن الیون پر فون کیا۔ پولیس پہنچی تو وہ مر چکا تھا۔ بعد میں چارلین کو آگے کل سمیت گرفتار کر لیا گیا جو اس کی کار سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے بلاؤز پر بھی خون کے دھبے لگے ہوئے تھے جو ابھی۔۔۔“

مائز چند سیکنڈ خاموش رہا پھر بولا۔ ”لیکن اسے ایک اچھا دیکھ ل گیا ہے۔“

”کیا میں اس کا نام جان سکتی ہوں؟“
”بجائے جے ہیوم۔ اس کا شمار چوٹی کے دیکھوں میں ہوتا ہے۔“

”واقعی لیکن میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔“
مائز قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اسے ٹی وی چینل کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں حیران رہ گئی کہ چارلین کس طرح اتنا بڑا وکیل کر سکتی ہے۔ ”کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟“

”نہیں لیکن میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے جب وہ اسے کھڑی سے باہر لائیں گے تو وہ تمہیں فون کر سکے گی لیکن تمہارے پاس صرف تین منٹ ہوں گے اور یہ گفتگو ٹیپ ہوگی۔“

میں سیدھی پولیس اسٹیشن پہنچی اور اپنا تعارف کروایا۔ شیشے کے پیچھے بیٹھی ایک عورت نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور

”میں توقع کر رہی تھی کہ شاید تم کچھ کر سکو۔ بہر حال میں اس سے پہلے ایک کل کے کیس کو حل کرنے میں تمہاری مدد کر چکی ہوں۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بعد میں فون کروں گا۔“

”شکریہ مائز۔“ میں نے کہا اور تقریب میں موجود لوگوں سے معذرت کر کے گھر آگئی۔ جب کافی دیر تک مائز کا فون نہیں آیا تو میں نے خود ہی اس سے رابطہ کر کے پوچھا۔

”تم نے کچھ بتا لگایا۔“
”وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، اور تم اسے پسند نہیں کر دو گی۔“
”تم بتاؤ تو سہی۔“

”اس کے ایک پڑوسی سے میری بات ہوئی ہے جس نے ان دونوں کو بحث کرتے ہوئے سنا اور اس کے بلاؤز پر خون کے دھبے دیکھے۔“

”وہ کل دان سے لگے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب اس نے چارلین کو دھکا دیا تو اس نے جواب میں اس کے سر پر کل دان دے مارا، کیا یہ عمل ذاتی دفاع کے زمرے میں نہیں آتا۔“
”اس کے منہ پر گولی لگی ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ پولیس والے نے مجھے یہی بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسی نے گولی چلائی ہوگی۔“

”اس کی کار سے گن برآمد ہوئی ہے۔“
”اسے پھنسا لیا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو ایشی، اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو تشدد زور عورت ثابت کرے جو اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس کا محبوب ایک نا کام و محروم شخص تھا جسے ایلین بارکر نے بھی معطل کر دیا تھا مگر چارلین اعتراف کرے تو شاید وہ اس سے معاملہ طے کر لیں۔“

”کیا اعتراف جبکہ اس نے یہ قتل نہیں کیا۔“
”یقینی طور پر یہی لگتا ہے کہ اس نے ہی یہ قتل کیا ہے۔“

”میں نے پارکنگ لاٹ کے گرد ایک گولڈن کلر کی لیکس دیکھی تھی۔ ممکن ہے کہ کسی نے اس کی کار میں گن رکھ دی ہو۔“

”وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”جب پولیس نے وہ گن برآمد کی تو کار کے دروازے منقل تھے اور چابیاں

اور چارلین سے کہا۔ ”وکیل کے آنے تک تم اپنی زبان بند رکھنا۔“

دوسرے پولیس والے نے مجھے وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہا تو میں بولی۔ ”کم از کم اتنا بتا دو کہ اسے کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟“

اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھما لیں اور بولا۔ ”قتل، اس کا بواؤ فرینڈ مر چکا ہے۔“

”قتل۔“ میں نے یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ اس کے سر پر کل دان مارا تھا لیکن۔۔۔۔“

اسکوڈ کار چارلین کو لے کر چلی گئی اور میں وہاں کھڑی دیکھتی رہی کہ ایک ٹرک اس کی کار کو کھینچے ہوئے لے جا رہا ہے۔

”کیا تم مجھے اس کی کار لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ میں نے دوسرے پولیس والے سے کہا۔
اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اطلاع ملی ہے کہ اس نے اپنی کار میں گن رکھی ہوئی ہے۔“

”مگر اس کے پاس تو کوئی گن نہیں ہے۔“
”وہ طنز بے انداز میں بولا۔ ”ہاں، میرا خیال ہے کہ اس نے اسے گولی بھی نہیں ماری۔“

مجھے رونا آ گیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہی گولڈن کلر کی لیکس کار پارکنگ لاٹ سے باہر آرہی تھی۔ میں اندر گئی اور چارلین کی آغوش میں گریں لگائی۔

میں شکر نہیں کر سکتی کہ میں نے اپنا فون نکالا اور ان لوگوں کے نمبر تلاش کرنے لگی جن سے کچھ مدد مل سکتی تھی بالآخر مجھے ایک ایسا نمبر مل ہی گیا۔ سراخ رساں مائز نے میری بات سن کر کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ تمہارا واسطہ ایک اور کل سے پڑ گیا ہے۔“

میری ملاقات مائز سے کچھ عرصے قبل ہوئی تھی جب میرے ایک کلائنٹ کا کل ہوا اور مجھ پر شبہ کیا جا رہا تھا وہ اتنا برا نہیں تھا لیکن اسے اچھا بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن ہماری دوستی نہیں تھی تاہم ایک قربت ضرور ہو گئی تھی۔

”اس کی بھینرین مدد یہ ہوگی کہ اس کے لیے ایک اچھا سا وکیل تلاش کرو۔“ مائز نے مشورہ دیا۔

”تمہارے پاس کہنے کے لیے یہی کچھ ہے؟“ میں نے طنز آ کہا۔

”اس لیے کہ یہ ایک سیدھا سادہ کیس ہے۔“

”اس لیے کہ یہ ایک سیدھا سادہ کیس ہے۔“

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اس کے سر پر کل دان دے مارا۔ اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں دروازے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور کار کی طرف بھاگی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کار دوڑاتی رہی پھر یہاں چلی آئی۔“

میں نے اس سے کہا کہ تھوڑی سی برف لے کر آئی ہوں لیکن اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور انکار میں سر ہلانے لگی۔

”دیکھو، تمہیں ان چٹوئوں پر کچھ لگانے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے بعد ہم پولیس کو فون کریں گے۔“

”پولیس۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔
”ہاں، کسی مرد کو اس طرح تم پر تشدد کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“

اس نے نظریں جھکا لیں اور بولی۔ ”یہاں سے چلو۔ اس وقت میں کسی کا سامنا نہیں کر سکتی۔“

”ہم باہر آئے۔ دیکھا تو دو پولیس والے اس کی کار کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔“

”یہ تمہاری کار ہے؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔
چارلین نے اثبات میں سر ہلایا تو پولیس والے نے ریڈیو پر کوئی بات کی اور جب سے ہتھکڑی نکال لی۔ جیسے ہی اس نے چارلین کی کلائی پکڑی تو میں نے کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ تو خود مصیبت زدہ ہے۔“
”یہ زیر حراست ہے۔“ پولیس والے نے اس کے بازو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”کس جرم میں؟“ میں نے پوچھا لیکن اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور چارلین کو اپنی اسکوڈ کار کی طرف لے جانے لگا۔ جبکہ دوسرے پولیس والے نے اس کے پرس کی تلاشی لے کر کار کی چابیاں نکال لیں اور ریوٹ کاٹن دبا دیا۔

”کیا تمہارے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمیں یقین ہے کہ ہم نے صحیح گاڑی ضبط کر لی ہے۔“

”ضبط کر لی۔ مگر کیوں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

پولیس والے نے مجھے نظر انداز کر دیا اور دوبارہ ریڈیو پر بات کرنے لگا۔ میں دوڑتی ہوئی اسکوڈ کار تک پہنچی



آج بھی کھانے کا دعوت نامہ نہیں آیا.....
ہم ہر شام تیار ہو کر انتظار کرتے ہیں

تمہاری ہمدردی میں یہاں آگیا تاکہ تمہیں کسی مشکل سے بچا سکوں۔

”اس نے کہا تھا کہ کاری چاہوں گا ایک سیٹ اور بھی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی کار میں کبے رکھی ہوگی۔“

وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”نور! یہاں سے نکلو۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کروں۔ میں کاری چاہیوں یا پچھنے ہوئے کاغذات تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اگر یہ چیزیں پولیس کے پاس نہیں ہیں تو کوئی اور شخص

انہیں لے گیا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چیزیں کتنی اہم تھیں۔ گرگ چاہ رہا تھا کہ چارلین کسی چیز سے دستبرداری کے لیے دھتکا کر دے۔ جب اس نے کاغذات کو پڑھے بغیر

دھتکا کرنے سے انکار کیا تو دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ چارلین نے کاغذات بھاڑ دیے اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کے بعد کسی نے گرگ کو کوئی مادی اور اس کی کار سے گن

برآمد ہوئی۔ ان واقعات کی کڑیاں ملاتے ہوئے مجھے ایک بات اور یاد آئی۔ وہ گولڈن میکس کار جسے میں نے پارکنگ

لاٹ سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا، ممکنہ طور پر گرگ کے بھائی جری کی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے پاس بھی ایسی ہی گاڑی تھی۔ جس میں اس نے گرگ کو رہسہل والے دن چھوڑا

تھا۔ اب مجھے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ میں نے اپنا آئی فون نکالا اور فیس بک چیک کرنے لگی۔ پہلے میں نے چارلین کا صفحہ دیکھا جس سے میں گرگ کے صفحے پر پہنچی تھی جس پر اس کی برادری کے افراد کی فہرست

تالے میں چابی گھمائی اور شپ کے پیچے سے گزر گئی۔ اندر اندر جہاں لہذا میں نے لائٹ جلا دی اور سروں کی تلاشی لینے لگی۔ نہیں جانتی تھی کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے البتہ میری خواہش تھی کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے چارلین کی بے

گناہی ثابت ہو سکے۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دھک دی تو میں پریشان ہو گئی۔ کہیں اصل قاتل تو میرا

تقاب نہیں کر رہا۔ دوسری بار دھک کے ساتھ ہی مجھے ایک جانی بچانی آواز سنائی دی۔ ”دروازہ کھولو۔ میں جانتا ہوں کہ تم اندر ہو۔ میں نے تمہارا ٹرک دیکھ لیا ہے۔“

یہ باز تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بولی۔ ”اچھا ہوا، تم بھی آگئے۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ پولیس کے کام میں مداخلت کرنے پر تم کو بڑی مشکل میں پھنسن سکتی ہو؟“

”یہ کل چارلین نے نہیں بلکہ میں اور نے کیا ہے۔ اسے پھنسا یا جا رہا ہے۔ یقین کرو۔ میں بھی ایسی ہی صورت حال سے گزر چکی ہوں۔“

”بہتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔“ وہ بولا۔ میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ ”کیا تمہیں ان

پچھنے ہوئے کاغذات کے بارے میں کچھ پتا چلا؟“ وہ ہنسنی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”میں نے متعلقہ

سراغ رساں کو فون کیا تھا لیکن انہیں جانے وقوعہ سے ایسے کاغذات نہیں ملے۔ وہ اس کل کو گھر لیٹ کر کا شخسانہ مجھ

رہے تھیں۔“ میں جھٹاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے کہ انہوں نے اپنا ڈھن بنالیا ہے۔ کوئی ایسا شخص بھی ہے جو چارلین کی حمایت میں بول سکے۔“

”اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا وکیل آیا تھا اور اس نے چارلین سے کہا ہے کہ وہ عدالت میں پیش

ہونے سے پہلے کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ ثبوت کے بغیر ہم اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔“

”کم از کم تم ان کاغذات کو تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو؟“ میں نے کہا۔ اس نے مایوسی کے انداز میں کہا۔ ”وہاں اس طرح

کے کوئی کاغذات نہیں تھے۔“ ممکن ہے کہ کوڑے دان میں پھینک دیے گئے ہوں۔“

”تم کچھ سے کہ دو میں غوطہ لگا چاہتی ہو۔ میری گزارش ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ میں صرف

کسی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہونے میں دس سیکنڈز گئے ہیں۔“

”خدا حافظ ایشی۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تم میری خاطر عدالت میں آؤ گی؟“

میں نے کہا ضرور آؤں گی تو، وہ بولی۔ ”کیا تم میری آنٹی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو بتاؤ گی کہ میرے ساتھ

کیا ہو رہا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔“ ”کہہ دوں گی لیکن تم نے جری کا پورا نام نہیں بتایا۔“

اس نے رونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔ ایک پولیس والا بڑا سا پلاننگ بیگ لے کر آیا جس میں چارلین کا پرس بھی تھا۔ اس نے بیگ کھول

کر اس میں رکھے ہوئے سامان اور نقد رقم کی فہرست بتائی اور میں نے دھتکا کر کے وہ چیزیں وصول کر لیں اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ اب مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا

کہ وہ کیسے کاغذات تھے جن پر گرگ دھتکا کر دانا چاہ رہا تھا۔ یہ جری کون ہے اور وہ پارکنگ لاٹ میں کیا کر رہا تھا۔

اگر میں اس کی برادری کے بارے میں پتا کروں تو اس کا پورا نام بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے چارلین کا پرس کھول کر چاہیاں دیکھیں۔ ان میں انیشن کی نہیں تھی۔ اس کے

اپارٹمنٹ کو ایک نظر دیکھا لیکن ضروری تھانیں پہلے میں نے مارگز سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”اب کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے چارلین سے بات کروانے اور اس کا سامان دلوانے میں میری مدد کی پھر

پوچھا۔ ”کیا جانے وقوعہ سے کچھ پچھنے ہوئے قانونی کاغذات بھی ملے ہیں۔“

اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا پھر بولا۔ ”اب میں سمجھا۔ تم نے صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون نہیں کیا

بلکہ ایک بار پھر بلا اجازت تحقیقات کا منصوبہ بنائی ہو۔“ میں نے معصوم بننے ہوئے کہا۔ ”بالکل نہیں، البتہ

مجھے جیسے ضرور ہے۔ کیا تم میری خاطر یہ معلوم کر سکتے ہو۔“ ”یہ میرا کیس نہیں ہے۔ پہلے ہی غیر ضروری طور پر اس میں ٹانگ اڑا چکا ہوں۔“

”تھوڑی سی اور سہی۔ اس سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

دس منٹ بعد میرے فون کی گھنٹی بج گئی۔ ”تمہاری آواز سن کر بہت اچھا لگا۔“ میں نے

چارلین سے کہا۔ ”تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو لیکن یہ ایسا ڈراما خواب ہے جو مجھے تم نہیں ہوگا۔ گرگ مر چکا ہے۔“

”جانتی ہوں، تمہارا وکیل کیا کہتا ہے؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”کچھ نہیں۔ اس نے صرف اتنا

کہا کہ امی میں کچھ نہ بولوں جب تک وہ مجھ سے مل نہیں لیتا۔“ ”اور پہلی پیشی کب ہوگی؟“ میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ پرسوں، اس وقت تک اسی کوٹھڑی میں بند رہوں گی۔“

اس نے مجھ سے پوچھا کہ ریسٹوران میں کیا ہوا تھا تو میں نے کہا۔ ”اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ جب تم گرگ کو اس کے گھر لے کر گئیں تو

وہاں کیا ہوا تھا؟“ اس نے وہی کہانی دہرائی کہ گرگ نشے میں دھتکا تھا۔ جب وہ گھر پہنچے تو اس نے کچھ کاغذات نکالے اور کہا

کہ ان پر دھتکا کر دوں۔ ”وہ کیسے کاغذات تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ان میں کچھ قانونی باتیں لکھی ہوئی تھیں جیسے میں

کسی جگہ کے بارے میں اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤں۔“ میں نے انہیں پڑھنے کی کوشش کی اور جب اس سے پوچھا

کہ یہ کیا ہے تو وہ صفحے میں آگیا۔ ہم ایک دوسرے پر چلانے لگے۔ میں نے وہ کاغذات پھاڑ کر اس کے منہ پر دے

مارے۔ ”پھر کیا ہوا؟“ ”پھر؟“ اس کی آواز گھٹنے لگی۔ ”اس نے مجھے دھکا

دیا۔ باقی تم جانتی ہی ہو؟“ ”کوئی شخص تمہیں پھنسانا چاہتا ہے۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ اس نے کہا۔ ”کسی اور کے پاس بھی تمہاری کاری چالی ہے؟“

میں نے پوچھا۔ ”نہیں، البتہ میرے پاس گھر پر ہنگامی ضرورت کے لیے دوسری چابی ہوتی ہے۔“

”کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جس کے پاس گولڈن ایکس کار ہو؟“

”ہاں، گرگ کا منہ بولا بھائی جری!“

”اس کا پورا نام کیا ہے؟“

سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ تقریباً تیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی لیکن جری کے بجائے کوئی اور شخص بول رہا تھا۔ ”میرا نام بریڈ ہے اور مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہو گی۔“

”میں نے جری ٹیم سے بات کرانے کے لیے کہا تھا۔“

”آج جری کی ڈیوٹی نہیں ہے لیکن مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی، ہم سب بنگامن ہیوم کے لیے کام کرتے ہیں۔“

”تب میں تمہیں مشورہ دوں گی کہ اپنے ذرائع استعمال کر کے جری سے رابطہ کرو اور اس سے کہو کہ وہ مجھے فون کرے۔ میں اپنی بات دہرانا پسند نہیں کرتی۔“

”تم نے کسی ہنگامی حالت کا ذکر کیا تھا پھر مجھے اپنا مسئلہ کیوں نہیں بتاتیں؟“

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں بلکہ تمہارے ساتھی جری کو ہے۔“ میں نے اسے چند سیکنڈ سوچنے کے لیے دیے پھر کہا۔ ”اے صرف اتنا بتا دینا کہ میرے پاس گریگ کا لیپ ٹاپ ہے اور اس میں کچھ ایسی دستاویزات ہیں جن سے اسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”لگتا ہے کہ میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔“

”پریشان مت ہو۔ جری سمجھ جائے گا۔ اے بتا دینا کہ اگر اس نے دس منٹ میں فون نہ کیا تو میں کسی اور سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔“

”دیکھو گے کہ تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”مکس براؤن!“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے پسینے آنے شروع ہو گئے۔ میں نے پانی میں پتھر پھینکا تھا۔ اب مجھے سوچنا تھا کہ اچانک حملے کی صورت میں کیا کرنا ہے۔ اگر جری، گریگ کی موت میں ملوث ہے تو ان دونوں نے رف میل کیا تھا۔ اب مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی، مائز کو فون کرنا چاہا لیکن رک گئی، مجھے خاموش رہنا تھا جب تک کوئی خوش ثبوت نہ مل جائے۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں جری نے مجھے فون کیا اور بولا۔ ”کیا ہم پہلے مل سکتے ہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہمارا ایک مشترکہ

دہان پہنچی تو ایک بڑا سپورڈنگ ہوا تھا۔ ”بہت جلد آرہا ہے۔“ نین ٹینی جو تیزی کی طرف سے شائدارتھا۔ اس کے ساتھ ہی مزید معلومات جاننے کے لیے فون نمبر بھی دیا ہوا تھا۔ مجھے اس اشتہار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن گیٹ پر لگے ہوئے ایک سرخ رنگ کے سائن بورڈ کو دیکھ کر میں چونک گئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ ”کام روک دیا جائے“ گویا کوئی دوسرا فریق اس منصوبے کو مکمل نہیں ہونے دینا چاہتا۔ میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کیا کہ وہ کون ہو سکتا ہے پھر میں نے ایلین پارکرامی قانونی فرم سے رابطہ کر کے اپنا نمبر انہیں دے دیا تاکہ وہ مجھے کال بیک کر سکیں۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد میرے فون کی گھنٹی بجی۔

”میں ایلین پارکرامی سے بول رہا ہوں۔“ ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ”تم نے کسی ایئر جیسی کے بارے میں فون کیا تھا؟“

”ہاں، میرا ایک دوست گرفتار ہو گیا ہے۔“

”کس الزام میں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ”میں تمہاری فرم کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کی ایجنسی وہیل کا نام تجویز کر دے گی۔ کیا یہ وہی فرم ہے جو ٹیم وارنر کی جائداد کے معاملات دیکھتی ہے؟“

چند سیکنڈ بعد اس نے ہاں میں جواب دیا لیکن اس کی آواز سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔ ”تمہیں کس نے اس فرم کا نام بتایا؟“

”میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا گریگ بویز تمہاری فرم کے لیے کام کرتا ہے؟“

اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟“

”فوکس براؤن۔“ وہ معاف کرنا، ایک اور کال آ رہی ہے۔ میں نہیں بعد میں فون کروں گی۔“

تمام چیزیں ایک لمحے کی شکل میں سامنے آ رہی تھیں۔ گریگ اسی قانونی فرم کے لیے کام کر رہا تھا جو ٹیم وارنر کی جائداد کے معاملات دیکھتی تھی۔ وہ چارلین سے ان قانونی کاغذات پر دستخط کروانا چاہ رہا تھا جن کے مطابق وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جاتی۔ اس کا منہ بولا بھائی جری، اسی فرم میں ٹینکس کینی جو تیزی کے نام سے کام کر رہا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے سری کو فون کر کے بنگامن ہیوم لاء فرم کا ہنگامی فون نمبر مانگا اور جری ٹیم

بھی بولنا شروع کر دیا۔ ”لیکن وہ لاروگ کے مالک ولیم وارنر سے محبت کرنے لگی اور پھر وہ حاملہ ہو گئی اور لوگوں سے چھپنے لگی پھر وہ اپنے والدین کے پاس نارٹھ کیرولینا چلی گئی اس کے بعد۔۔۔۔۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”ڈیویری کے دوران اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی بہن نے بچی کو پالا۔“

”اوہ، یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ ولیم وارنر نے اس بچی کی ذمہ داری قبول نہیں کی؟“

”میں نہیں جانتا کہ کوئی نے بچی کے باپ کے بارے میں کیا بتایا ہوگا۔ مجھے تو بھی معلوم نہیں کہ وارنر کو اس بچی کے بارے میں پتا تھا یا نہیں۔ وہ چھوٹی سی لڑکی ایک دن جوان ہو گئی اور شادی کے بعد اس نے بھی ایک بچی کو جنم دیا۔“

”اوہ میرے خدا!“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”وہی بچی، چارلین کی ماں تھی؟“

ایلین ہنکراتے ہوئے بولا۔ ”تم واقعی ایک اچھی سربراہ رسا ہو۔“

”تم ولیم وارنر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے پہلے بتایا تھا کہ وہ بھی لاروگ جولی کو نہیں فروخت کرے گا۔“

”مگر اب وہاں کوئی سرگرمی نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود وارنر نے عمارت کو اسی حال میں رہنے دیا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے اپنی وصیت میں یہ جائداد کوئی کے وارثوں کو دے دی تھی لیکن اس کے انتقال کے بعد گھروالوں نے اس کا سودا ٹینکس کینی کے بیٹے سے کر دیا جو وہاں ہوٹل اور شاؤنگ پلازہ بنانا چاہتا ہے۔“

مجھے اچانک ان کاغذات کا خیال آیا جن پر گریگ، چارلین سے دستخط کروانا چاہ رہا تھا۔ ”تم وارنر خاندان کے وہیل کا نام جانتے ہو؟“

”شاید بنگامن ہیوم ہے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

اس کا گھر آ گیا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا، اور کہنے لگا۔

”مجھے بتاؤ کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس بہت زیادہ پیسے نہیں ہیں لیکن اگر چارلین کو میری مدد کی ضرورت ہو تو۔۔۔۔۔“

میں نے کہا کہ اگر ضرورت ہوئی تو ضرور بتاؤں گی پھر میں نے اپنے ٹرک کارخ لاروگ جولی کی طرف موڑ دیا۔

موجود تھی۔ میں نے اس میں جری، نام کے شخص کو تلاش کرنا شروع کیا جو گریگ کا ہم عمر ہو۔ اس نام کا ایک ہی شخص تھا جری ٹیم اور جب میں نے اس کی فیس بک پر تصویر دیکھی تو یہ وہی شخص تھا جس نے گریگ کو ذرا پک کیا تھا۔ وہ نیرونی کا رہنے والا تھا اور بحیثیت وکیل بنگامن بے ہیوم، جیسے مشہور قانونی فرم میں کام کرتا تھا۔

میں نے گہری سانس لی۔ کچھ اشارے ضرور مل رہے تھے لیکن ابھی تک کوئی واضح جواب نہیں مل رہا تھا۔ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے چارلین کا اٹکل ایلین بول رہا تھا۔ ”میں یہاں ریٹائرمنٹ میں بیٹھا ہوں۔ سب لوگ جا چکے ہیں اور مجھے کسی سواری کی تلاش ہے۔“

میں وہاں سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے پیسٹے ہی پوچھا۔ ”چارلین کی مشکل میں ہے؟“

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ہاتھ روم جانے کے لیے کھڑکی کے پاس سے گزرا تو میں نے تمہیں، چارلین اور پولیس کو باہر کھڑے دیکھا۔“

میں نے اسے مختصر پوری بات بتائی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے وہ شخص بھی اچھا نہیں لگا۔ یہ معاملہ بھی بے چاری لوٹی سے ملتا جلتا ہے۔“

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہے۔ اب اس کے بارے میں بات کرنا بیکار ہے۔“

”تمہیں بتانا ہوگا۔ میں جانتا چاہ رہی ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ تاکہ میں چارلین کی مدد کر سکوں۔“

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ کہانی اب بہت پرانی ہو چکی ہے اس زمانے میں بہت سی باتیں مختلف تھیں۔ گورے اور کالے بہت کم ملتے تھے اور وہ بھی مکمل عام نہیں۔“ اس نے لب بلبھتے لیے جیسے سوچ رہا ہو کہ مجھے کیا بتائے پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”یاد ہے“ میں نے تمہیں لاروگ جولی کے بارے میں بتایا تھا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”لوٹی اس زمانے میں انار تھی۔ وہ بھی ایلا ٹر گیلر اور نیتا سیون کی طرح مشہور ہو سکتی تھی لیکن۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ گاڑی ایک سنگل پر رکی ہوئی تھی۔ سبز اشارہ ملا تو اس نے

شما ضرور ہے۔ شاید مجھے اس کا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔“

وہ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ تمہارے پاس میری دلچسپی کی کوئی چیز ہے؟“

”ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔ اس لیپ ٹاپ میں ایک دستاویز ہے جو واقعی دلچسپ ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”میں تمہیں صرف تین لفظ بتاؤں گی، لاروک جولی۔“

”یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”اگر تم اس میں دلچسپی رکھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“

”میں اتنی تیزی نہیں دکھانی چاہیے۔“ وہ بولا۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے آج رات کو ملو اور میرا معاوضہ دے دو۔ ورنہ پھر پولیس کا انتظار کرو جو تمہارے دروازے پر کھڑی ہوگی۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس کی سریلی آواز سنائی دی۔ ”تمہیں کتنے پیسے چاہئیں؟“

”میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ ڈالر ٹھیک رہیں گے۔“

”میں اتنے کم وقت میں اس رقم کا انتظام نہیں کر سکتا۔“

”اپنے پاس کے پاس جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ بندوبست کر سکتا ہے۔“

اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں تمہیں وقت اور مقام بتاؤں گی۔ جب تم فون کر کے تصدیق کر دو گے کہ رقم کا انتظام ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہو جائے گا۔ صرف اتنا بتا دو کہ کہاں ملتا ہے؟“

میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اس پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی چنانچہ بے اختیار کہہ دیا۔ ”مار یوگر یو یارڈ۔“

”وہ رات میں بند ہوتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”جانتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم وہ رقم وہاں چھوڑ دینا اور میں تمہیں بتاؤں گی کہ لیپ ٹاپ کہاں ہے؟“

”تم مجھے بے وقوف نہ سمجھو۔“ یہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کا معاملہ ہے ورنہ بات ختم سمجھو۔“

میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے

محسوس کر لیا تھا کہ اس گفتگو کو ریکارڈ کرنے کی ضرورت ہے۔

اب مجھے اس سے اعتراف کروانا تھا کہ اس نے گریگ کو قتل کیا اور چارلین کی گاڑی میں گن رکھ دی۔

”میں تمہارا منصوبہ سمجھ گئی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جب تم اس جگہ کے لیے روانہ ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔“

میں نے رابطہ منقطع کیا اور اپنی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اب تک مجھے صرف یہ حاصل ہوا تھا کہ میں ایک ممکنہ قاتل سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہوئی تھی اور میرے پرس میں ایک ہتھیار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے مارٹر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی

جب میں نے اسے بدحواسی کے عالم میں ایک پیغام بھیجا اور اسے پوری صورت حال بتانے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ اگر میں وہاں پہلے پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو میرے پاس موقع تھا کہ وہاں کوئی چڑھ کر سکوں گو کہ میرے پاس کوئی لیپ ٹاپ نہیں تھا لیکن اگر جری بیسوں کے ساتھ وہاں آجاتا تو اس طرح وہ بھی پولیس کی نظر میں چارلین کی طرح مشتبہ ہو سکتا تھا۔

جب میں گریو یارڈ پہنچی تو پوری عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن احاطے میں تمام نیون سائن روشن تھے جبکہ بقیہ حصہ سنسان تھا۔ یہ عمارت ایک باؤک اور خالی پلاٹ کے برابر تھی اور مرکز کے پار پارکمنٹ پر مشتمل دو عمارتیں خالی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹرک ایک جگہ کھڑا کیا اور اس میں سے ایک شاٹنگ بیگ اور دو فیشن میگزین نکالے، انہیں بیگ میں رکھ کر ایک بیڈل بنایا اور اسے ربر بینڈ سے باندھ دیا۔ اب وہ دور سے دیکھنے میں لیپ ٹاپ کے مانند ہی لگ رہا تھا۔

میں نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور ایک بار پھر مارٹر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ جری کی کال آ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں ایک بلاک کے قاصطے پر ہوں، تم کہاں ہو؟“

”بہت قریب۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے فون کال ریکارڈ کرنا شروع کر دی تاکہ اس سے کچھ انگوٹھیں لیکن مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی، میں نے کہا۔ ”تم اس راستے پر سیدھے چلے آؤ۔ تم پیسے دینا اور میں مطلوبہ چیز تمہارے حوالے کر دوں گی۔ ویسے بانی داوے تم کو سی گاڑی چلا رہے ہو؟“

اس نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا پھر میرے دوبارہ ہیلو کہنے پر بولا۔ ”میں لیکس میں ہوں۔“

الاحکام انجام

اسٹیرنگ گھمایا لیکن وہ میرے دائیں جانب آکر گر لیا۔ میرا ٹرک ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اب ایک آپ نے ایک بار پھر سامنے والے حصے پر نگر ماری اور میں آگے کی طرف لڑھک گئی۔

میں نے دروازے کو دھکا دیا اور باہر آ گئی۔ البتہ وہ مصنوعی پیٹت وہیں چھوڑ دیا۔ اس امید پر کہ وہ اسے لیپ ٹاپ سمجھ کر میرا تعاقب نہیں کریں گے لیکن ایسی قسمت نہیں تھی۔ میں نے گریو یارڈ کے عقبی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جری مجھ سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا جبکہ دوسرا شخص بھی میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جاؤں۔

عمارت کے چاروں طرف باڑھ لگی ہوئی تھی لیکن اس میں ایک جگہ غلط نظر آیا جو میرے چھپنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اپنے دونوں بازو میوزیم کی دیوار پر رکھے اور اس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں دوسری طرف چھلانگ لگانے ہی والی تھی کہ جری نے مجھ سے دیکھ لیا۔ وہ پچیس فٹ کے فاصلے پر گن لیے کھڑا ہوا تھا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے چلانے لگا لیکن میں نیچے کی جانب جھکی اور نیون سائن کے درمیان دوڑنے لگی پھر ایک تاریک جگہ پر میں نے ٹھنوں کے بل بیٹھ کر اپنا سیل فون نکالا چاہا لیکن وہ کہیں گر گیا تھا۔ جری اور دوسرا آدمی باڑھ کے باہر ہی رک گئے اور جری نے کہا۔ ”وہ اندر ہے۔“

”پھر ہم بھی باڑھ بھٹکا لیتے ہیں۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”اتنی تیزی مت دکھاؤ۔“ جری نے کہا اور سیل فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ دوسری جانب سے کسی نے کہا۔

”نیلسن، تم پہنچ گئے؟“

”ہاں۔“

”لیپ ٹاپ کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ اس نے جو چیز بھیجی وہ جعلی تھی۔“

”دفع کرو۔ وہ لڑکی بھاگتے نہ پائے۔“

”میں اور فریڈی اس کے پیچھے جارہے ہیں۔“ جری نے کہا۔

اس نے سیل فون جیب میں رکھا اور باڑھ پر چڑھنے لگا۔ میں ٹھنوں کے بل چلتی ہوئی ایک بڑے سے بورڈ کی آڑ میں چھپ گئی۔

”تم اس جانب جاؤ۔“ جری نے کہا۔ اگر اسے دیکھ لو تو گولی مت چلانا جب تک ہم اس سے لیپ ٹاپ کے

”ٹھیک ہے۔ باتیں کرتے رہو۔ میں تمہاری گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ لوں گی۔“

”تم اس معاملے میں کیسے شامل ہو گئیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”اور یہ لیپ ٹاپ تم نے کیسے حاصل کیا؟“

”میں گریگ کو ہلکے سے جاتی تھی۔ اس نے چارلین کی خاطر مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن میرے پاس اب بھی اس کے گھر کی ڈپلیکٹ چابیاں ہیں۔“

اس نے تہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس لحاظ سے تو وہ واقعی خوش قسمت تھا۔“

”تم اسے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، اس کے لیے میں بڑے بھائی جیسا تھا۔“

اسی لمحے میں نے اس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ اب میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”پھر تم نے اسے قتل کیوں کیا؟“

اس نے ایک اور تہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کون کہتا ہے کہ میں نے اسے قتل کیا؟“

”رہے دو۔ وہ تم ہی تھے۔ اس کے بعد چارلین کو پھنسانے کے لیے اس کی کار میں گن رکھ دی۔“

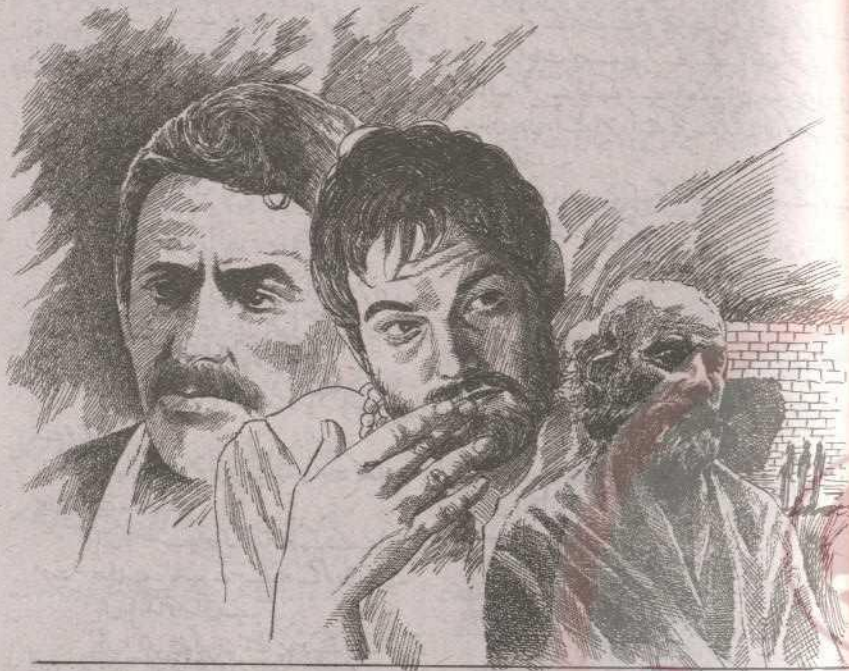
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ یہ تمہارا کام ہے۔ میں نے تمہیں ریستوران کی پارکنگ لائٹ میں دیکھا تھا۔“

”کیا یہ حقیقت ہے؟“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ہاں، تم ان کے اپارٹمنٹ میں جھگڑے کے دوران یا اس کے بعد داخل ہوئے۔ تم نے سوچا کہ گریگ کو راستے سے ہٹانے اور اس کے قتل کا الزام چارلین پر ڈالنے کا ایک اچھا موقع ہے۔“

اس کی گاڑی سڑک کے درمیان رک گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ویسے تم نے ایک اچھا ٹرک حاصل کیا ہے۔“

مجھے لگا کہ کہیں کچھ گڑبگڑ ہو گئی ہے۔ اسے میرے ٹرک کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ اب مجھے فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ میں نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن کیں اور دیکھا کہ ایک بڑی سی پک اپ میری طرف آرہی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ٹرک کو گیسز میں ڈالتی، اس کی پک اپ کا اٹھارہ حصہ میرے ٹرک سے ٹکرایا اور ڈیش بورڈ میں لگی ہوئی تھیلی میرے چہرے پر آ گئی۔ میں نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور گاڑی کو یورس میں ڈال کر پیچھے دیکھنے لگی۔ جب میں نے دیکھا کہ ایک... ٹرک میری جانب بڑھ رہا ہے۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے



محبتوں اور نفرتوں کی سرزمین کو لپٹ میں لیے والی نفرتوں کی چنگاریاں...

آشیانہ

منظرِ رامپا

گھر... سنکون... اور امن و آشتی کا گہوارہ ہے... جہاں گزارے لمحے اس وقت امن ہو جاتے ہیں... جب ہر مکین کا چہرہ جگمگاتا اور متور ہو... خوشی کے ساتھ غم سے مفر ممکن نہیں ہے... بس زندگی میں تازگی اور توانائی برقرار رہنی چاہیے... تلخ گوشتوں اور حقائق پر لکھی ایک ایسی ہی خاص تحریر...

”آبا، آبا... وہ کون ہے؟“ بیٹے نے باپ کی توجہ ایک آدمی کی طرف دلائی جو ایک درخت کے تنے کے لپٹ کر روئے جا رہا تھا اور کچھ لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔
”یہ، وہ ہلکا مارا دام ہے۔“ باپ نے سرگوشی میں بتایا۔
”نہیں آبا۔“ بیٹا بھلے لگا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہلکا مارا دام؟“
”اے ایک شوہر تھا لیکن تیری پیدائش سے چار سال پہلے مر گیا تھا۔“ باپ نے بتایا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 87 جنوری 2016ء

ضرورت ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ ڈیپچر نے پوچھا۔
میں نے اپنا اصل نام بتانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ اس نے مجھے ہولڈ کرنے کے لیے کہا اور چند منٹ بعد مائز سے میرا رابطہ ہو گیا۔

”اسٹیبی، تم کہاں ہو۔ میں تمہیں گزشتہ دس منٹ سے فون کر رہا ہوں لیکن تمام کالیں وائس میل میں جا رہی ہیں۔“
”خوش آمدید؟“ میں نے اسے بتایا کہ اس وقت کہاں ہوں اور بولی۔ ”اگر تم فوراً یہاں پہنچ جاؤ تو نیلسن کینی جونیر کو پکڑ سکتے ہو۔ وہ چارلین کے قتل میں ملوث ہے۔“

”کیا واقعی؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے تمہیں کافی وضاحت کرنا پڑے گی۔“

”یہ بعد کی بات ہے مائز۔“ میں نے کہا۔ ”فی الحال تم جلدی سے آ جاؤ اور اسے اپنی تحویل میں لے لو، میں نے تمہارے لیے ایک بار پھر تمہارا ریس مل کر دیا ہے۔ اگر اس سے تمہاری تسلی ہو جائے تو تم میرا شمار بھی سرائے رسائوں میں کر سکتے ہو۔“

دورانِ تفتیش نیلسن نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اس کے منصوبے کی راہ میں چارلین سب سے بڑی رکاوٹ تھی کیونکہ اس نے بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے ہوئے لاوارک جونی کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ نیلسن نے گریگ کو یہ فٹے داری سوچی کہ وہ چارلین کو اپنے حق سے دستبرداری پر آمادہ کر لے۔ گریگ، چارلین سے محبت کرتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس کا کہنا نہیں ٹالے گی لیکن ساتھ ہی اس نے نیلسن کو بھی بیک میل کرنا شروع کر دیا اور معاوضے کے طور پر ایک خطیر رقم مانگی۔ نیلسن کا مقصد چارلین کو راستے سے ہٹانا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک تیرے دو شکار کیے۔ وہ ان دونوں کا تعاقب کرتا ہوا ان کے اپارٹمنٹ تک پہنچا اور جس وقت وہ دونوں لڑ رہے تھے تو نیلسن دوسرے کمرے میں چھپ کر یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب چارلین لڑ بھڑک کر واپس چلی گئی تو اس نے گریگ کو کوئی مارو کی اور آلہ قتل چارلین کی گاڑی میں پیسٹک دیا تاکہ گریگ کے قتل کا الزام اس پر آئے اور وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی جائے اس جھگڑے میں بے چارہ گریگ خود بخود اپنی جان سے گیا اور وہ لالچ نہ کرتا تو شاید نیلسن بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔



جاسوسی ڈائجسٹ 86 جنوری 2016ء

بارے میں معلوم نہ کر لیں۔“

اچانک ہی مجھے اپنی جیب میں رکے ہوئے میسر کا خیال آیا۔ گویا میں بالکل بچی نہیں تھی لیکن میسر کا کن سے کوئی مقابلہ نہیں جبکہ وہ دو تھے۔ میں نے اپنے سامنے تین فٹ کے فاصلے پر ایک آواز سنی اور دیکھا کہ دوسرا آدمی دبے پاؤں آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ جھلملاتی روشنیوں کے درمیان دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے ان دونوں کے پاس نارنج نہیں تھی۔ میں نے اپنا بازو آگے بڑھایا اور میسر سے اس کا نشانہ لیا۔ اس سے نکلنے والے دو چھترے اس کے سینے میں پھوس ہو گئے اور وہ نیچے گر پڑا۔ میں جانتی تھی کہ وہ نوے سینکڑ تک اس کے اثر سے باہر نہیں آسکے گا۔ میں آگے بڑھی تاکہ اس کی گن اپنے قبضے میں لے سکوں۔ اسی لمحے میں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی اور جبری اچانک ہی میرے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے دشت ٹپک رہی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے کہا۔

میں نے اس کے متوقع حملے سے بچنے کے لیے ایک جانب چھلانگ لگائی اور ایک بورڈ کے سخت کنارے سے جا ٹکرائی اور دیکھا کہ لوہے کا بورڈ نیچے گر رہا ہے۔ جبری کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس کی زد سے بچا سکے۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور دیکھا کہ جبری شدید تکلیف میں ہے۔ چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف چھلانگ لگا کر اس کی گن قابو میں کر لی اور اس کا رخ جبری کی طرف کرتے ہوئے بولی کہ وہ کوئی حرکت نہ کرے۔

”ایمبولینس بلاؤ۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”شاید میرا بازو ٹوٹ گیا ہے۔“

”میرے لیے خوشی کی بات ہے۔“ میں نے اس کی گن کو تھوکر مارتے ہوئے اس کی پیٹھ سے دور کر دیا پھر بولی۔ ”تم میں سے کس کے پاس فون ہے؟“

دوسرے آدمی نے قسمیہ اعزاز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ”اپنے سیل فون یہاں چھپک دو۔“ اور اس کے ساتھ ہی پیسٹول کی نال کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ مجبوراً اسے میرے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر تائن الیون پر فون کیا اور آہرین کو بتایا کہ اس وقت کس جگہ پر ہوں اور یہ کس میں دو پولیس کاروں، ایک ایمبولینس اور سرائے رسائوں کی

آگئے۔ میرکس کے باہر کسی قسم کی چوکیداری نہیں کی جاتی تھی اور نہ ہی چار دیواری کے پاس کے پہرے کا انتظام ہوتا تھا۔ دو پہر میں ملنے والا آدمی میرکس کے باہر ہی کھڑا تھا۔ وہ اس وقت بہت پر جوش اور خوش دکھائی دے رہا تھا۔

”میں نے تو اکیلے دیوار اڑائی کر دی۔“ اس نے بتایا۔

”کیوں تم نے اکیلے کیوں کی؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”میں نے کہا چلو چل کر اپنی طاقت آزماتے ہیں۔

بس ذرا سارو رنگ یا اور دیوار اڑائی ہوئی۔“

”اور راستہ؟“ باپ نے پوچھا۔

”ہاں، راستہ بھی مل گیا۔ بہت مزے کا راستہ ہے۔“

”لیکن یہ تو بے ایمانی ہے۔“ بیٹا چچا پڑا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تینوں مل کر دیوار اڑائی کریں گے پھر تم نے اکیلے کیوں کر دی۔“

”چلو، غلطی ہو گئی۔“ باپ نے اس کے شانے پر چھکی دی۔

”نہیں اباء، اس سے کچھ پہلے دیوار سیدھی کرے۔ پھر ہم تینوں مل کر اٹھا کریں گے۔“

”ابے اس چکر میں یہاں سے نکلنے میں دیر ہو جائے گی۔“ باپ نے کہا۔

بیٹا خاموش ہو گیا۔ تینوں چار دیواری کے پاس آگئے۔ اندھیرے کے باوجود دیوار میں موجود بڑا سا سوراخ انہیں دکھائی دے گیا تھا۔

”یہ ہے وہ راستہ۔“ اس آدمی نے بتایا۔ ”ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

”چلو۔“ باپ نے کہا۔

سب سے پہلے وہی آدمی باہر نکلا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں بھی باہر آگئے۔ ان کے سامنے ایک میدان تھا جو اندھیرے کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ میدان سے ہٹ کر سڑک کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

”اباء، وہ روشنیاں کسی ہیں؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”بیٹے وہ ستارے ہیں۔“ باپ نے بتایا۔ ”رات کے وقت نیچے اتر آتے ہیں اور دن میں آسمان پر چلے جاتے ہیں۔“

”اب چلو نا تم لوگ۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”ہمیں افریقہ تک جانا ہے۔ یہیں کھڑے رہیں گے تو دیر ہو جائے گی۔“

تینوں اس اندھیرے میدان سے ہوتے ہوئے سڑک تک آگئے۔

”پھر تو تم دونوں نے مگر مجھ ہی نہیں دیکھا ہوگا؟“

”نہیں تو، بالکل نہیں دیکھا۔“

”تو پھر چلو میرے ساتھ۔“ اس نے کہا۔ ”میں تم کو باہر کی ہر چیز دکھا دوں گا۔“

”لیکن ہم کیسے جائیں۔ یہاں سے کوئی جانے نہیں دیتا؟“

”میں نے ایک راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”وہ جو سامنے دیوار دیکھ رہے ہو۔“

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“

”ہم تینوں مل کر اس دیوار کو الٹا کر دیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”پھر اس کی جڑ سے راستہ نکل آئے گا۔“

”اباء یہ ترکیب تمہارے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟“

بیٹے نے شکوہ کیا۔ ”ورنہ ہم کب کے باہر چلے جاتے۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔“ اس آدمی نے تسلی دی۔

”معاف کر دو اباء۔ ہر آدمی میری طرح عقل مند تو نہیں ہوتا ہے۔“

”تو پھر کب باہر چلتا ہے؟“ باپ نے پوچھا۔

”رات کے وقت۔“ اس نے بتایا۔ ”رات کے وقت سورج کی روشنی بھی ہوتی ہے اس لیے سب نظر بھی آجائے گا۔“

”ٹھیک ہے تو پھر رات کے وقت تیار رہیں گے۔“

وہ آدمی اٹھ کر چلا گیا۔ دونوں باپ بیٹے اس خیال سے خوش ہو رہے تھے کہ اب انہیں باہر جانے کا موقع ملے گا۔

”اباء، تم نے تو باہر کی دنیا دیکھی ہوگی؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”ہاں ہاں پانچ بار دیکھی ہے۔“

”بتاؤ نا، باہر کیا کیا ہوتا ہے۔“

”باہر سمندر ہوتا ہے۔“ باپ نے کچھ یاد کرتے ہوئے بتایا۔ ”سمندر میں رنگ برنگے پھول لگتے ہیں۔ دن کے وقت سمندر آرام کرنے چلا جاتا ہے اس لیے دن کو نظر نہیں آتا۔“

”وہ آرام کرنے کہاں جاتا ہے اباء؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”اسے ہر شہر میں اس کے گھر ہوتے ہیں۔“ باپ نے بتایا۔ ”کسی ایک گھر میں چلا جاتا ہے۔“

اسی وقت گھنٹی بجنے لگی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ان کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ دونوں باپ بیٹا اس ہال کی طرف چل پڑے جہاں کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔

دونوں کو اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ رات ہوتے ہی وہاں سے نکل جائیں گے۔

رات کے کھانے کے بعد دونوں اپنی بئرک سے باہر

کا ماحول بہت اٹوکھا اور دلچسپ ہوتا تھا۔ شہر کے بہت سے مخیر حضرات مل کر اس یاگل خانے کے اخراجات پورے کیا کرتے تھے۔ انہیں بہترین اور صاف ستھرے کھانے دیے جاتے۔ ان کے کمروں کی صفائی ہوتی، اُبلے بستر، اُبلے کپڑے غرض ان کو سب کچھ حاصل تھا۔

دونوں باپ بیٹے ایک جگہ آ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ باپ نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”اباء، اب یہ کیا کر رہے ہو؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”آنکھیں کیوں بند کر لیں؟“

”ابے سوچ رہا ہوں۔“ باپ نے جواب دیا۔

”آنکھیں کھول کر سوچو اباء۔“ بیٹے نے کہا۔ ”تم آنکھیں بند کر لیتے ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تمہارا انتقال ہو گیا ہو۔“

”ابے جب آنکھیں کھول لیتا ہوں تو تیری آنکھیں صورت دکھائی دے لگتی ہے۔“ باپ نے کہا۔ ”اس لیے مجھے آنکھیں بند کر کے سوچتے دے۔“

”اباء، جب تم سوچتے ہو تو بالکل افلاطون کی طرح دکھائی دیتے ہو۔“ بیٹے نے تعریف کی۔

”اب یہ بھی بتا دے کہ یہ افلاطون کون ہے؟“ باپ نے پوچھا۔

”یہ لو اباء، تم کو اتنا بھی نہیں معلوم۔ وہ سامنے جو دیوار دیکھ رہے ہوتا۔“

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔ تو تیرا افلاطون اس دیوار کے پیچھے ہوتا ہے؟“

”نہیں اباء، اس دیوار کا نام افلاطون ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ باپ نے اپنی گردن ہلا دی۔

اسی وقت ایک آدمی ان دونوں کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے۔

”باہر چلتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”باہر کہاں؟“

”شہر مرگ کے انڈے لینے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا۔“ باپ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کہاں ملے ہیں یہ انڈے؟“

”کپڑوں کی دکان پر۔“

”کپڑوں کی دکان؟ یہ کیا ہوتا ہے؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”تم کو یہ بھی نہیں معلوم؟“

”نہیں۔“ دونوں باپ بیٹے نے گردنیں ہلا دیں۔

”پھر تو میں بیوہ ہوئی نا اباء۔“

”ہاں۔“ باپ نے گردن ہلائی۔ ”تو بیوہ۔ تیرا باپ بیوہ۔ تیرا پورا خاندان بیوہ۔ بس اب بکواس بند کر اور مجھے سوچنے دے۔“

”تم کیا سوچ رہے ہو اباء؟“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سکندر اعظم نے مغل اعظم دیکھی تھی یا نہیں دیکھی تھی؟“

”دیکھی تھی اباء۔“

”ابے تجھے کیسے معلوم؟“

”اباء، تم کو یاد ہوگا کہ جب اسے دفنایا گیا تو اس کے دونوں ہاتھ قبر سے باہر تھے۔ ایک ہاتھ کی گتھی میں سینا ہال کا ٹکٹ دیا ہوا تھا۔ وہ مغل اعظم فلم کا ٹکٹ تھا۔“

”بیٹا تو کب سے اتنا عقل مند ہو گیا؟“ باپ نے پیار سے پوچھا۔

”جب سے میرا شوہر مرا ہے۔ میں بہت سمجھدار ہو گیا ہوں۔“ بیٹے نے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ سمجھدار ہونے کے لیے شوہر کی موت ضروری ہے۔“ باپ نے سوچتے ہوئے گردن ہلائی۔

”ہاں اباء، بالکل تو ایسا ہی ہے۔“

”چل، لیکن بیٹھ کر اس مسئلے پر سوچتے ہیں۔ میں تو پچھلے پندرہ سال سے اسی جگہ کھڑے کھڑے ٹھک گیا ہوں۔“

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک طرف چل دیے۔ درخت سے لپٹ لپٹ کر رونے والا اب درخت سے باتیں کر رہا تھا۔ ”ارے میں نے تو مذاق میں کہا تھا کہ کھڑی میں نمک زیادہ ہو گیا ہے۔ آئندہ جب کرے لیے بنایا کرو تو اس میں نیم کے پتے بھی ڈال دیا کرو۔ تم نے میری بات کا برامان لیا اور درخت بن کر کھڑی ہو گئیں۔ ایسا نہ کرو۔ واپس آ جاؤ۔ میں تمہیں پولیٹک کا وزیر اعظم بنا دوں گا۔ پلیز واپس آ جاؤ۔ ورنہ میں چار بائی پانی پی کر مر جاؤں گا۔“

یہ ایک بہت بڑا یاگل خانہ تھا۔

درختوں کے حساب سے پاگلوں کو رکھا گیا تھا۔ بہت سی بئرک بنی ہوئی تھیں۔ کچھ بئرک میں عورتیں بھی تھیں۔ زیادہ تر مرد تھے۔

اس یاگل خانے میں مریضوں کے لیے ڈاکٹروں کا بہت معقول انتظام تھا۔ ہر پتے کئی ڈاکٹر آتے اور پاگلوں کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ مرتب کیا کرتے۔

بعض بھی کئی ڈاکٹر کے ساتھ طالب علم لوگ اور لڑکیاں بھی پاگلوں کی اسٹڈی کے لیے آیا کرتے۔ ان کے لیے یہاں

رات کے دس بجے ہوں گے۔ اس لیے ہر طرف چہل پہل تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

”بیارے بھائی ہم افریقہ کیسے جائیں گے؟“ بیٹے نے اس آدمی سے پوچھا۔

”یہاں سے سیدھے چلتے جائیں گے پھر دائیں طرف کوڑ جائیں گے۔ اس کے بعد ایک گلی آئے گی اس گلی سے نکلیں گے تو سامنے افریقہ ہوگا۔“

وہ تینوں افریقہ کی طرف چل دیے۔

ابھی پچھری دور چلے تھے کہ پولیس کی ایک موبائل ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سے دو پولیس والے اتر کر ان کے سامنے آ گئے۔

”اے کون ہو تم لوگ؟“ ایک نے پوچھا۔

”ہم پاگل ہیں۔“ اس آدمی نے بتایا۔ ”ہم نے دیوار الٹی کر کے راستہ بنا لیا تھا۔ پھر وہاں سے باہر آئے ہیں۔“

”واہ، دیوار بھی الٹی کر دی۔“ دوسرا ہنس پڑا۔ ”اور دیوار کو در کہاں جا رہے ہو؟“

”ہم تو افریقہ جا رہے ہیں۔“ بیٹے نے کہا۔ ”بس یہاں سے سیدھے جائیں گے۔ وہاں سے سیدھے ہاتھ کی گلی میں مڑ جائیں گے۔ سامنے افریقہ آ جائے گا۔“

اب وہ دونوں ہنس رہے تھے۔

”اچھا افریقہ جا کر کیا کرو گے؟“ ایک نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہاں کے بادشاہ نہیں گے۔“ باپ نے کہا۔ ”پہلے تین مہینے تک یہ بادشاہ رہے گا۔“ اس نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کے بعد تین مہینے تک میں بادشاہ بنوں گا۔ اس کے بعد یہ میرا بیٹا بادشاہ بنے گا۔“

”اوہو، تو تم دونوں باپ بیٹے ہو۔“

”ہاں، اس سال میں اس کا باپ ہوں۔ پچھلے سال یہ میرا باپ تھا۔“

”اور اگلے سال میں ان دونوں کا باپ بن جاؤں گا۔“ اس آدمی نے کہا۔

”کے کن چکروں میں پڑ گیا۔“ ایک پولیس والے نے دوسرے سے کہا۔ ”یہ تینوں واقعی پاگل ہیں سالے۔ ان سے کچھ نہیں ملے والا۔ خواہ مخواہ ناظم برآمد ہو رہا ہے۔“

وہ دونوں پولیس والے موبائل میں بیٹھ گئے۔ موبائل روانہ ہوئی۔

”ابا، لگتا ہے یہ دونوں پاگل تھے۔“ بیٹے نے کہا۔

”ہاں بیٹا، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ پاگل ایسے ہی

ہوتے ہیں۔“

”چلو نا۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”دیر ہو گئی تو افریقہ کیسے چلا جائے گا۔“

”بیارے بھائی، یہ افریقہ جاتا کہاں ہے؟“ بیٹے نے دریافت کیا۔

”وہ کبھی کبھی یورپ کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر تین چار مہینوں میں واپس ہوتی ہے۔“

”اوہو، پھر تو ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔“

وہ تینوں تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئے۔ شہر کی دکانوں میں رش ہو رہا تھا۔ لوگ ہوں کے آگے پیٹھے کپ شپ کر رہے تھے۔

”ابا، یہ کون لوگ ہیں؟“ بیٹے نے ہوں کے آگے کر سبوں پر بیٹھے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹا، یہ ہماری طرح کے انسان ہیں۔“ باپ نے بتایا۔

”نہیں ابا، یہ ہماری طرح کے انسان تو نہیں ہیں۔“ بیٹے نے کہا۔ ”ہم جہاں رہتے تھے ابا، وہاں تو ہر وقت کام کرتا ہوتا تھا۔ کبھی پودوں کی دیکھ بھال، کبھی بریک کی صفائی، کبھی باورچی خانے جا کر برتن صاف کرنا، ہمارے پاس تو بیٹھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

”اب ان کو دیکھو نا، کتنے آرام سے بیٹھے ہیں۔ جیسے ان کو کوئی کام ہی نہیں ہے۔“ بیٹے نے کہا۔ ”سب جائے پی رہے ہیں۔ چند ایک مذاق کر رہے ہیں۔ اس لیے ابا یہ ہماری طرح کے انسان نہیں ہیں۔ یہ تو پاگل معلوم ہوتے ہیں۔“

بیٹے کی بات سن کر باپ اور وہ آدمی خوف زدہ ہو گئے۔

”ہاں، یہ ہماری طرح کے نہیں ہیں۔ یہ پاگل ہیں۔ چلو جلدی سے آگے بڑھو ورنہ یہ ہم کو مارنے لگیں گے۔ پاگل ہیں نا، پاگلوں کا کوئی پھر و سام نہیں ہوتا۔“ تینوں پھر آگے بڑھ گئے۔

بہت دور تک چلنے کے بعد بیٹے نے اس آدمی سے پوچھا۔ ”بھائی تمہارا نام کیا ہے؟“

”آدی۔“ اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ”اور تمہارا کیا نام ہے؟“

”بیٹا۔“ بیٹے نے جواب دیا۔ ”اور یہ میرا باپ ہے اور اس کا نام ہے ابا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ میں آدی، تم بیٹا اور یہ ابا۔“

”اچھا آدی یہ بیٹا وہ افریقہ کب آئے گا۔ تم کتنی دیر

آشیانہ

”لیکن ہم سے تمہاری کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔“ باپ نے کہا۔

”اوئے عقل مند پاگل، ہم لوگوں کے لیے دشمنی دشمنی کچھ نہیں ہوتی۔ ہمیں صرف مارنے کا کام دیا جاتا ہے۔ بس اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔“

”بھائی، میں تم کو ایک مشورہ دوں۔“ بیٹے نے کہا۔ ”کیسا مشورہ؟“

”یہاں سے سیدھے چلے جاؤ۔ ایک ایسی جگہ ملے گی جس کی دیوار الٹی ہے۔ اس دیوار میں ایک سوراخ ہے۔ اس سوراخ سے تم دونوں اندر چلے جانا۔ وہ بہت اچھی جگہ ہے۔ وہاں کوئی کسی کو مارنے کے لیے نہیں کہتا۔“

”اوئے مذاق کرتا ہے۔“ پہلا دھاڑنے لگا۔ ”سب سے پہلے تو یہی جا۔“

اس نے پستول کا رخ بیٹے کی طرف کر دیا۔ اسی وقت آدمی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ لیکن وہ اس کا پستول جھینٹے میں ناکام رہا۔

اسی لمحہ میں پستول چل گیا۔ اور آدمی ایک جھج کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا جبکہ وہ دونوں بائیک اسٹارٹ کر کے بھاگ نکلے تھے۔ ان کا کوٹا پورا ہو چکا تھا۔

دونوں باپ بیٹا آدمی کی لاش کے پاس کھڑے رہ گئے تھے۔

”ابا، اس کے سینے سے یہ لال خون کی طرح کیا نکل رہا ہے؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”بیٹا یہ خون ہی ہے۔“ باپ نے بتایا۔ ”اور یہ مر چکا ہے۔“

”خون۔“

”خون نہیں بے وقوف، یہ آدمی۔“

”لیکن اس کو تو افریقہ جانا تھا۔ یہ افریقہ گئے بغیر کیسے مر گیا؟“

”بیٹا، لگتا ہے یہی اس کا افریقہ تھا۔“

”ابا، ایک بات اور بھی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”دیکھو نا، جہاں ہم رہتے تھے۔ وہاں اگر کسی کو چوٹ بھی لگتی اور وہ روتا چلاتا تو سب اس کے پاس جمع جاتے تھے۔“

”یہ بات تو ہے۔“

”لیکن ابا، یہاں تو کوئی اپنے گھر سے باہر بھی نہیں

سے چل رہے ہیں؟“

”فکر مت کرو اس کا تو باپ بھی آئے گا۔“

اب وہ جس علاقے سے گزر رہے تھے، وہ نسبتاً ویران تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے مکانات تھے۔ جن میں روشنیاں تو ہو رہی تھیں لیکن باہر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک ایک بائیک ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس پر دو آدمی بیٹھے تھے۔ دونوں بائیک سے اتر آئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

”اوئے، جلدی موبائل دکاؤ۔“ ایک نے کہا۔ ”جلدی کرو۔ ہمارے پاس ناظم نہیں ہے۔“

”لیکن ہمارے پاس موبائل کہاں ہے؟“ باپ نے بتایا۔ ”ہم تو پاگل ہیں۔ پاگلوں کے پاس موبائل نہیں ہوتے۔“

”پاگل بنارہے ہیں سالے۔“ دوسرے نے پہلے سے کہا۔ ”جیکائے کسی ایک کو۔ ہمارا کوڑ بھی پورا ہو جائے گا۔“

”پستول ٹھیک ہے۔“ پہلے نے ہنگامی لی۔ ”چل ان سے تقریباً لے کر ٹپکا دیتے ہیں۔“ پھر اس نے ان تینوں کو مخاطب کیا۔ ”ہاں اب بتاؤ۔ تم تینوں میں سے کون دنیا سے جانا چاہتا ہے؟“

”میں اپنے باپ کے بغیر نہیں جاتا۔“ بیٹے نے کہا۔ ”اور میرا باپ میرے بغیر نہیں جاسکتا۔“

”اور میں ان دونوں کے بغیر نہیں جاتا۔“ وہ آدمی بھی بول پڑا۔

”پاگل ہی معلوم ہوتے ہیں سالے۔“ ایک نے ہنس کر کہا۔ ”چل جلدی سے کسی ایک کو ٹپکا۔ ہمیں جا کر رپورٹ بھی دینی ہے۔“

”ایک بات بتاؤ۔ تم کسی کو کیوں ٹپکانا چاہتے ہو؟“ باپ نے پوچھا۔

”واہ۔“ دوسرا ہنس پڑا۔ ”اس وقت تو عقل مندی کی بات کر رہا ہے۔“

”بتاؤ نا، کیوں مارنا چاہتے ہو؟“

”چل سن ہی لے۔ مرنے سے پہلے تیری معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔ دیکھ بھائی، ہم لوگوں کو ٹاسک ملتا ہے کہ آج باج کو مارنا ہے۔ چھ کو مارنا ہے یا سات کو مارنا ہے۔ آج ہمیں باج کو مارنا تھا۔ چار کو تو ٹپکا چکے تھے۔ ایک رہ گیا تھا۔ اب تم لوگ مل گئے ہو۔ تم میں سے کسی ایک کو ٹھکانے لگانا ہے۔“

”اب کیا تم بخینی طور پر چاہتے ہو کہ یہ کام مکمل کر لیا جائے؟“

”ہاں، میری طرف سے جواب مثبت ہے۔“

”اس لیے کہ جب یہ کام رواں ہو جائے گا تو پھر اسے روکا نہیں جاسکے گا۔ تمہارے پاس مجھ سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوگا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“

”اوکے۔ تم رقم اور تصویریں لائے ہو؟“

الٹی بازی

سلیم انور

پُرسکون.... مطمئن اور آسودہ روز و شب گزارنے کی تمنا ہر دل میں بسی ہوتی ہے... خصوصاً شادی شدہ زندگی میں کوئی ہلچل بیانا نہ ہو... مگر ان دونوں میاں بیوی کی زندگی ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچی تھی... دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے فیصلے پر مطمئن اور پُر اعتماد تھے...

ذرا مائی موڑ اختیار کرنے والے کھیل کا اٹو کھانا اور دلچسپ انجام



آگے جا کرے۔

کچھ لوگ ان دونوں کو کچلتے ہوئے کھانے کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ ساتھ ہی ہاں، بہن کی گالیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کچھ دھڑا دھڑ برتن گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک آدمی جو بریانی کی ٹرے لیے ایک طرف بھاگا جا رہا تھا۔ باپ سے گرا کر اس پر گر پڑا۔ باپ کا پورا چہرہ اور اس کے کپڑے بریانی سے بھر گئے تھے۔

دوسری طرف بیٹے کے بدن پر قورے کا بڑا پیلہ گر پڑا تھا۔ وہ تکلیف سے چیخا ہوا لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔ ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔

”ابا، کہاں ہو تم؟“ بیٹے کی آواز سنائی دی۔

”میں تیرے پاس ہی ہوں، ہاتھ پکڑ لے میرا۔“

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ اور لوٹھکتے، لوگوں کی ٹانگوں سے گزرتے، مٹی میں لت پت ہوتے ہوئے اس صبح اور افراتفری سے باہر نکل آئے۔

دونوں کا بہت مجرا حال ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ان کا کچھ مرکل گیا تھا۔

”ابا، یہ سب کیا تھا؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”شاید باہر کی دنیا میں یہی کچھ ہوتا ہے۔“

”ابا، اب ہمیں آگے نہیں جانا۔“ بیٹے نے کہا۔ ”یہاں تو سب پاگل ہیں۔“

”ہاں بیٹا، سب پاگل ہیں۔“

”چلو اب واپس چلتے ہیں۔ وہ راستہ تو ابھی تک ہو گا نا؟“

”ہاں، راستہ تو ہو گا۔“

”تو پھر چلو واپس، وہاں تو یہ سب نہیں ہوتا ہے ابا۔“

وہاں تو ہر ایک کو بہت آرام سے کھانا مل جاتا ہے۔“

”ہاں اور وہاں بغیر کسی دشمنی کے کوئی کسی کو مارتا بھی نہیں ہے۔“

”چلو اب واپس چلیں۔ صبح ہونے والی ہے۔“ بیٹے نے

آسمان کی طرف دیکھا۔ ”جہاں ہم رہتے ہیں وہاں کی صبح بہت

سکون والی ہوتی ہے ابا۔“

دونوں واپس اسی طرف چل دیے جہاں وہ دیوار تھی۔

وہ دنیا تھی اور وہ زندگی تھی جس میں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کوئی

ٹارگٹ کلنگ نہیں تھی۔ کوئی چھیٹا چھیٹا نہیں تھی۔ کوئی تفریریں

نہیں تھیں۔

نکلا۔“ بیٹے نے کہا۔

”شاید یہاں کا بھی دستور ہو، چل اب ہم چلتے ہیں۔“ دونوں پھر آگے بڑھ گئے۔ اب ان کے ساتھ وہ آدمی بھی نہیں تھا۔ ان دونوں کو خود ہی افریقہ پہنچنا تھا۔ اب رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور افریقہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

”ابا، مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“ بیٹے نے کہا۔

”بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“

”نہیں ابا، یہ دھوکا ہے۔ پہلے میں نے کہا ہے، کھانا پہلے میں کھاؤں گا۔“

”چل ٹھیک ہے۔“ باپ ہنس پڑا۔ ”لیکن کھانا ملے گا

کہاں ہے؟“

”ہم افریقہ کی طرف جا رہے ہیں۔ شاید وہیں مل جائے۔“

کچھ دیر چلے تھے کہ کچھ آوازیں آنے لگیں۔ یہ

آوازیں بہت عجیب تھیں۔ زندہ باؤ زندہ باد کے نعرے بھی لگ رہے تھے اور تالیاں بھی بج رہی تھیں۔ درمیان میں کسی آدمی

کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”ابا، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”لگتا ہے کہ کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔“ باپ نے بتایا۔

”یہ جلسہ کیا ہوتا ہے ابا؟“

”جب بہت سے لوگ کسی ایک آدمی کی خوشامد کرتے

ہیں تو اس کو جلسہ کہا جاتا ہے۔“

”وہاں تو کھانا بھی ہوتا ہو گا۔“

”جانتیں۔ چل، چل کر دیکھتے ہیں۔“

جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے، آوازیں واضح ہوتی چلی

گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بڑے سے میدان میں کھڑے

تھے۔

وہاں بہت سے لوگ تھے۔ ایک طرف ایک اونچا سا

انچ بھی بنایا گیا تھا۔ کوئی اعلان کر رہا تھا۔

”خواتین و حضرات! آپ لوگوں کے لیے کھانے کا

بندوبست بھی ہے۔“

دونوں خوش ہو گئے تھے۔ ”ابا، یہاں تو کھانا بھی مل رہا

ہے۔“

”ہاں، چل آگے چل۔ وہ دیکھ کھانا لگایا جا رہا ہے۔“

باپ نے اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھے اور اس کے ساتھ ہی بھگدڑ شروع ہو

گئی۔ کچھ لوگوں نے پیچھے سے ان دونوں کو دھکا دیا۔ وہ دونوں



گھر کے ہر فرد کے لیے
بے مثال تحریروں کا مجموعہ

پاکینہ

ماہنامہ

میں نیا دل گداز سلسلے وار ناول

گم شدہ محبت

آپ کی ہر دلچسپی اور مایہ ناز مصنفہ

انجم انصار

کے ماہرانہ قلم کا شاہکار... شہنشاہ چنگیز... جملوں
سے سجا... معاشرتی و نفسیاتی گرہیں کھولتا یہ ناول
محبت کے ایک نئے اور بے حد خوب صورت رنگ سے

بھی روشناس کرائے گا

ماہِ فروری سے صفحات کی زینت بنے جارہا ہے

میز پر آگیا جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انہوں نے جگت میں
اپنے مشروب پیے اور پھر میز پر سے اٹھ کر لفٹ کی جانب
چل پڑے۔ ان کا رخ اوپری منزل کے کسی کمرے کی
جانب تھا۔

بریڈ بارنٹ بھی ان کے پیچھے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ
دونوں لفٹ میں داخل ہو گئے تو بریڈ بھی اسی لفٹ میں سوار
ہو گیا۔ لفٹ میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ
دونوں اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے بلکہ
جدبائی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
بریڈ نے اپنے کٹ کاٹن کھولا اور اندر سے اعشاریہ
دو دو کی چھوٹی پستول چیکے سے باہر نکال کر اس پر تیزی سے
سائیکسٹرنٹ کر دیا۔ وہ جوڑا اب بھی اس کی طرف سے
غافل ایک دوسرے میں کھویا ہوا تھا۔

بریڈ بارنٹ گھوما اور اس نے جم آئٹن کے سر کا نشانہ
لے کر فائر کر دیا۔ اس کی ساتھی عورت نے ایک قحج ماری لیکن
بریڈ نے اس کی کھوپڑی پر فائر کر کے اسے بھی خاموش کر
دیا۔

بریڈ کا ارادہ اس عورت کو مارنے کا نہیں تھا لیکن جب
جم آئٹن کو شکانے لگانے کا وقت آیا تو وہ عورت بھی راستے
میں آچکی تھی۔ وہ اپنے لیے کوئی عین شاہد نہیں چھوڑنا چاہتا
تھا۔ اس لیے مجبوراً اس عورت کو بھی شکانے لگانا پڑا۔ فوج
نے اسے سکھایا تھا کہ اسے منہنی نقصان کہتے ہیں۔ یہ
منسوبے میں شامل نہیں تھا لیکن ایسا کرنے کی ضرورت پیش
آئی تھی۔

بریڈ چوتھی منزل پر لفٹ سے باہر آگیا اور ہال سے
گزر کر زینے کے راستے چلی منزل پر چلا گیا۔ وہاں سے اس
نے ایک اور لفٹ پکڑی اور میں فلور پر آگیا۔ وہ ہول کی لابی
سے گزرتا ہوا داخلی دروازے سے باہر نکل گیا اور ایک نیکی
پکڑ لی۔ نیکی ابھی ہول سے دو بلاک کے فاصلے پر پہنچی تھی کہ
اس نے مخالف سمت سے سائرن بجائی ایک پولیس کار کو تیزی
سے آتے ہوئے دیکھا جس کا رخ ہول کی جانب تھا۔

نیکی ڈرائیور نے اسے ایک عمدہ ریٹشورٹ پر اتار
دیا۔ اس نے اطمینان کے ساتھ شام کا کھانا کھایا اور نیکی
سے انٹرپورٹ کے قریب اپنے موٹیل کے کمرے میں پہنچ
گیا۔

اپنے موٹیل سے اس نے انٹر لائن کے دفتر فون کیا اور
پوچھا کہ کیا وہ سٹیجنگ انتظار کرنے کے بجائے کل صبح کی
بدواڑ سے میا می روانہ ہو سکتا ہے۔ اسے مزید تین دن موٹیل

اپنے والدین کے مرنے کے ایک سال بعد لیزلی
سمجھ گئی کہ اس کی ازدواجی زندگی بے حد خوش و خرم گزر رہی
ہے۔ لیکن جیف ہنگلی مطمئن نہیں تھا۔

اپنی اس شادی کا خاتمہ کرنے کے فیصلے کے بعد اسے
اس کام کے لیے درست آدمی کو تلاش کرنے میں دو سال
صرف کرنے پڑے۔

اور وہ درست آدمی بریڈ بارنٹ تھا جو ایک پیشہ ور
قاتل تھا۔ البتہ جیف ہنگلی کو یہ یقین نہیں تھا کہ اس پیشہ ور کا
اصلی نام یہی ہوگا۔ لیکن اس کے کام کے لیے نام کوئی اہمیت
نہیں رکھتا تھا۔ اس کے ایک کاروباری وسیلے نے اسے بریڈ
بارنٹ کا حوالہ دیا تھا اور سفارش بھی کی تھی۔

جب ان کی میٹنگ ختم ہوئی تو جیف ہنگلی ہول کے
بار سے پہلے نکل کھڑا ہوا۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کی
مشکلات ختم ہونے میں اب صرف تین ہفتے باقی رہ گئے
ہیں۔ بحری جہاز کی سمندری سیر و تفریح کے لیے دو آگئی میں
ابھی دو ہفتے باقی تھے اور اس کی میا کی واپسی تین ہفتے بعد ہونا
تھی۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بحری جہاز کی واپسی اس کی
بیوی کے بغیر ہوگی۔

جیف ہنگلی کے جانے کے بعد بریڈ بارنٹ جزیہ
آدھے گھنٹے تک بار میں بیٹھا رہا۔ اسے اپنے موٹیل کے
کمرے میں واپس پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ یہ ایک تسلیم
شدہ بات تھی کہ اپنے پیشے کی وجہ سے اس کی زندگی کا ایک
خاص وقت موٹیل کے کمروں میں گزرتا کرتا تھا لیکن موٹیل
اس کی پسندیدہ جگہ نہیں تھی۔ اس کی پسندیدہ جگہ مسوری
اوزارک میں وہ بین تھا جو اس کی ملکیت تھی۔ یہ کین
برانسن، مسوری سے مغرب میں تیس میل کے فاصلے پر واقع
تھا اور بین میکز اراشی پر محیط تھا۔

اسے جب مکمل تنہائی کی خواہش ہوتی تو وہ اس کین
میں چلا جاتا تھا۔ چونکہ یہ اراشی برانسن سے نزدیک تھی اس
لیے جب وہ موٹیل لائف گزرنے کا خواہش مند ہوتا تو
برانسن آجاتا تھا۔

وہ اس وقت بار میں دیر تک اس لیے بھی بیٹھا ہوا تھا
کہ اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جس کے بارے میں
مشہور تھا کہ وہ بھی نہ کسی یہاں ضرور آتا ہے۔ بریڈ بارنٹ کو
’ڈبل ڈینک‘ کا آئیڈیا پسند تھا۔ یہ اصطلاح خود اس کی ایجاد
کرہ تھی۔ ایک ہی وقت میں دو کاموں کا معاوضہ۔

اسے دوسرے شخص کی آمد کے لیے زیادہ انتظار نہیں
کرنا پڑا۔ اس شخص کا نام جم آئٹن تھا۔ وہ سیدھا اس عورت کی

”ہاں، دونوں چیزیں اسی میں ہیں۔“ جیف ہنگلی
نے ایک لفاظ بریڈ بارنٹ کی جانب سے بڑھاتے ہوئے
کہا۔ ”وہ بڑا ذرا لڑکی تم اور چھ مختلف تصویریں۔ ساتھ میں
’روشن بریڈ‘ نامی بحری جہاز پر سمندری سیر و تفریح کا ٹکٹ
اور میا کی فلائٹ کا ٹکٹ بھی موجود ہے۔“

بریڈ بارنٹ نے لفاظ اپنے اسپورٹس کوٹ کی
اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ ”شکریہ۔“
”کیا تم لفٹ کے اندر نہیں دیکھو گے؟“

بریڈ مسکرا دیا۔ ”ابھی نہیں اور خاص طور پر یہاں
نہیں۔ میرے پاس بعد میں اسے دیکھنے کے لیے بہت
وقت ہوگا۔ اب اپنا منصوبہ ایک بار پھر میرے گوش گزار کر
دو۔“

”لیزلی اس سمندری سیر و تفریح پر تنہا جائے گی۔ یوں
تو ہم دونوں نے اس سفر پر اکٹھا جانا تھا لیکن آخری لحاحات
میں مجھے ایک کاروباری معاملہ درپیش آجائے گا۔ وہ اب
اس قسم کی چیزوں کی عادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے ہمراہ جانے
کے لیے کسی کو بھی تلاش کر لے گی۔ لیکن جہیں اس معاملے
سے کوئی سروکار نہیں ہوگا، ہے نا؟“ جیف نے بتایا۔
”نہیں۔“ بریڈ نے کہا۔

”باقی سارا معاملہ تم پر ہے۔ بس یہ یقین کر لیتا کہ وہ
اس سمندری سیر و تفریح سے زندہ واپس نہ لوٹے۔ ہمارے
ازدواجی معاہدے کے مطابق اگر ہمارے درمیان سادگی
سے طلاق ہو جاتی ہے تو مجھے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ البتہ اس
صورت میں سب کچھ مجھے مل جائے گا۔“ جیف نے اسکاچ
کی ایک چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

”اپنے ڈیڈی کے مرنے کے بعد اسے وراثت میں
بہت بڑی رقم ملی ہے۔“ جیف نے جیسے گھوڑے کے مانند
ہنہاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی تنگدستی نہیں ہوگی کہ اس کی ڈیڈی
کی سخت محنت سے کمائی ہوئی رقم خیرات میں ضائع ہو جائے۔“
لیزلی اور جیف ہنگلی کی شادی کو ابھی صرف چھ برس
ہی ہوئے تھے۔ ان کی شادی کے دو برس بعد لیزلی کے ماں
باپ کا رے کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جیف
نے جب لیزلی کو شادی کی پیشکش کی تھی تو اسے علم تھا کہ وہ
اس کے باپ کی دولت پر کبھی نہ کسی ہاتھ ڈالنے میں کامیاب
ہو جائے گا۔ لیکن اس کے باپ نے اپنی بیٹی کے تحفظ کی
خاطر تحریری ضمانت پر اصرار کیا تھا۔ البتہ اس کے باپ نے
یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ جیف اس کی تمام دولت کو ہتھیانے کا
ارادہ رکھتا ہے۔

کے کمرے میں گزارنے کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی۔
ایئر لائن کے آپریٹر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ
وہ کل صبح کی پرواز سے مپای روانہ ہو سکتا ہے۔ اس اطمینان
کے بعد بریڈ بارت نے ٹیلی وژن آن کر دیا اور اپنا پسندیدہ
کامیڈی شو لاء اینڈ آرڈر دیکھنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد
بہسی آتی تھی کہ اس پروگرام میں جرائم کو کس طریقے سے حل
کیا جاتا تھا۔

بحری جہاز کی روانگی سے ایک رات قبل بریڈ بارت
میامی، فلوریڈا کے ایک موٹیل میں مقیم تھا۔ بحری جہاز نے
وہیں سے روانہ ہونا تھا۔

انگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب وہ بحری جہاز
میں سوار ہو گیا۔ وہ پہلے بھی آسٹاک تھا لیکن اسے کوئی جلدی
نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لیزلی جنگلی جہاز کے کس کمرے
میں ٹھہرے گی کیونکہ اس کے شوہر نے ان انگلوں کے حوالے
سے جو انہوں نے خریدے تھے، اسے یہ معلومات پہلے ہی سے
فراہم کر دی تھیں۔

وہ جہاز پر اپنے فنی کمرے میں چلا گیا اور اپنے
سامان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران اس نے
لیزلی کی وہ چھ تصویریں نکال لیں جو اس کے شوہر جیف
جنگلی نے اسے دی تھیں۔ وہ اس عورت کا چہرہ شناس کرنا
چاہتا تھا۔ جسے اس کو ٹھکانے لگانا تھا۔

ان چھ تصویروں میں سے صرف ایک تصویر ایسی تھی
جو اس کے خیال سے لیزلی کی تھی اور واضح خدوخال والی
تصویر تھی۔ باقی تمام تصویریں یا تو کسی ریٹینوٹ کی میز پر
بچھتی تھیں یا دوسری جگہوں پر جہاں اس کے چہرے پر
غیر معمولی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ صرف اس تصویر میں وہ
سنجیدہ نظر آ رہی تھی جو کسی قسم کی میننگ کے دوران بچھتی تھی
تھی جہاں ہر کوئی ایک بڑی سی بیضی میز کے گرد بیٹھا ہوا
تھا۔

بریڈ بارت اس تصویر کا غور سے جائزہ لینے لگا۔
لیزلی کی صورت کچھ شناسائی لگ رہی تھی لیکن تصویر میں اس
کا چہرہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے پیشے کی بنا پر اس کی
ملاقات دھڑوں لوگوں سے ہوتی تھی۔ اس لیے اس بات پر
اس نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

ساڑھے چھ بجے جہاز سمندر میں تھا۔
بریڈ بارت شام کے کھانے کے لیے ڈائننگ روم
میں چلا گیا۔ جیف جنگلی نے پہلے ہی سے یہ انتظام کر رکھا تھا
کہ جس ڈائننگ روم میں اور جن اوقات میں لیزلی وہاں

جائے، بریڈ بارت بھی انہی موقعوں پر وہاں موجود ہو۔
ڈائننگ روم کھلنے کے انتظار میں کھڑے ہوئے لوگوں کی
قطار میں شامل نہیں ہوا بلکہ ایک طرف کھڑے ہو کر لوگوں کی
انداز جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ پہلی بار ہی لیزلی کو پہچان
گا۔ لیکن اس وقت اس کے بالوں کی رنگت وہ نہیں تھی جو
تصویروں میں تھی۔ لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

اسی شب بریڈ وہ براڈوے ٹاپ کا شو دیکھنے چلا گیا
جو جہاز میں پیش کیا جا رہا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد اس نے
لیزلی کو مخالف سمت کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تو وہ
بھی اس کے پیچھے لپکا۔

لیزلی مرکوزیسٹ نامی لاؤنج میں چلی گئی جو جہاز پر
موجود بہت سے لاؤنجز میں سے ایک تھا۔ بریڈ لاؤنج میں
داخل ہونے سے پہلے دروازے پر رک گیا تاکہ دیکھ سکے
کہ لیزلی کہاں بیٹھ رہی ہے۔ جب لیزلی پارک کے ایک
اسٹول پر بیٹھ گئی تو بریڈ بھی لاؤنج میں داخل ہو گیا۔

لیزلی کے برابر میں ایک اسٹول خالی تھا۔
”اس پر کوئی بیٹھا تو نہیں؟“ بریڈ نے خالی اسٹول
کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لیزلی سے پوچھا۔

”نہیں۔ پہلی پور سیلف۔“ لیزلی نے جواب دیا
اور اس کی جانب گھوم گئی۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر
حیرت کے تاثرات ابھرائے۔ ”کیا تم فریک ٹڈلن ہو؟“
اس نے حیرانی سے پوچھا۔

بریڈ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دوبارہ غور سے
اس عورت کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ”لیزلی فاؤنڈ؟“
”دی ون اینڈ اوٹی۔ ہوئی شٹ اہم کتنے عرصے بعد
مل رہے ہیں؟“

بریڈ خالی اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ”اسے برس ہو چکے ہیں
کہ اب شارٹ نہیں کیے جاسکتے۔“ اس نے ہتے ہوئے کہا۔

جانتے ہو ہائی اسکول میں مجھ سے تاتا توڑنے پر
میں ابھی تک تم سے ناراض ہوں۔“ لیزلی نے کہا۔
”بھئی غلطیاں ہم سب سے ہوتی ہیں۔ سو آج کل تم
کیا کر رہی ہو؟“ بریڈ نے بات سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”نی الوقت تو میں تنہا ہی سمندر کی سر و تفریح کرنے
ٹکلی ہوئی ہوں کیونکہ میرا شو ہر ایک انتہائی کامز آدی ہے۔
اس نے میرے ساتھ نہ آنے کا ایک جواز تلاش کر لیا تھا جیسا
کہ اب وہ اکثر کیا کرتا ہے۔“

بریڈ نے اس بات پر اپنا سر جھکا لیا۔ ”یہ من کر انھوں

ہو۔“

”ہاں، مجھے بھی انھوں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ
میری غلطی ہے۔ مجھے اس بات کا حقیقت میں احساس کڑی
پڑتا ہے کہ میں ہوا تھا۔ اگر تجھیں یاد پڑتا ہو تو بعض اوقات
میرا اچھوتا سادہاں معاملات کا تخمینہ لگانے میں درست کام
نہیں کرتا تھا۔“

”اوہ، میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا تھا کہ تم خاصی ذہین ہو۔“
”لیکن یہ اندازہ لگانے کے لیے کسی ذہانت کی
ضرورت نہیں ہوتی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ جب آپ کا
شو ہر ٹیک اکاؤنٹ سے بڑی بڑی رقمیں نکال رہا ہو اور
آپ کو اس بارے میں کچھ نہ بتا رہا ہو۔ اور اس بحری سفر پر
روایتی سے دو دن قبل مجھے ایک ہوٹل کے پارکنگ گیراج کی
ریسیڈل گئی۔ غالباً وہ خفیہ طور پر کسی سے رابطے میں ہے۔“

بریڈ نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ رسید
کہاں سے تعلق رکھتی تھی۔ اب وہ اس بارے میں پریقین
نہیں تھا کہ اپنے پلان پر عمل کر سکے گا یا نہیں۔ آج تک کسی
نے بھی اس کی خدمات کسی ایسے کو ٹھکانے لگانے کے لیے
جاسکے نہیں کی تھیں جسے وہ ذاتی طور پر جانتا ہو۔

”مجھے یہ سن کر انھوں ہوا کہ تمہیں کچھ مشکلات در
پیش ہیں۔“ بریڈ یہ مشکل تمام یہ جملہ ادا کر سکا۔

”جانتے ہو شاید تم ہی وہ شخص ہو سکتے ہو جو میری
مشکلات میں سے کچھ کو کھلانے میں میری مدد کر سکتے۔ اس
بارے میں کیا خیال ہے کہ تم تمہارے کمرے میں چلتے ہیں
اور ایک پرائیویٹ پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں؟ وہاں کتنے کے
بعد میں روم سروس سے اسکا کچن کی ایک بول بھی منگوا لوں گی۔“
یہ ایک ایسی پیشکش تھی جس سے بریڈ انکار نہیں کر سکتا
تھا۔ ہائی اسکول کے زمانے میں اپنی شدید خواہش کے
باوجود وہ بھی لیزلی کو ایک جان دو قاب کرنے میں کامیاب
نہیں ہو سکا تھا۔

”آؤ، کمرے میں چلتے ہیں۔“ بریڈ نے اپنی خوشی
چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے بریڈ کے کمرے میں آ گئے۔
لیزلی کمرے کی مخالف سمت کی دیوار کے پاس پہنچ کر
کھوم گئی۔

بریڈ نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اپنا کوٹ اتار
دیا۔ اسے اپنے رویو اور کی ٹکر نہیں تھی کیونکہ وہ اسے اپنے
ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس بحری سفر
میں اتنی جلدی اسے رویو اور کی ضرورت پیش آ جائے گی۔

الٹن بازی

کیونکہ اس کی تمام تر توجہ لیزلی کی جانب تھی اس
لیے وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس کے کوٹ اتارنے کے
دوران اندر کی جیب میں سے ایک تصویر نکل کر فرش پر گر
پڑی تھی۔

لیزلی نے پہلے تصویر کو اور پھر واپس بریڈ کی طرف
دیکھا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنے پرس میں چلا گیا۔

”سو وہ تم ہو جس کی خدمات اس نے مستعار لی
ہیں۔“

”معاف کرنا، کیا کہا؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کے لیے کسی کی
خدمات حاصل کرے گا۔ وہ مجھے طلاق دینے کا حائل نہیں ہو
سکتا تھا۔ مجھے کبھی بھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کوئی تم جیسا
ہوگا۔“

بریڈ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور بولا۔
”لیزلی!.....“

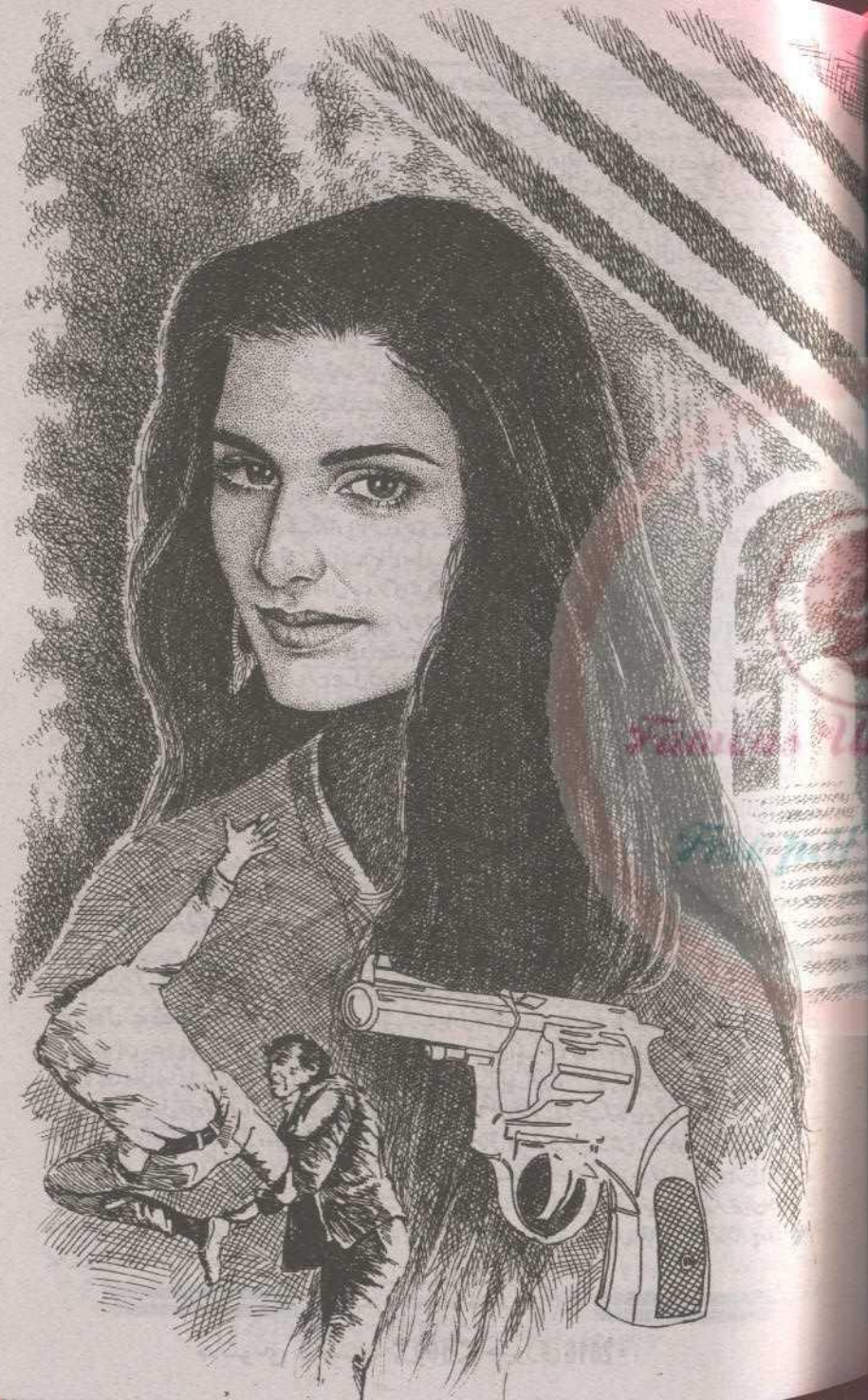
لیکن یہ اس کے منہ سے ادا ہونے والے آخری
الفاظ تھے کیونکہ لیزلی نے اپنے اعشاریہ تین آٹھ کے
پستول کا ٹریگر دبا دیا تھا۔ وہ یہ پستول اس وقت سے اپنے
پرس میں ہر وقت رکھتی تھی جب سے اسے خدشہ ہو گیا تھا کہ
اس کا شوہر جیف جنگلی اسے مارنے یا مروانے کی کوشش
ضرور کرے گا۔

وہ بریڈ کی لاش کو پھلانگ کر دروازے کی جانب بڑھ
گئی۔ دروازہ کھولنے سے قبل وہ پہلی اور فرش پر پڑی فریک
ٹڈلن عرف بریڈ بارت کی لاش کو گھورنے لگی۔ ”پہلی گولی
مجھے قتل کرنے کی کوشش کے جواب میں تھی۔“ اس نے کہا۔
پھر اس بے جان لاش پر ایک اور فائر کرتے ہوئے بولی۔
”اور یہ گولی ہائی اسکول میں مجھ سے یکا یک تاتا توڑنے کے
صلے میں ہے۔“

پھر بیرونی ڈیک کی جانب جاتے ہوئے اس نے
اپنے پرس میں سے پستول کے علاوہ باقی تمام چیزیں نکال
لیں۔ عرصے پر پہنچ کر اس نے اپنا پرس اور پستول نیچے
سمندر کے پانی میں پھینک دیے۔

”جیسا کہ میں نے سوچا تھا، یہ رات تو درحقیقت اس
سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوئی ہے۔ اب میں اپنی بقیہ
سمندری سر و تفریح کا پھر پور لطف اٹھا سکوں گی۔“
پھر وہ اس خوشی میں ایک اور جام پینے کے لیے واپس
مرکوزیسٹ نامی لاؤنج میں چلی گئی۔





طاہر جاوید معنل

انکارے

ساتویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں درد مند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر پولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیر داری کے بے رحم سرغنہ لہجے کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنیوں کی نگاہوں سے نفرت کے انکارے برسے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور دیانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اٹھو رسوخ اور زندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ پار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

مطرِ سحر رنگِ برفِ برف... ایک لیونرنگ اور
دلِ گدا از داستان...

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ لیکن یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو بدلا کر دیا۔ میں نے سہراہ ایک ایسے زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوڑی لکڑی مار کر مرنے لگی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم سمجھا اور سبیلوں سے جبر و انصاف کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مجھے کھیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے لے آیا۔ یہ لوگ ایک قبیہ گروپ کے سرنیل تھے جو رہائی کا لوٹا بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین بھینانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر و رواشت نہ کر سکا اور کھیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرات کی سزا سے بی بی کان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائر سمیت جلا کر رکھ دیا گیا اور وہ خود ہشت گرد قرار پا کر جیل بھیج دیا گیا۔ اب انسپکٹر قیصر چودھری اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرا ماضی کیا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں WWF کا ایئر بی جیٹین تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے کنٹریکٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن اپنے وطن واپس آنے پر مجھے آواز دینے کی تھی۔ میں نے اپنی بیٹی اور چچا زاد بہن فائرہ کے قاتل لالہ نظام کو پھانسی دے کر دیا۔ انسپکٹر قیصر چودھری شدید زخمی ہو کر اسپتال لائے ہوئے تھے۔ کھیل داراب ایک شریف انٹنس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے چچے کا ہاتھ جو کر بڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی "مخلی" کی تھی۔ میں نے کھیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر ہڈاؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ عاشرہ اور عارف کو میں نے بیرون ملک بھجوا دیا تاکہ وہ تحفظ کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کر سکیں۔ میں خود بھی بیزار ہو گیا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر میرا ایک انہونی ہوئی۔ وہ جاوہی حسن رکھنے والی لڑکی تھی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام جاوہر تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں کچھ نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجر کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیس بلور مددگار میرے ساتھ تھے۔ مجھے پتا چلا کہ جاوہر کا خلیق صفت بھتیجی اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور دیر ولایت کے ساتھ مل کر جاوہر اور اس کے والدین محمد کے گرد گھیرا انگ کر رہا تھا۔ دیر ولایت نے گاؤں والوں کو اور کرکھانہ کا گرا تاجوری شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آنے کی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست کو نام مجھ مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ مولوی فدا جو پہلے زبردستی کی شادی کو غلط قرار دے رہے تھے، اب نا مطمئن و جبر اسحاق کی حمایت کرنے لگے تھے۔ اسی دوران میں کسی نے تاجر کے گھر آئی ہوئی مہمان نگر دانی کو بری طرح زخمی کر دیا۔ اسحاق کے ہمنواؤں نے اس کا الزام بھی تاجر پر لگانے کی کوشش کی، لیکن میں نے کھوج لگانے کی کھانی۔ مجھے شک نہ رہا کہ اس کام میں مولوی فدا یا اس کا کوئی شاگرد ملوث ہے۔ ایک رات میں نے چچے پر ہڈاؤ ڈالا تاکہ وہ مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام بیاری اور وکر م کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلطی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کی غلطی سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آگئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترن بندے کی حیثیت سے یہاں وکر م اور رام بیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکر م اور رام بیاری کے کچھ خاندان نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ بی بی کا شکار وکر م ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکر م اور رام بیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکر م کو کندھے پر لاد کر رام بیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نہرواری کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ پتا چلا کہ یہ مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا ہے۔ وہ تاجوری جان لینا چاہتا تھا کیونکہ "ا" کی وجہ سے مولوی صاحب کی بلک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے مجھے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیاری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں شیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت خیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو اسٹال نے گاؤں پر حملہ کیا۔ سٹلے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجر کو کھلا آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے ہمیں بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلک میلنگ" سے نکلنے کا عندیہ دیا، مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاد کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چپ کر ان کی تصاویر بھیج لیں۔ پھر میں اقبال کے ساتھ شاد پور روانہ ہوا جہاں میری ملاقات اس شخص سے ہوئی جو یاسر بھائی کے نام سے خراج حسین وصول کر رہا تھا۔

اب آہ مزید واقعات ملاحظہ فرمائے

اقبال اندر اوجھل ہو گیا تو میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شہر خوشاں میں مکمل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ کروں کے گرد گھوم پھر کر دیکھا۔ دو ٹھوکیاں موجود تھیں مگر اچھی طرح بند تھیں۔ پھر میری نگاہ ایک گول روشن دان پر پڑی۔ یہ چھت سے بس ایک فٹرفٹ ہی نیچے ہوگا۔ میں کوئی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر کھڑکی کی کچھکٹ پر پاؤں جمانے میں کامیاب ہوا اور پھر چھت پر پہنچ گیا۔ یہاں التالیث کر میں نے گول روشن دان میں جھانکا۔ لائین کی تدم روشنی میں مجھے اقبال کی پست نظر آئی۔ اس کے سامنے جو ادھر عرض کھڑا تھا، وہ اپنے پیٹے سے کوئی گورنر ہی نظر آتا تھا۔ کمرے میں کھدائی کے آلات، کسپاں، کھربے وغیرہ موجود تھے۔ ایک طرف لہ کے اوپر رکھے جانے والے لکڑی کے پھٹے ڈھیر کی صورت میں نظر آرہے تھے۔ اقبال کی دھیمی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "میں اس کا دکھ بھٹتا ہوں کس چاچا پر اس کا جانا بالکل شیک نہیں۔ تم اسے بلاؤ" میں بتاتا ہوں سب کچھ۔

"اچھا تم بیٹھو۔ سردی لگ رہی ہے تو یہ کبل لے لو۔"

ادھر عرض کھٹ لہا۔

"نہیں میں بالکل شیک ہوں۔" اقبال بولا۔

پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ادھر عمر چاہے شمس نے ایک پلنگ نما چارپائی کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کیا۔ چارپائی کے نیچے ایک بڑے سائز کا جفتی صندوق تھا۔ چاہے نے اسے بھی اس کی جگہ سے کھسکایا۔ پچھلکڑی کے پھٹے نظر آئے۔ دو پھٹے ہٹانے کے بعد چاہے شمس نے آواز دی۔ "یاسر پتر ابا ہر۔ بالائے آپا ہے جے۔"

کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر غلامش لکڑی کی سیڑھی نظر آئی، اور اس سیڑھی پر چڑھ کر وہ باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ مہربان ہوا اور سیاہی مائل تھا۔ شلوار میں ایسے جی جیسے کی طویل لکڑی پر جمول رہی ہو۔ اس کی گردن پر ایک پٹی بھی بندھی ہوئی تھی، مجھے تاجوری بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔ جب عالمگیر کے بندوں سے یاسر بھائی کی لڑائی ہوئی تھی تو ان کی گردن پر چوٹ آئی تھی۔

یاسر کو دیکھ کر مجھے گہری مایوسی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بھی سو جی ہوئی تھیں۔ لیکن ہے کہ یہ سوز اس دکھ کا نتیجہ ہو

جلدی ہی مجھے شاد پور گاؤں کے آثار نظر آنے لگے۔ کہیں کہیں بلی روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ رات سرد تھی اور موٹر سائیکل پر سفر کرنے والے کے لیے تو مزید سرد تھی۔ میری توقع کے عین مطابق کر یا نہ فروش اقبال نے مجھے گاؤں کے اندر جانے کی زحمت نہیں دی۔ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھے موٹر سائیکل روکنے کا اشارہ دیا۔ میں رگ کیا تو وہ فوراً نیچے اترا آیا۔

بولا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بات کا منہم سمجھانے کے لیے میرا کندھا بھی چمکا۔

تب اس نے اپنے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بیٹریول کے خرچے کے طور پر پچاس روپے میرے ہاتھ میں چھانے کی کوشش کی۔ میں نے شہرود سے انکار میں سر ہلایا اور اشاروں کی زبان میں اسے بتایا کہ ہم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور بھائی جارے میں ایسا لین دین نہیں ہوتا۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس نے شلوار میں سے اوپر غائبانہ لٹے گاؤں کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ قبول صورت تھا اور اس کا قد بھی کوئی ایسا چھوٹا نہیں تھا۔ جسم کے لحاظ سے مناسب ہی تھا۔

اس کو دکھانے کے لیے میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور واپس چل دیا مگر کچھ ہی آگے جا کر میں نے انجن بند کر کے موٹر سائیکل کو درختوں میں کھرا کیا اور اس سمت میں بھاگا جہاں اقبال گیا تھا۔ جلدی مجھے اس کا ہیو لال نظر آ گیا، وہ گاؤں کے اندر جانے کے بجائے آبادی کے ساتھ ساتھ چلتا جا رہا تھا پھر وہ کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ اس کے انداز میں گت تھی۔ میں فاصلہ رکھ کر محتاط انداز میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں کے قبرستان میں داخل ہو گیا۔ قبرستان کو نکلیں اور جتنے وغیرہ کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔

اب میں نے فاصلہ کر دیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں اوجھل ہی نہ ہو جائے۔ قبرستان کے اندر پہنچتے ہی والے دو کپے کمرے سے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں لائین کی روشنی بھی موجود تھی۔ اقبال نے ایک دروازے پر دستک دی اور اس کے ساتھ ہی محتاط انداز میں مڑ کر پیچھے دیکھا۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اگر مجھے ایک قبر کے پیچھے لینے میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو اقبال کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور "السلام علیکم چاچا" کی تدم آواز میرے کانوں تک پہنچی، یہ آواز یقیناً اقبال ہی کی تھی۔

جو اسے اپنی پیاری پھوپھی کی ناگہانی موت سے ہوا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ مجھے یہ بھی لگا کہ اس نے تھوڑی بہت پی رکھی ہے۔

اقبال اور یاسر غم آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ ”یاسر بھائی! تمہاری پھوپھی جی کا بہت افسوس ہے۔ یقین کرو ایسے لگتا ہے کہ اپنا کوئی خون کا رشتہ وچر گیا ہے۔“

”اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔“ چاچے شمس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔

وہ تینوں چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔ چاچا شمس تو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا مگر یاسر اور اقبال دونوں دکھائی دیتے تھے۔ یاسر نے روکے سے لہجے میں کہا۔ ”بالے! تم سے کہا بھی تھا کہ بہت ضرورت کے وقت ہی آیا کرو۔ زیادہ آؤ گے تو کوئی بھی تمہارا پیچھا کر کے یہاں تک پہنچ جائے گا۔“

”اس وقت سخت ضرورت ہی تھی تو آیا ہوں یاسر بھائی، مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں چاند گڑھی کا رخ نہ کرلو۔ میرا مطلب ہے پھوپھی سے تم کو بڑا پیار تھا۔ تم ان کا مت بھی نہ دیکھ سکے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تم کی قبر پر آنے کی کوشش کرو گے۔“

”اگر کرتا بھی تو اس میں کیا ہے؟“ یاسر نے چڑچڑے سے انداز میں کہا۔

”پولیس چاند گڑھی میں قبرستان کا پہرا دے رہی ہے۔ ابھی دو چار ہفتے تک بھول کر بھی ایسی سوچ دماغ میں نہ لانا۔“

یاسر نے اپنی بظنی جیب ٹول کر سگریٹ کا ایک مزارعہ پیکٹ نکالا اور لڑتے ہاتھوں سے اسے جلا دیا۔ اس کا انداز اس امر کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ سگریٹ منہ میں دبا کر اس نے دو لمبے کش لیے۔ دوسرے کش کے بعد اسے کھانسی ہونے لگی۔ کھانسی ہوتے ہی اس کے مدقوق چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلہ قائم کیا۔ یقیناً گلے کا پرانا زخم اسے تکلیف دے رہا تھا۔

گورکن چاچا شمس نے اٹھ کر اسے جلدی سے پانی پلایا۔ اس کی کھانسی بھی تو نہیں لیکن کم ہوئی۔ اقبال نے بھی لہجے میں کہا۔ ”یاسر بھائی! تمہاری ساری مشکلوں کی اصل بڑ میں ہی ہوں۔ سچی سچی تو زندہ رہنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔“

”ہر بار یہ رونا نہ رو دیا کرو۔ بس جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ یاسر نے ایک بار پھر چڑچڑے انداز میں کہا اور منہ پر ہاتھ

رکھ کر کھانسنے لگا۔

گورکن شمس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”بالے! وہ کالی پگڑی والے کا کیا قصہ ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ یاسر ہے بلکہ کئی تو اس پر پکا پکائی قین کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”ہاں چاچا، چاند گڑھی میں بھی زیادہ تر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ وہ یاسر بھائی ہے اور یہ جو یاسر بھائی کے گھر پر سیالکوٹی کے غنڈوں نے ہلا دیا ہے، اس کی وجہ بھی تو یہی ہے۔“

گورکن شمس نے کہا۔ ”ہاں، کوئی تصویروں والی مٹی بھی سنی ہے۔ ان تصویروں کی وجہ سے ہی عالمگیر اور تحصیل دار میں خون خرابا ہوا ہے۔“

”اور کہا یہ جارہا ہے کہ یہ تصویریں یاسر بھائی نے اتاری ہیں۔“ اقبال نے شمس کی بات مکمل کی۔

”مجھے اس سارے سمجھنے سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔“ یاسر نے تقریباً چلا کر کہا اور سگریٹ کا خالی پیکٹ دور پھینک دیا۔ ”بالے! تم بس میرا ایک پیغام میرے تایا کی تک پہنچا دو۔“

”جو حکم یاسر بھائی۔“ اقبال نے سراپا اطاعت میں کر کہا۔

یاسر دھیمی آواز میں اسے اپنے پیغام کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ اپنے تایا سے کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی والدہ اور بہن وغیرہ کو پتھیل والے گاؤں سے نکال کر سیالکوٹ یا پھر لاہور پہنچا دیں۔ وہ ان کے لیے مزید خطرات مول لینا نہیں چاہتا اور خود اس کے بیمار جسم میں اتنی ہمت نہیں ختمی کہ وہ ان کی حفاظت کر سکتا۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بالکل بے بس اور کمزور شخص دکھائی دیا۔ جو بے شک دلیر تھا لیکن اب اپنی بیماری اور حالات کے ہاتھوں شکست کھا چکا تھا۔ وہ اس وقت ایک خوف زدہ شخص کی طرح اس گورکن کے زمین دور ٹھکانے میں چھپا ہوا تھا۔ یہ تصویر اس تصویر سے بہت مختلف تھی جو میں نے یاسر کے حوالے سے اپنے ذہن میں بنائی تھی۔ اس نے اقبال سے یہ بھی کہا کہ وہ اس کے تایا تک

اس کا پیغام ڈاک کے گناہم خط کے ذریعے پہنچائے یا ایسا ہی کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ کچھ دیر بعد اس کی کھانسی پھر شدت پکڑ گئی۔ وہ ٹوٹھڑاتا ہوا ساٹھ کھڑا ہوا۔ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم دونوں بیٹھو، چائے شائے پیو، میں اب پیچے جاتا ہوں۔“

اقبال نے اسے سہارا دینا چاہا مگر اس نے اسے پیچے

انگادے

ضبط کا بند ٹوٹا تو یوں لگا کہ سیلاب آ گیا ہے۔ اس نے اپنا سر اپنے منھوں پر لٹکا دیا اور روتا چلا گیا۔ کس اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے اپنے ساتھ لگانے لگا۔ وہ بھی شمس کے گلے لگ گیا۔ جیسے ایک ہمدرد کو پانے کے بعد اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لینا چاہتا ہو۔

پتا نہیں یہ کیا روداد تھی مگر اقبال جس طرح ٹوٹ کر رو رہا تھا، وہ بڑا سٹارٹ تھا۔

میں زیادہ دیر اس سرودی میں کھلے آسمان کے نیچے اوندھا حلیت کر رہے مناظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہاں تک آنے کا میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے آج اس بے بس ”یاسر بھائی“ کو دیکھ لیا تھا جو پورے چاند گڑھی کے لیے بلکہ ارد گرد کے علاقے کے لیے بھی ”بہرو“ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت نے بالکل متاثر نہیں کیا تھا۔

میں ایک بیچ کے لگ بھگ موٹر سائیکل پر سوار چاند گڑھی واپس پہنچ گیا۔ حسب معمول اتنی میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ فٹ بولا۔ ”شاہ زیب بھائی! آپ نے تو مجھے بیوی بنا کر رکھ دیا۔ ہے۔ آپ رات کو نکل جاتے ہیں اور میں تارے گننا رہتا ہوں۔“

”لیکن اگر تمہیں ایک زبردست کہانی بھی تو سنانا ہوں ہر بار۔“ میں نے کہا۔

”پتلیں پھر سناں، اب کی بار کی کہانی۔“ میں نے اسے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے کی ساری روداد کہہ سنائی۔ وہ بھی حیرت کے دریا میں گم ہو گیا۔ ہر حال میں نے اسے تاکید کی کہ وہ حق نواز وغیرہ کو اس بارے میں بھونک نہیں پڑنے دے گا۔

☆☆☆

فضاؤں میں آج کل شرمسار ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میں زمین پر نہیں چلتا میرے پاؤں بے ساختہ ہوا پر حرکت کرتے ہیں اور میں اڑتا ہوں۔ ایک عجیب ترنگ تھی، ایک عجیب میٹھا میٹھا درد تھا اور یہ جو کچھ میں تھا، سب تاجور کی وجہ سے تھا۔ اس کا تصور ہر وقت میرے دل و دماغ کو جکھکاتا رہتا تھا۔ گاؤں کی ایک سہانی صبح میرے سامنے تھی۔ ہریالی پر اس کے ننھے ننھے قطرے تھے اور کھیتوں پر ہلکا ہلکا کھرا دکھائی دے رہا تھا۔ جی چاہا کہ ایسے میں کہیں سے تاجور نمودار ہو جائے۔ مجھے دیکھ کر شرارت سے بھاگ اٹھے، میں اس کے پیچھے بھاگوں۔ ہم ایک ایسے گہرے کبرے میں چھپ جائیں جہاں کوئی ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میں اپنے ہونٹوں کو اس کے سین چہرے کے مقابل رکھ دوں اور سب

بہنا دیا۔ خود ہی سنبھل سنبھل کر کڑی کے زینے تک پہنچا اور اترنے لگا۔ اترتے اترتے رک گیا اور اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہاری اطلاع کا شکریہ۔“ ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو تو میں ابھی باہر نہیں نکلوں گا۔“

اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔ یاسر کے اوچھل ہونے کے بعد گورکن شمس نے غلا پر تختے برابر کر دیے اور ان پر ٹنک اس طرح رکھ دیا کہ وہ چھپ گئے۔

سرودی میں چھت پر اوندھے لیٹے لیٹے میرا جسم آگڑ گیا تھا مگر اندر کی صورت حال اتنی دلچسپ تھی کہ میں مزید یہاں رہنا چاہتا تھا۔ یاسر کے جانے کے بعد گورکن شمس نے مجس آئینہ لہجے میں اقبال سے پوچھا۔ ”بالے! سوچنے کی بات ہے اگر وہ پگڑی ڈھانے والا یاسر نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اس نے عالمگیر کو تو تھو ڈال دی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ پیر ولایت اب اپنی صفائیاں پیش کر رہا ہے۔“

”ولایت کی صفائیاں بس ایسے ہی ہوتی ہیں۔ پہلے بھی اس کی صفائیاں لوگوں نے کم ہی مانی تھیں۔ بس وہی مانتے ہیں جو اندھوں کی طرح اس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ جیسا پیو ویسا پتر۔ پیو کہا کرتا تھا کہ سب کو جسم کر دوں گا اور جسم خود ہو گیا۔ یہ کہتا ہے کتنے کی موت مرو گے، اور مرنا اس نے خود ہی ہے۔“

دونوں اپنی اپنی جگہ کم کم ہو گئے۔ جیسے ماضی قریب کے کسی واقعے کی یاد میں گم ہو گئے ہوں۔ گورکن شمس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”اس کا کچھ پتا چلتا ہے؟“ اقبال کے چہرے پر جیسے ایک رنگ سا گزر گیا، ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”چاچا! نہ کرو اب اس کی بات۔ دل دکھتا ہے۔ اس کو اب کہاں آتا ہے۔ آنا ہوتا تو اب تک آچکی ہوتی۔“

”وہ کہتے ہیں نا بالے کہ مرنے والوں کے لیے جہنم آجاتا ہے لیکن جو کم ہو جاتے ہیں ہمیشہ رلاتے رہتے ہیں۔ مجھے پتا ہے تو اسے نہیں بھول سکا اور نہ چاند گڑھی والے بھول سکے ہیں۔“

”نہیں، میں بھول چکا ہوں چاچا! نہیں آتی اب مجھے اس کی یاد۔ وہ میری بھی ہی نہیں، اگر ہوتی تو اس طرح میرے آئے سے پہلے پنڈت چھوڑتی اور چھوڑنا ہی تھا تو کوئی پتا ٹھکانا تو بتاتی۔ سچی کوئی خط تو لکھتی کہ اس دنیا میں ہے یا نہیں۔ وہ کبھی کہیں کہیں ایک بار بھی تو پھر نہیں آؤں گی اور اس نے ایسا ہی کیا ہے چاچا، اگر وہ اتنی ٹھنڈی دل کی ہے تو پھر میں بھی کیوں کروں اسے یاد۔۔۔ کیوں کروں؟“

وہ ایک دم لپکیوں سے رونے لگا۔ ایک بار اس کے

کچھ بھول جاؤں۔

ایق نے آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ”کہاں کھو گئے شاہ زیب بھائی۔“
میں نے کہا۔ ”اس منظر میں کھو گیا ہوں جو اس منظر میں نہیں کھوتا۔۔۔۔۔ میرے خیال میں وہ بالکل ”کھوتا“ ہے۔“

”لیکن میں کھوتا نہیں ہوں۔“

”تو آخر پھر ذرا چہل قدمی فرمائیں۔“ میں نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

ہم دونوں نکل پڑے۔ ہوا کسی ایسی لطیف و شیزہ کی طرح تھی، جسے کسی کا ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے کسی نے میلی نظر سے دیکھا تک نہ ہو۔ کوئیں سے آنے والی شفاف تالیوں میں پانی کی ”کھل کھل“ سنائی دیتی تھی۔ ایتق نے ایک کیکر سے دوپٹی شامیں توڑیں۔ ہم انہیں مسواک کی طرح استعمال کرتے ہوئے کچے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ گاؤں کی اس جانب ہم بھی نہیں آئے تھے۔ دراصل میں ہیر ولایت کا آستانہ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس نیم چھتہ آستانے پر دوری سے ایک بڑا جھنڈا الہرا نظر آتا تھا۔ قریبی درختوں پر لوگوں نے منتوں مرادوں والی بے شمار دھجیاں باندھ رکھی تھیں۔ آستانے کے پیچھے سیاہ دیواریں تھیں، لگتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے یہاں زبردست آتشزدگی ہوئی جس نے سب کچھ رکھ کر دیا۔

”یہ کیا ہے ایتق؟“ میں نے پوچھا۔

”سنا ہے جی کہ یہ ہیر ولایت کے والد ہیر سانسائی کا ڈیرا تھا۔ چھ سات سال پہلے یہاں زبردست آگ لگ گئی تھی۔“

”پھر کوئی جانی نقصان ہوا یا کچھ بچاؤ ہو گیا؟“

”اس کا تو پتا نہیں جی۔۔۔۔۔“ ایتق بولتے بولتے رک گیا۔ اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ صبح کی ان اولین گھڑیوں میں یہ سادہ لوح دیہاتی بڑی عقیدت کے ساتھ اس خاکستر جگہ کے سامنے دوڑاؤ بیٹھا تھا اور ہاتھ جوڑ کر دعا وغیرہ مانگ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جگہ بھی لوگوں نے اپنی منتوں مرادوں کے لیے وسیلہ بنائی ہوئی ہے۔

ایق بولا۔ ”میرا خیال ہے ان بابا جی سے کچھ پوچھنا چاہیے۔“

میں نے اشیات میں سر ہلایا۔

گھجڑی داڑھی والا شخص اپنی ”مناجات“ سے فارغ

جاسوسی ڈائجسٹ 104 جنوری 2016ء

انگاہ

میں نے ایتق کو ہٹو کا دیا۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر پہلوان حشمت سے نوجوان لڑکی سے زیادتی والے واقعے کی تفصیل پوچھنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلوان کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ نوجوان لڑکی وارثوں کی سادہ لوحی بیوی سے چھ سات روز۔۔۔۔۔ سانس کا ڈیرے پر ہی رہی تھی۔ ہیر اسے زیادتی کا نشانہ بناتا رہا اور ساتھ ساتھ ڈراتا رہا کہ اگر اس نے اپنے گھر والوں سے اس ”مکمل“ کا ذکر کیا تو وہ مزید مصیبت میں پڑ جائے گی۔ اس سے چپتا ہوا جن اس کا حشر نشر کر ڈالے گا۔ (چپتا ہوا جن تو اصل میں ہیر سانس خود ہی تھا)

لڑکی کے وارث لڑکی سے ملے آئے تو اس نے سب کچھ اپنی ماں کے گوش گزار کر دیا۔ وہ لوگ خاموشی سے لڑکی کو لے گئے لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا وہ۔۔۔۔۔ سانس کی سوچوں سے بہت آگے تھا۔ مشتعل وارثوں نے اسے اور اس کے دو مریدوں کو ڈیرے سمیت جلا کر راکھ کر ڈالا۔ بعد ازاں ہیر سانس کے بیٹے ہیر ولایت اور خاص مریدوں نے اس سارے واقعے کو ایک اور رنگ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہیر صاحب نے 120 دن کا جو چلہ کاٹا تھا، اس میں انہوں نے اپنے چاہنے والوں کے سارے گناہ اپنے سر لے لیے ہیں اور ان گناہوں سمیت خالق حقیقی سے جاملے ہیں۔ ایتق نے کہا۔ ”اور حشمت بھائی! وہ جو خوشبو چلے ہوئے کھنڈر میں سے آتی ہے؟“

”وہ سب جھوٹ ہے۔“ حشمت نے جھٹلے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اللہ معاف کرے۔ خوشبو تو ان عظیم لوگوں کی قبروں سے آوت ہے جو اللہ کی راہ میں جان دیوت ہیں۔ ایسے پاک کھنڈریوں کے مرقد میں خوشبو کا کیا کام؟ یہ تو ہیر ولایت کے چلے چائے ہی ہیں جو خاموشی سے وہاں عطر وغیرہ چھپک دیوت ہیں۔ کچھ خوشبو ان پھولوں کی ہوت ہے جو لوگ وہاں چڑھاوت ہیں۔“

یہ اسی روز شام کی بات ہے۔ میں تین گھنٹے مسلسل ٹریکٹر چلانے کے بعد ابھی ابھی نیچے اترتا تھا۔ پانی کے ایک کھالے کے کنارے بیٹھ کر اپنے پاؤں دھوئے لگا۔ اس دوران میں دین محمد کی ملازمہ لوری نظر آئی۔ وہ سروسوں کا ساگ توڑ رہی تھی۔ بغل میں دو تین گلو ساگ ہوگا۔ میرے قریب۔۔۔۔۔ بیٹھ کر وہ ساگ کو شفاف پانی سے دھوئے گی۔ ارد گرد نکادے کھت تھے۔ کوئی تنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہولے سے بولی۔ ”کیا حال ہے بھائی شاہ زیب؟“

اور ہی کہانی سنائی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”اللہ سے ڈرگت ہے بھیا کہ منہ سے کوئی غلط سلف بات نہ نکل جاوے۔۔۔۔۔ مگر جو کچھ یہ بابا جی بتا رہے تھے، بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ سچ ثابت ہے۔“

”تو سچ کیا ہے؟“ ایتق نے پوچھا۔

پہلوان حشمت نے اپنی آواز کچھ مزید دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی نور کی لاث شات نہیں اتری تھی۔ سب من زبانی باتیں ہیں۔ وڈے پیر کے ڈیرے میں آگ لگی تھی اور بس جل گیا تھا وہ۔“

”آگ کیسے لگی؟“ ایتق نے پوچھا۔

”اگر میرے منہ سے کچھ غلط نکلے تو اللہ مجھے معاف کرے۔ بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وڈے پیر نے ایک لڑکی کا جن نکالنے کے بہانے اس سے زیادتی کی تھی۔ وہ لڑکی ڈس کے کی طرف کسی پشیمان گھرانے کی تھی، بڑے ڈھاڈے لوگ تھے وہ۔ وہ آدمی رات کے وقت آئے۔ انہوں نے ڈیرے کے چاروں طرف بیٹھ کرل پھینکا اور آگ لگا کر غائب ہو گئے۔ وڈا پیر سانس اور اس کے دو خاص چیلے اندر ہی جل کر خاک ہو گئے تھے۔ اس واقعے کے دو دن بعد وہ پشیمان لڑکی بھی غائب ہو گئی۔“

یہ حیرت ناگ انکشاف تھا۔ ایتق نے حشمت سے پوچھا۔ ”یہ بیٹھول اور آگ لگانے والی بات کا پتا کیسے چلا۔“

کیا کسی نے پشیمانوں کو دیکھا تھا؟“

”ہاں، کچھ نے دیکھا بھی تھا لیکن سانسے آکر کسی نے بات نہیں کی۔ اندر خانے کی کہانی کا بہت سے لوگوں کو پتا ہے۔“ حشمت نے کہا۔ پھر جیتی و نظروں سے ارد گرد دیکھا، جیسے کسی کے موجود نہ ہونے کی تسلی کرنا چاہتا ہو۔ سرگوشی میں بولا۔ ”میں بائیس سال کی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کے وارثوں کا خیال تھا کہ اس پر سایہ ہے۔ وہ اسے وڈے پیر سانس کے پاس چھوڑ گئے تھے علاج معالجے کے لیے۔ وہ جن نکالنے کا دعویٰ بھی کرتا تھا۔ مریض کو ڈنڈوں سے مارتا تھا اور جب مریض چلاوت تھا تو سانس کہوت تھا کہ اس کے اندر کی بدروح چلاوت ہے۔ میں نے چھ سات سال کی ایک بچی کو خود اپنی لگاؤ گار گھوٹوں سے دیکھا ہے۔ ہیر سانس کے چیلوں نے ڈنڈے مار مار کر اس معصوم کی جان ہی لے لی تھی۔ آج بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے آوت ہے تو دل کانپ جات ہے۔“

پہلوان حشمت نے جھرجھری سی لی اور خاموش ہو گیا۔

ہوا تو ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے جلی ہوئی جگہ کی کچھ سیاہی بڑی عقیدت سے اپنی پیشانی پر لگائی اور سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ (پہلے تو لوگ ہم سے بات ہی نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم دین محمد صاحب کے ملازم تھے اور دین محمد کا گاؤں والوں نے بائیکاٹ کیا ہوا تھا مگر اب صورت حال مختلف تھی)

”کیا بات ہے پتر؟“ داڑھی والے نے ایتق سے پوچھا۔

ایق بولا۔ ”بزرگوار! ہم نے سنا ہے کہ یہ ہیر ولایت کے والد ہیر سانسائی کا ڈیرا تھا۔ یہ آگ میں جل گیا تھا۔ کیا ہیر جی خود بخود گئے تھے؟“

”نہیں! وہ شہید ہو گئے تھے اور۔۔۔۔۔ یہ شہادت انہوں نے خود اپنے لیے چھپی تھی۔“

”خود چھپی تھی؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ انہوں نے اس جگہ بیٹھ کر ایک موشی دن کا چلہ کاٹا تھا۔ ہم گناہ گاروں کے سارے گناہ اور ہماری ساری برائیاں انہوں نے اپنے سر لے لی تھیں اور پھر اللہ پاک سے دعا کی تھی کہ وہ انہیں اٹھالے۔ آسمان سے نور کی ایک لاث اتری تھی اور اس نے وڈے پیر جی کے خاکی پنڈے (جسم) کو ساڑ کر سواہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ ہمارے گناہوں سمیت۔“

ایق حیرت سے اس چلے ہوئے کھنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں اب بھی لوگ پھول وغیرہ بیچتے تھے۔ اسی دوران میں ایک اور ضعیف شخص بھی بیچ پھیرتا ہوا وہاں آگیا۔ اس نے ہمیں یہ واقعہ مزید تفصیل سے سنایا۔ 120 دن کے چلے کے بعد ایک اندھیری رات میں آسمان سے روشنی کا ایک ستون سا اترتا تھا اور اس نے وڈے پیر سانسائی کے آستانے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ پھر سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ وڈے پیر جی کے ساتھ ان کے دو خاص مرید بھی ”شہید“ ہوئے۔ بزرگ کا کہنا تھا کہ اس چلے ہوئے آستانے سے سات سال بعد بھی ایک طرح کی خوشبو آتی ہے۔ اس نے ہمیں سوچنے کو کہا۔۔۔۔۔ خوشبو واقعی محسوس ہوتی تھی۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی پہلوان حشمت بھی چہل قدمی کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور خاموشی سے بیٹھ کر سفید براق لمبی داڑھی والے بابا جی کی باتیں سن رہا۔ اس نے ان کی باتیں میں ہاں ملانی۔

لیکن کچھ ڈیر بعد جب ہم پہلوان حشمت کے ساتھ ڈیرے پر واپس پہنچے تو اس نے سرگوشیوں میں ایتق کو کچھ

طرح تاجور بھی اس کی جدائی کو بے طرح محسوس کرتی تھی۔ اگلے چند ریس منٹ انکشاف آئیز تھے۔ اس شخصری ہوئی شب میں تاریک چھت پر مجھ سے تین فٹ کے فاصلے پر بیٹھ کر تاجور نے اقبال اور ریشمی کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ اس طرح تھا۔

وہ دونوں اسی گاؤں کے تھے اور لڑکپن سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ریشمی کی صورت کی طرح اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ وہ شادی بیاہ کے موقع پر گانا

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ریشمی تاریخ کی صورت میں قارئین کو پر جانیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بیک اسٹال گانم جہاں پر چاندی چاپ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بیک اسٹال PTCL یا سہیل فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63 فی 11 سٹیشن ڈسٹریکٹ ہاؤس قادیان مین کوریڈور، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

”اگر نہ بتایا ہوتا تو آپ اس وقت یہاں بھی نہ ہوتے۔۔۔۔۔ ویسے جناب، نوری بالکل اور طرح کی لڑکی ہے، بے فکر ہیں۔“

دفعہ ایک مدم آواز نے مجھے چونکا دیا۔۔۔۔۔ کوئی عورت بہت باریک آواز میں رورہی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ تاجور کی تیار والدہ ہے لیکن پھر غور کرنے پر پتا چلا کہ آواز پڑوس کے گھر سے ابھر رہی ہے۔ بہت دیمی آواز تھی مگر اتنی دلدوز کہ روح میں چھید کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس میں جدائی کا دکھ تھا اور فاصلوں سے پیدا ہونے والا کرب تھا۔

”کون ہے یہ؟“ میں نے تاجور سے پوچھا۔

”چائلی حلیمہ۔۔۔۔۔ ریشمی کی ماں۔“

”ریشمی؟ کون ہے؟“

”ریشمی ایک بد نصیب۔“ تاجور کی آواز میں بھی بے پناہ دکھ عکس کر آیا۔ ”میری سب سے قریبی اور گہری ٹیلی۔“

”کیا ہوا اس کے ساتھ؟“

”وہی جو ہوا کرتا ہے، پیار کرنے والوں کے ساتھ۔“ آخری الفاظ اس نے بڑی مشکل سے ادا کیے۔

”کہیں اور شادی ہوئی اس کی؟“

”شادی ہوئی یا۔۔۔۔۔ مریجی جاتی تو شاید ماں باپ کو چین آجاتا۔۔۔۔۔ پر وہ تو ایسا لا پتا ہوئی کہ کبھی کبھج ہی نہیں ملتا۔“

ایک دم میرے ذہن میں کوندا اسال کا۔ مجھے وہ مختصر گفتگو یاد آئی جو میں نے قبرستان میں گورن کشن اور کرمانہ فروش اقبال کے درمیان سنی تھی۔ اس میں بھی کسی لڑکی کی کشش کی کا ذکر تھا۔ میں نے اندھیرے میں حیر چلائے ہوئے کہا۔ ”تاجور اب یہ ریشمی وہی تو ہیں جس کا اقبال سے ملنا چلتا تھا۔“

”ملنا چلتا نہیں شاہ زیب، وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے بغیر جینے کا سوچا بھی نہیں تھا انہوں نے۔۔۔۔۔ لیکن انہیں جینا پڑا۔۔۔۔۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں شاہ زیب اب یہ کانوں بھر راستہ ہے۔ اس پر جو بھی چلا ہے، لہو لہان ہی ہوا ہے۔“

میں یہاں آیا تھا تاجور سے کچھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کے لیے۔ اسے پھر سے چھوٹنے کی آرزو لے کر۔ لیکن یہاں تو ایک اور ہی عکس موضوع چھڑ گیا تھا جس لڑکی کے کم ہونے کی بات میں نے پانچ دن پہلے اقبال کے منہ سے سنی تھی وہ تاجور کی بہت گہری ٹیلی۔۔۔۔۔ بھی اور دوسروں کی

کھول دے گی۔ میں بیڑھیاں چڑھ کر سیدھا چھت پر چلا جاؤں گا۔

وہ تاریک رات میرے لیے بڑی سنسنی خیز تھی۔ میں ایسی تاریک راتوں میں دنیا کے خطرناک ترین کام کر چکا تھا۔ یورپ کے ایسے خوشنور لیکسٹرز کا سامنا کر چکا تھا جن کا نام سن کر بھی لوگوں کے جسموں میں کچکی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے ایسے ”رنگی ایڈ وچرز“ میں حصہ لے چکا تھا جن میں ہر گھڑی جان بچھتی پر رہتی ہے لیکن اس وقت بھی میرا دل اتنی بے قراری سے نہیں دھڑکا تھا جیسے آج دھڑ دھڑا رہا تھا۔ یہ ایک معمولی سا کام تھا۔ خاموشی سے تاجور کے گھر میں داخل ہونا اور پھر گھر کی چھت پر اس سے ملاقات کرنا۔ لیکن یہ معمولی کام میرے لیے معمولی نہیں رہا تھا۔ جب تاجور کی بات ہوئی تھی تو پھر ہر صورت حال اور ہر کیفیت اپنے سستی بدل لیتی تھی۔

حسب پروگرام میں نے لوہے کے بیرونی دروازے پر مدم دستک دی۔ نوری نے دروازہ کھول دیا اور میں جکی بیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ یہاں چار فٹ اونچی جٹی منڈر تھی۔ میں ایک چار پائی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ اوپر آئے گی بھی یا نہیں؟ آخر قدموں کی مدم چاپ ابھری اور وہ میرے پاس پہنچ گئی۔ لرزاں آواز میں بولی۔ ”آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے کسی بڑی مصیبت میں ڈال دیں گے۔“

”میرے ہوتے کوئی مصیبت تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔“ میں نے بھی مدم ہر گوشی کی۔

”آپ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دلیر نہیں ہوتے۔“

”جو کیا ہے، تم نے کیا ہے۔“

”الٹا چور کو تو الٹا کو ڈانٹتے۔“

”اسی طرح کھڑی رہو تو کوئی دیکھ لے گا۔“

وہ چھت پر بولی چار پائی کے ایک سرے پر بیٹھ گئی۔

”انتاہم کھٹکھٹو تو کر جاؤ گی۔“

”ہم نہ کر نہ بیٹھا جائے تو بھی تو بندہ گر جاتا ہے شاہ زیب۔“ وہ سستی خیز انداز میں بولی۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ اس نے نوری کو پورا پورا راز داں بنا رکھا ہے اور میرے ”بے زبان“ نہ ہونے کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”سیانے کہتے ہیں کہ بات جب تک اپنے سینے میں رہے تب تک اپنی رہتی ہے۔ تم نے نوری کو بتا دیا ہے کہ میں گفتگو کر سکتا ہوں۔“

میں نے اشاروں سے بتایا کہ ٹھیک ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر دلی دہشت کھیل گئی۔ ارد گرد دیکھ کر بولی۔ ”مجھ سے اشاروں میں بات کرنے کی کوڑ نہیں۔ میں جانتی ہوں بھائی، آپ بول سکتے ہیں۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا، تاجور نے اسے سب کچھ بتا رکھا ہے۔ وہ پانی کے قریب گھاس پر دوڑا نو بیٹھ گئی اور بولی۔ ”باجی کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔“

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”پھر تو تم بڑے کام کی چیز ہو رہی۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ وہ سستی خیز انداز میں بولی۔

”تو پھر کچھ کرو گا۔“

”کیا مطلب جی؟“

”تین چار دن ہو گئے ہیں اس کی شکل دیکھے ہوئے، گرا حال ہے۔“ میں نے بھی سستی خیز لہجے میں کہا۔

وہ سنی ان کی کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو بولتے سنا ہے بھائی، تو پچی ایسے لگا ہے، جیسے کسی بے زبان جانور کو بولتے دیکھ لیا ہے۔“ اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسنے لگی۔

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”مجھے مار پڑوا دینی ہے آپ نے، مالک سے یا پھر باجی جی سے۔“

”باجی جی تو نہیں مارے گی۔ یہ تو میں گارنٹی دیتا ہوں جنہیں۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”پرسوں کچھ گھٹائیں نکل سکتی ہے۔ مالک نے ایک رات کے لیے گورنر لے جانا ہے۔ کوئی تاریخ شائع ہے۔“

”شاباش! یہ ہوتی نا بات۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہو گا مجھے؟“

وہ ساگ کا پانی نچوڑتے ہوئے بولی۔ ”ابھی تو میں ذرا آہستہ بولنا ہو گا۔ کسی نے سن لیا تو ابھی پورے پنڈ میں رولا پڑ جائے گا کہ گونگا بولنا شروع ہو گیا ہے۔“ وہ شرارت آمیز انداز میں ہنسی۔

”آہستہ ہی بول رہا ہوں بھی، تم زور سے فیس رہی ہو۔“

اگلے دو تین منٹ میں طے ہو گیا کہ میں پرسوں رات گیارہ بجے کے بعد آؤں گا۔ لوہے کے دروازے کو بہت آہستہ سے اٹھ کے ساتھ دو تین بار بجاؤں گا۔ نوری دروازہ

تھی اور انعام میں ایڈوائس وغیرہ کوئی نہیں ہوتا اور اب پلیز آپ چلے جائیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”بہت دیر ہو گئی ہے؟ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”بہر حال، میں چلا جاتا ہوں۔ بس ریشمی کے بارے میں دو تین مزید سوال پوچھنے ہیں۔“

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہ کر ہنسنے لگی مگر اب اس دوسری چارپائی پر بیٹھی جو پانچ چھت دور تھی۔ میں بھی اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔ میں نے تاجور سے چند سوال مزید کیے اور پھر اسے بھرپور امید دلانی کے میں بہت جلد اسے ریشمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتاؤں گا۔

اگلے روز میں نے انیق کے ذمے لگا دیا کہ وہ ریشمی کے گم ہو جانے والی رُوداد کی تفصیل معلوم کرے اور یہ جانے کہ آخری بار اسے کب اور کہاں دیکھا گیا تھا۔ حسب توقع انیق نے اللہ دین کے جن کی طرح کام کیا اور صرف 24 گھنٹے میں مجھے ایک اہم اطلاع پہنچائی۔ اس اطلاع کے مطابق ریشمی کو آخری بار دیکھنے والے چاند گڑھی کے ہی ایک میاں بیوی تھے۔ رام بیاری اور اس کا بیار شوہر وکرم۔ یہ کچھ عرصے پہلے کی بات تھی۔ ان دنوں وکرم کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ وہ سہارے کے ساتھ چل پھر سکتا تھا۔ وہ دونوں کہیں سے آرہے تھے۔ انہوں نے میرے پورے بس اڈے پر ایک ملنگ لڑکی کو دیکھا تھا۔۔۔ وہ ریشمی تھی۔ اس واقعے کی مزید تفصیل رام بیاری سے مل کر معلوم کی جاسکتی تھی۔ اس روز رات کو میں ایک بار پھر ”یاسر بھائی“ والے کاسٹیوم میں فیض پور گاؤں پہنچا۔ میرا اصل مقصد رام بیاری سے ملنا تھا۔ تاہم میں ماڈل گرل در قاصد جانا کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں تھی اور اسے تسلی بخشی کی ضرورت تھی۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ میں نے فیض پور پہنچ کر رام بیاری کی قیام گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے وکرم کے کھانسنے کی تھم آواز ابھر رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی شاید رام بیاری بھی جاگ رہی ہوگی۔ میں نے دیکھا تھا کئی بار وہ رات رات بھر شوہر کے سر پرانی بیٹھی رہتی تھی۔ میرا خیال درست نکلا۔ جلد ہی دروازے کی دوسری جانب رام بیاری کی ڈری ڈری آواز ابھری۔ ”کون ہے؟“

”یاسر۔“ میں نے غصے سے لہجے میں جواب دیا۔ دروازے کی جھری میں سے دیکھنے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح زرق برق لباس میں

”بس اس بارے میں تم چپ رہو۔ بس ایک بار اپنے منہ سے ذرا پیار کے ساتھ اپنی بات کہہ دو۔۔۔ شاہ زیب! پلیز! آپ میرے لیے ریشمی کا پتا چلائیں۔۔۔ بس یہ آٹھ نو الفاظ کافی ہوں گے۔“

وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ”کیا آپ کے پاس کوئی گیدڑ لٹی ہے یا جادو ٹونا؟“

”دونوں چیزیں ہیں۔ اور وہ دونوں چیزیں تمہارے روپ میں میرے سامنے موجود ہیں۔“

”آپ کیا چیز ہیں شاہ زیب؟“

”اس پکڑ میں نہی پڑو تو اچھا ہے۔ بس جو آٹھ نو لفظ میں نے کہے ہیں، وہ پیار سے کہہ دو۔“

اس نے ایک گہری سانس لی اور لڑاؤں ہونٹوں سے مسکرا کر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ میں کہہ رہی ہوں۔“

”نہیں بھئی، منہ سے ادا کرو، اور پوری سنجیدگی کے ساتھ۔“

وہ جھپٹے ہوئے انداز میں پھر مسکرائی اور بولی۔ ”شاہ زیب! پلیز! آپ میرے لیے ریشمی کا پتا چلائیں۔“

”اس کا انعام کیا ہوگا؟“ میں نے بے باکی سے پوچھا۔

”شرافت کے دائرے میں رہ کر آپ جو مانگیں گے۔“

”وعدہ رہا، شرافت کے دائرے میں ہی رہوں گا، ڈیل فائنل۔“

”لیکن شاہ زیب۔۔۔“

”بس اب کوئی سوال جواب نہیں۔ ڈیل فائنل ہاں اگر کچھ ایڈوائس میں دینا چاہتا ہوں۔۔۔“

”بھئی، ڈیل میں تمہارا بہت ایڈوائس تو ہوتا ہے نا۔“

اس کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے جمبوک میں لہر کر پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تاہم اس مرتبہ وہ بالکل میرے پہلو میں تھی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کی ٹانگوں کو چوما۔ ”پلیز چھوڑیں، کوئی آجائے گا۔“ وہ ہراساں آواز میں بولی۔

میں نے اس کی گردن کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ تڑپ کر اٹھ گئی اور کئی فٹ دور جا کھڑی ہوئی۔

”اتنا تھوڑا ایڈوائس؟“ میں نے شرارت سے کہا۔

”آپ بھول رہے ہیں، آپ نے انعام کی بات کی

تھا۔ وہ اپنی یادوں کے سہارے زندہ تھا۔ ریشمی کی حالت دیکھ کر کڑھٹا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی پرویز سے منہ ماری ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرویز نے اسے بری طرح پیٹ دیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ریشمی اچانک گاؤں سے غائب ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ اپنی عزیز ترین کھلی تاجور کے نام ایک مختصر رقعہ چھوڑ گئی۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنی مرضی سے جاری ہے۔ کوئی اسے تلاش نہ کرے۔ اس دنیا سے اس کا پیٹ بھر گیا ہے، اب وہ کسی اور دنیا کی تلاش میں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اسے آنے والے وقت میں بہت تلاش کیا گیا۔ خاص طور سے اس کے والدین اور شوہر ”پرویز عرف بیجا“ نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی کھوج نہیں ملا۔ اب تک یہ صورت حال برقرار تھی۔

اپنی عزیز ترین کھلی کی رُوداد بیان کرتے ہوئے تاجور کی آنکھیں پٹی پار ہوئیں۔ آخر میں وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ”بھئی کبھی سوچتی ہوں، شاید یاسر بھائی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکیں۔ اپنے پنڈے کے ہر بندے کا انہیں بہت خیال رہتا ہے۔ جب وہ یہاں تھے ریشمی کی گمشدگی کے بارے میں اکثر بات کرتے تھے۔۔۔“

میں نے دھیان سے تاجور کی طرف دیکھا۔ آسمان پر تاروں کی برات تھی۔ سرد ہوا شمال جنوبا چل رہی تھی۔ اس ہوائے تاجور کے چہرے کی آوارہ لٹوں کو رقصاں کر دیتا تھا۔ وہ انہیں بار بار سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی، ایسے میں اس کی گوری کلائی کی چوڑیاں چن چن بجنے لگتی تھیں۔

وہیں تاجور کے سامنے بیٹھے بیٹھے، اس کھڑی پٹا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تاجور! جو کام تم یاسر بھائی سے کروانا چاہتی ہو، وہ میں کروں تو؟“

”کیا مطلب؟“

”پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر ایک بار تم اپنی زبان سے یہ کہہ دو کہ میں تمہاری سبیلی کا کھوج لگاؤں تو یہ کھوج لگ جائے گا۔ ضرور لگ جائے گا۔“

”یعنی آپ ڈھونڈنے لگیں گے اُسے؟“

”ہاں، لیکن اگر تم کو تو اور میں اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگاؤں گا۔ وہ جہاں اور جس حال میں بھی ہے، اس کا پتا تمہیں دوں گا۔“

”کس طرح شاہ زیب! جو کام اب تک نہیں ہو سکا

اور۔۔۔۔۔“

گاتی تھی تو سننے والے دم بخود رہ جاتے تھے۔ ریشمی کے لیے کچھ بننے کی خاطر اقبال چند سال پہلے مسقط چلا گیا۔ مگر وہاں بھی اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ اسی دوران میں ریشمی کے والدین کا ارادہ بدلنا شروع ہو گیا۔ چاند گڑھی میں رہنے والا پرویز نامی ایک لڑکا لاہور میں ایک بڑے ٹھیکیدار کے پاس ملازمت کرتا تھا۔ ٹھیکیدار لاہور جیسے بڑے شہر میں کونھیاں وغیرہ بنانے کا کام کرتا تھا۔ پرویز کے حالات بھی بدل رہے تھے۔ وہ چاند گڑھی آتا تو لوگوں کو لاہور میں اپنے غماز باٹ کے واقعات سناتا۔ ریشمی کے والدین اس کی باتوں میں آنے لگے۔ ایک دن ایسا آیا جب انہوں نے اپنی بیٹی کی خوش حالی کی خاطر اس کا رشتہ پرویز سے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریشمی کا ہر احتجاج نا کام ہوا۔ وہ بیہ کر لاہور چلی گئی۔ چاند گڑھی سے بہت دور ہو گئی۔ ایک سال کے دوران میں وہ بس دو تین دفعہ ہی چاند گڑھی آئی۔ ہر وقت ہنسنے کھیلنے اور گیت گانے والی ریشمی بالکل گم نظر آتی تھی۔ وہ کچھ بتاتی نہیں مگر پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے پھر ایک دن گاؤں والوں پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ پرویز اسے گانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ ہونٹوں اور گھریلو محفلوں میں پیسے لے کر گانے گاتی ہے، اور اس کے علاوہ بھی اس کے ساتھ بہت بُرا ہوتا ہے۔ پرویز اسے اپنے جاننے والوں کے ساتھ تعلق رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ پرویز غنڈا ٹائپ شخص تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ریشمی کے بوڑھے ماں باپ بھی اس سلسلے میں خاطر خواہ احتجاج نہیں کر سکے۔ کچھ لوگوں نے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے مشورے دیے مگر اس پر بھی غل نہ ہو سکا۔ پرویز کا اٹھنا بیٹھنا بھی عالمگیر گروپ کے ساتھ تھا۔ پھر ایک دن وہ ریشمی کو پھر یہاں چاند گڑھی میں لے آیا۔ اس کا بچہ ضائع ہوا تھا اور وہ برسوں کی بیاہ نظر آتی تھی۔ اس کے جسم پر چوٹوں کے نشان بھی تھے۔ یہ جوئیں یقیناً اس سے ہونے والی مار پیٹ کا نتیجہ رہی ہوں گی۔ پرویز اس کا کبھی علاج کروا رہا تھا کیونکہ اس کا بیٹا بیٹا اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ نماز روزے کی طرف بھی متوجہ ہو گئی تھی۔ کئی لوگوں نے اسے دغیر وغیرہ پڑھتے بھی دیکھا۔ نوجوانی میں ہی بڑی بوڑھیوں کی طرح سنجیدہ ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں ملنگی بن جاؤں گی، کسی کو بتائے بغیر کسی طرف نکل جاؤں گی۔ یہ بھی پتا چلا کہ پرویز اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہے اور جب وہ ٹھیک ہو جائے گی وہ اسے پھر لاہور لے جا کر اپنی بیٹی مانی شروع کر دے گا۔ اقبال مسقط سے نا کام ہو کر واپس آ چکا

تھی۔ کالوں میں جیسے، ناک میں چھوٹی سی تھلی، ہونٹوں پر لالی کے بدم آ جا رہے تھے۔ اس کے شوہر کی یہ عجیب منطق تھی۔ وہ آخری دم تک اپنی شریک حیات کو خوب صورت اور بنا سنورا دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی رام پیاری نے دروازے کو کھڑی چڑھا دی۔ رکی کلمات کی اداسگی کے بعد میں نے اس سے جاناں کے بارے میں پوچھا۔

اس نے اپنے غم بال اوڑھنی کے نیچے سینے اور بولی۔ ”جھگوان کا شکر ہے، اب وہ تھوڑا بہت بھونچا لگنے لگی ہے۔ بات شات بھی کر لیتی ہے۔ اسے آپ کا بہت انتظار تھا۔“ ”کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں ہی ہوگی۔“ میں نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانا جاہا لیکن وہ پہلے ہی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ لحاف اوڑھ سو رہی تھی۔ سر ہانے کی طرف لائین کی ہلکی روشنی تھی۔ اس کی گردن اور رخساروں پر ابھی تک تشدد کے نشان موجود تھے۔ میں نے بہت آہستہ سے اسے چنگا یا لیکن وہ بچھری ڈرنی۔ خاص طور سے میرے ڈھانے نے اسے ڈرایا۔ وہ چلائی اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں میں ہراس اور کرب کی یلغار تھی۔ ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کچھ نہ کہنا۔۔۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ اس نے کہا اور بستر سے چھٹانگ لگا کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے بازو سے تھام لیا۔ تب تک میرا رخ لائین کی طرف ہو چکا تھا اور وہ مجھے زیادہ اونچی طرح دیکھ سکتی تھی۔ اس کے ہونے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ مزاحمت بھی ختم ہو گئی۔ ”میں یاسر ہوں۔“ میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

اسے چاہئیں کیا ہوا کہ اس نے اپنی پیشانی میرے شانے سے ٹکائی اور پچھلیوں سے رونے لگی۔ اسی دوران میں رام پیاری بھی گھبرائی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے باہر جانے کے لیے کہا۔ چار پانچ منٹ بعد جاناں آنسو وغیرہ بہا کر نازل ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بس ایک ہی بات تھی۔ ”میں یہاں سے واپس کب جاؤں گی؟“

میں نے کہا۔ ”اگر دو ہروری ہے جاناں۔۔۔۔۔ تو اس میں تمہاری بہتری ہی ہے۔۔۔۔۔ زیادہ نہیں، لیکن ایک ہفتہ انتظار تو نہیں کر ہی لیتا چاہیے۔“

میرے سمجھانے بھانے سے اس کی بے قراری کم ہو

گئی۔ وہ سب سے زیادہ پاشا اور تھانے دار قیصر چودھری سے خوف زدہ تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میری معلومات کے مطابق۔۔۔۔۔ قیصر زخمی ہے اور دلچسپ لگتا ہے لاہور کے اسپتال میں ہے جبکہ پاشا یہاں سے واپس جا چکا ہے اور اگر ہوتا بھی تو میرے ہوتے تمہارے قریب نہ پہنچ سکتا۔

رام پیاری کا ذہنی کا گرم دودھ دے گئی۔ میں نے اصرار کر کے جاناں کو بھی پلایا۔ وہ رام پیاری اور وکرم کی باتیں کرنے لگی۔ وہ میاں بیوی کے پیار کو دیکھ کر ششدر تھی۔ اسے یقین نہیں ہوتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک بات بتا کر مجھے بھی حیران کر دیا۔ بولی۔ ”آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ تم یہ سن کر حیران ہو جاؤ گے کہ انہوں نے شادی کی سالگرہ اسی طرح منائی ہے جس طرح عام لوگ مناتے ہیں۔ رام پیاری نے اپنی کوئی نئے کپڑے پہنائے، خوشبو لگائی۔ اچھا کھانا پکایا۔ حلوہ پوری کی خوشبو تو نہیں بھی آ رہی ہوگی؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔ ”شام کے بعد سے دونوں کمرے میں اکٹھے ہی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی لائین روشن کی ہے انہوں نے۔“

مجھے رام پیاری کے کیلے بال یاد آئے۔ وہ یقیناً کچھ ہی دیر پہلے نہا کر نکلتی تھی۔ جاناں نے جتنی خیر انداز میں پوچھا۔ ”وکرم کوئی لی ہے۔ کیا اس طرح اس کے قریب جانے سے رام پیاری کو بیماری نہیں لگے گی؟“

میں نے کہا۔ ”ٹی بی اسپتالوں میں جو لازم دن رات مریضوں میں گھرے رہتے ہیں، وہ بھی توجہ ہی جاتے ہیں۔ صحت بیماری اور پر والے کے ہاتھ میں ہے اور شاید رام پیاری کو بھی اس پر یقین ہے۔“

واقعی بات سوچنے کی تھی۔ وہ بے خوف ہو کر دن رات تب دق زدہ شوہر کی خدمت میں مصروف تھی۔ یہی مشرق ہے۔ اگر یہ ناروے یا انگلینڈ کی کوئی گوری ہوئی تو شوہر سے کم از کم میں میٹر کا فاصلہ برقرار رکھتی اور زیادہ امکان یہی تھا کہ اب تک طلاق لے کر کسی اور کے بیڑوم کو جھگڑ رہی ہوتی۔ میرے دل میں اس جوڑے کے لیے اور خاص طور سے رام پیاری کے لیے مزید ہمدردی اور انصاف پیدا ہو رہی تھی۔

میں نے رام پیاری سے علیحدگی میں ملاقات کی اور اس سے ریشمی والے واقعے کے بارے میں تفصیل سے

پوچھا۔

ریشمی کے ذکر نے رام پیاری کو بھی اداس کر دیا۔ وہ بولی۔ ”سچ یہ ہے یاسر بھائی کہ تاجور کی طرح وہ بھی بڑی اچھی لڑکی تھی۔ بڑی سندر، بہت ہمدرد، دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ ایسا پریم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے لیکن دونوں بے جا ریلوں کے ساتھ انیائے ہوا۔ تاجور کے لیے ایک ایسا منگیت پڑ گیا جس نے اس کا جیون عذاب بنا دیا۔۔۔۔۔ اور یہ بے جا ریشمی بد معاش بچی کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اسے دلہن بنا کر شہر لے گیا اور وہاں اس کی کمائی کھانا شروع کر دی۔“ رام پیاری کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

جلدی ہی اسے اصل موضوع پر لے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میر پور کے لاری اڈے پر اس کی ملاقات ریشمی سے کب اور کیسے ہوئی۔

اس نے بتایا۔ ”یاسر بھائی، کوئی سات ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ پر وہ مظر مجھے ابھی تک پہلے روز کی طرح یاد ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وکرم کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ کسی نے مجھے کوئی کا بتایا اور کہا کہ وہاں ایک کشمیری سنیاسی ہے جو ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے کرائے اور خرچے کے پیسے جمع کیے اور وکرم کو وہاں لے گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو میر پور کے اڈے پر لاری تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ وہاں کھڑکی سے میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک عورت سے بچھینا تانی کر رہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ یہ ریشمی تھی۔ اس نے فقیروں جیسا چولا پہنا ہوا تھا۔ سر اور پاؤں سے نکلتی تھی۔ دو تین منٹ کے بعد اٹھ کر ایک وین میں ڈالنا چاہتے تھے۔ جھگوان کی کرپا سے تین چار دکاندار آ گئے اور انہوں نے غنڈوں سے مار پیٹ شروع کر دی۔ اسی دوران میں ریشمی موقع سے فائدہ اٹھا کر کہیں غائب ہو گئی۔“

”تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا، وہ ریشمی ہی تھی؟“ ”ہاں بھائی، مجھے اتنا ہی دھواش ہے جتنا یہ کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو۔ وہ ریشمی تھی لیکن بالکل بدلی بدلی۔ میں نے اسے لاری کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ ہمارے درمیان کیول دو تین گز کا فاصلہ رہا ہوگا۔“

میں نے رام پیاری سے کچھ مزید معلومات حاصل کیں اور اسے بتایا کہ میں ریشمی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری یہ بات اسے بہت پسند آئی اور اس کی آنکھیں بھر م ہوئیں۔ میں نے دوسرے کمرے میں جا کر وکرم کا حال احوال بھی دریافت کیا۔ وہ بہتر پر نیم دراز آگئی تھی

انکارے

تاپ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے لینے رہنے پر مجبور کر دیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ اب پہلے سے کچھ بہتر ہے۔ کسی وقت دل میں یہ خیال آتا تھا کہ شاید وہ زندگی کی طرف لوٹ ہی آئے۔ اس کی یہ سالگرہ آخری سالگرہ ثابت نہ ہو۔ رام پیاری بھی ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی۔ صحن میں بندھی ہوئی بکری میاں تو ہم تینوں کو ایک ساتھ مولوی فدا محمد کی یاد آ گئی۔ مولوی صاحب اب اس دنیا میں نہیں تھے لیکن چاند گرمی میں انہوں نے اس غیر مسلم جوڑے کے لیے جو کچھ کیا تھا اور جس طرح ان کے سامنے ڈھال بنے تھے، وہ یادگار تھا۔

ہم نے دو چار منٹ مولوی فدا اور ان کی بیمار بچی کا ذکر کیا جس کا اسلام آباد میں علاج ہو رہا تھا۔ پھر میں میاں بیوی اور جاناں سے رخصت ہو کر بیرونی دروازے کی طرف آ گیا۔ رام پیاری مجھے باہر تک چھوڑنے آئی۔ وکرم کی طرح یقیناً اس کی بھی خواہش رہی ہوگی کہ میں کم از کم ایک بار تو انہیں اپنی صورت دکھاؤں لیکن پچھلی بار میں نے چونکہ رام پیاری کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ لہذا اس مرتبہ یہ خواہش اس کی زبان پر نہیں آئی۔ پتا نہیں کہ میری نقاب پوشی کے حوالے سے وہ دل میں کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ جاناں بھی اس سلسلے میں مسلسل انصحن میں تھی۔ میں موٹر سائیکل پر واپس چاند گرمی روانہ ہوا۔ گمشدہ ریشمی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب پارہا تھا۔

☆☆☆

اب ایٹق اور میں دونوں ریشمی کا کھوج لگانے کے مشن پر تھے۔ ہم نے پہلے پیدل اور پھر دو پہنی تانگے کے ذریعے قریباً بیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ تب کچی سڑک سے کھٹارا بس پر بیٹھے تھے اور اب میر پور سے ہوتے ہوئے کوٹی کے آس پاس پہنچ چکے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ چمک دکھا رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب جھنگا تک سرسبز نیلے تھے۔ کہیں کہیں مکئی اور گنے کے کھیت بھی دکھائی دیتے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے چاند گرمی کے قدیم پاسیوں، سونگلی اور پھلوان حشمت کے ساتھ بیچ کر کوٹی کے علاقے میں موجود مزاروں، آستانوں اور خانقاہوں کا ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ اس نقشے کے مطابق کوٹی سے آگے پہاڑی اور نیم پہاڑی علاقے میں کم و بیش دس اہم مزار اور آستانے موجود تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر ہم نے دھجی سے کوشش کی تو انہی جگہوں

MEDICAM

Bleach Cream

Whiteness in 14 days

*No Side Effects



رکے ہر نظر آپ پیرا

دیتی تھی۔ پانی گرنے پر لڑکی تکلیف سے چلاتی تھی اور جان بچنے کی التجا بھی کرتی تھی۔ بار بار بچنے سے اس کا لباس جسم کا حصہ ہی بن گیا تھا اور وہ دور سے دیکھنے پر عریاں نظر آتی تھی۔ دیکھنے والے کن اکھیں سے اسے دیکھتے تھے۔ ایک مرید نے بتایا کہ اس پر جن ہے۔ یہ صحرانی علاقے کا جن ہے اور ٹھنڈے پانی سے بہت ڈرتا ہے۔ پانی ڈال کر لڑکی کا علاج کیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال پر مجھے ایک بار پھر چاند گڑھی کے پیر سامتا کے لڑکھنڈے یاد آ گئے۔ پہلوان حشمت راہی نے پورے دھوکے سے کہا تھا کہ پیر سامتا نے ایک لڑکی کی عزت تاراج کی اور اس کے پٹھان وارثوں نے غیرت میں آکر سامتا کو دو مریدوں سمیت خاکستر کر دیا۔ جہاں توہمات ہوں وہاں اس طرح کے سامنے ہونا بڑی بات نہیں ہوتی۔

ہم اگلے روز دو پہر تک اس مزار پر رہے اور یہاں ریشمی کا کھوج لگایا۔ اندازہ یہی ہوا کہ ریشمی یہاں موجود نہیں، کم از کم اس وقت تو نہیں۔

ہماری اگلی منزل قریب آٹھ کلومیٹر دور ایک اور آستانہ تھا۔ یہ بھی پہاڑی جگہ تھی۔ یہاں ایک گاؤں بھی آیا تھا۔ کئی گز لمبی ایک قبر تھی۔ قبر پر بڑا سا ستیان تھا اور ستیان پر ان گنت چھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہاں سازوں پر بڑے جوش خروش سے کچھ گایا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے قوالی کہتے ہیں۔ سامعین میں سے کچھ لوگ اپنے سر کو گول گول حرکت دے رہے تھے۔ اور عجیب کیفیت میں نظر آتے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہی نے کہا۔ ”اسے حال چڑھنا کہتے ہیں۔“

اس جگہ پر بھی ہمیں ریشمی کا کوئی اتا پتا نہیں ملا۔ ہم نے کئی افراد سے اس بارے میں سن سن بھی لی۔ مگر اگلی صبح جب ہم وہاں سے آگے روانہ ہونے والے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہم نے لنگر خانے کی سیڑھیوں پر ایک شخص کو بے ہوش پڑے دیکھا۔ اس کی عمر بچپن کے لگ بھگ ہو گی۔ ہٹا کٹا تھا اور براؤن رنگ کی خشہ شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر آٹھ دس روز پرانی چوٹوں کے نشان تھے۔ دو تین افراد اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، باقی تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص نے اس کی بوسیدہ جرسی اوپر اٹھا کر اس کی جیب ٹٹولی۔ کچھ ریزگاری کے علاوہ مزے تڑے سگریٹ نکلے۔ وہ سوچ کر بولا۔ ”چرس والے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”لگتا ہے زیادہ پیٹنے سے ہی اس کا

میں سے کسی جگہ سے ریشمی کا کھوج کھرا ل جائے گا۔ چند دن پہلے میں نے دین محمد صاحب سے ایک دو روز کی رخصت مانگی تھی۔ اب اس مشن کے پیش نظر میں نے اس رخصت کی مدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے دین محمد صاحب سے پانچ دن کی چھٹی کی درخواست کی تھی اور انہوں نے قبول کر لی تھی۔ انہی نے بتایا تھا کہ پاکستانی دستور کے مطابق ہم ان پانچ دنوں میں دو تین دن کا اضافہ اپنی طرف سے بھی (بہ امر مجبوری) کر سکتے ہیں۔

اب ہم چاند گڑھی سے کافی سے زیادہ دور آ چکے تھے، اس لیے ضروری نہیں تھا کہ میں اپنا گونگے والا روپ برقرار رکھوں۔ میں اور اینٹ آزادانہ باتیں کر رہے تھے اور کھانپنی بھی کر رہے تھے۔ چاول کی پٹیاں، باداموں والا گڑ، مر دینڈ اور بھنے ہوئے مکی کے بھنے، سب کچھ اس کھانا لاری کے اندر ہی دستیاب تھا۔ راستے کے دگش مناظر دل کو لہما رہے تھے۔ اور چھو بستیوں میں اکھیلیاں کرتی ہوئی زندگی کے ٹھٹھے ٹرکانوں میں رس گھول رہے تھے۔ پاکستان میں وارد ہوتے ہی مجھ پر جو عظیم سانحہ گزرا تھا، وہ ناقابل برداشت تھا۔ مجھے لگا تھا کہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی میں مدتوں اس دکھ کے حصار سے نکل نہیں سکوں گا۔ لیکن عجیب بات تھی۔ میں پاکستان میں ہی تھا اور میرے ذہنوں کا مداوا بھی ہو رہا تھا۔ شہری زندگی کے لگائے ہوئے گھاؤ..... وہی زندگی بھر رہی تھی۔ تاجور کی سن موہنی صورت میری نگاہوں میں چمکی۔ میری نظر دور ایک سرسبز پہاڑی ڈھلوان پر جم گئی۔ ایک چھوٹا سا تنہا گھر دکھائی دیا۔ میرا دل چاہا، میں ایسی ہی کسی دور دراز ڈھلوان پر کسی تنہا گھر کے اندر تاجور کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزار دوں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا وہ مصیبتیں جو یورپ سے میرے ساتھ لگی ہوئی ہیں، میرا پیچھا چھوڑ دیں گی؟

پروگرام کے مطابق رات کو ہم نے اپنا پہلا پڑاؤ ایک نیم پہاڑی مقام پر کیا۔ یہاں کسی نوری سامی کا مزار تھا اور اس نسبت سے اس جگہ کو نوری پور کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک بڑے احاطے میں مریدوں کے رات گزارنے کا انتظام بھی تھا۔ یہاں ہم نے کئی ایک خرافات دیکھیں لیکن ایک بے ہودہ عمل نے دل و دماغ کو بہت مکدر کیا۔

ایک جوان لڑکی کو درخت سے بانٹا دیا گیا تھا۔ سخت سردی میں بھی بے چاری نے گرمیوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پاؤں سے ننگی تھی۔ ایک موٹی تازی عورت گاہے بگاہے اس کے جسم پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی انڈیل

کوئی صدی پہن رچی تھی یا بسیدہ کسل اوڑھ رکھا تھا۔ ہمیں کہیں بھی کوئی عورت دکھائی نہیں دی۔ بس دو تین بوڑھی عورتوں پر نظر پڑی جو صفائی سترائی کے کام میں مصروف تھیں۔

ہم عام عقیدت مندوں کی حیثیت سے داخلہ دھر گھومتے رہے۔ مزار کی سیزجیوں کے پاس ڈھول بج رہا تھا اور کئی ملک یہاں رقص میں مصروف تھے۔ اینٹ نے کہا۔ ”اے دھال ڈالنا کہتے ہیں۔ شروع شروع میں ہماری اکثر پنجابی فلمیں اس دھال کے بغیر مکمل بھی جاتی تھیں۔۔۔“ شاید وہ فلموں کے حوالے سے مزید کوہرا نشانی کرتا مگر اسی دوران میں باہر بھی چاول وغیرہ کھا کر یہاں پہنچ گیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ سیدھا ہماری ہی طرف آیا۔ رقصاں ملکوں کو دیکھ کر وہ بولا۔ ”آپ خوش قسمت ہیں۔ اچھے موقع پر حاضری کے لیے آئے ہیں۔ آج ضرور پردے والی سرکار لوگوں کے سامنے آئے گی۔ یہ ملکوں کی دھال اسی وقت ہوتی ہے جب سرکار نے سامنے آنا ہو۔“

”کیا مطلب؟“ اینٹ نے پوچھا۔ ”وہ لوگوں کو اپنی صورت دکھائیں گے؟“

”نہیں بھائی، اتنی ہم۔۔۔ گناہ گاروں کی قسمت کہاں۔ ان کا ہمارے درمیان آجانا ہی بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ وہ اس سامنے والے چوتھرے پر بیٹھیں گے اور مریدوں اور عقیدت مندوں سے خطاب کریں گے۔“

میں نے دیکھا دور احاطے کے آخری سرے پر سفید پتھر کا گول چوڑا سانپ نظر آ رہا تھا اس چوڑے کے قریب سے اس وسیع و عریض احاطے کو لکڑی کی ایک عارضی دیوار کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ باہر نے بتایا کہ عورتیں اس دیوار کی دوسری جانب بیٹھتی ہیں۔

نیلے چولے اور لمبے بالوں والا ایک ادیب عمر ملک ہمارے قریب سے گزرا۔ اس نے اپنی بلی جیب سے کچھ نکالا تو اس کی نیلی، جالی دار ٹوپی نیچے گر گئی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ”باباجی۔“

وہ رک گیا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ٹوپی اٹھا کر جھڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کی ہے؟“

اس نے پھر بھی جواباً کچھ نہیں کہا۔ بس اثبات میں سر ہلایا اور ٹوپی لے کر آگے بڑھ گیا۔ باہر نے کہا۔ ”جن لوگوں نے تقریری کی ہوتی ہے۔ وہ عام لوگوں سے بات نہیں کرتے، ہاں کوئی بہت شدید ضرورت ہو تو اور بات ہے۔ یہ لوگ بالکل الگ تھلک رہتے ہیں اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جو

آبادی بھی آج کی آبادی سے آدھی تھی اور ملٹی ڈیرے کا تو اس علاقے سے باہر کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔ اب دیکھیں لوگ کس طرح ٹولیوں کی شکل میں آرہے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ جو نذرانہ تم پردے والی سرکار کے لیے لائے ہو، یہ کہاں استعمال ہو گا؟“

”عام لوگوں کی ”مدد امداد“ کے لیے۔ ملٹی ڈیرے پر بہت سے ایسے لوگ رہتے ہیں جنہوں نے فقیری۔۔۔ لی ہوئی ہے۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ لوگ بھی ڈیرے سے باہر نہیں آتے۔ وہیں پر رومی کو سوجھی کھاتے ہیں اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں پھر بہت سے یتیم اور بے آسرا بچے بھی ہیں جو ملٹی ڈیرے کے کچے کچے کھانے پھانے ہیں۔۔۔ ان کے لباس، خوراک اور تعلیم وغیرہ کا دھیان ملٹی ڈیرہ ہی رکھتا ہے۔“

اسنے میں شور مٹائی دیا۔ پتا چلا کہ دو غجروں پر دو دیکھیں لا کر لائی گئی ہیں۔ ان دیکوں میں چاول تھے جو عقیدت مندوں میں تقسیم ہونا تھے۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ایک طویل قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ باہر ایک کھانا پیتا شخص لگتا تھا لیکن وہ بھی چاول لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”یہاں کا لنگر کھانا بھی برکت کا ذریعہ بنتا ہے۔“

میں اور اینٹ سر ہل کر رہ گئے۔ اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کے مزاروں اور خانقاہوں کا تقدس اپنی جگہ ہے۔ ان جگہوں پر بہت نیک و متقی لوگ بھی پائے جاتے ہیں لیکن بہت سی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں عیار لوگ روحانیت کی آڑ میں سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ بے شک شرعی ممالک میں یہ پریکٹس زیادہ ہے لیکن میں نے یورپ کے بادریوں اور ان کے کلیساؤں میں بھی یہ سب کچھ ہوتے دیکھا تھا۔

پہلے تک ملٹی ڈیرے کا مزار علاقے کے عام مزاروں کی طرح تھا۔۔۔ مگر پھر یہاں پردے والی سرکار کا ظہور ہوا۔ پردے والی سرکار کی اونچی شان تھی اور ان کی کرامات تھیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ملٹی ڈیرہ پورے علاقے میں مشہور ہو گیا۔ اب دور دور سے لوگ یہاں آتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔“

میں نے باہر سے پوچھا۔ ”تم کیا مراد لے کر آئے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں مراد لے کر نہیں آیا جی۔ مراد پوری ہونے پر سرکار کا شکر یہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔ نذرانہ لے کر آیا ہوں۔“

”کیسا نذرانہ؟“

”دس ہزار روپیہ نقد اور اپنی بیوی کی دو چوڑیاں۔ میری چار سال کی بیٹی ایک سال سے بیمار تھی۔ اس کے سر کا درد کی طرح جاتا ہی نہیں تھا۔ بہت سے ڈاکٹروں، حکیموں کو دکھایا۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ پھر کسی نے پردے والی سرکار کا بتایا۔ انہوں نے چوہے کی راکھ پر دم کر کے دیا۔ اب دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اللہ کے فضل سے بیٹی بالکل شگ ہے۔ جیسے اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور کوئی بیماری بیٹی کی بات ہی نہیں ہے۔ اللہ کی بڑی مخلوق کو پردے والی سرکار سے فائدہ نصیب ہو رہا ہے۔“

اپنی بات ختم کر کے باہر نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا اور بولا۔ ”آپ کس لیے آئے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہم تو بس سلام کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ بڑی شہرت کی تھی ملٹی ڈیرے کی۔“

گاؤں اس کے خلاف ہے۔ وہ شہر میں رہتی کو محفلوں میں گانے پر مجبور کرتا رہا ہے اور اس کی کمائی کھاتا رہا ہے۔ بعض یہ بھی کہتے تھے کہ وہ اسے غیر مردوں سے تعلق رکھنے پر بھی مجبور کرتا تھا۔ اب وہ کس منہ سے پولیس کے پاس جاسکتا تھا۔

مجھ کہتے ہیں کہ ہر چھٹی کو اس سے بڑی چھٹی کھائی ہے۔ ”چٹا“ اپنے طور پر چاند کڑھی کا غنڈا اپنا ہوا تھا اور عالمگیر کو روکھتا تھا۔ رہتی کے ماں باپ سمیت کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بے بس چڑیا کی طرح چڑچڑاتی ہوئی رہتی کو اس کے چنگل سے نکال سکتا لیکن اب اس کو ملٹی ڈیرے کے ملک مگر گئے تھے، جو اس سے زیادہ طاقتور تھے۔ رہتی ان کے پاس تھی اور انہوں نے بددماغ پیچے کو مار بھگا تھا۔

صبح ہم اٹھے تو چٹا غائب تھا۔ وہ رات بچھلے پھر اٹھ کر کہیں نکل گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ اینٹ کی جینٹ سے چس کی دو پڑیاں اور ہزار بارہ سو کی نقدی بھی لے گیا تھا۔ اس سے ایسی ہی امید تھی۔ ہمیں اس کے جانے سے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ جانے سے پہلے وہ ہمیں ہمارا راستہ دکھا گیا تھا۔ مٹی قبر والے اس آستانے سے ایک ناہوار کپار استہ آگے کی منزل کا سراغ دیتا تھا۔ فوجی طرز کی دو بہت پرانی جینیں یہاں نکل و حرکت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ہم نے کراہی پھر اور اس دشوار گزار راستے پر قریب پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے کہاں والا پہنچ گئے۔

یہ بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا گاؤں تھا۔ گاؤں کا کچھ حصہ ہوار جگہ پر اور کچھ ڈھلوان پر تھا۔ یہ ڈھلوان آگے جا کر پہاڑوں کی اونچائی میں نہیں کم ہو جاتی تھی۔ ایک پہاڑ کی اوٹ سے سفید رنگ کا ایک گنبد سا نظر آتا تھا۔ وہاں جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس جگہ کو ملٹی ڈیرہ کہتے تھے اور یہیں پر ”پردے والی سرکار“ بھی رہتی تھی۔

گاؤں میں ایک کافی بڑا بازار بھی تھا۔ دو تین مسافر سرائے تھے جہاں پردے والی سرکار کے عقیدت مند رات بسر کر سکتے تھے۔ اس بازار میں باورچی حضرات بھی موجود تھے جو نذرانے کی دیکھیں وغیرہ پکاتے تھے۔ مضافی اور چڑھاویے کی رہتی چادریں وغیرہ بھی یہاں کثرت سے دستیاب تھیں۔ ایک دور دراز گاؤں ہونے کے باوجود یہاں خوب چھل پھل نظر آتی تھی۔۔۔ مسافر سرائے میں ہماری ملاقات کوئی کے ایک نوجوان باہر سے ہوئی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ”چھ سات سال

سرکاری کی طرح زندگی بھر کی کوشش نہ دکھانے کا عہد کر لیتے ہیں۔“

بار نے ادھر ادھر دیکھا، پھر دور ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک پتھری دیوار سے ٹک لگے چٹا بھارا تھا اور چنے کی آواز کو ڈھول کی تھاپ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ایک نیلی چادر، گھونگھٹ کی طرح ڈال رکھی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بار نے کہا۔ ”یہ دیکھو، اس طرح کے کئی اور بھی نظر آئیں گے۔“

میں نے لکڑی کی اس طویل دیوار کو دیکھا جو اس ہال نما احاطے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ تو کیا تاجور کی عزیز ترین ”ریشی“ اس دیوار کی دوسری جانب آکر بیٹھے گی؟ کیا وہ یہیں موجود ہو گی؟ اس قدیم عمارت کی اونچی دیواروں کے پیچھے؟ اس کو کیسے دیکھا جاسکے گا، اس سے کیسے بات کی جاسکے گی؟ یہاں کا انتظام بہت سخت دکھائی دے رہا تھا، پتا چل رہا تھا کہ انتظام کی مرضی کے بغیر یہاں سے کسی کو لے جانا تو دور کی بات ہے، کسی سے ملنا بھی آسان نہیں۔

ایک گھڑیال سا بچا اور ریشی کرنے والے فقیروں نے اپنے پاؤں روک لیے۔ سب لوگ وسیع وعریض چھت تلے جمع ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوڑے کے سامنے والا حصہ مریدوں اور زائرین سے بھر گیا۔ اگلی قطاروں میں نیلے چولوں والے مریدین اور جیلے تھے۔ ان کے عقب میں عام زائرین اور عقیدت مند ترتیب سے بیٹھے جا رہے تھے۔ لکڑی کے عارضی پارٹیشن کی دوسری جانب بھی ہلکا ہلکا شور مٹائی دینے لگا تھا۔ یہ عورتوں کی جھینساہٹ تھی۔ بالآخر خاص مریدوں کے چلو میں پردے والی سرکار نمودار ہوئی۔ سر سے پاؤں تک ایک سیاہ لہادہ تھا۔ کندھوں پر بھی ایک سفید شال تھی۔ ایک مٹل کی کادر چادر سر پر تھی اور اس نے چہرے پر گھونگھٹ سا بنا رکھا تھا۔ سب لوگ باادب انداز میں کھڑے ہو گئے اور تعظیم کے انداز میں سر جھکا یا۔

پردے والی سرکار چوڑے کی سب سے اونچی نشست پر بیٹھ گئی۔ دو صحت مند مرید جن کے بال ان کے کندھوں تک پہنچ رہے تھے، دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ یہ نیلے چٹوں میں تھے۔ گلے میں لکڑی اور پتھروں کی موٹی مالا میں تھیں۔ میں نے ریشی کے شوہر پیچ کی زبانی ملنگ کرنا کی حلیہ سنا تھا، مجھے فوراً خیال آیا کہ پردے والی سرکار کی دائیں جانب کھڑا ہونے والا فرپہ شخص ملنگ کرنا ہی ہے۔ بعد ازاں یہ خیال درست ثابت ہوا۔ پردے پر یز عرف پیچ

کے مطابق یہی شخص تھا جس کی باتوں سے متاثر ہو کر ریشی نے فقیری لہادہ اوڑھا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔

نیشی سے چلنے والا ایک لاؤڈ اسپیکر ”پردے والی سرکار“ کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ایک ایسا ہی اسپیکر عورتوں کی جانب بھی پہنچا دیا گیا۔

”کیا عورتوں کی طرف سے بھی کوئی تقریر کرے گا؟“ انیق نے سرگوشی میں پوچھا۔

”تقریر اور زبان کے استعمال میں عورتیں مردوں سے کہیں آگے ہوتی ہیں۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

مگر عورتوں کی طرف سے کوئی تقریر نہیں ہوئی بلکہ کورس کی شکل میں ایک گیت سنائی دیا۔ یہ کوئی ”کافی“ کی طرح کا پنجابی گیت تھا جس میں انسان کے لالچ کی بات کی گئی تھی اور اس لالچ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کا تذکرہ تھا۔ عام لوگوں کو لکھن کی گئی تھی کہ وہ سادہ زندگی گزاریں۔ لذتوں اور دنیاوی آلائشوں سے دور رہیں۔ گیت اچھا تھا اور اس کی لہجہ بہت خوب صورت تھی مگر سادہ زندگی کے جو اصول بتاتے جا رہے تھے، ان پر کم از کم یہاں کے خاص مرید تو ہرگز عمل پیرا نہیں تھے۔ پردے والی سرکار کے دائیں بائیں کھڑے دو اہم مریدوں کو ہی دیکھا جا تا تھا ان کا وزن دو دو سو کے قریب تھا۔ خود پردے والی سرکار بھی خوش خوراک ہی نظر آتی تھی۔

کورس میں ”لنڈ“ کرنے والی لڑکی کی آواز بہت سُرلی تھی اور دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ تاجور نے بتایا تھا کہ ریشی بڑی خاص آواز کی مالک ہے اور اس آواز نے ہی اس کی مشکلوں میں اضافہ بھی کیا ہوا ہے۔ کہیں یہ آواز ریشی ہی کی تو نہیں تھی؟

میں نے یہ بات انیق کے کان میں کہی تو وہ بھی چونک گیا۔ ”یہ ہو سکتا ہے۔“ پھر اس نے قریب بیٹھے بار سے پوچھا۔ ”بڑی چاری آواز ہے۔“

بار نے کہا۔ ”بالکل ایسا ہی ہے۔ اس آواز نے دھوم مچا دی ہے۔ کئی لوگ تو اس ”پاک بہن“ کی آواز کو سننے کے لیے ہی یہاں آ جاتے ہیں۔“

”پاک بہن؟“

”ہاں، اس کو پاک بہن ہی کہا جاتا ہے۔ پردے والی سرکار کی خاص مریدیوں میں سے ہے۔ کچھ عرصہ پہلے

ہی یہاں آئی ہے لیکن سب ”پہلے پڑھنے والیوں“ کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ بلے شاہ، وارث شاہ اور ان جیسے کئی بزرگوں کے کلام پڑھے ہیں اس نے۔ خود بھی شعر بناتی ہے۔ کل تو میں نے پاک بہن کی ایک کیسٹ بھی کرماں والا کے بازار میں دیکھی ہے۔

”پاک بہن کا کوئی نام بھی تو ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”نام کا تو پتا نہیں، لیکن سائیکلو سائز کی ریشی والی ہے۔ شوہر کے ظلم اور زمانے کی سختیوں سے تنگ تھی، فقیری کی طرف آ گئی۔ سنا ہے کہ کچھ دن پہلے اس کا نشی شوہر اس کا دعویدار بن کر یہاں آیا تھا۔ پردے والی سرکار نے اسے سمجھایا بھجایا اور ہدایت پر لانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ بعد میں اس نے بڑے مرید کرنا لی صاحب سے بدتمیزی کی تو عام لوگوں نے اسے مار پیٹ کر یہاں سے بھگا دیا۔“

اب بات واضح ہو رہی تھی۔ وہ جادو اثر آواز جو اس ملنگی ڈیرے کے درو دیوار میں گونج رہی تھی، یقیناً ریشی ہی کی تھی۔ مجھے موسیقی اور نغمے وغیرہ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، مگر اس آواز میں یقیناً کوئی بات تھی۔ اس نے مجھے کشش کیا اور یہی دل گداز کشش تھی جو ہر کسی کو متاثر کر رہی تھی۔ مغربی دنیا میں تو موسیقی کے نام پر ایک طوفان بدتمیزی مچا ہوتا ہے۔ یہ آواز اس سے بہت اوپر کی چیز تھی۔

گیت ختم ہوا تو کافی دیر سناٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد کچھ ملنگوں نے دھمال ڈالی اور اپنی بھونڈی آواز میں حق جو کے نعرے بلند کیے۔ اس کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے پردے والی سرکار نے مختصر خطاب کیا۔ اس کے لب و لہجہ میں پنجابی جھلک نمایاں تھی تاہم وہ اردو بول رہا تھا۔ اس کی شکل بالکل اچھل تھی۔ اس نے جو باتیں کہیں ان میں سے کئی ایک گیت میں بھی کہی جا چکی تھیں۔ اپنی آواز سے یہ کوئی درمیانی عمر کا سنجیدہ شخص لگتا تھا۔

تقریر کے بعد نیلے رنگ کی ایک طویل ریشی لائی گئی۔ اس میں سیکڑوں گرہیں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ریشی دو گڑلوں میں تھی۔ ہر گڑلے کی لمبائی سو فٹ کے قریب رہی ہوگی۔ ایک گڑلا عورتوں کی طرف پھیلا دیا گیا، دوسرا مردوں کی طرف۔ بے شمار بے تاب عقیدت مندوں نے ریشی کے اس گڑلے کو پکڑ لیا۔ گڑلے کا دوسرا سرا ”پردے والی سرکار“ کے ہاتھ میں تھا۔ پردے والی سرکار نے کچھ پڑھا اور بار بار ریشی کے گڑلے پر پھونکا۔

بار نے بتایا۔ ”ریشی کو تھامنے والے سب مریض باہر نے بتایا۔“

انکارے

ہیں، جو اپنا کوئی نہ کوئی روگ لے کر یہاں آئے ہیں۔ پردے والی سرکار کے ہاتھ میں جوشفا ہے، وہ اس نیلی ریشی کے ذریعے روگیوں تک پہنچے گی اور ان کی مشکلیں آسان کرے گی۔“

انیق نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”آپ بھی ریشی تھام لیں، شاہ زیب بھائی۔“

”مجھے کیا روگ ہے؟“

”پریم روگ سے بڑا روگ کیا ہوگا۔“ اس نے بے باکی سے کہا لیکن جب میں نے مڑکا تا تو اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہمیں یہاں ایسی کئی چیزیں دیکھنے کو ملیں جنہیں خرافات کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں نے کچھ ایسے ملنگ بھی دیکھے جو مردوں سے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ انہوں نے جو کلمے یا بیوند لگی چادریں پلٹ رکھی تھیں ان کے پیچھے یقیناً آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ ملنگی ڈیرے میں چوڑے کے پیچھے ممنوعہ علاقہ تھا جس کی طرف چھاپا پوش مریدوں کو جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ میں اور انیق ایک گوشے میں بیٹھ کر تہرک کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ”انیق! میں نے تو ایک ہی نتیجہ نکالا ہے، اگر ہم ریشی سے رابطہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے کسی عورت کی مدد درکار ہوگی۔“

”اور یہاں ایسی کون سی عورت ہے جو اپنی عاقبت خطرے میں ڈال کر آپ کی مدد کو تیار ہو جائے گی؟“

”لیکن مسئلہ ایک اور بھی ہے۔ بات صرف ریشی سے ملنے ہی کی نہیں انیق، اسے سمجھانے کی بھی ہے۔ وہ جس راہ پر چل نکلا ہے آسانی سے اسے چھوڑے گی نہیں اور جب وہ خود ہی اپنے پیچھے سے نکلے کو تیار نہیں ہوگی، ہم اسے کیسے نکال سکیں گے؟“

”اور ماں بے چاری رو رو کر مر جائے گی اس کی۔“

انیق نے کہا۔

”ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔“ میں نے طویل سانس لے کر غصہ کی تھار پتھری دیوار سے ٹک لگائی۔

”وہ کیا؟“ انیق بہت متوجہ ہو گیا۔

”تاجور اس کی قریب ترین کنبلی ہے اور یہ جتنی تاجور کی مانتی ہے اور کسی کی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تاجور اس کا ذہن بدلنے میں کامیاب ہو جائے۔“

انیق مسکرایا۔ ”آپ کی بات میں وزن ہے لیکن ایک اندیشہ بھی ہے۔ اگر التاریشی نے تاجور کا ذہن بدل دیا اور

”کیا کہتا تھا؟“
 ”وہی کچھ جو آپ سے کہہ رہا تھا۔ لگتا ہے کہ اس نے اپنے طور پر ریشمی کو واپس لے جانے کی کوشش کی مگر ملنگوں نے اسے ڈرا دھکا کر اور مار پیٹ کر بھاگ دیا۔“
 ”کیا یہ ملنگ ہمارے ساتھ بھی یہی کریں گے؟“
 چاچا رزاق نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔
 ”وہ کیا کریں گے، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ ریشمی سے کسی کا رابطہ ہو اور اس کی مرضی کا پتا چلے، ہم اسی لیے جیسے بہانے سے دین محمد صاحب کی بیٹی تاجور بی بی کو یہاں لے کر آئے ہیں۔“

چاچا رزاق کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آیا، بولے۔
 ”تم لوگوں نے بڑا کچھ والا کام کیا ہے۔ میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ریشمی کا ذہن بدل کر اسے یہاں سے نکال سکتا ہے تو وہ صرف تاجور ہے۔۔۔ لیکن ریشمی کا پتا کیسے چلے گا کہ وہ ڈرے پر کس جگہ ہے اور ان دونوں کی ملاقات کیسے ہوگی؟“

”یہ سب کچھ ہم نے سوچ لیا ہے چاچا جی، آپ فکر مند نہ ہوں۔“ انٹیق نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔
 ”بس ہم کو آپ سے ایک ہی درخواست کرنی ہے۔“
 ”کہو پتر، مجھے حکم دو۔“

”نہیں جی، آپ ہمارے بڑے ہیں، آپ کچھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آپ کی بیٹی کے لیے کر رہے ہیں جو ہمارے لیے بہن کی طرح ہے۔ اس کے بدلے ہماری بس ایک ہی درخواست ہے۔ یہاں آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اسے صرف اور صرف اپنے تنگ رکھیں۔“

چاچا رزاق نے بلا توقف کہا۔ ”میں اس کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ تم مجھ سے جس طرح کا وعدہ چاہو لے سکتے ہو۔ بس میری بھی ایک ہی آرزو ہے بلکہ شاید یہ زندگی کی آخری آرزو ہے کہ میں اپنی ریشمی کو پھر سے ہنستا کھلتا ہوا دیکھ سکوں۔“

”بالکل ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے کہا۔ میں کچھ مزید بھی کہنا چاہتا تھا مگر خاموش ہو گیا۔ سرائے کا ایک ملازم چھوٹی سی فرسے لیے ہمارے آس پاس گھوم رہا تھا۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ نئے آنے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہو۔

باہر بارش ہونے لگی تھی، سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چوٹیوں پر پگھلی چمک رہی تھی۔ دھولوانوں پر پانی گرنے کا شور تھا۔ برسات کی اس رات میں ساتھ والے کمرے میں تاجور موجود تھی۔ جی چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لنگوں اور بارش

میں بھیگتے ہوئے اس جنگل میں گم ہو جاؤں۔ ایک پہاڑ کی چوٹی پر وہی تنہا خوب صورت مکان میری نگاہ تصور میں اتر آیا جو میں نے کھنارائیں میں سفر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مکان ہو، یہ موسم ہو اور تاجور ہو، پھر آخری سانس تک زندگی سے کوئی شکوہ نہ رہے۔

میری نظر اس ہاکی پر پڑی جس کے ہمارے چاچا رزاق چلتے تھے۔ یہ ہاکی چاچا نے سرائے کی چوٹی دیوار کے ساتھ کھڑی کی ہوئی تھی۔ کافی پرانی لیکن مضبوط ہاکی تھی۔ میں نے چاچا سے پوچھا۔ ”آپ اسکول کے زمانے میں کھیلتے رہے ہیں؟“

”صرف کھیلتا ہی نہیں رہا، بہت اچھا کھیلتا رہا ہوں۔ میں گول کبیر تھا اور اپنی بیٹی کا کپتان بھی تھا۔ ماسٹر اشفاق کہا کرتے تھے۔۔۔ تو بہت اوپر چائے گاڑتے تھے۔ مجھے بھی ایسے ہی لگا کرتا تھا۔ بے شک میرا تعلق ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا مگر ارادے چھوٹے نہیں تھے۔ میں گوجرانوالہ اور پھر لاہور تک جانا چاہتا تھا مگر پھر ایک دن سب کچھ چکنا چور ہو گیا۔ ایک بیچ میں میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس زمانے میں آج جیسے علاج کی سہولت کہاں تھیں، مجھے علاج کے لیے کسی بڑے شہر میں بھیجا جانا چاہیے تھا لیکن جنہوں نے بھیجا تھا، انہوں نے غفلت کی۔ میں گاؤں میں ایک بڑی جوڑنے والے سے برا بھلا علاج کرنا تارہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن لاہور کے میوا ہسپتال میں میری ٹانگ کاٹ دی گئی۔“

چاچا رزاق جیسے ماضی کے ان تلخ روز و شب میں کھو گئے تھے، ان کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ چھوٹی جگہ کا ایک بڑا کھلاڑی پرواز سے پہلے ہی اپنے پر کوڑھ بیٹھا تھا اور اب ایک کمزور باج شخص کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

سخت سردی کی وجہ سے بوڑھے چاچا رزاق کی معذور ٹانگ میں رات بھر درد ہوتا رہا۔ صبح تودہ اوپر ملنگ ڈیرے پر نہ جا سکے۔ تاہم میں انٹیق، تاجور اور پرچلے گئے۔ نور کی چاچا رزاق کی دیکھ بھال کے لیے پہنچے ہی رہی۔ ملنگی ڈیرے پر وہی چند دن پہلے والی کھانا بھی تھی۔ حلوے بانڈے کی خوشبو، گھونگر دوؤں کی چمن چمن، جتنے بجاتے اور رقص کرتے ہوئے سمت حال ملنگ۔ تاجور خواتین والے حصے کی طرف چلی گئی۔ میں اور انٹیق ادھر ادھر گھومتے رہے اور جائزہ لیتے رہے۔ گہری لال آنکھوں والے دو بچے کئے ملنگ مین دروازے کے قریب کھل رہے تھے۔ اب میں

پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ ان کے ہونڈ لگے کھیلوں کے نیچے آتشیں اسلحہ موجود ہے۔
 تاجور کی واپسی قریب دو گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سیاہ برقع میں تھی۔ بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ بالکل جیسے سیاہ بادل میں سے چاند کا ایک تابندہ حصہ چمک رہا ہو۔ انٹیق لنگر حاصل کرنے کے لیے ایک قطار میں کھڑا تھا۔ وہ سیدھی میری طرف آئی۔ وہ اندر سے جو تھک لے کر آئی تھی، وہ کمر کی شکل میں تھا اور مٹی کی چھوٹی تھالی میں تھا جسے ٹھوکی کہا جاتا ہے۔ اسکی ایک ایک ٹھوکی میرے ہاتھ میں بھی تھی۔ ہم دونوں وہیں پتھری میز جیوں پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

تاجور کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کچھ کا سامانی ہوئی؟“
 ”بالکل ہوئی۔۔۔ میں ریشمی سے مل کر آ رہی ہوں۔ ہم نے بائیں کی ہیں، وہ تو حیران ہو گئی مجھے دیکھ کر۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔“
 ”وہ شک تو ہے؟“
 ”ہاں، لیکن پہلے سے بڑی کمزور ہو گئی ہے۔۔۔۔۔۔“

رنگ بھی سا نولا ہو گیا ہے۔ بالکل کمزور لگتی ہے۔ بائیں کسی اور سے کر رہی ہوئی ہے دھیان نہیں اور ہوتا ہے۔
 ”تم نے کیا بتایا ہے کہ کیسے آئی ہو؟“
 ”میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں اس سے ملنے اور اسے لینے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ اس کے اباجی بھی ساتھ ہیں۔ یہ سن کر اس کا رنگ بیلا پڑ گیا، کہنے لگی۔۔۔ اب یہ نہیں ہو سکتا تاجور، اب میرا جینا مرنا یہاں پر ہی ہے۔ میں سارے درختے پھاڑ کر یہاں آئی ہوں۔۔۔ میں نے اس بارے میں زیادہ بحث نہیں کی۔ ابھی اس کو بس بات چیت میں رواں کیا ہے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔۔ آپ کا انداز درست تھا۔ مزار کے سامنے عورتیں مل کر جو شعر گاتی ہیں ان میں اکلی آواز ریشمی کی ہی ہوتی ہے، اس کی آواز کی یہاں بڑی قدر کی جارہی ہے۔“

سرخ آنکھوں والا ایک عاود ہمیں گھورتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا۔ تاجور تھوڑا گڑبڑائی۔ میں نے کہا۔ ”خود کو نازل رکھو۔ جیسے ہم۔۔۔ میاں بیوی ہوں۔۔۔ سلام کے لیے آئے ہوں۔“
 ”سلام کے لیے تو شیک ہے، لیکن یہ دوسری بات شیک نہیں۔“ وہ لمبی سانس لے کر بولی۔
 ”بھئی، فرض کر رہے ہیں ہم۔۔۔ فرض کر رہے ہیں

کہ میاں بیوی ہیں، فرض کر رہے ہیں کہ ابھی تک ہماری کوئی اولاد نہیں ہوئی۔۔۔۔۔۔ فرض کر رہے ہیں کہ میری والدہ یعنی تمہاری ساس، پوتے پوتی کے لیے بہت بے چین ہیں۔۔۔۔۔۔“
 ”تو پھر آپ یہ بھی فرض کر لیں کہ میں نے آپ کو دکھا دیا ہے اور آپ میز جیوں سے لڑھکتے ہوئے نیچے گرے ہیں۔“ وہ ذرا مسکرا کر بولی۔
 ”نہیں، یہ فرض نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مزار ہے۔ اسی جگہوں پر ایسی نازیبا باتیں فرض نہیں کرتے، یہاں پر دعا وغیرہ مانگتے ہیں۔“
 ”دعا بھی مانگی ہے کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں، وہ اللہ کی مدد سے پورا ہو۔“
 ”اور میں جس مقصد کے لیے آیا ہوں؟“
 ”کیا مطلب؟“
 ”بھئی، میں تو تمہارے لیے آیا ہوں نا، تمہاری خاطر۔۔۔۔۔۔ ایک آدھ بول میرے لیے بھی کہہ دینا تھا۔“
 ”آپ کے لیے ہدایت کی دعا مانگی ہے؟“
 ”ماشاء اللہ۔۔۔۔۔۔ اور اپنے لیے؟“
 ”اپنے لیے آسانی کی۔“
 ”کس بات کی آسانی؟“
 ”جس انجمن اور مشکل میں آپ نے مجھے ڈال دیا ہے، اس میں سے نکلنے کی آسانی۔“
 ”تم محبت کو مشکل کہہ رہی ہو؟“
 ”سائنے کہتے ہیں کہ اس سے بڑی مشکل کوئی اور ہے ہی نہیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”شاہ زیب! ریشمی سے مل کر خوشی بھی ہوئی ہے اور پریشانی بھی بڑھی ہے۔ وہ یہاں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ کچھ میں نہیں آ رہا کہ وہ ہماری بات مانے گی بھی یا نہیں۔۔۔۔۔۔ میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا خوف اس کا شوہر بیٹھا ہی ہے۔ اس خبیث کی وجہ سے وہ یہاں ہے۔“
 ”تو اسے پکڑوادیتے ہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”وہ بیوی پر ظلم توڑتا رہا ہے۔ اسے گانے اور پیشہ کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ اس کے خلاف بڑا مضبوط کیس بن سکتا ہے۔ تین چار سال کے لیے آسام سے جیل میں چلا جائے گا۔ لاہور میں میرا ایک خالہ زاد کافی بڑا ایڈووکیٹ ہے۔ وہ یہ کام آسانی سے کر لے گا۔“

”لیکن اس کا خوف تو پھر بھی ریشی کے سر پر سوار رہے گا۔“

اسی دوران میں انیق لنگر کے چاول لے کر ہماری طرف آگیا اور ہم خاموش ہو گئے۔ انیق نے بتایا کہ لنگر خانے کے پتھوڑے ملکوں نے ایک لڑکے کو بری طرح مارا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ درخت پر چڑھ کر عورتوں والے حصے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رات کو مسافر خانے میں ایک سریلے گیت کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ آواز تقریباً ایک فرلانگ اوپر ملنگی ڈیرے میں سے آ رہی تھی۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ریشی ہی کی آواز ہے۔ سرائے میں لیٹے ہوئے کئی افراد اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑے دھیان اور احترام سے یہ آواز سننے لگے۔ شہر میں بھی نہیں آ رہے تھے لیکن یہ کوئی مناجات قسم کی چیز تھی۔ کچھ دیر بعد آواز ختم ہوئی اور پہاڑی سنانے نے اس مختصری ہوئی شب کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔

انیق تلی ہوئی مچھلی کھا کر سو گیا تھا۔ میں اٹھا اور سرائے سے باہر آگیا۔ میں نے سیل فون پرلا ہور میں داؤد بھاؤ سے رابطے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ سیکٹل کمزور تھے۔ میں کچھ اور آگے نکل گیا اور ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر تفصیلی بات کی۔ داؤد بھاؤ اپنے اسی زیر زمین ٹھکانے پر تھا جس کے اوپر ایک ہائی فائی اسٹورک کلب کی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ مجھ سے بات کر کے داؤد بھاؤ خوش ہو گیا۔ ”کیسا چل رہا ہے؟“ اس نے اپنے مخصوص پاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”سب ٹھیک ہے اور سب سے پہلے تو آپ کے پٹھے کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بھاؤ، انیق میری توقع سے بڑھ کر میری مدد کر رہا ہے۔ بڑا کل چل چیا عات فرمایا ہے آپ نے۔“

”تم خود بھی تو چل ہو تمہارے جانے کے بعد بھی یہاں کلب میں تمہارے چرچے ہیں۔۔۔۔۔ اور تو اور لودھی جیسا کھر دماغ باکس بھی تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہے۔“ میں نے سانس منظر میں متاثرین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید ڈینگ میں اب بھی کوئی باکسنگ مقابلہ جاری تھا۔ میں نے کہا۔ ”داؤد بھاؤ اس وقت آپ کو ایک ضروری کام کے لیے فون کیا ہے۔“

”میرے خیال میں اس لڑکی کے سلسلے میں ہو گا جو شاہ کر کے تمہارے دل کو لگی ہوئی ہے۔ اگر سیدھی طرح ہاتھ

نہیں آ رہی تو بتاؤ۔۔۔ ایک سو ایک دوسرے طریقے بھی ہیں۔“

”یہی کام تو کرنا نہیں ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تو پھر؟“

”بس ایک بندے کو پھڑکانا ہے۔۔۔۔۔ جو اس بے چاری کی زندگی کا دشمن بنا ہوا ہے۔“

”نام بتاؤ اس کا۔۔۔۔۔ اور بتاؤ رہتا کہاں ہے؟“

”نام ہے پرویز عرف پتیا اور ملے گا چاندنی کلب میں۔ وہاں اس کی بیوی گانا وغیرہ گاتی رہی ہے۔“

”نو پر اہم۔۔۔۔۔ ہو جائے گا۔۔۔۔۔ کو تو آج رات ہی ہو جائے گا۔۔۔۔۔ لیکن صرف پھڑکانا ہے یا پتا بھی ہے۔“

”نہیں صرف پھڑکا دیں۔۔۔۔۔ ڈیڈ باڈی بے شک کسی سڑک پر پھینک دیں۔ تصویر خود بخود ہی اخبار میں آجائے گی۔“

”کوئی مزہ نہیں آیا۔“ داؤد بھاؤ بولا۔ ”تمہارا فون آیا تھا تو میں سمجھا تھا کہ کوئی بڑا کام ہوگا۔“

”بڑا کام بھی آنے والا ہے داؤد بھاؤ۔ پتا چلا ہے کہ لالہ وریام مجھے ڈھونڈنا پھر رہا ہے۔ اپنے بھائی کی موت اسے ابھی تک ہضم نہیں ہوئی۔“

”موت بھی ہضم نہیں ہوئی اور اس کی موت سے کوئی سبق بھی نہیں سیکھا اس نے۔۔۔۔۔ انیق نے بتایا تھا کہ آج کل وہ سیالکوٹ کے علاقے میں کہیں پایا جا رہا ہے اور وہاں بھی زمین پر نکلے گا زکراشت کاروں کی بددعا سیکھ لینے کا پروگرام بنا رہا ہے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے داؤد بھاؤ، کچھ دیہات خالی کرانے کے لیے اس نے ایک ڈکیت سیالکوٹی کی مدد بھی لے رکھی ہے۔ سیالکوٹی اپنے گینگ کے ساتھ ان دیہات کے لوگوں کو مسلسل خوف زدہ کر رہا ہے۔ بہت سے لوگ نقل مکانی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ یعنی ہجرت کر رہا ہے۔ اور ایک بات کا پتا مجھے ابھی طرح چل چکا ہے بھاؤ، یہ ٹھیک دار اب بھی ان لوگوں میں سے نہیں جو آسانی سے ہار مان لیتے ہیں۔ یہ اندر خانے ضرور بہت برا سوچ رہا ہوگا۔ مجھے ولید اور چاچا حنیف کی طرف سے فکر رہتی ہے۔“

اچانک شور شرابا سنائی دینے لگا۔ شراب کی بوتلیں اور گلاس ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کوئی لڑکی سڑیلے انداز میں چلائی۔ یقیناً یہ کچی عمر کے داؤد بھاؤ کی سترہ اٹھارہ سالہ رکھیل روہی ہی رہی ہوگی۔ ”کیا ہوا داؤد بھاؤ؟“ میں نے

پوچھا۔

”کچھ نہیں یار، لودھی ایک لڑکے سے جھگڑ پڑا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے اطمینان سے کہا پھر بولا۔ ”باقی تمہارا کام ہو جائے گا۔۔۔۔۔ آج ہی رات ہو جائے گا۔ تصویر بھی چھپ جائے گی۔۔۔۔۔ اوکے؟“

”تھیک ہو۔“ میں نے کہا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کام ہو جانے کی بات داؤد بھاؤ نے یوں کی تھی جیسے میں نے اسے بندہ مارنے کے لیے نہ کہا ہو۔ پانی یا بجلی کا ٹیل ٹھیک کرانے کے لیے کہا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا ہی ہوگا جیسا اس نے کہا ہے۔

ریشی کے شوہر پیچ کو میں نے میں چوبیس گھنٹے میں ہی پہچان لیا تھا۔ وہ پرلے درجے کا کرخت مزاج اور بدکردار شخص تھا جس کے درست ہونے کے امکانات دور دور نہیں تھے۔ ریشی اور اس کے بوڑھے والدین کی زندگیاں اسی صورت بدترین عذاب سے بچ سکتی تھیں اگر پتیا ہمیشہ کے لیے ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتا۔ وہ ایک عالم شوہر ایک بے رحم داماد اور ایک قابل نفرت انسان کی ساری خصوصیات پر پورا اترتا تھا۔

کرمان والا کے بازار میں اخبار اگلے روز پہنچتا تھا۔ منگل کا اخبار وہاں بدھ کو پہنچا اور مجھ سے پہلے انیق نے دیکھا۔ میں نے ابھی تک انیق کو نہیں بتایا تھا کہ داؤد بھاؤ سے فون پر میری کیا بات ہوئی ہے۔ ہم مسافر سرائے کے دالان میں بیٹھے چلیوں میں چائے پی رہے تھے۔ تاجور ہمارے لیے مقامی طرز کے شکر پارے پلیٹ میں رکھ کر لائی تھی۔ ابھی میں نے پہلا شکر پارہ ہی اٹھایا تھا کہ انیق اخبار پکڑے اندر داخل ہو اور بلند آواز میں بولا۔ ”شاہ زیب بھائی ایہ دیکھیے، یہ کیا خبر ہے؟“

اس نے اخبار میری طرف بڑھایا اور اندرونی صفحے کی دو کاپی خبر پر اٹھی رہی۔ خبر سے پہلے میری نظر تصویر پر پڑی۔۔۔۔۔ اور یہ ریشی کے بددماغ شوہر پرویز عرف پیچ کی تصویر تھی۔ خبر کی سرخی تھی۔ ”چوراہے میں کوئیوں سے چٹنی لاش۔“

ذیلی سرخی تھی۔ ”مقتول پرویز ایک ٹھیکیدار کے پاس ملازم تھا۔ نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔“

خبر کی تفصیل اس طرح تھی۔ ”کل رات ایک بچے کے لگ بھگ مقتول پرویز نے کئی حالت میں موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ نامعلوم کارسواروں نے اسے ٹکر مار کر گرایا اور گولیاں مار کر فرار ہو گئے۔ پرویز نے موقع پر ہی دم توڑ

انکار

دیا۔ یاد ہے کہ پیچ کا ملنا جلنا مشکوک کردار کی عورتوں سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کی سینیڈی ہوئی گلوکاری کرتی تھی اور ایک مقامی ہوسل میں ڈنر کے وقت لائیو پرفارمنس دیتی تھی۔“

انیق خبر پڑھ رہا تھا اور چاچا رزاق کے ساتھ ساتھ تاجور بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے سن رہی تھی۔ چاچا رزاق نے لرزاتے ہاتھوں کے ساتھ اخبار تمام اور غور سے پیچ کی تصویر دیکھنے لگے۔ پیچ کے چہرے کا ایک حصہ خون میں لتھڑا نظر آتا تھا۔ آنکھیں تارے لگی ہوئی تھیں۔ پھر چاچا نے اخبار ایک طرف رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ روتے ہوئے بولے۔ ”اس نے بڑا دکھ دیا ہے میری دھی کو۔ بہت رلا یا ہے اسے۔ اللہ کی لاشی بے آواز ہوئی ہے۔ مجھے پتا تھا ایک دن اس نے ایسے ہی مرنا ہے۔ ایسے ہی کسی گندی تالی میں گرے گا۔۔۔۔۔“

☆☆☆

اس سہ پہر جب میں، انیق اور تاجور اوپر ملنگی ڈیرے پر گئے تو وہ اخبار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ تاجور نے اسے تکر کے اپنے برقع میں چھپایا ہوا تھا۔ پہلے کی طرح ہم مردانہ حصے میں رہے اور تاجور زنانہ حصے میں چلی گئی۔

انیق اڑتی چڑیا کے پر گنتا تھا۔ وہ گاے بگے غور سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا۔ آخر یوں ہی اٹھا۔ ”شاہ زیب بھائی اس پیچ کی موت کی ٹانگ بڑی زبردست ہوئی ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”وہی بات کہ رہا تھا۔“ اس نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری آنکھوں میں دیکھ کر گویا ہوا۔ ”یہ کل آپ نے جو داؤد بھاؤ کو فون کیا وہ کس سلسلے میں تھا؟“

کوشش کے باوجود میں اسے ہونٹوں تک پہنچنے والی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ انیق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے کہا۔ ”تمہاری سوچنے کی حس بڑی تیز ہے۔ ایک نمبر کے ہو گئے ہو تم۔“

”یعنی میرا اندازہ درست ہے۔“ وہ چمک کر بولا۔

”پرویز عرف پیچ کو آپ کی نظر لگی ہے۔“

”وہ تھا ہی اس قابل۔“ میں نے کہا۔

اس نے کچھ سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں کتے کی ٹیڑھی دم والی مثال دی جاتی ہے۔ اب اللہ کرے اس دم کے کاٹے جانے کی خبر ریشی کی زندگی کے

ہو کر اوجھل ہو گئے۔ ارد گرد موجود کئی اور مردوزن نے بھی ان بھاگتے ہوئے ملنگوں کو دیکھا تھا اور اب سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک ملنگ تیز تیز قدموں سے چلتا ایک محرابی دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک عورت نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”کیا ہوا سائیں جی؟“

”کچھ نہیں، ایک جیب کھڑا تھا۔“ ملنگ نے مختصر جواب دیا اور محرابی دروازے میں اوجھل ہو گیا۔

اس کا جواب اور انداز سلی بخش نہیں تھا۔ بہر حال اس کے بعد بھاگ دوڑ کا کوئی اور منظر نظر نہیں آیا۔ ارد گرد موجود لوگ پھر اپنے اپنے حال میں مگن ہو گئے۔ کچھ دیر بعد میں یونہی ٹھٹھا ہوا ایک منڈیر کے پاس پہنچا۔ میں انیق کو دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ انیق تو نظر نہیں آیا لیکن میری نگاہ دور نیچے گہرائی میں گئی۔ قریباً تین چار سو فٹ نیچے ملنگی ڈیرے کا ایک زیریں حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک منظر مجھے چند سیکنڈ کے لیے دکھائی دیا اور بری طرح چونکا گیا۔ مجھے غمن چار ملنگ دکھائی دیے جو ایک نوجوان کو مار رہے اور ٹھٹھتے ہوئے ایک جانب لے جا رہے تھے۔ میں کافی بلندی سے دیکھ رہا تھا پھر بھی مجھے اندازہ ہوا کہ نوجوان بری طرح لہو لہان ہے۔ وہ شاید ملنگوں سے جان بخشی چاہتا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہے تھے۔ گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ نوجوان کے چلانے کی آواز اور ملنگوں کے دہانے کی صدا میں مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ لوگ زخمی نوجوان کو ٹھٹھتے ہوئے ایک دروازے میں اوجھل ہو گئے۔ یہ سارا منظر بمشکل تین چار سیکنڈ پر مشتمل تھا۔

”کیا ہوا شاہ زیب؟“ سیزھیوں پر بیٹھی تاجور نے میرے تاثرات دیکھ کر کہا۔

”کچھ نہیں، یونہی جائزہ لے رہا تھا۔ بہت زیادہ گہرائی ہے اس طرف۔“

اس سے پہلے کہ تاجور کوئی مزید سوال پوچھتی، ایک طرف سے انیق آتا دکھائی دیا۔ وہ مناسب وقت پر آیا تھا۔ میں نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بادل گھر سے ہو رہے ہیں، کسی بھی وقت بارش ہونے لگے گی۔ تم انیق کے ساتھ نیچے سرانے میں جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔“

”کیوں؟ کہاں جانا ہے؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”ایک واقعہ بندہ نظر آیا ہے، اسے دیکھ کر آتا ہوں۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

تاجور نے تھوڑی سی بحث کی لیکن پھر وہ انیق کے ساتھ مغربی جانب کی سیزھیوں اتر کر سرانے کی طرف روانہ ہوئے۔

آجائوں، باہر کی دنیا میں کچھ نہیں رکھا، بس دکھ اور تکلیفیں ہیں۔“

”یعنی لینے کے دینے۔“ میں نے ہلکے ہلکے انداز میں کہا۔ ”پلو بھی چلو۔ مٹی ڈالو اس روشنی پر۔ صبح نکل چلتے ہیں۔ پہلے ناٹم والی بس پکڑیں کے کوئی کے لیے۔“

”سیاہ نقاب کے اوپر تاجور کی آنکھیں مسکرائیں۔ وہ بولی۔“ فرض کر لیں کہ میں روشنی کی باتوں میں آجاتی ہوں اور فرض کر لیں کہ میں زمانے حصے میں جاتی ہوں اور پھر واپس نہیں آتی۔۔۔۔۔ اور فرض کر لیں کہ آپ کو اکیلے واپس جانا پڑتا تو پھر۔۔۔۔۔؟“

”تو پھر یہ بھی فرض کر لو کہ میں نے آٹھ دس ملنگ مار ڈالنے ہیں اور اپنی پیشی پر خود ہی پتول رکھ کر گولی چلا لینی ہے۔“

”انتا غصہ؟“

”نہیں انتا پیار۔۔۔۔۔ جب تم اس طرح کی بات کرتی ہو تو جی چاہتا ہے کہ۔۔۔۔۔“ میں نے دانت چپیں کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا جی چاہتا ہے؟“

”میں نے ٹھنڈی سانس لی۔“ ”مگر بتا دوں تو۔۔۔۔۔ تم اپنا رنگ لال لگائی کر لو گی اور ہو سکتا ہے کہ اگلے آٹھ دس روز تک مجھ سے بات ہی نہ کرو۔“

”انتے بڑے ارادے ہیں۔“ وہ مجھے گھور کر بولی۔

”میں نے نفی میں سر ہلا کر پہلو بدلا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔“ مذاق کر رہا ہوں تاجور۔۔۔۔۔ تم سے جتنا پیار کرتا ہوں، اتنا ہی احترام بھی کرتا ہوں تمہارا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھنے سے پہلے بھی تم سے اجازت لوں، سچ بہت چاہتا ہوں تمہیں۔“

”کہتے ہیں زیادہ پیار اچھا نہیں ہوتا اور وہ بھی ایک ایسے شخص سے جسے آپ اچھی طرح جانتے بھی نہ ہوں۔“

”یعنی تم کہنا چاہ رہی ہو کہ۔۔۔۔۔ تم مجھے ٹھیک سے جانتی نہیں ہو؟“

”ہاں شاہ زیب۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے مجھے شاید۔۔۔۔۔ آپ نے اپنے بارے میں بہت کچھ مجھ سے چھپا رکھا ہے۔“

”یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔“

”شاید میں کچھ اور بھی کہتا مگر دو ملنگوں کو بھاگتے دیکھ کر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی کے پیچھے لپک رہے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک محرابی دروازے میں داخل ہوئے۔“

تاجور نے ایک گہری سانس لی اور اس گہری سانس کے سبب برج کے اندر اس کے جسم نے بڑے دلکش انداز میں حرکت کی۔ وہ بولی۔ ”شاہ زیب! وہ اتنی جلدی کسی شخص پر نہیں پہنچ سکتی۔ اس سے بار بار ملنا بھی آسان نہیں۔ مجھے ہے کہ اس کے لیے کافی سارا وقت چاہیے ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ دو تین مہینے۔ کوئی اسے سمجھانے والا ہو اور وہ پکا ارادہ کر کے لگا رہے تو شاید اس کا ہن بدل جائے۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے تاجور کہ دو تین مہینے میں یہاں کے رنگ میں کچھ اور رنگ جائے۔“

”ہاں، ہونے کو تو کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ ملنگوں اور مجاوروں نے یہاں مشہور کر رکھا ہے کہ حزار میں لٹنی ہوئی ہستی کی آواز روشنی کی آواز میں بدل گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس آواز میں درد ہے اور لوگ ملنگی ڈیرے کی طرف بھاگ چلے آتے ہیں۔“

”حزار میں لٹنی ہوئی؟ تمہارا مطلب ہے یہ حزار کی عورت کا ہے؟“

”ہاں، یہی تو انکشاف ہوا ہے آج۔ اسے مستان مانی کا حزار کہتے ہیں۔ وہ دو تین سو سال پہلے یہاں دفن ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ اس میں حصار تھا۔ وہ خود ہی شعر جوڑتی تھی اور پڑھتی تھی۔ راہ گزر کے آواز سن کر رک جاتے تھے اور پڑے بھی اس پاس جمع ہو جاتے تھے۔ کچھ اسی طرح کی باتیں ہیں۔“

”ایسی کہانیاں تو ایسے حزاروں، مقبروں کے بارے میں گھڑی لی جاتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”پر شاہ زیب! اب جو کہانی گھڑی گئی ہے، وہ روشنی کے لیے بڑی خطرناک ہے۔ بڑے مجاور اور پردے والی سرکار کہہ رہی ہے کہ روشنی کے ٹکے میں مستان مانی کی آواز ہے۔ اس لیے روشنی کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اسے ملنگی ڈیرے کے زمانے حصے میں رہنے کے لیے بڑی خاص جگہ دی گئی ہے۔ میں آج دیکھ کر آ رہی ہوں۔ وہاں ہر وقت انگلیشیاں چلتی ہیں، نرم گدے ہیں، فالوس کی طرح کے بڑے بڑے لیپ ہیں اور جلی کی روشنی بھی ہے۔ انگلیشیاں میں کوئی خوشبو بھی چھپتی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر طرف مہک سی رہتی ہے۔ دو تین نوکرانیاں رات دن روشنی کے آس پاس رہتی ہیں۔ وہ تو۔۔۔۔۔ تاجور کہتے کہتے چپ ہو گئی۔“

”بات تو پوری کرو۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو مجھے بھی یہ مشورہ دے رہی ہے کہ میں یہاں

لیے مہار کا ثابت ہو۔“

”ضرور ہوگی۔“ میں نے کہا۔

ہم ملنگی ڈیرے کے طول و عرض میں گھومتے پھرتے رہے۔ یہ جگہ تقریباً پہاڑ کی چوٹی پر تھی۔ دو طرف گہری کھائیاں تھیں جن میں اترا تا آسان نہیں تھا۔ تیسری طرف داخلی راستہ تھا۔ یہاں کڑا چہرہ اڑتا تھا۔ بہر حال ہم نے کسی شخص کے ہاتھ میں رائل وغیرہ نہیں دیکھی۔ یہ لوگ آتشیں اسلحہ اپنے پیوند لگے کیلوں یا صدر یوں میں چھپا کر رکھتے تھے۔ داخلی دروازے کے قریب ایک بلند جگہ پر ہمیں ایک پوسٹ نما جگہ بھی نظر آئی۔ میرا اور انیق کا مشترکہ خیال تھا کہ یہاں کم از کم دو چہرہ ہمارے دور مار رائل کے ساتھ موجود ہوں گے۔ بہر حال عملی طور پر ہمیں وہاں بھی کوئی رائل دکھائی نہیں دی۔ ڈیرے کی چوٹی کی طرف نشیب میں کلوی کا ایک جھولتا ہوا پلی تھا۔ اس پلی کو پار کر کے ساتھ والے پہاڑ پر جایا جاسکتا تھا۔ یہاں بھی کڑی نگرانی موجود تھی۔

اس روز تاجور کو زمانے حصے سے واپس آنے میں کافی تاخیر ہوئی۔ وہ ڈھائی بجے کے لگ بھگ مٹی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا۔ گیس لیمپس اور لائٹس جل اٹھیں لیکن وہ لوٹی نہیں۔ ہمیں تشویش ہونے لگی۔ گمراہی دوران میں اس کا برج نظر آگیا۔ وہ سیزھیوں اترتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس کی ہموار متوازن چال یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ مطمئن لوٹ رہی ہے۔ تاجور کو دیکھتے ہی انیق ادھر ادھر ہو جایا کرتا تھا تاکہ ہمیں آسانی سے بات کرنے کا موقع ملے۔ اس مرتبہ بھی وہ کسک گیا۔

”انتی دیر؟“ میں نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”دیر ہوئی لیکن درست ہوئی۔“ وہ پتھر لی سیزھیوں پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“

”میں نے روشنی کو اخبار دکھایا۔ پہلے گم سم ہوئی، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن یہ پرویز کے مرنے کا دکھ نہیں تھا۔ اسے وہ سارے زخم یاد آئے تھے جو اس بندے کی وجہ سے اسے لگے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگی۔“ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ ایک دن اس بندے کا یہی آخر ہوتا ہے۔ وہاں روشنی کی ساسی عورت ایک اور اخبار بھی ڈھونڈ لائی۔ اس میں بھی پرویز والی خبر موجود تھی۔ ہم دیر تک اس بارے میں بات کرتے رہیں۔۔۔۔۔“

”کوئی کام کی بات بھی کی یا نہیں؟ میرا مطلب ہے اس کی واپسی کی بات؟“

ہو گئی۔ نوجوان کی بے چارگی کا منظر مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو دو ملک بھاگتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرے تھے، وہ بھی غالباً اسی نوجوان کے پیچھے تھے۔ کیا پتا یہ وہی نوجوان ہو جسے پرسوں مارا بھی گیا تھا۔

جونی اتنق اور تاجور میری نظروں سے اوجھل ہوئے، میں عام انداز سے چلتا ہوا شرقی ڈھلوان کی طرف اترنے لگا۔ ایک جگہ پتھروں پر لکھا ہوا نظر آیا..... آگے جانا منع ہے۔ مگر میں اس وارنگ کو نظر انداز کرتا آگے بڑھتا رہا۔ تیس چالیس قدم آگے جا کر مجھے طویل میڑھیاں نظر آئیں جو گہرائی کی طرف جاری تھیں۔ اچانک ایک خوبصورت ملک نے میرا راستہ روک لیا، اس کے ہاتھ میں مضبوط لاشی تھی۔ اپنے نیلے چو لے کے اوپر اس نے بیوند لگا لیا اور ڈھ رکھا تھا۔

”ادھر کہاں آگئے ہو؟“ وہ مجھے دیکھ کر سخت لہجے میں بولا۔ سردی کے سبب اس کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔

”میں پردے والی سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”ان کی جی لینی ہے۔ میرا مطلب ہے ان کے پاؤں چومنے ہیں۔“

”کیا بکواس کرتے ہو؟ کون ہو تم؟ ہم نے وہاں اوپر لکھا ہوا نہیں دیکھا، ادھر آنا منع ہے۔“

”عام لوگوں کا آنا منع ہے۔ میں تو عاشق ہوں سرکار جی کا۔“

ملک کو میرے بارے میں شک ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً کبل اٹھایا۔ میری توقع کے عین مطابق کبل کے نیچے چینی ساخت کی چھوٹی رائلز موجود تھی۔ وہ ہنسنے لگا۔

”کارڈ بے تھارے پاس؟“

”نہیں کارڈ تو نہیں، لیکن اگر آپ کو برا لگ رہا ہے تو واپس چلا جاتا ہوں۔“

”اب اتنی دور آگئے ہو تو آسانی سے واپس کیسے جا سکو گے۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

مجھے لگے کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو آواز دینا چاہ رہا ہے۔ میں حرکت میں آیا اور میرا حرکت میں آنا اس کے لیے بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ میں نے اس کی چربی دار گردن پر اسی

جگہ ہاتھ رسید کیا تھا جس کی ضرب ریزہ کی ہڈی تک پہنچ گئی اور جسم و دماغ کا رابطہ منقطع ہو جاتا تھا۔ خودمختار ملک کے ہونے شہنشاہ کی طرح میڑھیوں پر گرا۔ اس کی لاشی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

ملک اور لاشی کے گرنے کی آوازیوں نے ایک اور شخص کو میری طرف متوجہ کیا۔ یہ بھی ایک ملک تھا مگر چہرے پر بے رحمی اور زیادہ پھر تھلا۔ اس نے ساجھی کی گڑھی ہوئی لاشی اٹھائی اور پوری طاقت سے میرے سر کے دو گلوں کے گرد چاٹا۔ میں نے اس کے دو دار بڑے اطمینان سے بچائے اور تیسرے وار سے پہلے ہی اسے دیو بج کر پشت کے بل گر دیا۔ گرتے ہوئے ملک کا سر بڑے زور سے پتھری میڑھیوں سے ٹکرایا تھا۔ میں نے ایک بار مزید اس کے سر اور میڑھی کا ملاپ کرایا۔ وہ بھی بے سدھ ہو گیا۔ میں دونوں کو گھسیٹ کر پاس ہی ایک پتھری کوٹھڑی میں لے آیا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اب پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھنا ہی مناسب تھا۔ میں نے دونوں ملکوں کا جائزہ لیا۔ ایک ملک کا قد کاٹھ مجھ سے مطابقت رکھتا تھا۔

قریباً دو منٹ بعد میں لمبے نیلے چو لے اور کبل میں ملبوس میڑھیاں اتر رہی تھیں۔ میرے پاؤں ننگے تھے اور ہاتھ میں بالوں کی بلی لاشی تھی۔ میں نے اپنے سر پر ملک کی لاشی چادر اس طرح ڈال لی تھی کہ لمبا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ یہ دھاری دار چادر بھی اور گھونگھٹ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ گھونگھٹ والے پردہ دار ملکوں کی موجودگی یہاں ثابت ہو چکی تھی۔ مجھے تو یقین تھی کہ کوئی مجھ پر خصوصی توجہ نہیں دے گا۔ دونوں بے ہوش ملکوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر میں نے ان کے منہ میں کپڑے غونسل دے دیے تھے اور انہیں گتے جھاڑ جھکاڑ میں ڈال دیا تھا۔ امید نہیں تھی کہ وہ دو دشمن گتے تک میرے لیے کوئی مشکل پیدا کر سکیں گے۔

سو کے قریب میڑھیاں اترنے کے بعد میں بھی ڈیرے کے خاص حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں ملکوں کے علاوہ جواں سال مسکندیاں بھی نظر آئیں۔ میں ایک وسیع ہال میں داخل ہوا۔ یہ پتھر کا ایک قدرتی جھیر تھا۔ یہاں لذت کھانوں کی خوشبو بھی پھیلی تھی۔ میں نے وہ عمرانی دروازہ پہچان لیا تھا جس میں زخمی نوجوان کو گھسیٹ کر لے جایا گیا تھا۔ میں درست سمت میں جا رہا تھا۔ جب ایک دروازے میں سے گزرنے لگا تو ایک پہریدار نے کہا۔ ”کہاں جا رہے ہو مہارک؟“

میں نے گھونگھٹ ہٹائے بغیر پہریدار کے کان میں سرگوشی کی۔ ”کرنا لی صاحب نے بلایا ہے۔ ایک بری خبر ہے۔“ ”دیکھا؟“

”واپسی پر جاتا ہوں۔“ میں نے پھر سرگوشی کی۔ سرگوشی میں آواز کا پہچانا مشکل ہوتا ہے۔ لہذا لگا کہ کام چل گیا ہے مگر جب میں آگے بڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ پہریدار کی نگاہیں میرے پاؤں پر جمی ہوئی ہیں۔ میرے پاؤں صاف سترے تھے جبکہ ملکوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پہریدار چونک چکا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ کسی طرح کا رد عمل ظاہر کرتا، میں راہدار یوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں جگہ جگہ سیسے پیسوں روشن تھے۔ ایک دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے، مجھے عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے جانور یا ایک سے زیادہ جانور کسی چیز پر چھٹ رہے ہوں اور چھینا بھی نہیں کر رہے ہوں۔ ایک جگہ بڑی سی سلاخ دار کھڑکی کے سامنے کی ملک جمع تھے اور ڈرے ڈرے انداز میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ اپنے گھونگھٹ کے اندر سے میں نے جو کچھ دیکھا وہ دل کی دھڑکنیں روکنے والا تھا۔ میں نے سیاہ وہیوں والے تین تین نیم پتے دیکھے۔ ان کی خوشنویں خون سے سرخ تھیں اور وہ گوشت کے چند ٹکڑوں کو ادھر ادھر پھینچ رہے تھے۔ وہ ایک انسانی جسم کے کوٹھے تھے۔ جا بجا کپڑے کی دھجیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ یہ ایک سیاہ چٹلون اور کرم کلر سویٹر کی دھجیاں تھیں۔ قیس وغیرہ کی دھجیاں بھی ہوں کی لیکن انہیں علیحدہ سے شناخت کرنا مشکل تھا۔ مجھے پچھاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی، یہ وہی بد قسمت نوجوان تھا جسے کچھ دیر پہلے بٹے کے ملک گھسیٹ کر یہاں لائے تھے۔

کھڑکی سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود یو پارڈ چیتے نے نوجوان کے جسم کا ایک ٹاؤک حصہ اپنے خون خونی جیزوں میں دب کر رکھا تھا۔ دوسرے چیتے نے اس کی خون آلود کلائی دیو بج کر پھینکی تھی۔ اس کی ہوتی کلائی پر ابھی تک رست و اچ بندھی ہوئی تھی۔ میں چند سینکڑوں کے لیے اس دلدرد منظر میں کھو کر رہ گیا۔ تب ایک دم مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ طویل راہداری کے موڑ پر وہی پہریدار نظر آیا جس نے مجھے روکا تھا۔ وہ لپکا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہی لیکن اس سے

انگاری

پہلے ہی ایک سفاک سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔ ”اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت کرو گے تو آٹھ گولیوں کا برست پورے کا پورا ہتھارے دل میں اتار دوں گا۔“

تب میں نے محسوس کیا کہ میری بائیں بغل کے نیچے رائفل کے بیلر کا بے رحم دباؤ موجود ہے۔ پچھلے پانچ چھ سالہ تجربے نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کہاں پھرتی دکھانا ٹھیک ہوتا ہے اور کہاں نہیں۔ یہ ہرگز پھرتی دکھانے کا موقع نہیں تھا۔

سرگوشی کرنے والے نے مجھے اگلے قدموں پیچھے آنے کے لیے کہا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا، اسی دوران میں پہریدار بھی بائیں جانب کا پتلا وہاں پہنچ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں رائفل بھی نظر آرہی تھی۔ یہ دوسری رائفل بھی میرے سر سے آن لگی۔ دونوں رائفل برداروں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسلحے کے استعمال میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔ اس منظر نے ہمارے ارد گرد ایک دم پچھل عبادی تھی۔ چیتوں کی خون آلودی کا لرزہ خیز منظر دیکھنے والے کسی اب کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔ پھر جب انہیں یہ احساس ہوا کہ یہاں کسی بھی وقت فائرنگ ہو سکتی ہے تو وہ کونے کھدروں میں بسنے لگے۔

دو مزید رائفل بردار وہاں پہنچ گئے۔ رائفلوں کا رخ میری طرف ہی تھا۔ ایک نے رائفل کی نال سے دھاری دار چادر میرے چہرے سے ہٹائی۔ دوسرے نے کڑک کر کہا۔ ”ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

میں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ جو رائفل میری بائیں بغل کے نیچے لگی ہوئی تھی اس نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ اس رائفل کی موجودگی میں مزاحمت کرنا خودکشی کے برابر تھا۔ اس کے باوجود میں موقع کی تلاش میں تھا۔..... یہ موقع مجھے تب ہی مل سکتا تھا جب وہ جذبہ پا ہو کر مجھ سے مار پیٹ کی کوشش کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا ہاتھ اتار لیا گیا اور مجھے ایک راہداری سے گزار کر ایک لاک اپ نما جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ یہ جگہ سرکاری رنگ کے پتھروں کو تراش خراش کر بنائی گئی تھی یا پھر خود ہی وجود میں آگئی تھی۔ اس لاک اپ یا کوٹھڑی کی ایک جانب لوہے کی موٹی موٹی زنجیر آلود سلاخیں تھیں۔ نیچے چاول کی چھال بھی ہوئی تھی۔ کونے میں دو تین بویدہ بیل اور میلے نیلے کتے رکھے تھے۔ مجھے لاک اپ میں دھکیلنے کے بعد دروازے کو ایک

ان کو پورا پورا اطمینان نہ کر دیا تو نام نہیں۔

”مگ... کیا کریں گے آپ؟“

”وہی جو پہلے کرتا آیا ہوں۔ جادو ٹوٹا.... تم سے کہا ہے تاکہ تمہاری صورت میں میرے پاس ایک جادو ٹوٹا ہے، جو بڑی سے بڑی مصیبت کو دھواں بنا کر اڑا سکتا ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“ وہ دہانسی ہو گئی۔

”لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں پہنچے۔ اس کا مطلب ہے کہ چاچا رزاق ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی تک ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی طرف سے ہی کوئی مدد آجائے اور اگر نہ بھی آئی تو کچھ نہ کچھ ہم ضرور کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے، اور اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔“

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ویسے جو میں کہہ رہا تھا، وہ حقیقت تھی۔ فی الوقت میں بالکل نہتا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کوئی مشکل پڑی تو مجھے کس طرح اپنا اور تاجور کا دفاع کرنا ہے۔ لیکن ایک بات کا مجھے پکا یقین تھا اگر کوئی ایسی صورت ہوئی کہ یہ لوگ ہم پر اور خاص طور سے تاجور پر ہاتھ ڈالتے اور وہ خطرے میں ہوتی تو میں کچھ نہ کچھ ضرور کر کرتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے وہ کسی آفت سے دوچار ہوتی۔ اچانک مجھے نوری کا خیال آیا، میں نے پوچھا۔ ”نوری کہاں ہے؟“

تاجور نے کہا۔ ”وہ شاید وقتی طور پر توجہ گئی ہے۔ اسے اس کے علاقے کی کوئی عورت ملی تھی۔ اس کے ساتھ پاس کے کسی گاؤں تک گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رات بھی وہیں رہے۔“

کوئی آدھ گھنٹے بعد سرخ آنکھوں والا اگر انڈیل ملنگ اپنے لیے بالوں کو جھلٹاتا ہوا آہنی سلاخوں کے سامنے نمودار ہوا۔ ایک راضل بردار کبل پوش اس کے عقب میں تھا۔ ملنگ نے خوشخوار نظروں سے مجھے گھورا اور پھنکا را۔ ”تم جو کوئی بھی ہو لیکن اپنے لیے بڑی مشکل پیدا کر لی ہے تم نے۔ وہاں اوپر پڑھو میں پر تم نے دو بندوں کو زخمی کر کے باندھا ہے۔ ان میں سے ایک ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ اسے کچھ ہو گیا تو تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا جو اس لاہوری لوٹے کے ساتھ ہوا ہے۔“

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسی لڑکے کا حوالہ دے رہا ہے جس کے جسمانی اعضا میں نے ایک قریبی کمرے میں

بکھرے دیکھے تھے۔

”میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے دفاع میں کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اپنے دفاع میں ہی تم نے بشارت خان کو بچا لیا اور اپنے دفاع میں اس کے کپڑے پہن کر یہاں اندر کے حصے میں گھس آئے۔۔۔۔۔ زبردست۔۔۔۔۔ بہت اچھے۔۔۔۔۔ اب ذرا اپنے ”دفاع“ میں یہ بھی بتا دو کہ تمہارے دونوں ہنگوڑے ساھی کہاں ہوں گے اور کیسے پکڑے جاسکتے ہیں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”تم کہہ سکتے ہو۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور سلاخوں کے اندر سے میرا موبائل مجھے تھما دیا۔

”کیا کروں؟“

اس نے تاجور کی پروا کیے بغیر ایک تنگی گالی دی اور بولا۔ ”ان کو فون کرو اور یہاں بلاؤ ان کو۔ ورنہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا وہ نہ بتانے کے قابل ہے اور نہ سننے کے۔“

”فون ان کے پاس نہیں ہے۔ ہم دونوں کے پاس ہی تھا۔“

اس نے اچانک سلاخوں کے درمیان خلا میں بازو ڈال کر مجھے گھونسا مارنا چاہا۔ یہ اس کے بس کی بات تھی مگر میں نے جان بوجھ کر گھونسا کھایا تاکہ اس کا غصہ کچھ خفصا ہو۔

وہ کچھ دیر تک مجھ سے فون کرنے کے بارے میں تکرار کرتا رہا، پھر جھپٹ کر موبائل فون میرے ہاتھ سے لیا اور پاؤں پختا ہوا باہر نکل گیا۔

پریشان کن حالات کے باوجود مجھے ہموک محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ میں ان حالات کو پریشان کن سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کچھ دیر بعد ایک اخبار میں لپیٹ کر کھانا ہم تک پہنچایا گیا تو مجھے اس کی خوشبو اچھی لگی۔ یہ کھانا تندرستی روٹی اور بڑے گوشت کے کبابوں پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں چٹنی تھی۔ میرے بہت اصرار کے باوجود تاجور ایک لقمہ بھی نہیں لے سکی۔ میں نے تین چار کباب اس کے لیے رہنے دیے کہ شاید رات کو وہ کسی وقت ہموک محسوس کرے۔

رات سرد اور گرم تھی۔ بس دور کییں ڈھول بجتے اور چٹا کھڑکانے کی بدھم آواز سنائی دیتی تھی یا پھر کسی دھن ملنگوں کے کسی گروہ کا ترے ستانہ بلند ہوتا تھا کہ ٹھنڈی لٹی

لاک اپ کے باہر دو مسلح سپر ہیرا جو کس حالت میں موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک لائٹیں دے دی تھی، مگر کچھ دیر بعد میں نے تاجور کے کہنے پر اسے بجھا دیا تھا۔ روشنی میں ہمیں ہر وقت یہی لگتا تھا کہ سپر ہیرا ہمیں گھور رہے ہیں، تاریکی میں سکون کا احساس ہوا۔ ہم بوسیدہ کبل لینا نہیں چاہتے تھے مگر سردی کے سبب لینا پڑے۔ ہم اپنے درمیان تین چار فٹ کا فاصلہ رکھ کر لیٹ گئے۔ تاجور مسلسل یہ سوال کر رہی تھی کہ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے اور اگر نہ نکل سکے تو ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟

وہ سرگوشی میں بولی۔ ”شاہ زیب! آپ نے تو کہا تھا کہ ان لوگوں نے آپ کو اوپر نگر خانے کے قریب سے پکڑا ہے مگر وہ لال آنکھوں والا ملک کچھ اور کہہ رہا تھا۔“

”کیا کہہ رہا تھا؟“

”یہی کہ آپ خود نیچے اترے ہیں اور دو ملنگوں کو زخمی کر کے۔۔۔۔۔“

”کیوں کر رہا تھا۔ اس طرح کے کئی جھوٹ یہ لوگ بولیں گے۔ کیا تم ان پر بھی یقین کر لو گی۔“

”لیکن یہ کپڑے آپ نے کیسے پہنے؟“

”میں نے نہیں پہنے، انہوں نے پہنا ہے ہیں اور تم اپنے ننھے منے ذہن کو زیادہ تکلیف نہ دو۔ سوچنے کے لیے اور کرنے کے لیے میں جو موجود ہوں یہاں۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟“

وہ جذباتی لہجے میں بولی تو اس کی آواز بھر گئی۔ ”میرا دماغ یہی تو آپ کے کہنے پر اتنی دور چلی آئی ہوں۔“

”اور مجھے یقین ہے تاجور کہ۔۔۔ میں تمہارے بھروسے کو ٹخنے نہیں دوں گا بھی نہیں۔“

”مم۔۔۔۔۔ میرا دل بہت زیادہ دھوک رہا ہے۔“

”اس کو بجھاؤ کچھ ذرا آرام کرے۔۔۔۔۔ اور تم بھی سو جاؤ۔ میں ہوں نا جاننے کے لیے۔“

رات دھیرے دھیرے آگے کو سرکتی رہی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتی رہی۔ شاید اپنا دھیان بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سوچ بار بار اس دائرے میں گھوم رہی تھی کہ انیق اور چاچا رزاق کہاں گئے ہوں گے۔۔۔۔۔ اور یہ کہ اگر وہ جلد ملنگی ڈیرے سے نکل کر واپس کوئی نہ جانکی تو وہاں کیا صورت حال بنے گی؟

اچانک کہیں پاس ہی ایک سرسراہٹ سی سنائی دی۔

مانگا ہے

پھر ایک ”تیز بار یک چنگھاڑی“ خاموشی کا سینہ چرتی چلی گئی۔ میں ایک لمحہ میں پہچان گیا۔ یہ جیتے کی آواز تھی۔ تاجور جلدی سے میری طرف کھٹک آئی اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب جیتے کی تیز آواز دوسری مرتبہ ابھری۔ یہ شاید دوسرا چپا تھا۔

تاجور لرزاں آواز میں بولی۔ ”یہ کیا ہے شاہ زیب؟“

وہ اتنی پاس تھی کہ میں نے اس کی کمر کو تلی آمیز انداز میں تھپکا۔ ”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ کوئی جانور ہے شاید۔“

”کون سا جانور ہے یہ۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟“ وہ پھر ہلکائی۔

”جو بھی ہے تاجور۔۔۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں۔“

جیتے اب مسلسل چلا رہے تھے۔ شاید دوز آہیں میں لڑ رہے تھے یا پھر یہ زور بادہ کی اٹھیلیاں تھیں۔

تاجور نے سرگوشی کی۔ ”شاہ زیب! ایسی آواز تو۔۔۔۔۔ جیتوں کی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ میں نے چڑیا گھر میں ایک دو بار سنی ہے۔“

”شاید جیتے ہی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جس طرح کچھ لوگ رکھوالی کے لیے کتے وغیرہ رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ کچھ لوگ دوسرے جانور بھی رکھتے ہیں۔ یہاں پاس ہی ایک لکڑی کا مل ہے۔ میرا خیال ہے یہ جانور اس مل کی رکھوالی کے لیے رات کو چھوڑ دے جاتے ہوں گے۔ دن کے وقت تو ایسی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔“

چیتوں کی آوازیں تو کچھ دیر بعد ختم گئیں، لیکن تاجور کا خوف برقرار رہا۔ اس نے میرا بازو مسلسل اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے رکھا۔ اس کے ماتن میرے بازو کے بالائی حصے میں پھوست ہو رہے تھے۔ وہ اتنی قریب تھی کہ میں اس کی سانس کا لمس تک محسوس کر سکتا تھا۔

میں اس سے تسلی بخشی کے بول بول رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہو گیا۔ اس نے میرا بازو تھوچھوڑ دیا لیکن میرا اور اپنا درمیانی فاصلہ بڑھانے کی ہمت نہیں کی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں ہم تین دن پہلے کوئی سے روانہ ہوئے تھے۔ برقع کا زیریں حصہ ابھی تک اس کے جسم پر تھا لیکن بالائی حصہ ملنگیوں کی کھینچا تانی میں کہیں گر گیا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک مجھے اپنے بالکل قریب سنائی دے رہی تھی اور بدن کی جھک اپنی سب سے الگ پہچان رکھتی تھی۔ چند سال پہلے پیرس کے ایک نامور ترین

عطار سے میرا واسطہ پڑا تھا اس نے انڈر ورلڈ کے ایک بندے سے اپنی جان بچانے کے لیے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اسی سلسلے میں کچھ تحائف پیش کیے تھے۔ ان میں ایک نایاب پرفیوم بھی تھا۔ مجھ سمیت جس نے بھی اس فریوم کا تجربہ کیا، اسے بے مثال قرار دیا تھا لیکن مجھے وہ پرفیوم بھی اس قدرتی کنواری مہک کے سامنے بچہ مخصوص ہوتا تھا جو چاند گروہی کی اس اہلکار کے پیکر سے پھوٹی تھی۔ اس میں کبھی نمی، گیلے پتوں اور کھلے شکوفوں اور گندم کی بالیوں کی خوشبو بڑی گہنی گہنی۔

میں ایک بار پھر اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔ اس کا خوف کم کرنے کے لیے میں نے لائین پھر روشن کر دی اور بہت اصرار کر کے اسے دو کتاب کھلائے۔ اسی دوران میں راہداری کی طرف کچھ آٹھنیں بوعیں پھر کوشری کا آہنی دروازہ کھلا۔ ملک پھر براہروی آواز میں بول رہے تھے۔ پھر انہوں نے کسی کوٹھی گالی دی اور زوردار دھکے سے کوشری میں پھینک دیا۔ اندر آنے والا اوندھے منہ گرا، یہ چاچا رزاق تھے۔ میں نے لپک کر انہیں اٹھایا اور بٹھایا۔ ان کے ہونٹوں سے خون دس رہا تھا اور چہرے پر چوٹوں کے گہرے نشان تھے۔ چاچا کا پورا جسم خشک کھجور سے لٹھڑا ہوا تھا۔ چاچا کی میسا کھی۔ جی ہاں ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ کوشری سے باہر ایک ڈھکڑے ملک کے ہاتھ میں تھی۔ شاید اس ہاکی کوٹھی بٹھیا قرار دیا گیا تھا اور باہر ہی روک لیا گیا تھا۔



Benchmark.pk

”کیا مطلب تمہارا؟“

”میں نے بڑے عمار کرنا صاحب سے اجازت لے لی ہے۔ ہم اس لاک اپ سے باہر چلیں گے لیکن ٹھوڑی سی پابندی آپ کو سہتا پڑے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کے ہاتھ پست پر ہاتھیں گے۔ واپس آکر کھول دیں گے۔“

”کون کون جائے گا؟“

”آپ چلے جائیں اور ساتھ چاچا رزاق کو لے لیں۔“

”لیکن میں تاجور کو یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

”اس کے لیے بالکل فکر مند نہ ہوں۔ میں آپ کو پوری گارنٹی دیتا ہوں۔“ اس نے بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا۔

”نہیں، میں اس سلسلے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔“ میرا اچھی جی تھا۔

انٹق نے چند لمحوں وقف کے بعد کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے باہر جا کر کچھ دیر پہریداروں کے لیڈر سے کھس پھسری پھر واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ راضی ہو گئے ہیں۔ دوسری اچھی خبر یہی کہ صرف میرے ہاتھ پست پر چکرے چلنے والے تھے چاچا رزاق اور تاجور کو رعایت مل گئی تھی۔ انٹق وہاں بھی پہریداروں سے واپس لے آیا جس کے سہارے چاچا رزاق چلتے تھے۔

میرے ہاتھ پست کی طرف موڑ کر ان میں خاص طرح کی ہتھکڑیاں پہنائی گئیں۔ یہ لوہے کے بجائے توت یا کسی اور مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ پہریدار نے یہ کڑیاں کوٹھڑی میں پہنچائیں اور انٹق نے معذرت کے ساتھ مجھے پہنا دیں۔ اوپر گرم چادر کی بکلی مار لی تھی تاکہ عام لوگ میرے بندھے ہاتھ نہ دیکھ سکیں، ہم انٹق سمیت باہر نکل آئے۔ چار مسلح افراد کی معیت میں ہم کوٹھڑی سے نکلنے کے بعد ایک طویل راہداری میں سے گزرے۔ دو آہنی دروازوں میں سے گزرنے کے بعد چوکور شکل کے ایک وسیع جیمبر میں پہنچ گئے۔ چھت کوئی سات فٹ بلند تھی۔ میزمری پتھر کی دیواروں سے چٹا تھا کہ یہ قدرتی جگہ ہے۔ بس دو چار جگہ آہنی گرلیں اور شیشے وغیرہ لگا کر اسے ہال کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس میں حجرہ نما کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان حجرہ میں آرام دہ گدوں اور فرخندہ سمیت تقریباً تمام ضروریات زندگی نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف نہانے کے لیے وسیع تالاب تھا جس میں کسی گرم چشمے کا بھاپ دیتا ہوا پانی داخل ہوتا تھا۔ یہاں ہمیں کچھ ایسے مردو

کوٹھڑی میں بند کیا گیا تو دوسرے لفظوں میں آپ تینوں اس قتل سے باخبر ہو گئے۔“

”اور یہ حماقت کس نے کی؟“

”اسی۔۔۔۔۔ لال آنکھوں والے ملگ رنگا نے۔ اس بات پر اسے کافی ذلت بھی اٹھانی پڑی ہے۔“ انٹق نے کہا۔

میری نگاہوں میں وہی کل صبح والا منظر گھوم گیا۔ گرائڈ مل رنگا کھسٹ کر گئیں بند کیا گیا تھا اور بیرونی بھی مارے گئے تھے۔

انٹق بولا۔ ”اب ایک طرح سے ہم چاروں ہی اس قتل کے گواہ ہیں، اور ہماری وجہ سے قتل کے ذمے دار پھانسی کے پھندے تک پہنچ سکتے ہیں۔“

صورت حال کی گتینی کا احساس ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اور جو بات انٹق کہتا چاہ رہا تھا وہ بھی سمجھ میں آرہی تھی۔ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کا بیٹا یا بھائی یہاں ہولناک طریقے سے قتل ہوا تھا اور باہر کے لوگوں میں سے ہمارے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔

انٹق نے کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! برسوں رات تک تو یہی لگ رہا تھا کہ یہ لوگ ہم چاروں کو بھی مار کر نہیں کہیں گا۔ دین کے اور قیامت تک کسی کو ہمارا کھوج نہیں لگے گا۔ لیکن پھر پوچشیں بدلی۔ میں نے کوشش کی، اللہ نے بھی مدد کی اور حالات میں کچھ تبدیلی آئی۔ لیکن یہ تبدیلی کب تک رہے گی اس کا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ ہم کیا فیصلہ کرتے ہیں۔“

”کوئی شرط رکھی ہے انہوں نے؟“

”شرط نہیں تھی، شرٹا نکلا ہیں، اور بہت کڑی۔ لیکن اگر خشنہ دل سے سوچا جائے تو ہمیں جان کے فوری خطرے سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ مان لینا چاہیے بلکہ اگر سچی بات پوچھیں تو میں تو دی طور پر مان بھی چکا ہوں۔ اب آپ تینوں کا کیا فیصلہ ہوتا ہے یہ بتائیں۔“

”تم تجسٹ جڑ ہمارے ہو، مکمل کربات کرو انٹق۔“

انٹق نے ایک نظر تاجور کی طرف دیکھا، پھر آواز مزید جیسی کر کے کہا۔ ”ہمیں پردے والی سرکار کا مرید بن کر یہاں رہنا ہوگا۔ ایک خاص چادر دیوار میں، ہم وہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔“

”کب تک؟“ چاچا رزاق نے پوچھا۔

”اس سوال کا جواب ذرا سخت ہے۔ میں آپ کو بتانے کے بجائے کچھ دکھانا چاہوں گا۔“

رہی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم چاول کی چھال پر آئے سامنے بیٹھ گئے۔ انٹق کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کچھ نہایت اہم قسم کی اطلاعات ہیں۔ اس نے ٹھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ چوبیس گھنٹے پہلے تک ہم چاروں کی زندگیاں اتنے شدید خطرے میں تھیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اب بھی یہ خطرہ کم نہیں ہوا۔۔۔۔۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غلا ہوا ہے۔ کتنی دیر تک غلا رہتا ہے؟ یہ ہمارے رویے پر ہے۔“

”کیا رویہ؟“

”ہم چاروں کی بات باندھتے ہیں یا نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس ”نہیں“ کی گنجائش بہت کم ہے۔“ اس کی آواز گہرے ہو گئی۔

میں نے تاجور کی طرف دیکھا، اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ کوئی اور جگہ بھی نہیں تھی جہاں ہم بیٹھ کر بات کر سکتے۔ ہمارے لیے سب کچھ یہی کوٹھڑی تھی۔ سلاخوں کی دوسری جانب دونوں پہریدار حسب معمول موجود تھے اور عقابانی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جیسے اس بات کا اہم پیشہ موجود ہو کہ ہم دھواں بن کر یہاں سے اڑ جائیں گے۔ میں نے تاجور کو اشارہ کیا۔ وہ اس کیورتی کوٹھڑی کے آخری کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ انٹق نے کہا۔ ”پرسوں جب آپ ڈیرے کے اس خاص حصے میں آئے آپ نے کیا دیکھا؟“

میں نے بدقسمت لڑکے کے حصے بخرے ہونے والا واقعہ بیان کر دیا۔

وہ بولا۔ ”اس واقعے نے ڈیرے کے ملنگوں میں تھرملی چاڑھی ہے۔ اس لڑکے کا نام اسامہ تھا۔ وہ لاہور کے ایک بڑے پولیس آفسر کا بیٹا، یا شاید چھوٹا بھائی تھا۔ جس طرح ہم ریشی کے لیے یہاں آئے ہیں، وہ بھی کسی لڑکی کے لیے یہاں آتا تھا۔ ان ملنگوں نے اسے مار ڈالا ہے اور ہمارے لیے بدترین بات یہ ہوئی ہے کہ ہم اس قتل کے گواہ بن گئے ہیں۔“

”یہ بات تو بے شک ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اصل میں گواہ تو آپ ہی تھے اور وہ بھی اتفاقاً ہے۔ مگر اس کے بعد ان لوگوں سے حماقت ہوئی اور انہوں نے تاجور اور چاچا کو بھی گواہوں میں شامل کر دیا۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ جب آپ تینوں کو ایک ہی

اگلے روز صبح سویرے ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ ہم نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ تین چار پہریدار ایک شخص کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے تھے اور یہ کوئی اور نہیں دی لال انگارا آنکھوں والا ملنگ رنگا نا تھا۔ پتا نہیں کہ اس کا کیا قصور تھا۔ وہ تو ہمیں پکڑنے اور اس کوٹھڑی تک پہنچانے میں پیش تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہماری حیرت میں اضافہ ہو گیا، جب ہمیں کسی قریبی کمرے سے کراہنے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ اسی رنگا نا ملنگ کی آوازیں تھیں۔

”لگتا ہے کہ اسے چھڑی یا بید سے پینا جا رہا ہے۔“ چاچا رزاق نے کہا۔

”مگر کیوں؟“ تاجور نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

اس ”کیوں“ کا جواب ہمیں تب تو نہیں ملا، مگر اگلے روز دو پہر کو مل گیا۔ اگلے روز دو پہر تک کا وقت ہم نے جس شدید کشش اور فکر میں گزارا، وہ کچھ ہمیں ہی معلوم تھا۔ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا جیسے ہم ملنگی ڈیرے میں نہیں، کسی دور دراز جزیرے میں پھنس گئے ہیں اور وہاں ہر گھڑی انوکھے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ میرے لیے کوئی اور پریشانی تو اتنی اہم نہیں تھی مگر انٹق کے سلسلے میں، جس میں فکر مند تھا۔ اسے پکڑے گئے دونوں سے زیادہ ہو چکے تھے مگر اس کے بارے میں کچھ نہیں تھی جو پہریدار ہمیں اس کی بے کوٹھڑی میں کھانا پہنچا رہے تھے، میں نے ان سے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں سے چھڑکی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ اس دوران میں ایک موقع پر جب تاجور سوئی ہوئی تھی کلڑی کے پل کی جانب سے ایک بار پھر پالتو چیتوں کی کڑھ خیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے چاچا رزاق کو اس بارے میں بتایا۔ یہ موضوع چھڑا تو پھر اس خونی واقعے کا ذکر بھی ہوا جس میں ان جانوروں نے ایک جوان لڑکے کی جان لی تھی۔ چاچا ششدر رہ گئے۔

خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹا اور تیسرے روز دو پہر کے بعد ہمیں انٹق کی شکل نظر آئی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بہتر لباس میں تھا۔ اس نے سفید شلوار میں بن کر سیاہ رنگ کی گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی کھینچا تانی بھی نہیں ہوئی اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اسے ہمارے پاس اندر پہنچا دیا گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ اور ایک رخسار پر چوٹ کا نشان تھا۔ ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ میرے گلے لگ گیا۔ اس کے بعد چاچا رزاق سے ملا۔

ضعف خودکشی کا سوچنے لگے۔

انین نے کہا۔ ”چاچا! آپس ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو یہاں ہمارے دو بڑے ”جرم“ ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ہم لوگ کے کل کے گواہ بن چکے ہیں اور دوسرا یہ کہ ہم یہاں ایک نہایت غلط ارادے سے آئے تھے۔ کم از کم ان ملکوں کے نزدیک تو یہ نہایت غلط ہی ہے۔ ہم یہاں اس لیے پہنچے تھے کہ ریشمی کو یہاں سے نکال سکیں اور ریشمی اب ان لوگوں کے لیے بڑی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ ان دونوں جرائم کے باوجود اگر یہ لوگ ہماری جان بخشی کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو ہمیں شکر کرنا چاہیے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا، زندگی بچ گئی تو پھر آگے جا کر ہو سکتا ہے، کوئی بہتر راستہ بھی نکل آئے۔“

اچانک میں چونک گیا۔ آہنی کھڑکی کی دوسری جانب مجھے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک خوب صورت پالکی دکھائی دی۔ اس پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ پالکی یا ڈولی کی دونوں جانب دو دو طویل بانس تھے۔ ان بانسوں کو کم و بیش ڈیڑھ دو درجن لڑکیوں نے کندھوں کا سہارا دے رکھا تھا۔ یہ جواں سال لڑکیاں نیلے چوڑوں میں تھیں اور سروں پر چادریں تھیں۔ تقریباً سبھی لڑکیوں کے گلے میں لکڑی کے موٹے دانوں کی مالا میں نظر آ رہی تھیں۔ پالکی کے بوجھ سے لڑکیوں کے جسم شاخوں کی طرح لپک رہے تھے۔

انہوں نے جھک کر پالکی ایک آبیٹار کے قریب رکھی۔ پردے اٹھے اور ایک طویل قامت شخص باہر نکل آیا۔ وہ سر تا پا ایک کامدار سفید لباس میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک چمکی سفید چادر کا طویل گھونٹ تھا۔ اس کے ارد گرد موجود لڑکیاں بالکل منسوب کھڑی تھیں۔ ہم نے پہچان لیا۔ وہ یہی پردے والی سرکاری۔ پھر پالکی میں سے ایک اور سواری برآمد ہوئی۔ یہ لڑکی تھی۔ وہ ٹخنوں تک جاتے ہوئے ایک نیلے سکلی لباس میں تھی۔ پالکی سے اترتے ہوئے اس کا کامدار اچانک ایک کھلے کے لیے اس کے سر سے ڈھلکا۔ وہ خوش شکل تھی۔ چاچا رزاق میرے پہلو میں کھڑے تھے۔ وہ بے ساختہ کرناک انداز میں چلائے۔ ”ریشمی.... ریشمی.... میری بچی۔“

یہ سب کچھ دو چار سیکنڈ کے اندر ہی ہو گیا تھا۔ قریب کھڑے ایک پیریدار نے لپک کر چاچا رزاق کو دو بوجھ لیا اور ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے پیریدار نے پھرتی سے کھڑکی کے طویل پٹ بند کر دیے۔ کھڑکی سے پالکی کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ یقیناً چاچا رزاق کی پکار اس کی نیٹی

”تو تم یہاں نہیں..... اوپر دہاں رہو گے؟“ چاچا رزاق نے جیسے ہوئے آزرہ لکھے میں کہا۔

”ہاں چاچا! عارضی طور پر تو یہی انتظام ہو رہا ہے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں تاکہ اگر زندگی بچ گئی تو ہم بعد میں کسی ”دقت“ ”ایچھے“ کی امید بھی کر سکتے ہیں۔ باقی یہاں سے نکلنے والی بات ابھی دماغ سے نکال دیں۔ میں نے پچھلے دو تین دن میں یہاں بہت کچھ سمجھا ہے۔ آپ بھی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہاں اس جیمبر میں بھی آپ کو کوئی دقت نہیں ہونے والی۔ آپ کی ضرورت پوری ہوگی۔ گاہے بگاہے آپ ریشمی سے بھی مل سکیں گے۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ کے لیے بھی کسی طرح کا کوئی پرالیم نہیں ہوگا شاہ زیب بھائی۔ وہ بندہ بشارت بھی ہوش میں آگیا ہے جو آپ کی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے کرناٹی صاحب سے اس سلسلے میں خاص طور سے بات کی ہے۔ آپ کو ان دو بندوں کی وجہ سے کسی طرح کی پوچھ کچھ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تاجور کے سلسلے میں بھی آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ وہ آپ کے ساتھ آپ کی آنکھوں کے سامنے یہاں رہے گی۔ چاہے تو وہ چاچا رزاق کے ساتھ رہ سکتی ہے اور اگر..... چاہے تو اسے آپ کے ساتھ رہنے کی اجازت بھی مل سکتی ہے۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے انین کا لبہ متنی خیز ہو گیا۔

چاچا رزاق نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم سب کے پیچھے ہمارے گھر والے ہیں۔ اب تاجور بیٹا کوئی لو۔ دین محمد اور اس کی گھر والی چند دن بھی اس کے بغیر نہیں نکال سکتے اور.....“

”چاچا! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ انین نے ذرا سختی سے چاچا کا جملہ کاٹا۔ ”یہاں کچھ بھی ہماری مرضی سے نہیں ہو رہا۔ یہ ہمیں کرنا پڑ رہا ہے اور کرنا پڑے گا۔ خدا کا شکر کرو کہ جانیں بچانے کے لیے ایک راستہ نکل رہا ہے ہمارے لیے.....“

”اس سے تو نہ بچیں جانیں۔ مارویں یہ لوگ ہمیں۔ ہمارا قصور ہے تو کر دیں ہمیں ذبح۔“ چاچا رزاق کے لہجے میں شدید تپش تھی۔

میں نے ایک بار پھر چاچا کو آہستہ بولنے کے لیے کہا۔ مجھے لگتا تھا کہ ریشمی کے حوالے سے پے در پے مصلحوں کے بعد اب چاچا رزاق زندگی سے عاجز آتے جا رہے ہیں۔ جیسے طویل بیماری سے تنگ آ کر کوئی بھلا مانس

وہ مجھے مجھے سے لہجے میں بولا۔ ”اس کا جواب دینی ہے جو آپ کے ذہن میں بھی آ رہا ہے۔ ان کو ایسا کر دیا گیا ہے۔“

”یعنی..... ٹانگ کا نقص جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ انین نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں سانٹے میں تھا۔ چاچا رزاق کا رنگ بھی مزید پیکا پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے..... کہ اگر ہم یہاں رہتے ہیں تو..... ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو گا؟“

”میں ابھی اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بڑے مجاور آپ کو رعایت دینے پر تیار ہو جائیں۔“

”آپ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”یعنی آپ تینوں کو۔“

”کیا مطلب ہے انین۔ کیا تمہارا معاملہ الگ سے ہے؟“

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”ابھی تو الگ سے ہی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ سے بھی کچھ رعایتیں ہو جائیں اور آپ کو وہاں اوپر ”سانے“ میں جگہ دے دی جائے۔“

”سایہ؟ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

انین میں چند قدم چلا کر اس جیمبر کی بڑی بڑی آہنی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی کے پاس لے آیا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ دوسری جانب ایک سرسبز ڈھلوان پر بڑی خوب صورت جگہ نظر آ رہی تھی۔ یہاں کھلا آسمان تھا۔ پھول پودے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دو تین آبیٹار دکھائی دے رہے تھے۔ پھل دار درختوں کے نیچے لکڑی اور پتھروں کے خوب صورت گھر بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں میں برقی روشنی نظر آ رہی تھی جو یقیناً جزیر بڑی مدد سے حاصل کی گئی تھی۔ غالباً وہاں کی وی اور فرنیچ جیسی سہولتیں بھی موجود تھیں۔ مرد و زن وہاں آزادانہ پھر رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو ایک دو ایسی شخصیں بھی نظر آئیں جو ادھر ادھر پر مست ٹانگ تھیں۔ وہاں ان لوگوں نے پھنپھنے پرانے کپڑے

اڑھ رکھے تھے مگر یہاں بڑے آرام وہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چند بچے بھی ہنستے کھیلتے دکھائی دیے۔

انین بولا۔ ”اس جگہ کو یہاں سایہ کہتے ہیں۔ یعنی یہ جگہ پردے والی سرکار کے قریب ان کے سامنے میں ہے۔“

زن نظر آئے جنہوں نے اچھے قیمتی لباس پہن رکھے تھے لیکن ایک تعجب خیز بات تھی، وہ سب کے سب لنگڑا کر چل رہے تھے۔ ہر ایک کی بائیں ٹانگ میں ہلکا سا لنگ موجود تھا۔ یہ لوگ یہاں کھائی رہے تھے۔ کچھ عبادت میں مصروف تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں ہی تھیں، تاجور ایک دم کم ہی گئی۔ چاچا رزاق بھی حیرت زدہ نظر آنے لگے ”میرا سر چل رہا ہے۔“ تاجور کراہی۔

ہم نے اسے تالاب کے کنارے ایک آرام دہ گلدے پر بٹھا دیا۔ انین نے اسے پانی پلایا۔ وہ ستون سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے زرد چہرے پر سوال ہی سوال تھے۔ میں انین اور چاچا رزاق تو ڈھڑے فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ”یہ سب کیا ہے انین؟“

وہ غمگین ہوئے لہجے میں بولا۔ ”شاہ زیب بھائی! کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ان خطرناک لوگوں سے اپنی زندگی بچانے کے لیے ہمیں اپنی آزادی کھونا پڑے گی۔ ہمیں یہیں رہنا پڑے گا۔“

”اس جیل میں؟“

”ہاں، اب سب کچھ آپ کے سامنے ہی ہے۔ بے شک ہے تو یہ جیل ہی لیکن بہت آرام دہ۔ زندگی کی ہر سہولت ہمیں یہاں ملے گی۔“

”کب تک رہنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ اس سوال کا جواب ذرا سخت ہے۔ اب آپ خود ہی سمجھ لیں، مگر یہ بھی ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں کوئی تبدیلی آجائے۔“

”..... تم کسی باتیں کر رہے ہو۔“ چاچا رزاق جھٹکا کر بولے۔ ”تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہمیں یہاں بند کر دیا جائے گا؟“

”چند ہفتوں کے لیے یا پھر چند سالوں کے لیے؟“ آخری الفاظ کہتے کہتے ان کی آواز بیٹھ گئی۔

”فی الحال تو زندگی بچانے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔“ انین نے مجھ پر لہجے میں جواب دیا۔

”ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم نے کیا گناہ کیا ہے؟“ چاچا کی آواز بلند ہو گئی۔

میں نے انہیں وہی آواز میں بولنے کو کہا کیونکہ چند قدم دور کھڑے پیریدار چونک کر ہمیں دیکھنے لگے تھے۔

میرے ذہن میں ایک سوالی بری طرح کھل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہاں سارے لوگ لنگڑا کر چل رہے ہیں۔ یہ کیوں؟“



سلیقہ شعار

بابر نسیم

سلیقہ شعاری اور صفائی پسندی پر عورت کی فطرت کا خاصہ نہیں ہوتی... بعض عورتیں حد درجہ بے ترتیب اور بھوپڑ ہوتی ہیں... مگر اس عورت میں سلیقہ شعاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے گھر کا ہر کونا چمک رہا تھا... دمک رہا تھا... مگر اچانک ہی اس کے سادہ و خوب صورت سے گھر میں بھونچال سا آگیا...

سلیقہ شعار بوی کے نقش قدم پر چلنے والے شوہر کی قاش غلطی کا غیازہ...

خاتون کا کوچ کے سامنے فرش پر ہاتھ پیر پھیلائے پڑی ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔
سراغ رساں کیچی کا سامنی لیسن ایک ڈیجیٹل کیرے سے لاش کی مختلف زاویوں سے تصویریں اتار رہا تھا۔

”یہ میری بیوی لوٹل ہے۔“ ہیری کنگ نے بتایا۔ ”کسی نے زبردستی گھر میں کس کرا سے قتل کر دیا

لیونگ روم کے وسط میں کھڑی سراغ رساں کیتھی نے ستائشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کرا یا لکل بے داغ تھا۔ تمام فرنیچر اپنی اپنی جگہ اور درست طریقے سے رکھا ہوا تھا۔ کہیں بھی ریت یا گرد کی کوئی جھلک تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ فرش پر بچھا ہوا قالین بھی تازہ و یکسوم کیا ہوا تھا۔ کمرے میں روم فرنیچر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس صفائی ستھرائی اور سلیقہ شعاری کی ذمے دار

تک یا دیگر لوگوں تک نہیں پہنچی تھی۔
چاچا نے تڑپ کر اپنے ہونٹوں کو پہریدار کی مضبوط گرفت سے آزاد کرایا اور ایک بار پھر سینے کی پوری قوت سے پکارے۔ ”ریشمی... ریشمی...“ ان کی آواز میں وہی کرب تھا جو ایک ایسے بد نصیب باپ کی آواز میں ہو سکتا ہے جس نے ایک طویل عرصے بعد اپنی گمشدہ جوان بیٹی کو دیکھا ہو۔ پہریدار نے چاچا رزاق کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ ڈمک کر گرے۔ گرتے ہوئے ان کی ہاکی گھوم کر پہریدار کے منہ پر لگی۔ وہ جیسے بہتا تھا۔ اس کے منہ سے گندی گالیاں، بے ساختہ ایک بوچھاڑ کی طرح نکلیں اور وہ چاچا رزاق پر پل پڑا۔ یہ نظارہ تکلیف دہ تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن ٹانگیں تو آزاد تھیں اور میں ان ٹانگوں سے ہی ان ڈشکرے پہریداروں میں سے دو چار کی پٹیاں توڑ سکتا تھا۔ میری بھر پور خوراک پہریدار کے جڑے پر لگی اور وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر میری جانب دیکھا جیسے مجھ سے ایسی جرأت کی توقع اس نے نہ کی ہو۔ پھر وہ چٹھا ڈکر میری طرف آیا۔ اس بار میں نے ایڑی سے اس کی ناف کو نشانہ بنایا اور وہ دہرا ہو کر چاچا رزاق کے پہلو میں گرا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ دوسرے پہریدار نے عقب سے میرے سر پر رائفل کے دسے کا وار کیا، وہ میری بے خبری میں مجھے چوٹ لگاتا چاہتا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ روشنی اس کے عقب میں تھی اور سامنے دیوار پر اس کا سایہ بڑی وضاحت سے پڑ رہا تھا۔ میں نے جھک کر یہ وار بے آسانی بچایا اور اس کے سینے پر سر کے عقبی حصے سے ضرب لگائی۔ وہ گر بناک آواز کے ساتھ پشت کے بل گرم پانی کے حوض میں گرا۔ اس سے پہلے کہ پہلا پہریدار پھر مجھ پر چھپتا کئی دیگر ”ملنگ پہریدار“ اندر آگئے اور انہوں نے لڑنے والے دونوں پہریداروں کو سنبھال لیا۔ اس سلسلے میں اتنی نے بھی کردار ادا کیا اور اس لڑائی کو بڑھنے سے روک لیا۔ اس نے گرے ہوئے چاچا رزاق کو سہارا دے کر اٹھایا اور ان کے ہونٹوں سے بچنے والے خون کو روکد جاؤں کی سفید داڑھی کو بھی رنگین کر چکا تھا۔ تاجور پتھر کا بت کی کھڑی تھی۔ پیش میں آنے والے دونوں پہریداروں کو ان کے سامنی باہر لے گئے تھے۔ تاہم ان میں سے ایک دوا لیے بھی تھے جو خونی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

☆☆☆

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

ایک ایسا خاص نمبر جسے آپ جلد کرنا کریں گے

سرگزشت

پراسرار نمبر

شمارہ جنوری 2016ء

کی جھلکیاں

تاریک بین

روس کے اس پراسرار شخص کا تذکرہ جس نے پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا تھا

پردہ اسرار

کراچی کی اس شخصیت کا زندگی نامہ جس نے لاکھوں افرو کی زندگی بدل دی

خبردار

پاکستان کے ان مشہور مقامات کا تذکرہ جہاں آسب کا میرا ہے

زومبی

زندہ لاشوں کے حملے سے نمٹنے کے لیے امریکا کے خصوصی فوجی دستے

چھوٹا سا کام

ایک دلچسپ مگر پراسراریت بھری جج بیانی

ایک ایسا خاص نمبر جسے آپ جلد کرنا کریں گے

اوپر بھی بہت کچھ، ایسے لاشیں قصبے، سچ واقعات جن کو عقل کی کسوٹی پر پکھنا بہت مشکل ہے

ایک ایسا خاص نمبر جسے آپ جلد کرنا کریں گے

جاسوسی ڈائجسٹ 146 جنوری 2016ء

www.pdfbooksfree.pk

کنگ کی چٹون تکی ہوئی کرسی کی پشت پر رکھی ہوئی تھی اور جوتے بھی نیچے دکھائی دے رہے تھے۔ اس بے داغ کمرے میں بس بیسی دو چیزیں اپنی مقررہ جگہوں سے الگ رکھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

کمرے میں موجود الماری کا پٹ بھی قدرے کھلا ہوا تھا اور اس میں تمام کپڑے پیچنگ فیکٹری میں قرینے سے اور قطار میں لٹکے ہوئے تھے۔

کیٹھی نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ وہ چادر اور کپیل جو ہیری کنگ نے سوتے وقت اوڑھے ہوئے تھے اور جنہیں اس نے غلت میں اتار کر بے ترتیبی سے پھینکا ہوا تھا جبکہ کنگ سائز بیڈ بالکل صاف ستھرا اور قرینے سے بچھا ہوا تھا۔

”کیا اپنی بیوی کی لاش دریافت کرنے کے بعد تم واپس یہاں آئے تھے؟“ کیٹھی نے سوال کیا۔

ہیری کنگ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں، یقیناً نہیں۔ میں تم لوگوں کے آنے تک اسی کے پاس رہتا چاہتا تھا اور وہیں رکارتا۔“

کیٹھی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ پھر اپنے ساتھی کسٹن کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف لے گئی۔

”یہاں کوئی زبردستی نہیں کھسکتا۔“ کیٹھی نے کسٹن سے آہستگی سے کہا۔

”تم یہ بات کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

”اس لیے کہ ہیری کنگ کا کہنا ہے کہ لاش دریافت کرنے کے بعد وہ یہاں ہیڈروم میں واپس نہیں آیا تھا لیکن اس نے ابھی بھی اپنی ہاتھ روپ اور بیروں میں موزے پہنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنی بیوی کی چیخ سن کر سوتے سے بیدار ہوا تھا اور بقول اس کے فوراً ہی دوڑتا ہوا نیچے آ گیا تھا تو پھر بھلا اسے اپنی ہاتھ روپ اور موزے پہننے کا موقع کب ملا ہوگا؟ کیا سوتے ہوئے کوئی ہاتھ روپ اور موزے پہننے رہتا ہے؟“

یہ کہہ کر کیٹھی واپس ہیری کنگ کی جانب بڑھ گئی اور اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میں تمہیں اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں حراست میں لے رہی ہوں۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم خاموشی اختیار کیے رہو۔“

ہیری کنگ بھونچکا رہ گیا۔

تب کسٹن نے آگے بڑھ کر ہیری کنگ کے ہاتھوں میں پھنکڑی پہنا دی۔



وائٹ ہاؤس

جمال دستی

رنگ و نسل کی تفریق نے انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے... اپنے وطن سے دور زندگی کے روز و شب گزارنے والے ایک شریف النفس لکھاری کا ماجرا... حالات و واقعات نے سراغ رساں بنادیا۔

ایک شہر میں اچانک ہی اس کا ساتھ ایک لاش سے پڑ گیا تھا

”اس کا نام... اس کا نام... جو ظلم میں ہے...“

وہی نام ہے جو... جو ظلم وائٹ ہاؤس میں ہے... اور پھر اس نے میری ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔

اس کا نام الفانسو اور وڈو تھا اور وہ ایک میکسین تھا۔

لیکن وہ ایک عرصے سے یہاں ایسٹریڈیم میں رہ رہا تھا۔

میں اسے زیادہ اچھے طریقے سے نہیں جانتا تھا۔ وہ کبھی بھار

کسی کہانی کے لیے مجھے کرنا گرم مواد فروخت کر دیا کرتا تھا

اور اس کے عوض وہ مجھ سے شراب کے پیسے لے لیتا تھا۔ وہ

جاسوسی ڈائجسٹ 147 جنوری 2016ء

شراب کا رسیا تھا۔

گزشتہ تین برسوں کے دوران اسے صرف تین بار ہی میرے کمرے میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔

میں نے آرام سے اس کا سر قالین پر رکھ دیا۔ میرے کمرے کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ مجھے بال تک پہنچنے میں صرف چند قدم اٹھانا پڑے۔ اسی فلور پر موجود باقی پانچوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ یہ بال امریکن واک ان الماری جتنا چھوٹا تھا۔

میرے کمرے کے بچ رنگ کے قالین پر تازہ چمکدار خون پھیلا ہوا تھا۔ الفانسو کے زخم سے اس وقت بھی خون ابل رہا تھا جب اس کی موت واقع ہوئی۔ اسے جس کسی نے بھی چاقو گھونپا تھا وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔

ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے جب اس نے میرا دروازہ زور زور سے ہلایا تھا اور جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ میرے بازوؤں میں گر پڑا تھا۔ لفٹ کی انڈیکس لائٹ بتا رہی تھی کہ لفٹ پہلی منزل پر تھی۔ یہ ایک سست رفتار لفٹ تھی اور میں پانچویں منزل پر تھا جو کہ سب سے اوپر کی فلور تھا۔ میں دوڑتا، خون پر چھلانگیں لگا کر چپتا ہوا زینے تک پہنچا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔

زینہ صرف ایک رخ پر اور پیچھے کو جاتا تھا۔ مجھے کچھ سنا ہی نہیں دیا۔ زینے پر قالین نہیں تھا اس لیے اگر کوئی سیزہیاں اترتا تو اس کے قدموں کی آواز ضرور سنا دیتی تھی۔ میں سیزہیاں پھلانگتا ایک منزل نیچے پہنچا اور دروازہ کھول کر ہال میں داخل ہو گیا۔ یہ ہال بھی ہماری اوپر کی منزل کے ہال سے مشابہ تھا۔ بس یہاں خون دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ ہی یہاں کوئی شخص نظر آ رہا تھا۔ پھر میں تیزی سے سیزہیاں اتر کر سب سے چلی منزل پر جا پہنچا اور چھوٹی سی لابی کا دروازہ کھول کر وہاں داخل ہو گیا۔

کاؤنٹر پر سنہری بالوں والی ایک دلکش لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر پچیس پچیس سال رہی ہوگی۔ مجھے چونکہ نام یاد رکھنے کی عادت تھی اس لیے میں اس کا نام لے کر اس سے مخاطب ہوا۔ ”جولی، گزشتہ پانچ منٹ میں کیا کوئی یہاں آیا تھا؟“

”نہیں مسٹر وائٹ“ جولی نے جواب دیا۔ ایسٹروڈیم میں ہر شخص کی طرح جولی بھی بیشتر امریکیوں کے مقابلے میں بہتر انگریزی بولتی تھی۔

”پولیس کو فون کرو۔“ میں نے کہا۔ ”ایک قتل ہو گیا ہے۔“

جولی نے بے ساختہ قبضہ لگایا۔ پھر اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات اٹھ آئے۔ اسے یہ احساس ہونے میں کچھ وقت لگا کہ میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ ”کیا آپ سنجیدہ ہیں، مسٹر وائٹ؟“ اس نے کہا۔

”پولیس کو فون کرو۔“ میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“

میری گرل فرینڈ میریلن کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ چھوٹے سے ڈبل بیڈ پر ٹانگیں کینڑے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اس حد تک پیکا پڑ چکا تھا کہ مجھے خوف آ گیا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ خون پر میرا پاؤں نہ پڑے۔ میں خون سے بچتا بچتا باہر روم میں چلا گیا اور ایک چھوٹے تو لیے کو پانی سے جھگو دیا پھر میں بیڈ پر میریلن کے پاس چلا گیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر نیلے تو لیے سے اس کا منہ پوچھنے لگا۔ میں نے سنا تھا کہ اگر کسی فرد کو صدمہ پہنچے تو اس کے ساتھ یہی کرنا چاہیے۔ لیکن مجھے اس بات کا کوئی ذوقی تجربہ نہیں تھا کیونکہ میرے ساتھ کسی قسم کا کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس وقت مجھے سب سے بہتر یہی بچائی دیا تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری کہ میرے کانوں میں پوربین سائزن کی باریک جھپتی ہوئی آواز آنے لگی۔ یہ امریکن پولیس کار کے سریلے سائزن کی آواز نہیں تھی جو یہاں بھی نہیں سنا دیتی تھی۔

پولیس مین نہایت عمدہ انگلش بول رہا تھا۔ اس نے ایک سستا بڑس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جب اس نے الفانسو کی لاش دیکھی تو اس کا چہرہ بھی اتنا ہی پیکا پڑ گیا جیسا میریلن کا چہرہ پڑا تھا۔ میں نے اسے ہم دونوں کے پاسپورٹ دیتے ہوئے وہ تھوڑا بہت بتا دیا جو مجھے معلوم تھا۔ اس نے زیادہ سوالات نہیں پوچھے۔ اس نے اپنے سکل فون پر چند جملے کہے، اس آفس نوٹک واک پر محضرت کی اور اپنی پشت پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی باختیار انفرسی آڈکاء انتظار کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کسی بھی پولیس مین نے ایسی کوئی بات نہیں کی جیسا کہ وہ فلموں میں کہا کرتے ہیں۔ نہ ہی انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ ہم شہر چھوڑ کر نہیں جاسکتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ سوال کیا کہ ہم یہاں ایسٹروڈیم میں کیا کر رہے ہیں یا یہ کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا جواز تھا کہ ہم الفانسو کو قتل کرنا چاہتے تھے! میرا پورا لباس خون آلودہ تھا۔ لیکن اگر وہ مجھ پر قتل کا شبہ کر رہے تھے تو انہوں نے اس کا بالکل بھی اظہار نہیں کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایئر نیٹیل ہیرالڈز ریون اخبار کا

ایک رپورٹر ہوں۔ میں نے انہیں الفانسو کے بارے میں بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو میں جانتا تھا اور جو زیادہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ میں قاتل کی تلاش میں کس طرح دوڑتا ہوا ہال میں گیا تھا، کس طرح سیزہیاں پھلانگ کر نیچے پہنچا تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ ظاہری حالات سے یہی لگتا ہے کہ قاتل ابھی اسی ہوکل میں موجود ہے اور غالباً یہاں کسی کمرے میں مقیم ہے اور غالباً اسی فلور کے کسی ایک کمرے میں موجود ہونا چاہیے۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے رہے جیسے میری بصیرت کی داد دے رہے ہوں۔ لیکن انہوں نے زیادہ بات نہیں کی۔

میں نے انہیں الفانسو کے آخری الفاظ بتا دیے۔ تب انہوں نے قدرے دلچسپی ظاہر کی۔ ”کیا الفانسو سنیٹا کا زیادہ رسیا تھا؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ ہم نے بھی فلموں کے بارے میں باتیں نہیں کی تھیں۔ وہ اپنی بیشتر باتیں پینے پلانے میں گزارتا تھا۔“

”کیا تمہیں کسی ایسی امریکن فلم کے بارے میں معلومات ہیں جس کا نام وائٹ ہاؤس ہو؟“

”نہیں۔ میرے خیال میں تو اس نام کی کوئی فلم نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق وائٹ ہاؤس کے بارے میں جو واقعہ فلمی ہے اس کا نام انڈی پینڈیشن ڈسے تھا جس میں وائٹ ہاؤس کاؤڈا دیا جاتا ہے۔“

اس حوالے پر کوئی بھی امریکی ہوتا تو وہ مسکرا دیتا۔ لیکن اس پولیس انفرسی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ولندیزی چیزوں کو بھک سے اڑانے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

☆ ☆ ☆

پولیس مین جا چکے تھے۔ وہ لاش کو بھی لے گئے تھے۔ البیہ خون ابھی بھی میرے قالین پر موجود تھا اور میں اپنا خون آلودہ لباس اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ میں اپنے مکمل لباس میں... شاور کے نیچے چلا گیا اور ٹھنڈے پانی کا فوارہ کھول دیا۔

مجھے تکلیف کا احساس کم ہونے لگا۔ میں اپنے خون میں بیٹھے ہوئے کپڑوں کو ایک ایک کر کے اتارتا رہا۔ میں انہیں اس وقت تک پانی میں پھونکنا کہ پانی کی گلابی رنگت صاف نہیں ہوگئی۔ میں نے اپنے جوتوں پر سے بھی خون دھونے کی کوشش کی لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ برباد نہ ہو جائیں۔ میرے پاس جوتوں کا وہی اٹکوتا جوتا تھا۔

پھر جب میں نے جہاں تک ہو سکتا تھا، خون کے

وائٹ ہاؤس

دھبوں سے نجات حاصل کر لی تو پھر گرم پانی کا فوارہ بھی کھول دیا اور اسٹیم ہاتھ لینے لگا۔ پھر چند منٹ بعد میریلن بھی فوارے کے نیچے آگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کی خاطر آپس میں کچھ ہر تک جمنے رہے۔ باہر روم کے فرش پر ہر طرف پانی ہی پانی ہو رہا تھا اور پھر جلد ہی گرم پانی ختم ہو گیا۔ تب مجھے اپنے امریکن موٹیو یاد آ گئے جہاں بڑے بڑے سائز کے نرم رومیں دار تو لیے اور لاہو دھو کر گرم پانی ہوا کرتا ہے اور ان کی قیمت بھی اس کرائے سے کم ہوتی ہے جو میں اس ہوکل کے اس چھوٹے سے کمرے کی ادا کر رہا تھا۔

پولیس آئل لک کے لیے میرے کمرے کی تلاشی لے چکی تھی۔ انہوں نے پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ انہیں کوئی بھی چیز نہیں ملی تھی۔

☆ ☆ ☆

شاور لینے کے بعد میں نے اپنا نصف لباس پہن لیا۔ تب اس کہانی کو قلمبند کرنے کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں کرائم رپورٹر تو نہیں ہوں۔

کالج سے فراغت کے بعد میں یورپ چلا آیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں امریکا سے دور رہنا چاہتا تھا۔ میں سیاہ فام ہوں لیکن میری پیدائش پر ایک سفید فام جوڑنے نے مجھے گولے لیا تھا۔ اتفاق سے میرے والدین کا نام بھی وائٹ تھا۔ انہوں نے میرا نام میکلم وائٹ رکھ دیا تھا۔

”یہ نام میکلم ایس کے نام پر رکھا گیا ہے؟“ ہر کوئی مجھ سے یہی پوچھتا تھا لیکن میری اور ڈیڈی نے یہ نام رکھنے کی وجہ بھی نہیں بتائی تھی۔

بہر حال امریکا میں سیاہ فام یا سفید فام ہر کوئی میری جلد کی رنگت کے بارے میں طفر کیا کرتا تھا۔ میرے لیے یہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ البیہ ایسٹروڈیم اس معاملے میں فکر بلائو تھا۔ یہاں رنگ اور نسل کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ یہ شہر اسی لیے مجھے پسند تھا۔

کالج کے زمانے کا میرا ایک پرانا دوست ایئر نیٹیل ہیرالڈز ریون میں جونیئر ایڈیٹر تھا۔ اس نے مجھے اخبار میں کچھ لکھنے کے لیے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے بھی یہی خیال کیا کہ جب تک میں یہ فیمل نہیں کر لیتا کہ مجھے زندگی میں کیا کرنا ہے اس وقت تک اپنی گزراوقات کے لیے لکھنا لکھانا ایک اچھا ذریعہ آمدنی رہے گا اور یہ میں برس پہلے کی بات ہے۔

میں فچر زور انسانی دلچسپی کے مضامین تحریر کرتا ہوں۔ ان میں سے بیشتر سیاہوں کی دلچسپی کے لیے ہوتے ہیں۔ میں

نے اسٹار وارز کی آخری فلم کے بارے میں بھی چند کہانیاں لکھی تھیں۔ میں خود کو فلموں کا شوقین سمجھتا ہوں لیکن میں نے کبھی 'وائٹ ہاؤس' ناٹل کے نام کی کسی فلم کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ مجھے 'مرڈر ان دی وائٹ ہاؤس' نامی فلم تو یاد تھی لیکن بہت بعد میں جب میں نے انٹرنیٹ مووی ڈیٹا بیس پر دیکھا تو اس فلم کا نام 'مرڈر اینٹ 1600' تھا۔ یہ وائٹ ہاؤس کا چٹا ہے۔ 1600ء میں سلوانیا ایویو!

کیا 1600ء کا کوئی مطلب تھا؟ ہمارے اس فلور پر بنے ہوئے چھ کمروں کے نمبر 501 سے 506 تک تھے۔ میرا کمر الفٹ سے باہر نکلتے ہی داہنی جانب تھا۔ ان نمبروں کا بھی 1600ء سے کوئی ربط نہیں جتنا تھا۔

بہر حال کسی صورت اس میں کسی قسم کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بے چارے الفانسو کو احساس تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ وہ کوئی کچھ چھوڑنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ مجھے کوئی نام بتانا چاہ رہا تھا۔ وہ نام جو بظاہر اسے صحیح طور پر یاد نہیں آ رہا تھا۔

میں ماضی میں چلا گیا۔ میں ان نصف درجن ملاقاتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جن میں الفانسو نے مجھے کوئی ٹپ دی تھی۔ لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ اس نے کسی کا نام لیا تھا یا کسی کا نام غلط لیا تھا۔ امریکن ناموں میں اسے ہمیشہ پریشانی ہوتی تھی۔

وہ مر رہا تھا اور جانتا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔ لیکن اسے وہ نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ البتہ اسے علم تھا کہ وہ کسی فلم میں کسی کا نام تھا۔ کسی کردار کا یا کسی اداکار کا۔ اور فلم کا نام اس نے وائٹ ہاؤس بتایا تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ وائٹ ہاؤس نام کی کوئی فلم نہیں تھی۔ میں نے جتنی طور پر انٹرنیٹ مووی ڈیٹا بیس کو بھی چیک کر لیا تھا۔ ایسی بے شمار فلمیں تھیں جن میں لفظ 'وائٹ ہاؤس' شامل رہا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی فلم ایسی نہیں تھی جسے الفانسو کو دیکھنے کا اتفاق رہا ہو۔

'دی وائٹ ہاؤس' نام کا ایک امریکن ٹی وی ایجنس پروگرام رہا تھا لیکن بات پھر وہی تھی کہ ایک فلمیں جو ایسٹریڈیم میں رہ رہا تھا اس پروگرام کے بارے میں کیوں کر واقف ہو سکتا تھا۔

جو بات بار بار میرے ذہن میں کچھ کے لگا رہی تھی وہ یہ تھی کہ الفانسو جو پیغام دینا چاہ رہا تھا وہ غیر ہم نہیں تھا۔ وہ مجھے نام بتانا چاہ رہا تھا اور وہ یہ نام جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا واضح اور صاف طور پر بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔

قدرتی طور پر میں اس معاملے کو یونہی تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

☆☆☆

ہوٹل کی فرنٹ ڈیسک پر ڈیوٹی دینے والی جولی میری مدد کے لیے بخوشی تیار ہو گئی۔

اس بات کا ایک اچھا امکان تھا کہ قاتل نے میری منزل یعنی پانچویں فلور پر کمر لیا ہوا ہو۔ اس کی وضاحت آسان طریقے سے کی جاسکتی تھی۔ اس نے الفانسو کو کارڈ پر ہال جو بھی کہہ سکتے ہیں اس میں چاقو ٹھونپا تھا اور پھر پلٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ جس وقت پولیس نے پوچھ بچھ شروع کی تو اس وقت تک اس نے نہ صرف خود کو صاف تھرا کر لیا ہوگا بلکہ چاقو سے بھی نجات حاصل کر لی ہوگی۔ یقیناً اس بات کا امکان بھی تھا کہ قاتل کا کمرہ کسی چلی منزل پر رہا ہو لیکن اس بات کا اتفاق کم ہی تھا۔ اس لیے کہ مجھے ذہن پر نہیں بھی خون کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا تھا ماسوائے ان نشانات کے جو میں نے اس وقت چھوڑے تھے جب میں زینے پر سے دوڑتا ہوا نیچے گیا تھا۔

میرے فلور پر چار دیگر افراد قیام پذیر تھے اور صرف ایک کمرہ خالی تھا۔ میں ان کے بارے میں باری باری بتاؤں گا لیکن سب سے پہلے خالی کمرے کی بات کرتے ہیں جس کا نمبر 506 ہے۔ جولی اور میں نے اسے اس کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ اس سے پہلے پولیس بھی اس کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس وقت بھی جولی ان کے ہمراہ تھی۔ انہیں بھی کچھ نہیں ملا تھا۔

اس ہوٹل کے دیگر کمروں کی طرح اس کمرے کا دروازہ بھی ہمیشہ لاک رہتا تھا اور صرف چابی کی مدد سے کھولا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

مشتبہ افراد کی تعداد چار تھی۔

مجھے اپنا حوصلہ بڑھانے میں چوبیس گھنٹے لگ گئے۔ بالآخر میں نے ان سب سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یقیناً پولیس اس سے پہلے ہی ان سے گفتگو کر چکی تھی لیکن میں ایک اخباری رپورٹر تھا جس کی بنا پر مجھے ان سے سوالات کرنے کا اشتیاق حاصل تھا۔ گوکہ اس قسم کی کہانیاں میں انٹرنیشنل ہیرو الڈ ٹریبون والوں کو فروخت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مل و قمارت ان کا پسندیدہ موضوع نہیں تھا۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے جب میں نے کمرہ

نمبر 502 کے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے تصور میں خود کو تمام کمروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے اور کسی کو کسی کمرے میں نہ پاتے ہوئے دیکھا۔ جب میں نے سوچا کہ میں اپنی یہ اہمیت کا کوشش ترک کر دوں اور اس جرم کو حل کرنے کا معاملہ پولیس پر چھوڑ دوں۔ لیکن میں نے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر میں نے کمرہ نمبر 503 پر دستک دی۔ یہ ان کمروں میں سے ایک تھا جو فلٹ کے سامنے بنے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں مقیم شخص کا نام جیمز ایڈلن تھا۔ وہ کمرے میں موجود تھا۔ اس نے مجھے اندر بلایا۔ اس کے کمرے میں کھڑکیاں تھیں جبکہ میرے کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ مجھے نیچے سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے جب اسے یہ بتایا کہ میں ایک اخباری رپورٹر ہوں تو اسے یہ آئیڈیا اچھا لگا کہ اس کا تمام اخبار میں آئے گا۔ وہ برطانیہ کا رہنے والا ایک نیم نیم آدمی تھا اور تعطیلات گزارنے کے لیے سٹریٹیم آیا ہوا تھا۔ مجھے شائبہ تھا کہ وہ عیش و عشرت کے لیے یہاں آیا تھا۔ گو اس نے خود سے یہ بات نہیں بتائی۔ عیاشی کو ایسٹریڈیم میں قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ مزید چند روز یہاں قیام کرے گا۔ اسے امریکیوں کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ "ان کے پاس پیسہ بہت ہے لیکن ان کا کوئی ذوق نہیں ہے۔" اس نے ہمارے متعلق یہ تبصرہ کیا۔ اس نے میرے امریکی تلفظ کا مذاق بھی اڑایا۔ "پولیس بھی سوالات کرنے کے لیے آئی تھی۔ ہے نا؟" اس نے کہا اور بتایا کہ اس وقت وہ باہر گیا ہوا تھا اور کافی دیر سے واپس آیا تھا۔ پاں، اس نے اپنے کمرے کی چابی فرنٹ ڈیسک پر چھوڑ دی تھی۔ فرنٹ ڈیسک پر موجود لڑکی اس بات کی تصدیق کر سکتی تھی۔

کمرہ نمبر 504 کا مقیم فلمسٹ ایک پست قد آدمی تھا جسے نہ تو جوان کہہ سکتے تھے اور نہ ہی بوڑھا۔ اس نے اپنے سیاہ بال سر پر جمائے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ لمبے دلچسپے ہنری کا بامشددہ لگ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق بڈاپسٹ سے ہے۔ بڈاپسٹ کو اس نے ہنری ٹلفٹ میں بڈاپسٹ ادا کیا۔ وہ ایک کاروباری شخصیت تھی اور اسی سلسلے میں ایسٹریڈیم آیا تھا۔

"اور تمہارا کاروبار کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کا جواب مبہم تھا۔ "میں چیزیں خریدتا ہوں۔ بعض اوقات میں چیزیں بیچتا ہوں۔ میں... بابا... میں بزنس

میں ہوں۔" یہ ان چاروں میں واحد فرد تھا جس نے یہ اعتراف کیا کہ وہ الفانسو کو جانتا تھا۔ "میں گاہے بگاہے اس کو شراب خرید کر دیا کرتا تھا۔ گو ہم ایک دوسرے کے... دوست نہیں تھے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ وہ بار بار مسکرا رہا تھا۔

ہاں، جب قتل کا واقعہ ہوا تو اس وقت وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ وہ اس وقت ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا۔ اسے قتل کے بارے میں اس وقت تک پتا نہیں چلا تھا جب تک پولیس نے اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا میں یہ توقع کر رہا ہوں کہ قاتل اعتراف جرم کر لے گا؟ میں اس معاملے کو بیس چھوڑ دوں اور اپنے کمرے میں واپس چلا جاؤں اور میریل سے پوچھوں کہ کیا وہ ہر ذر پر چلنے کے لیے خود کو تیار محسوس کر رہی ہے؟ اس واقعے نے اسے ابھی تک دہلایا ہوا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی تھی۔

میں انجنیوں کے دروازوں پر دستک دیتا پھر رہا ہوں۔ میں عام طور پر یہ انداز بھی نہیں اپناتا... پھر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟

جب میں کمرہ نمبر 504 سے نکل کر واپس ہال میں آیا تو عین اس وقت ایک شخص کمرہ نمبر 502 کے دروازے میں اپنا کارڈ مسلائڈ کر رہا تھا۔

آہ! قسمت یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ میں کم از کم ایک اور مشتبہ فرد سے سوالات پوچھ سکتا ہوں۔

فلپ ریڈیو ایک فرانسیسی یہودی تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال کی تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا، قد لانا اور کمر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ بالوں کی رنگت خاستری تھی اور دبلے پتلے چہرے سے ذہانت چمک رہی تھی۔ اس کے کمرے میں کتابیں اتنی زیادہ تھیں کہ خود اس کے لیے کمرے میں سامنے کی جگہ کم پڑی تھی۔

مجھے کرسی کی پیشکش کرنے کے لیے اسے فرش پر سے کتابیں ہٹانی پڑیں۔ وہ اس کمرے میں کئی برسوں سے رہ رہا تھا اور کمرے کا مہمان نہ کر لیا اور ادا کرتا تھا۔

وہ انٹرویو کے لیے کام کرتا تھا اور ہم جس پرستوں کی حالیہ قتل کی لہر کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ ایسٹریڈیم ہمیشہ دنیا کے انتہائی روادار شہروں میں سے ایک میں شمار ہوتا تھا لیکن گزشتہ چند برسوں میں یہاں کی ایک ہم منصب پرست

قتل ہو چکے تھے۔

”شا کنگ!“ اس نے کہا۔ اس کے لہجے سے یہ عیاں ہو رہا تھا کہ وہ حقیقت میں صدمے سے دوچار تھا۔ ”ایمسٹرڈیم رہنے کے لیے نہایت ہی عمدہ جگہ ہے۔ لیکن انسانی دلوں میں سیاحتی سبیل رہی ہے۔“

اس سے قتل ہماری گفتگو کے دوران اس نے خود سے یہ معلومات فراہم کر دی تھیں کہ وہ خدا کی ذات پر کوئی یقین نہیں رکھتا۔

میں کئی منٹ تک ہال میں کھڑا خود سے یہ بحث کرتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ میں ایک کے سوا تمام شہر افراد سے بات کر چکا ہوں اس لیے مجھے اس معاملے کو اب ختم کر دینا چاہیے۔

تب میں نے ستمبر 505 کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے دروازہ کھٹکھٹانے پر خوشی ہوئی کیونکہ جس شخصیت نے دروازہ کھولا وہ دروازہ قامت، سنہری زلفوں والی ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ تھی جس کا تعلق سویڈن سے تھا۔ وہ کسی فلمی اداکارہ سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا نام انگریز پیٹرین تھا۔ ایمسٹرڈیم میں اس کی آمد کسی کام کی وجہ سے نہیں تھی لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ کوئی سیاحت نہیں ہے۔ اس بات پر وہ قدرے خفا بھی لگ رہی تھی۔ جب میں نے اس سے ایمسٹرڈیم آنے کی وجہ جاننا چاہی تو اس نے بس اتنا کہا کہ اسے یہ جگہ پسند ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ گزشتہ رات قتل کے وقت وہ کہاں تھی تو اس نے جواب دیا۔ ”میں سونے کے لیے جلدی بیڈ پر چلی گئی تھی۔“ یہ بات اس نے اس انداز سے کہی جیسے کوئی عام سی بات کہی جاتی ہے۔ اس نے میرے سوال کی گہرائی پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

”مجھے پولیس کی آمد بھی اچھی نہیں لگی تھی۔“ اس نے خود ہی سے کہا۔ ”اور مجھے وہ لوگ بھی پسند نہیں ہیں جو بہت زیادہ سوالات کرتے ہوں۔“

میرے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔

☆☆☆

اس رات میں اور میریلین انکھیلیاں کرتے رہے۔ پھر میں ایک گہری اور بے خواب نیند سو گیا۔

جب صبح میں نیند سے بیدار ہوا تو گزشتہ تمام واقعات کی کڑیاں ملائے اور وجوہات پر غور کرنے پر میرے شعور نے مجھے قاتل کے نام سے آگاہ کر دیا اور یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں جب مقدمہ عدالت میں زیر سماعت تھا، اخبارات کے

ذریعے پتا چلی کہ قتل کا محرک کیا تھا۔

الفانسو کو پتا چلا تھا کہ کسی نے کسی بڑی رقم کا نہیں کیا ہے۔ اس نے اس فرد کو معمولی مصروفیت سے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ فرد غیظ و غضب میں مبتلا ہو کر اسے چاقو گھونب دے گا۔ کیونکہ یہ ایک نہایت غیر پیشہ ورانہ قدم تھا۔ وہ تو بس تھوڑی سی شراب کی قیمت طلب کر رہا تھا۔

جب میں نے پولیس کو یہ بتایا کہ قاتل کون ہے، تب وہ ثبوت تلاش کرنے کے قابل ہوئے۔ خون کے دھبے دھوا اور انہیں بالکل ہی صاف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اور ڈی این اے اس کا بہترین ثبوت ہے۔

الفانسو میکسین تھا۔ اس کی سوچ اسپینش تھی۔ میں اپنی زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ لہذا جب وہ مجھے سے بات کرتا تھا تو اسے اپنے خیالات کا انگریزی میں ترجمہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کی انگریزی اتنی بری نہیں تھی لیکن یہ اس کی اولین زبان نہیں تھی۔ اسے اس فرد کا نام معلوم تھا جس نے اسے چاقو گھونب دیا تھا۔ وہ میرے پاس مدد کے لیے آیا تھا۔ میرا کمر ہال کے تین مقابل تھا اور اس نے وہ نام ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے وہ وہ نام یاد نہیں آ رہا تھا۔

جیسا کہ ناموں کو یاد رکھنے کے بارے میں بہت سے لوگوں کی یادداشت کام نہیں کرتی، اسی طرح الفانسو نے نام یاد نہ آنے پر اسے ایک ایسے نام سے جوڑنے کی کوشش کی تھی جس کا نام اسے اچھی طرح سے یاد تھا اور یہ نام اس نام کے مانند تھا۔

وہ فلم غالباً اس نے اپنے بچپن میں دیکھی ہوئی۔ وہ فلم جس کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے اور اس نے مجھے فلم کا نام بتا دیا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس طرح میں قاتل کا نام جان لوں گا۔

الفانسو سے بس ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے فلم کے نام کا اپنی زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کر دیا تھا۔ انگریزی میں اس نے وائٹ ہاؤس بتایا تھا جبکہ اپنی زبان میں وائٹ ہاؤس کو کاسابلا کہا جاتا ہے۔

کاسابلا کا 1942 (Casablanca) برقی مقبول ترین امریکی رومانٹک ڈراما فلم جس کے اداکار ہنری بوگارت اور انگریز برکین تھے۔

الفانسو کا اشارہ ستمبر 505 کی مکین انگریز پیٹرین کی جانب تھا جو اس کی قاتل تھی۔

جاسوسی ڈائجسٹ 152 جنوری 2016ء



مطلبی

سیرینا راض

جنگیں فتوحات کا ہی نہیں... قہابی ویربادی... فسادات... اور انسانی جانوں کے بے دریغ قتل عام کا نام ہے... جذبات و احساسات کے زیر اثر زندگی گزارنے کا خواب ہر شخص کی آنکھ میں سجا ہوتا ہے... وہاں کے لوگ بھی اس خواب سے سرشار تعبیر کے لیے کوشاں تھے... مگر جنگ جیتنے کے جنون میں مبتلا فاتح یہ کب دیکھتے ہیں کہ کس کی آنس ٹوٹی ہے... کس کے دل کے ٹکڑے ہوئے ہیں... محبت اور چاہت بھرے دلوں کی ڈوبتی ابھرتی کسک... وہ آخری دم تک انتظار... بے اعتنائی... اور فراموشی کے ہتھیاروں سے گھائل ہوتے رہے...

دل کی آنکھوں سے پڑی جانے والی دل گذار تحریر کے پتہ و مخم

”گولڈ ویل بہترین انسان تھا۔“ جیری شینی نے کہا۔ ”اور وہ اس میڈل کا حق دار ہے، اس نے جو کچھ روشتیاں بالکل صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ ٹیڈ گولڈ ویل ہمارا ایک سابق ساتھی تھا اور ہم برلن میں ایک ساتھ تعینات

تھے جن دنوں دیوار برلن گرنے کا واقعہ ہوا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بول میں پتلی ہوئی بیڑا اپنے گلاس میں انڈلی اور فیصلہ کر لیا کہ خود کچھ کہنے کے بجائے جبری کو بولنے کا موقع دوں گا۔ ویسے اگر میں اس کے برعکس سوچتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔

”اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اچھا کیوں تھا۔ وہ ہمیشہ نتائج حاصل کیا کرتا تھا اور یہ بہت سادہ سی حقیقت ہے۔“
”ہمیشہ...؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
”ہمیشہ تو نہیں لیکن جو کام ہم کرتے ہیں اس میں کوئی بھی مکمل نہیں ہوتا۔“ جبری نے اپنا سر ہلایا اور گلاس میں مشروب ڈالنے کے بعد بولا۔ ”اس طرح کی موت واقعی دردناک ہے۔ جب میں سننے سے خبر لے کر تو اس پر یقین نہیں آیا اور اب بھی نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ...“

جبری اور میرا بہت پرانا ساتھ تھا لیکن اتنے سال گزر جانے کے بعد اس کے طبع اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے سرخ اور سنہری بال فوجی انداز میں کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول اور سرخ و سفید رنگت، جبری کو میں نے بھی سکرانے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جب میری اس سے کبلی ملاقات ہوئی تو وہ ایک خوش لباس نوجوان تھا جس نے اپنا پولس سے گریجویٹیشن کرنے کے بعد تبدیل ہوف میں ملازمت اختیار کر لی تھی جو برلن کا سب سے بڑا ہوائی اڈا تھا اور ان دنوں ہمارے زیادہ تر خفیہ آپریشن وہیں سے ہوتے تھے۔ ایک طویل عرصہ ملازمت میں گزارنے کے بعد اب وہ پینل میکینوری آفسر کے طور پر بیٹھا گون میں تعینات تھا اور کہا جاتا تھا کہ اوپر والے اس پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔

میرا نام ایلکس کلینر ہے اور میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد سارا ایک میں رہائش اختیار کر لی ہے جو نیویارک کے شمال میں ایک پُر سکون قصبہ ہے۔ جہاں میں علاقے کے کلبوں اور ریسٹوران کو برف پگھلائی کرتا ہوں۔ میں نے بیس سال انٹیلی جنس آفسر کے طور پر گزارے جواب بھولی بری یاد دہن چکے ہیں اور میں بمشکل ہی ان کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ایک مدت کے بعد آر پی نیوی کلب کا یہ میرا پہلا دورہ تھا اور میں جبری کے کہنے پر واپس آ گیا تھا۔ کلب کے ایگل لاؤنج میں ملاقات کے دوران میں ہم ایک گھنٹے تک پرانی یادوں میں کھوئے رہے اور ان دوستوں کو یاد کرتے رہے جن کے ساتھ ہم نے ان برسوں میں کام کیا

تھا۔

لیکن جبری سے ملنے کے بعد میں حیران تھا کہ مجھے ہفتے کی شام کیوں بلایا ہے۔ اس نے نہ صرف یہ میرے آنے جانے کے اخراجات بھی برداشت کیے بلکہ کلب میں ایک رات کے قیام کا بندوبست بھی کر دیا تھا لیکن جب اس نے میڈ گولڈویل کا تذکرہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔ گولڈویل کی موت صرف دس روز قبل واقع ہوئی تھی، جبری نے افسوس کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تقریب آج سے دو ہفتے بعد ہونے والی ہے۔“ اس کا اشارہ تقیم اعزازات کی اس تقریب کی جانب تھا جس میں گولڈویل کو یہ امتیازی ایٹمی جنس میڈل دیا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ ترین اعزاز تھا جو ابھی تک ہمارے کسی ساتھی کو نہیں ملا تھا۔

”وہ اس اعزاز کا مستحق تھا۔“ جبری نے کہا۔ ”وہ ہر کام کو مکمل طور پر انجام دیتا تھا۔“
”اس پر بحث نہیں کی جاسکتی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے ہمیشہ سے میڈ گولڈویل کے بارے میں تحقیقات تھے اور اس کے بارے میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے ہمیشہ پریشان کرتی رہی، ممکن ہے کہ اس کی وجہ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی اجنبیت ہو یا یہ کہ اس نے اپنے بارے میں بہت کم بتایا تھا حالانکہ ہم سب اپنے راز چھپانے میں یکے کے تھے اور میں ایسا ہی ہوتا چاہیے تھا۔
”اس میں ایک اور خوبی بھی تھی۔ وہ بڑی روانی سے جرمین بولتا تھا۔ ہمیں ہمیشہ ہی ایسے لوگوں کو تلاش کرنے میں مشکل پیش آتی جو مختلف زبانیں بول سکتے ہوں۔ اس نے کالج میں کئی زبانیں پڑھی تھیں۔ ایک اور بات وہ صرف ذہین ہی نہیں بلکہ بہم جو بھی تھا۔“

میں نے اس پر کچھ نہیں کہا لیکن دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ ہم سب ہی ہم جو تھے اور ہم میں سے کسی کی بھی اتنی قدر نہ ہوئی اگر ہم اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر دیوار کے اس طرف نہ جاتے۔ اگر آپڈر نہیں یا معمولی سا بھی سست ہیں تو یہ کام نہیں کر سکتے۔ اگر اپنی بات کر دیں تو اس وقت مجھے یقین تھا کہ ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ اپنے ساتھی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے میں نے مشرقی برلن میں جاسوس بھرتی کیے جو زیادہ تر سیاست دان اور فوجی افسر تھے۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں آہنی پردے کے بارے میں کچھ لگانا پڑتے تھے اور لوگوں کو اس انداز میں بلکھیل کرنا ہوتا تھا کہ انہیں کوئی غلط کام کرنے کا احساس ہی نہ ہو۔ بلکہ

انہیں یہ باور کرانا ہوتا تھا کہ اپنے ملک سے دھوکا کرنا دنیا میں سب سے زیادہ فطری بات ہے۔
میں نے کہا۔ ”یہ مت بھولو کہ گولڈویل پیٹ کا بھاری شخص تھا۔“
”ہاں، میں سمجھتا ہوں۔“

جلدی ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ جبری ہمارے کام کے منفی پہلوؤں مثلاً دھوکا، جھوٹ اور چالبازی کے بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا جیسے وہ سب ہمارے فرض کا حصہ ہوں لیکن ہم مستقل اپنے آپ کو باور کراتے رہے کہ ہم نے جو کچھ کیا، وہ ایک اچھے مقصد کے لیے تھا۔
”کیا تم ابھی تک کنوارے ہو؟“ جبری نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”میری منگنی ہو گئی ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“
”میں گولڈویل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عورتیں اس پرصرتی تھیں جب وہ بن سنور کر سامنے آتا تو ان کے لیے اپنا دل سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ جبری کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ گولڈویل ایک جراحی شخص تھا اور اپنی جامعہ طبی و چرب زبانی سے لڑکیوں کو متاثر کر لیتا تھا۔ اسی لیے ایک کے بعد دوسری لڑکی اس کی محبت کا دم بھرنے لگتی تھی۔
”وہ کبھی عورتوں کی کمپنی کے بغیر نہیں رہا اور وہ بے وقوف، عورتیں اسے ڈھونڈتی رہتی تھیں۔“

کیا بھی اس نے شادی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔
”کہانی کا یہی حصہ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ مرنے سے پہلے اس نے منگنی کر لی تھی۔ وہ گزشتہ مہینے کرکس پارٹی میں شرکت کے لیے یہاں آیا تھا تو اس کی منگنی بھی ساتھ تھی۔ وہ واقعی خوب صورت تھی اور نیویارک کی رینکس اسٹیٹ فرم میں بروکر کے طور پر کام کر رہی تھی۔“

یہ کہہ کر جبری نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور تپتی آواز میں بولا۔ ”جب میں کہتا ہوں کہ گولڈویل بہترین تھا تو میرا اشارہ اسٹیٹ والے واقعے کی طرف ہوتا ہے۔“

مجھے واقعی معلوم نہیں تھا کہ جبری کس بارے میں بات کر رہا ہے۔ جس واقعے کا اس نے ذکر کیا، وہ سرد جنگ کے زمانے میں سب سے بڑی خفیہ کارروائی تھی۔ 1986ء کے آخر میں گولڈویل کسی طرح، مشرقی جرمنی کی سیکرٹ پولیس

مطلب

کی خفیہ فائلوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں ادا کرنے کے بعد جبری نے ایگل لاؤنج جانے والے راستے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کلینر۔ اس نے یہ کام کس طرح کیا ہوگا؟“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ جبری ایک افسر سے باتیں کرنے کے لیے رک گیا۔ اس دوران میں نے اس کے سوال کا جواب تلاش کرنا شروع کیا۔ میں بھی سب لوگوں کی طرح حیران تھا کہ گولڈویل کے ذرائع کیا تھے۔ جب جبری دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے کہا۔ ”اس نے بھی مجھے راز دار نہیں بنایا۔“
”ممکن ہے کہ تمہارے علاوہ کسی اور شخص کو یہ معلوم ہو۔ اسی لیے میں پوچھ رہا ہوں۔“

”کوئی نہیں جانتا کہ وہ وہاں کس طرح پہنچا۔ فارمیشن اسٹارسی میں حفاظتی انتظامات انتہائی سخت تھے۔ یہ مشرقی برلن کی ایک غیر معروف سڑک تھی جہاں اسٹائی کا ہیڈ کوارٹر اور جیل واقع تھی۔ ان دنوں اس جگہ کا نام سننے ہی مشرقی برلن میں رہنے والے بدقسمت لوگوں یا پھر گولڈویل اور مجھے جیسے لوگوں کی کچھی جھوٹ جاتی تھی جنہیں اپنے کام کی وجہ سے مشرقی برلن آنا پڑ گیا تھا جو کوئی بھی وہاں قدم رکھنے کی کوشش کرتا، اس کا آخری ٹھکانا اسٹائی کی جیل ہی ہوتی۔“

”تم آن کلینر۔ تمہارا ضرور کوئی خیال ہوگا۔“ جبری نے بارہ میڈر کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا۔ ”میں یہ معلوم تھا کہ مشرقی جرمنی میں رہنے والے سب لوگ ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے ہیں۔ یہ گولڈویل ہی تھا جس نے انکشاف کیا کہ اسٹائی پولیس بھی مغربی جرمنی کی جاسوسی کر رہی تھی اور وہاں ان کے ایجنٹ موجود تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی ہوں گے۔ اس وقت تک کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا۔“

”میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ ان کے کچھ لوگ تو یہاں امریکا میں بھی کام کر رہے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو یہ بات معلوم ہوگی۔“

میں نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے لیے بھی نئی اطلاع ہے۔“
”ہاں، ہم نے پوری کوشش کی کہ اسے اپنے تک ہی رکھیں۔ ضروری نہیں کہ ہر خبر اخبار کی زینت بنے۔“
میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکا۔ جبری کے

تھمرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اٹلی جنس والے اخبارات سے کتنے چوکنے تھے۔

ہم نے اپنے لیے مشروب کا آرڈر دیا پھر میں بولا۔
”وہاں تمہاری موجودگی ہمارے لیے گھبراہٹ کا سبب بن سکتی تھی۔ یاد ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کتوں کی مدد سے میڈرگ میں ہمارا پیچھا کیا تھا۔ اس دور سے سے واپس آنے کے بعد میں بہت خوش ہوا تھا۔“

”ہمارے سبھی لوگ جانتے تھے کہ انہیں محتاط رہ کر کام کرنا ہے لیکن جب گولڈویل نے اطلاع لے کر آیا کہ مغربی جرمنی کی حکومت میں اسٹاسی کے ایجنٹ موجود ہیں تو سب لوگ ششدر رہ گئے۔“ جیری نے میز کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان کا ایک آدمی چانسلر کے دفتر میں بھی تھا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ گولڈویل کی اطلاع بے ہودہ ہے اور ان لوگوں نے ہی اسے یہ غلط معلومات دی ہیں لیکن بعد میں اس کا ایک ایک حرف سچ ثابت ہوا۔“

”ان کا ایک ایجنٹ جرمنی کے نیوز میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا۔“

جیری بناوٹی انداز میں بولا۔ ”مجھے وہ یاد ہے، ہم نے جلد ہی اسے پکڑ لیا تھا اور یہ صرف ایک شخص کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا۔“

”گولڈویل۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
اگلے میں منٹ تک ہم اسی کی باتیں کرتے رہے پھر جیری نے اپنی گھڑی دیکھی اور اسٹول سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”کل صبح ساڑھے اٹھ بجے ناشتے پر ملو، ہمیں کچھ مزید باتیں کرنی ہیں۔“

اگلے دن اس نے مجھے ناشتے کی میز پر ایک فولڈر پکڑا اور بولا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“

میں نے سرسری انداز میں اس کی ورق گردانی شروع کر دی تو وہ بولا۔ ”اس میں سب کچھ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً گولڈویل کہاں پیدا ہوا، اس نے کس اسکول میں تعلیم حاصل کی، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے والدین پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ منیجر کا نام مریم سیگلن ہے۔ اگر تم اس سے بات کرنا چاہو تو اس کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی اس فائل میں موجود ہے۔ نیو یارک سٹی کے اس سراغ رساں کا نام فرازی ہے۔ گولڈویل اپنے پندرہویں منزل کے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے گر کر مر گیا تھا۔ صرف ایک اخبار نامہ کرنے یہ خبر شائع کی اور اس نے بھی اسے آدھے کالم سے زیادہ جگہ نہیں دی۔ رپورٹ کا نام بیٹھی ہے اور اس نے اپنی رپورٹ

میں یہ نہیں بتایا کہ مرنے سے پہلے گولڈویل کے ساتھ کون تھا۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا جیری؟“
”ہم چاہتے ہیں کہ تم جانے وقوعہ کا جائزہ لو اور معلوم کرو کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا۔ پولیس والوں کے کہنے کے مطابق اس نے بالکونی سے چھلانگ لگائی۔ وہ اسے خودکشی کا نام دے رہے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم کیا معلوم کرتے ہو؟“

”میں ہی کیوں؟“
”کیونکہ تم ان محاملات میں بہت اچھے ہو اور تمہیں اس نوعیت کے کیس حل کرنے کا خوب تجربہ ہے اور مرنے والے کو بھی جانتے ہو جبکہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہیں وہ یاد ہو۔“

”کیا وجہ ہے کہ تم پولیس کا نقطہ نظر تسلیم نہیں کر رہے؟“

”جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب میری گولڈویل سے بات ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا اور شاہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کوئی موڈی انسان نہیں تھا کہ کسی کیفیت سے مطلوب ہو کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا۔ اس کی کوئی بڑی عادت نہیں تھی۔ وہ بہت کم شراب پیتا اور منشیات سے دور رہتا تھا۔ اس کی جسمانی صحت بھی ٹھیک تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ سینٹرل پارک میں دوڑ لگاتا ہے۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔“

میں نے فولڈر کے صفحات پر ایک اور نظر ڈالی۔ جیری مجھے ترغیب دے رہا تھا اور میرے لیے اس سے شق ہونا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ”تم جانتے ہو، میرا ایک کاروبار ہے اور اسے میں ہی دیکھنا ہوں۔“
”لیکن اس سیزن میں تو برف کی مائیک کم ہو جاتی ہے۔“

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اچھا دیکھو گا کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

☆☆☆
سراغ رساں لیفٹیننٹ لیوی فرازی ایک ڈیلا پتلا، سیاہ بالوں، مونچھوں اور سیدی ٹاک والا شخص تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”تینوں باتیں ہو سکتی

ہیں۔ اس نے چھلانگ لگائی، گر گیا یا اسے دھکا دیا گیا۔ لیکن اس کیس میں یہ بالکل واضح ہے کہ اس نے بالکونی سے چھلانگ لگائی تھی۔“

وہ بدھ کا دن تھا۔ اس سے ایک دن پہلے میں جیری سے مل چکا تھا۔ اس وقت ہم ایک دفتر میں موجود تھے، میں نے فرازی کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ میں ان تمام ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں جن کا تعلق گولڈویل کی موت سے ہے۔

”اس نے خودکشی کرنے سے پہلے کوئی تحریر چھوڑی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہر کوئی ایسا نہیں کرتا۔“ اس نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کہنا ہے کہ گولڈویل ایک ایسی جنس آفیسر تھا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”پہلے ہم سمجھے کہ وہ کوئی تجزیہ کار ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ گورنمنٹ سے ریٹائر ہوا ہے جب ہم نے چیک کیا تو اس کے بارے میں کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ اس نے چھلانگ لگائی تھی؟“

”اس کی موت اسی طرح ہوئی تھی۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اکیلا تھا۔ اس عمارت میں ایک چوکیدار بھی ہے اور عمارت کے سب لوگوں کے بارے میں جانتا ہے۔“ میں اپنی آسانی سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”اسے زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ لیفٹیننٹ اور وہ آسانی سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ میرا دل ملک اس نے کئی مشکل کارنامے سر انجام دیے۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ یوں بالکونی سے چھلانگ لگا دیتا۔“

”تم سرد جنگ کے زمانے کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”ایسا ہوتا ہے لیکن میں تمہاری دلچسپی سمجھ سکتا ہوں۔ ہم نے اس کا تمام سامان چیک کیا تھا اور جب تم نے اپنے آنے کا بتایا تو میں نے تمہارے لیے یہ دوبارہ حاصل کی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی ڈاک میں سے کوئی چیز نکالی اور اسے میری طرف کھکا دیا۔ وہ ایک خوب صورت سنہرے بالوں والی عورت کی تصویر تھی جس نے نیلے رنگ کا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کمر پر تھے اور وہ بے حجابانہ سرکاری تھی۔ تصویر کی پشت پر مارچ 1987ء کی تاریخ درج تھی۔ یہ تصویر شاید برلن میں اتاری گئی تھی۔

”یہ ہمیں اس کی ٹیم کی جیب سے ملی ہے۔ جہاں

مطلبین

تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس کی جیبوں میں زیادہ چیزیں نہیں تھیں سوائے ایک جیبی ٹکٹے، ایک قلم اور نوٹوں سے بھری گئی تھی۔ اس نے جینز پہن رکھی تھی۔ کیا تم وہ چیزیں دیکھنا چاہو گے؟“

میں نے کہا۔ ”میں اس کا اپارٹمنٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہم نے بڑی احتیاط سے وہاں کا جائزہ لیا ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ تم کی تلاش کر لو گے لیکن ہم وہاں جا سکتے ہیں۔ وہ صرف دو بلاک کے فاصلے پر ہے۔ تمہرو میں چابی لے لوں۔“

راستے میں اس نے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ تمہیں وہاں کوئی غیر معمولی چیز مل سکے گی۔ وہ شخص بظاہر ایک نارمل زندگی گزار رہا تھا۔“

”اس لیے کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ میں بھی ایک دفعہ اس جگہ کو دیکھ لوں۔“ میں نے نہیں کہہ سکا کہ تقسیم اعزازات کی تقریب میں ڈائریکٹر یہ نہیں کہنا چاہے گا کہ تمہارا حاصل کرنے والے نے چند منٹ قبل خودکشی کر لی ہے۔

گولڈویل کی عمارت نسبتاً نئی تھی۔ جسے سفید شیشوں سے بنایا گیا تھا اور سامنے والے حصے پر ماربل لگا ہوا تھا۔ باوردی چوکیدار نے فرازی کو پہچان کر سکرٹاتے ہوئے سلیوٹ کیا۔ تعارف کروانے کے بعد فرازی نے کہا۔ ”جس وقت گولڈویل کی موت واقع ہوئی، اسٹیل ہی ڈیوٹی پر تھا۔ اسٹیل، مسٹر کلیر کو بتاؤ جو تم نے ہمیں بتایا تھا۔“

”یقیناً، مسٹر گولڈویل ہمیشہ کی طرح اس روز صبح کو ٹریک سوٹ اور دوڑنے والے جوتوں سمیت پہنچ آئے۔ وہ تقریباً روزانہ ہی دوڑ لگایا کرتے تھے۔ وہ دس بجے گئے اور دو گھنٹے بعد اخبار ہاتھ میں لیے واپس آئے۔ وہ اکثر شام میں جیکٹ اور ٹائی کے ساتھ باہر جایا کرتے تھے بس میں نے اس دن یہی دیکھا۔“

”اس سے کوئی ملنے آیا تھا؟“ فرازی نے پوچھا۔
”ہاں، دو بجے کے قریب ایک عورت اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کی عمر پچیس چھیس سال ہوگی۔ وہ یہاں پہلی بار آئی تھی۔“

”تم نے اس کا نام معلوم کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”کیفیرولا۔ ایسا ہی کوئی نام تھا۔“ اسٹیل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے گولڈویل کو فون کر کے بتایا کہ کیفیرولا نام کی ایک عورت اس سے ملنے آئی ہے تو یوں لگا جیسے وہ اسے نہیں جانتا۔“

بسنامع ہے

نچر۔ ”15 بچوں کے نام بتاؤ۔“

سردار۔ ”مالٹا، سیب، آم۔۔۔“

نچر۔ ”شاباش 3 ہو گئے 12 رہ گئے۔“

سردار۔ ”ایک درجن کیلے!“

☆☆☆

شوہر۔ ”میں نے دوست کو کھانے پر بلا یا ہے۔“

ہوئی۔ ”تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟ پورے گھر میں گند

پڑا ہے برتن بھی دھونے والے ہیں اور میں اب کچھ پکا

نہی نہیں سکتی۔“

شوہر۔ ”یہ سب دکھانے کے لیے ہی تو بلا رہا

ہوں، کیونکہ وہ بے وقوف شادی کرنے کا سوچ رہا ہے۔“

سجاد علی شگری کا تجزیہ گلگت بلتستان سے

نہیں لیے لیکن جب اس پر یہ کیفیت طاری ہوتی تو وہ دوڑوڑا

کی پوری بولتی بی جاتا۔ وہ سارا دن کمرے کے پردے گرا

کر تھا بیٹھا رہتا۔ خلاؤں میں گھورتا۔ شراب پیتا اور اپنے

آپ سے باتیں کیا کرتا۔“

”وہ باتیں کس کے بارے میں ہوتی تھیں؟“

”وہ زیادہ تر بے ربط باتیں کیا کرتا۔ کبھی کبھی وہ کچھ

لوگوں کے نام بھی لیتا۔ کبھی یوں لگتا جیسے وہ کسی سے باتیں

کر رہا ہو اور کبھی وہ چلانے لگتا۔“

”پھر تم کیا کرتی تھیں؟“

”میں کیا کر سکتی تھی۔ میں نے ہمیشہ ان لمحات میں

اس کے پاس رہنے کی کوشش کی۔ اسے کھانا کھلاتی اور

میرسکون رٹنے کی کوشش کرتی۔ ایک دفعہ میں نے کسی ڈاکٹر کو

دکھانے کی تجویز پیش کی جس پر وہ ناراض ہو گیا اور مجھ پر

چلانے لگا۔ اس نے کچھ اس طرح کی بات کی کہ ہمارے

پیشے کے لوگ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے۔“

میں نے تائید میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”وہ کس پیشے کی

بات کر رہا تھا؟“

میں جانتا تھا کہ ایک پیشہ ایسا بھی ہے جس میں آپ

کبھی ریٹائر نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرتے

ہیں بلکہ اپنے راز قریب لے کر چلے جاتے ہیں۔

کر لیا۔“ میں مزید آدھ گھنٹا تک فونلڈرز اور ایمر دیکھتا رہا

لیکن وہ خط میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ بالآخر میں

نے فرازی سے کہا کہ میں نے کافی کچھ دیکھ لیا ہے۔

”کچھ پیش رفت ہوئی؟“ جیری نے فون پر مجھ سے

پوچھا۔

”شاید لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے کچھ

باتیں معلوم کرو۔“

جب میں نے اسے بتایا کہ کیا چاہتا ہوں تو اس نے

کہا۔ ”کیا یہ ہمارے منصوبے کے لیے ضروری ہے؟“

مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ

کہتا، جیری نے کہا۔ ”میں دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ تم

نے آخری آٹھ دنوں کا ریکارڈ چیک کرنے کی بات کی تھی؟“

”ہاں، وہ تمام فضائی کپیاں جن کے جہاز امریکا اور

برزیل کے درمیان پرواز کرتے ہیں۔ یہ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔“

جب میں مریم مکملین سے ملا تو اس نے گولڈویل کی

موت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جب یہ

خبر سنی تو مجھے شدید صدمہ ہوا۔ اس کی موت کو دو ہفتے ہو گئے

ہیں لیکن میں ابھی تک اس کیفیت سے باہر نہیں آسکی ہوں۔

مجھے تو رات کو شیک طرح سے نیند بھی نہیں آتی۔“

جیسا کہ جیری نے بتایا تھا کہ گولڈویل کی منگیتر ریتل

ایٹل بروکھی اور ایک فرم کے لیے کام کرتی تھی جس کے

دفاتر ایک کثیر المنزل عمارت میں تھے۔ وہ واقعی پرکشش

ہی اور بلی پتلی تھی۔ اس کے بال شانوں پر پلہا رہے تھے۔

آکھیں سیاہ، لمبا چہرہ اور وہ جسی آواز میں بات کرتی تھی۔

اس نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور جب میں

کھڑکی کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ بولی۔

”میں نے اس روز ٹیڈ کو سر پھر میں فون کیا تھا۔ اس

شام میں اس کے پسندیدہ ریستوران میں ڈنر کے لیے جانا

تھا اور وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔“

جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کبھی اس نے ٹیڈ کو

افسردہ دیکھا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”کچھ باتوں میں وہ

دوسرے مردوں سے مختلف تھا۔ وہ بہت خوش مزاج اور ہنس

مندانہ کرنے والا شخص تھا لیکن کبھی وہ افسردہ ہو جاتا تھا۔ میں

نے کبھی کسی کو اتنا دل شکستہ نہیں دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ

ان لمحات میں اسے میری بہت زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم غریب کہہ رہی ہو۔“

”اس کیفیت میں وہ پینا شروع کر دیتا تھا جبکہ عام

حالات میں اس نے ایک یا دو سے زیادہ وائن کے گلاس

اور پری خانے میں الہم کی ایک طویل قطار تھی جن پر الگ

الگ ٹیبل چسپاں تھے۔ ان میں تاریخ اور دیگر تفصیلات

درج تھیں۔

”ان میں زیادہ تر پرانی تصویریں ہیں۔ میں دیکھ

چکا ہوں۔“ فرازی نے کہا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ان میں سے دو الہم اٹھائے اور

انہیں کھول کر دیکھا۔ فرازی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ان میں

سب پرانی تصویریں تھیں اور یہ ایک طرح سے گولڈویل کا

ذاتی ریکارڈ تھا جسے دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ وہ کہاں کہاں گیا

اور اس نے مختلف ملکوں میں کیا کارنامے انجام دیے۔

پھر میں نے میز کے برابر میں رکھے ایک چھوٹے

شلف میں 1987ء کی الہم دیکھی۔ یہ وہی سال تھا جس کی

ایک تصویر گولڈویل کی قمیض سے برآمد ہوئی تھی۔ میں سوچنے

لگا کہ کیا اس نے الہم سے وہ تصویر نکالی اور الہم کو شلف میں

ہی چھوڑ دیا۔

اس الہم میں تصویروں کے علاوہ جرمن اخبارات

کے کچھ تراشے بھی موجود تھے۔ ان میں سے کچھ نے انسانی

کی فائلوں تک گولڈویل کی رسائی کے بارے میں خبریں بھی

شائع کی تھیں لیکن کسی جگہ اس کا نام نہیں آیا تھا۔ جس سے پتا

چلتا تھا کہ گولڈویل واقعی ایک اچھا بیٹن تھا۔

بالکل آخری صفحے پر ایک ڈیکو ہوا خط بارنگ کے کور

میں رکھا ہوا تھا۔ یہ کسی عورت کی جانب سے تھا اور اس پر

12 جون 1987ء کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ فرازی نے

پوچھا کہ کیا میں جرمن پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے اثبات میں

سر ہلا دیا۔ خط میں لکھا تھا۔ ”ڈیز تھا ڈیوس! تم تک پہنچنے کا

کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں یہ خط لکھ رہی

ہوں۔ مشکل اور گزشتہ روز دو صراغ رساں ہمارے دفتر میں

آئے تھے۔ انہوں نے فائلیں دیکھیں اور سوالات کرتے

رہے۔ میں نے کہا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن ان میں سے

ایک میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ اسے

کچھ شبہ ہو گیا ہو۔ میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔ تم نے کہا

تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو مجھے مغربی برلن لے جاؤ

گے۔ پلیز اب آ جاؤ۔ میں تمہیں بہت یاد کر رہی ہوں۔

تمہارے فون کا انتظار رہے گا تمہاری میرین!“

کرسی پر بیٹھ کر میں نے ان اخباری تراشوں کو غور

سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک خبر 23 جون کی تھی جس میں

میرین نامی ایک عورت کی گرفتاری کا اکتشاف کیا گیا تھا۔

اس خبر کی سرخی تھی۔ ”پولیس نے گورنمنٹ سیکریٹری کو گرفتار

”اس عورت نے اپنا پورا نام نہیں بتایا۔“

”ہاں لیکن مجھے یاد نہیں رہا۔ شاید اس کا آخری نام

اچھے سے شروع ہوتا تھا۔ میں نے وہ بھی مسٹر گولڈویل کو بتا

دیا۔ پہلے تو وہ اسے نہیں پہچان سکے پھر بولے کہ اسے اوپر

بیچ دو۔“

لفٹ میں فرازی نے کہا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ اس عورت

کا چھلانگ لگانے کے واقعات سے کوئی تعلق بنتا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“

”وہ صرف ایک گھنٹا یہاں رہی تھی۔“ فرازی نے

کہا۔ ”جبکہ گولڈویل اس کے جانے کے چار گھنٹے بعد تقریباً

ساڑھے سات بجے بالکونی میں گیا تھا۔“

لفٹ پندرہویں منزل پر پہنچی تو میں نے فرازی کو

آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اپارٹمنٹ کا تالا کھولتے ہوئے

فرازی نے کہا۔ ”تم دیکھو گے کہ وہ کتنی اچھی جگہ پر رہتا

تھا۔“

ہم گولڈویل کے لیوٹنگ روم میں داخل ہوئے جہاں

دو دیواروں کے ساتھ ایک بڑا سا ٹیبل ٹاپ صوفہ رکھا ہوا

تھا۔ شیشے کی ایک میز پر دو عدد اخبارات بھی نظر آ رہے

تھے۔ ہمارے بائیں جانب دو آرام کرسیاں رکھی ہوئی تھیں

جن کا شمار نوادرات میں کیا جاسکتا تھا۔ فرش پر ایک ایرانی

قالین بچھا ہوا تھا۔ فرازی نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی یہ ایک

عمدہ جگہ تھی۔

ہم اس بالکونی کی طرف گئے جہاں سے گولڈویل

نے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کی ریٹنگ چارفٹ اوٹ تھی۔

”ہمارا اندازہ ہے کہ اس نے کوئی پرچہ ڈھک چھلانگ

لگائی ہوگی۔“ فرازی نے کہا۔ ”ورنہ ریٹنگ تک نہیں پہنچ سکتا

تھا۔“

”میں تمہاری بات سمجھ گیا۔“ میں نے کہا۔ پھر ہم

دوسرے کمروں میں گئے لیکن وہاں ہمیں کوئی غیر معمولی

بات نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ بچن میں بھی ہر چیز ترتیب

سے رکھی ہوئی تھی۔

”اس نے ایک کمرے کو اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔“

فرازی نے کہا۔ میں نے اس کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں

ایک کپیوٹر، ایک کتابوں کی الماری، کچھ فائل کینینٹ تھے۔

فرازی نے بتایا۔ ”ان کینینٹ میں زیادہ تر ٹیکس کے

کاغذات اور کاروباری خط و کتابت کی فائلیں ہیں۔“

میں نے سرسری طور پر ان فائلوں اور کاغذات کو

دیکھا لیکن ان میں بھی مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔

”البتہ یہ کیفیت تین چار دن رہتی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ہمیشہ کی طرح خوش مزاج اور ہنس مذاق کرنے والا بن جاتا۔“ اس نے نشو سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

تین نے محسوس کیا کہ اس سے کافی سوالات کر چکا ہوں۔ اس لیے جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب دروازے پر پہنچا تو وہ بولی۔ ”میں صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ خبر میرے لیے بہت بڑا شاک تھی۔ ہم مٹی میں شادی کرنے کا پروگرام بن چکے تھے اور وہ شادی کرنے کے خیال سے بہت خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی میں وہ بیوی کی کمی محسوس کرتا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ہی خوش تھے بلکہ میں نے تو اپنی شادی کا جوڑا بھی منتخب کر لیا تھا۔“

”ایک بات اور؟“ میں نے اس کے دفتر میں آویزاں کیوس کے گلوے کی جانب اشارہ کیا جس پر انبر اینڈری کا کام ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک پیس میں میڈ کے لیونگ روم میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ”کیا تم نے ہی میڈ کے اپارٹمنٹ میں اسی طرح کا نیلے اور سفید رنگ کا نیڈل پوائنٹ آویزاں کیا تھا؟“

وہ پہلی بار مسکرائی۔ ”یہ میرا مشغلہ ہے۔ اس سے مجھے سکون ملتا ہے۔ میں نیکیوں اور چادروں پر بھی یہ کام کرتی ہوں اور ان پر دلچسپ کہاوٹیں اور مقولے تحریر کرتی ہوں۔“

”اس کا کیا مطلب ہے، جب کسی کو دھوکا دینا شروع کریں تو ہم کیسا کیلا حال بنتے ہیں۔“

”میں نے یہ عمارت کہیں پڑھی تھی۔ میں نے اسے فریم کر کے میڈ کو اس کی سالگرہ پر تحفے میں دے دیا۔ مجھے بھی اس کا ڈیزائن یاد ہے۔ وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر جب میں دوسری بار اس سے ملنے گئی تو اس نے وہ نیڈل پوائنٹ دیوار پر آویزاں کر دیا تھا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، اس نے ایسا کیوں کیا؟“

”یقیناً اسے نہیں کہہ سکتی۔ مجھے یاد آ رہا ہے۔ اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یہ مقولہ اس کے لیے خاص تھی رکھا ہے۔“

”اس نے دوسرے ملکوں میں بھی کام کیا تھا۔ اس نے بھی وہاں کی کوئی بات کی؟“

اس نے ٹی بی سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”صرف یہ کہا کرتا تھا کہ وہ اس کی زندگی کا ایک بند باب ہے۔“

واپس آیا تو ٹیلی فون پر جبری کا پیغام ملا۔ ”جسٹینا ہوف میسٹر نامی ایک خاتون نے میں جنوری کو فٹ ہنساک

پرواز کے ذریعے جان ایف کینیڈی انٹرپورٹ سے ملنے کے لیے سفر کیا تھا۔“

اگلی صبح میں نے اپنے لیے برلن کے لیے جمعے کی صبح کی پرواز کے لیے بلیک کروالی۔

وہ اتوار کی ایک خاموش صبح تھی اور میں برلن کے علاقے ہینٹگو ڈورف میں فونٹائش ٹراپی پر واقع ایک عمارت کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پہلے ہی ہوٹل سے فون کر کے جیسیلا کو بتا دیا تھا کہ میں اس سے اس کے حالیہ امریکی دورے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، میں نے مزید کہا کہ کئی سال پہلے تھا ڈیوس گولڈویل کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ضرور تجسس ہوئی تھی۔

”میں سارا دن گھر پر ہی رہوں گی۔“ اس نے دہرائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو۔“

جس عورت نے دروازہ کھولا، اس کی عمر تیس سال کے قریب ہوئی۔ وہ دروازہ پر کھڑی تھی۔ میں نے اپنے تعارف کروایا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا چلن تک آگیا اس نے بتایا کہ وہ چائے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی۔

ایک منٹ توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ”میں نے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں سفر گولڈویل سے ملنے گئی؟“

”مجھے کسی نے بتایا تھا۔“ میں نے نالائے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تم نے کس لیے نیویارک تک کا طویل سفر کیا؟“

وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”کچھ ایسی باتیں ہیں جن میں اسے بتانا چاہ رہی تھی۔“

جیسیلا نے اپنے اور میرے لیے چائے بنائی۔ گھبراہٹ کے باوجود وہ ایک اچھی میزبان ہونے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں نے پیگٹر پر ہنسی ہوئی سفید یونیفارم پہنی ہوئی وہ بولی۔ ”میں نیو یورک ٹیکس میں نرس ہوں۔“

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں میڈ گولڈویل کی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا۔ ”تم نے جو باتیں اس سے کہیں یقیناً اہم ہوں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ اہم ہی نہیں۔“

میں نے آئی سوچ کی روشنی میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی شکل اپنے باپ سے اتنی ملتی ہے۔ اسی کی طرح سنہرے بال، چوڑی پیشانی اور نیلی گول آنکھیں، میں سوچ رہا تھا کہ گولڈویل کو یہ محسوس کرنے میں کتنی دیر لگی ہوگی کہ غیر متوقع طور پر اس

کے اپارٹمنٹ میں آنے والی عورت اس کی بیٹی ہے۔

”میں وہاں کیوں گئی تھی۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کس طرح زندگی گزار رہا ہے۔ مجھے کچھ اور باتیں بھی معلوم کرنا تھیں۔“ پھر وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”گولڈویل میرا باپ ہے۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں وہ سب کچھ معلوم ہو گیا جو تم جانتا چاہ رہی تھیں؟“

”میں جو توقع کر رہی تھی۔ وہ اس سے بھی زیادہ پریشان کن نکلا۔“

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”وہ یقیناً ایک اچھی زندگی گزار رہا ہے۔ اسے امریکی حکومت سے معقول پینشن مل رہی ہے کیا ایسا نہیں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ سچ ہے۔“

”تم میرے باپ کو صرف ایک ساتھی کی حیثیت سے جانتے ہو لیکن تمہیں وہ سب کچھ معلوم نہیں جتنا میں اس کے بارے میں جانتی ہوں۔“

”تم اسے کس طرح جان سکتی ہو جبکہ پہلی بار اس سے مل رہی تھیں؟“

اس نے اپنا سر ہلایا اور بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو لیکن تاکہ میں اسے نہیں جانتی تھی لیکن مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا جو میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میں اپنے باپ سے پہلے کسی نہیں ملی لیکن میری ماں ہر وقت اسی کی باتیں کیا کرتی تھی۔“

جیسیلا کی ماں وہی عورت تھی جس کی تصویر گولڈویل کی جیب سے ملی تھی۔ اس نے یہ تصویر اہم سے نکالی ہوئی اور اسے دیر تک دیکھتا رہا ہو گا جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے نیوی اور بیٹی کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ سب جان لینے کے بعد وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے بالکونی سے چلا لنگ لگا دی۔

”میں اسے یہی بتانے گئی تھی کہ اس کے بارے میں میرے کیا خیالات ہیں اور یہ سب کچھ میں نے اپنی ماں کی خاطر کیا۔“

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”وہ مر چکی ہے سنہرے۔ اس کے انتقال کو کئی سال ہو چکے ہیں لیکن کیا تم جانتے ہو کہ اس نے مجھے کیا بتایا تھا۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے مجھے گولڈویل کی باتیں کیں۔“

مطلبی

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”اس نے کہا۔“ وہ میری زندگی میں آنے والا واحد مرد تھا۔ یہ بات اس نے بہتر مرگ پر کہی تھی۔“

میں نے چائے کا کھونٹ لیا اور اس کی بات غور سے سننے لگا۔

”بہر حال میری ماں نے اس کے لیے بہت کچھ کیا لیکن جنہیں نہیں معلوم کہ اس نے اسے دھوکا دیا اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ چلا گیا۔“

یہ کہہ کر جیسیلا ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر اس نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔ ”وہ 1986ء میں ملے تھے ان کی ملاقات مشرقی برلن کے ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بیچیس سال کی تھی۔ اچانک ہی وہ غیر ملکی اس کی میز پر آیا اور بولا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پوچھا کہ اس نے اتنا عمدہ انکراٹ کہاں سے خریدا ہے۔ قدرتی طور پر میری ماں اس تعریف سے خوش ہو گئی۔“

میں اس صورت حال کا تصور کر سکتا تھا۔ گولڈویل کو خواتین کی تعریف کرنے کا بہتر آتا تھا اور اس ضمن میں وہ اپنے تمام حربے آزماتا تھا۔

”اگلے نئے وہ پھر اسی کیفے میں آیا۔ اس زمانے میں مشرقی جرمنی کے لوگوں کو غیر ملکیوں سے راہ و رسم رکھنے کی ممانعت تھی لیکن میری ماں بہت ہی بھولی تھی۔ ایک مرحلے پر اس نے اسے اپنی ملازمت کے بارے میں بھی بتا دیا کہ وہ اسٹاشی کے ہیڈ کوارٹر میں سیکریٹری ہے۔“

ساری بات میری سمجھ میں آئی کہ کس طرح گولڈویل نے ان فائلوں تک رسائی حاصل کی ہوگی۔

”ان کے درمیان افیئر شروع ہو گیا سنہرے۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ ایک ساتھ باہر جانے لگے۔ گولڈویل کا قاعدگی سے مشرقی برلن آنے لگا اور اس کے لیے تحائف بھی لے کر آتا۔ گوکہ میری ماں کبھی اسے اپنے گھر لے کر نہیں گئی لیکن میرے باپ کے پاس شہر میں اپنی جگہ تھی جہاں وہ وقت گزارتے تھے۔“

اس کی یہ بات درست تھی۔ مشرقی برلن میں ہمارے کئی سیف ہاؤس اور اسٹور تھے کیونکہ پیسے سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔

”اسے میری ماں کی چاہت نہیں تھی۔ وہ صرف معلومات چاہتا تھا اور میری ماں انھوں کی طرح اسے وہ تمام معلومات فراہم کرتی رہی جو اس نے مانگیں۔ میری ماں

کیا تھا شاید وہ دہری زندگی کا دباؤ برداشت نہ کر سکا۔ اس کے بعد میں نے اس سے کام لیتا چھوڑ دیا لیکن اسے کبھی بھلا نہ سکا کیونکہ میں نے اس کے کہے پر یقین کر لیا تھا جب اس نے کہا کہ وہ صرف دوسرے اس لڑکی سے ملا۔ اس کے علاوہ کبھی کسی دوسری عورت سے اس کا تعلق نہیں رہا۔ مجھے یاد آیا کہ گولڈویل نے بھی ایک دفعہ اسی قسم کا دعویٰ کیا تھا۔

”ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایک نیک مقصد کے لیے ہے۔“ اس نے یہ بات ایک ڈنر کے موقع پر کہی جو کہ ہمارے ہیڈ کوارٹر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ جہاں ہم کبھی بھی جمع ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گولڈویل نے اس عورت کو بھی اپنے فرض کی تکمیل کے لیے استعمال کیا اس پر مجھے گولڈویل کے کیونگ روم میں آؤں اور وہ ڈیکوریشن چیں اور اس پر لکھا ہوا مقولہ یاد آ گیا جس میں کیلے جال کے الفاظ استعمال کیے گئے جب میں نے اس کا موازنہ مشرقی برلن کے ایک نچلے درجے کے ہلکار سے کیا تو احساس ہوا کہ ہم سب نے اپنے مقصد کے لیے ایسے جال استعمال کیے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرا ایجنٹ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گیا جبکہ گولڈویل کی بیوی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی اور اسے قتل میں شدید ذہنی اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں وہ نفسیاتی مریض بن کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور جب گولڈویل کی بیٹی نے اسے ان حالات سے آگاہ کیا تو احساس جرم سے مضطرب ہو کر اس نے خودکشی کر لی لیکن گولڈویل کے نیک مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کیا وہ واقعی مجرم تھا؟

میرا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے پانی کے ساتھ اسپرین کی دو گولیاں نگلیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیڑی ابھی تک اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ بھی اپنا کام نکل جانے کے بعد مجھے بھول گیا ہے۔ شاید یہی اس دنیا کا دستور ہے۔ یہاں سب اپنی غرض کے غلام اور مطلبی ہیں۔ مطلب نکل جانے کے بعد کسی کو یاد نہیں رہتا کہ جسے انہوں نے اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے، اس سے ان کا کیا تعلق تھا۔ گولڈویل میں اور جیڑی۔ ہم سب ایک جیسے ہیں مطلبی ہیں۔

میں نے دور سے ہی جیڑی کو ہاتھ ہلایا اور لاؤنچ سے باہر نکل گیا۔

کہ مشرقی جرمنی کی پولیس میں فیلڈ رہے کا ہلکار تھا۔ ”کیا تم میری بات سن رہے ہو کبیر؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“

”اس وقت میرے ذہن میں تقریباً اعزازات ہے۔“ جیڑی نے کہا۔ ”وہاں ڈائریکٹر بھی ہوگا اور وہ میڈل دینے سے پہلے کچھ کہنا چاہتا ہے گا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ گولڈویل نے اپنی زندگی کا خود خاتمہ کیا لیکن اگر یہ اسی طرح ہوا ہے۔۔۔“

”یہ ایسے ہی ہوا ہے جیڑی۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اس کے سوا اور کوئی بات نہیں۔“

”اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کا میڈل منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر کئی سوالات اٹھیں گے۔ وہاں دوسرے لوگ بھی ہوں گے جو ڈائریکٹر سے اپنے تحفے وصول کریں گے۔ اس صورت حال میں ہم کیا کریں گے۔“ اسی وقت اس کے دوست لاؤنچ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک جیڑی کو کہہ کر اس کی طرف بڑھا تو وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”معاف کرنا مجھے اس سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔“ پھر وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا چہرہ کیوں زرد ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ تم رات کو شیش طرح سے نہیں سو سکے۔“

جیڑی کے جانے کے بعد میں نے پھر اس شخص کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جس میں نے اپنے کام کے سلسلے میں بھرتی کیا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ شخص تھا اور اس کی تین بیٹیاں بھی تھیں لیکن اپنے دفتر کے ٹیلی فون سے کئی غیر محتاط فون کالز کرنے کی وجہ سے وہ ہماری سیکورٹی ایجنسی کے جاسوس کی نظر میں آ گیا تھا۔ میری اس سے ملاقات مشرقی برلن کے ایک پارک میں ہوئی جہاں ہم دونوں گئے درختوں کے نیچے ایک بیچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کسی لڑکی سے معاشرہ چل رہا ہے لیکن میں نے اس کوئی موقع نہیں دیا۔

وہ باتو ہمارے لیے کام کرنے پر تیار ہو جائے ورنہ دوسری صورت میں اس کی بیوی اور بیٹیوں کو اس کی محبوبہ کے بارے میں بتا دیا جائے گا جب وہ سر ہلا کر نہیں نہیں کی گردان کر رہا ہو تو میں نے اسے دھمکی دی کہ اس کی بیوی کو وہ تمام ٹیلی فون کال سنوا دی جائیں گی جو وہ اپنی محبوبہ کو کرتا رہا ہے۔ بالآخر چپکے سے ہونے ہمارے لیے کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ وہ بھی بھی ہمیں کوئی حقیقی معلومات فراہم نہ کر سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو

رہے تھے۔“

”اور تم نے اپنے باپ کو یہ سب باتیں بتا دیں؟“

”جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اسے امریکا میں ایک ہیرو کی طرح دیکھا جاتا تھا جو کچھ میری ماں نے کیا۔ اس کی سارا کریڈٹ وہ لے گیا۔ میں حیران ہوں کہ وہ اسی طرح کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔“

مجھے مریم کی بات یاد آ گئی کہ اس پر کبھی کبھی افسردگی کا دورہ پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اس کا احساسِ پشیمانی تھا لیکن اس کا دورانیہ بہت مختصر ہوا کرتا تھا۔

”تمہارا باپ مرچکا ہے جیڑی۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے رخصت ہونے کے چار گھنٹے بعد اس نے بالکل سب سے چھلا لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔“

میں اس کے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے تیار تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھیل گئیں۔ اب اسے ساری عمر اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا تھا کہ اپنے باپ کی خودکشی میں اس کا بھی حصہ ہے جب وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے تہا چھوڑ دیا جائے رخصت ہونے سے پہلے میں نے اسے اپنا پتا دیا اور کہا کہ وہ کسی مئی وقت مجھے فون کر سکتی ہے۔

”ہوں۔ تو اس کی ایک مینی بھی ہے۔“ جیڑی نے ہر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ نہیں جانتا تھا بلکہ ہم میں سے کسی بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ وہ اپنے معاملات خفیہ رکھنے میں بہت ہوشیار تھا۔“

وہ مشکل کی سہ پہر تھی اور میں واپسی میں آٹھ گھنٹے کے لیے واشنگٹن میں رک گیا تھا تاکہ جیڑی سے دوبارہ ملاقات کر سکوں۔ ہم کلب کے ایک لاؤنچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے کبیر؟ کوئی چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے؟“

”کچھ نہیں، سر میں ہلکا سا درد ہے۔ ویسے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

جیڑی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میرے سر میں اس وقت سے ہی شدید درد تھا جب میں اتوار کی شام جیڑی کے ایئر مشن سے واپس آیا تھا۔ میں نے ہونٹ کے بارے میں ڈیڑھ گھنٹے کی مانی اس ایجنٹ کی یاد کو ذہن سے نہ نکال سکا تھے میں نے بھرتی کیا تھا۔ میں اسے بھی نہیں بھول پایا تھا۔

نے اس کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ جب اسے مطلوبہ معلومات مل گئیں۔ گولڈویل نے میری ماں کو جھانسا دیا کہ وہ مغربی جرمنی جانے میں اس کی مدد کرے گا۔ وہ خود ایک بہتر زندگی گزارنے کی خواہش مند بھی لہذا اس کی باتوں میں آگئی۔ اس وقت تک وہ حاملہ ہو چکی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کا بچہ یعنی میں آزاد اور پرسکون فضا میں سانس لے سکوں۔“

”کیا وہ جانتا تھا کہ تمہاری ماں حاملہ ہے؟“

”ہاں نے اسے بتا دیا تھا۔“ جیڑی نے لہجے بھر کر کہا۔

”لیکن تم جانتے ہو کہ کیا ہوا؟“

میں جانتا تھا۔ مجھے وہ خط اور اخباری رٹا شے یاد آ گئے جو گولڈویل کے ایئر مشن سے ملے تھے۔

”اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس کا انتظار ہی کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ اس نے میری ماں کو تہا چھوڑ دیا پھر اسٹاسی پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔“

مجھے جیڑی کے وہ ریمارکس یاد آئے جو اس نے گولڈویل کی ہر جاتی فطرت کے بارے میں کہے تھے۔ وہ کبھی کسی ایک کا ہو کہ نہیں رہا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو شاید اب تک مریم کی جگہ کوئی دوسری لڑکی اس کی زندگی میں آچکی ہوتی۔

”میری ماں سے کبھی ختم نہ ہونے والی تفتیش شروع ہو گئی۔ اسے رات بھر جگا دیا جاتا۔ دوسرے قیدیوں سے ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک طویل عرصے تک وہ ایک ایسی زیر زمین کوٹھڑی میں قید رہی جہاں پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔“

مجھے وہ سب کہانیاں یاد آ گئیں جو ان زیر زمین کوٹھڑیوں کے بارے میں سنی تھیں۔ ان میں پانی بھرا ہوتا تھا اور جو خوش قسمت وہاں سے زندہ بچ نکلے میں کراہ بجاتے، وہ انہیں آبدوز کے نام سے یاد کرتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”لیکن اس کے بعد تو دیوار برلن گرا دی گئی تھی۔“

”یہ نومبر 1989ء کی بات ہے۔ وہ سیاسی قیدی تھی۔ اس لیے فوراً ہی رہا کر دی گئی۔ سب سے پہلے اس نے مجھے تلاش کیا۔ متعلقہ حکام نے میرا خاندانی نام تبدیل نہیں کیا تھا لہذا میں اسے آسانی سے مل گئی۔ لیکن جیل میں گزارے ہوئے ڈھائی سالوں نے اسے تیار کر دیا تھا اور وہ جسمانی سے زیادہ نفسیاتی مریض بن گئی تھی۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے بہت معمولی کام کرنا پڑا



آوارہ گرد

قسط 21

ڈاکٹر عرب الارب بھٹی

مندن کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور انا تھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں دکھایا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ پوریا ہے... استحصا کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلا حی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گہات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے پرتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... ہل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریک اشتراکیت میں رہبر ڈاکٹر عرب الارب بھٹی

تلاش غنیم جاری تھی۔

باوجود اس کے کہ مجھے اطمینان تھا کہ وزیر جان کو بس ہم تھوڑی ہی دیر میں چھاپے والے تھے، لیکن پتا نہیں کیوں اس کی تلاش میں میری بے چینی اور جوش آسمان کو چھو رہا تھا۔ حالانکہ میں اپنے اصل مشن میں کامیاب ہو چکا تھا، جس کا ثبوت وہ بلیک کو برا فائل تھی جو میرے سینے سے چسکی ہوئی تھی، مگر وزیر جان کو جلد از جلد تلاش کرنے کا ایک جنون میرے سر پر سوار تھا۔ میری اس کیفیت کو والی خیر سمجھ رہا تھا، تاہم وہ اور شکلیہ خاموش تھے، جبکہ میں اور میجر باجوہ آپس میں وزیر جان کے متعلق ہی گفتگو کر رہے تھے۔

صبح کا ذب کی روشنی چہرہ سوجھنے لگی تھی۔ مفرور وزیر جان کی تلاش میں ابھی ہمیں چند ہی سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ اچانک اس کے قدموں کے نشان ایک مقام پر گڑھ سے ہو گئے۔ جیپ رک گئی، ہم سب نیچے اتر آئے اور یہ غور زمین پر کچھ دیکھنے لگے۔

”گاڑی کے ٹائروں کے نشانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر اس کا کوئی ساتھی اسے لینے آچکا تھا، گو... گو“۔ میجر ریاض باجوہ نے جلدی سے کہا اور ہم سب دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔

میری بے چینی اور جوش ایک مرتبہ پھر سوا ہونے لگا۔ وزیر جان کا کسی گاڑی میں فرار ہونے کے انکشاف نے میری اُمیدیں مابعد کر دی تھیں۔ میں نے اُٹھے ہوئے لیج میں کہا۔ ”لیکن میجر صاحب! سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کے ساتھی کو اتنا موقع کیسے ملا کہ وہ پاور کے اینجنوں کے چلنے کے دوران ایک عدد گاڑی لے کر خاموشی سے فرار ہو گیا؟ اس پر مستزاد وہ وزیر جان کو لینے ٹھیک اسی مقام پر بھی پہنچ گیا؟“

میری بات پر وہ یہ دستور جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار اپنی نظریں جمائے ہوئے بولے۔ ”یہ کوئی نامکن سی بات نہیں ہے۔ اسٹیشن فور میں یقیناً اسی طرح کا کوئی دوسرا خفیہ راستہ بھی ہوگا، موصوع ملے ہی اس کا ساتھی نکل بھاگا۔ ڈرائیور یا اسی طرح کے کسی رابطے پر ہی ان دونوں کا اتصال ممکن ہوا ہوگا۔“

”حیرت ہے، پھر چوہدری ممتاز نے ایسے کسی موقع سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا تھا؟“

میرے منہ سے فوراً نکلا تو میجر صاحب زہریلی مسکراہٹ سے بولے۔ ”اس کا آسان سا جواب ہے کہ اُسے موقع ہی نہ ملا اور پھر ہم نے بھی تو اُسے ایسے کسی موقع

سے فائدہ اٹھانے کے لیے کہاں چھوڑا تھا۔ وہ جلد ہی ہمارے نرے میں آ گیا تھا۔“

ابھی ہم نے یہ مشکل تین چار کلومیٹر کا ہی راستہ طے کیا ہوگا کہ ہمیں دور ہی سے کسی آبادی کے آواز نظر آنے لگے۔ جس کے قریب سے ایک ایسی ذیلی سڑک ٹوڑی تھی جو سیدھا ملتان روڈ سے ملتی تھی۔ ہم اس سڑک پر پہنچے تو میجر باجوہ نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کا حکم دیا۔ ایک بار میجر جیپ سے اتر کر ہم مذکورہ گاڑی کے ٹائروں کے نشانات کا تعین کرنے لگے۔ تب اس کی سمت کا اندازہ ہوا۔

وزیر جان جس گاڑی میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ فرار ہوا تھا وہ ملتان روڈ کے رخ پر مڑ گئی تھی۔

پختہ سڑک پر آتے ہی میجر باجوہ نے ڈرائیور کو جیپ دوڑانے کی ہدایت کر دی۔ ساتھ ہی وہ اپنے وائٹس سیٹ پر کسی ساتھی کو کچھ ہدایات بھی دینے لگے۔

یہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ آنے جانے والی گاڑیاں ہمیں بہت قریب سے کراس کر رہی تھیں۔ مگر ڈرائیور بڑی مہارت سے جیپ کو طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ اگر میجر باجوہ درست سمت پر سوچ رہے تھے تو شکار ہم سے اب بھی زیادہ دور نہیں ہوتا چاہے تھا۔ اور پھر جلد ہی میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔

ملتان روڈ کا الحاق ابھی چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ جیپ کا ذب کا وقت ہونے کے باعث اس روڈ پر ٹریفک کی آدک جاوک بھی نہ ہونے کے برابر تھی، ہم سے آگے جانے والی گاڑیوں میں ایک تو مسافروں سے کچھ بھرپور تھی، دوسری جو یقیناً کسی قریبی بستی سے صبح ترکے روانہ ہوئی ہوگی، جبکہ باقی دو چار گاڑیوں میں سے ایک بجوسے سے لدا چند افراد تھا اور دوسرا ٹریکٹر۔

لیکن انہیں کراس کرتے ہی ہمیں ایک کار ضرور دکھائی دے گئی جس کی رفتار خاصی حد تک ”مشکوک“ تھی۔

اس کار کو دیکھ کر میجر باجوہ نے فوراً ڈرائیور کو جیپ کی رفتار بڑھانے کا حکم دیا۔

مشکوک کار کا تعاقب شروع ہو گیا تھا اور درمیانی فاصلہ بے لمحہ کم پڑتا جا رہا تھا۔ میجر باجوہ نے ڈرائیور کو دھم دیا کہ ہمارے دیکھنے کا مقصد یہی تھا کہ اگر وہ مطلوبہ کار نہ ملے تو اپنے پیچھے آنے والی ریجنرز والوں کی مخصوص جیپ دیکھ کر اپنی کار روک دے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ آگے والی کار کے ڈرائیور نے رفتار مزید بڑھا دی۔ ہمیں ایک دھچکا لگا کہ میں صرف ایک ہی فرد تھا، اور وہی ڈرائیور کی سیٹ سنبھالے

ہوئے تھا۔ جبکہ مطلوبہ شخص یہی لگتا تھا۔ کیونکہ ہمارے بار بار ہارن دینے پر بھی نہیں رک رہا تھا۔ ورنہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو وہ اپنے پیچھے آنے والی پولیس یا ریجنرز کی گاڑی کو دیکھتے ہی فوراً گاڑی روک دیتا۔

لیکن اس نے کار کی رفتار بجائے کم کرنے کے اور بڑھا لی تھی۔ اب صورت حال بڑی عجیب سی ہو گئی تھی۔ مشکوک کار بھی یہی معلوم ہوئی تھی۔ لیکن ہماری توقع کے خلاف اس میں ایک ہی آدمی سوار تھا اور وہ بھی صرف ڈرائیور۔ اس کے ساتھ وزیر جان کو بھی ہونا چاہیے تھا۔

”مجھ میں نہیں آ رہا، اگر یہ ہماری مطلوبہ گاڑی نہیں ہے تو پھر یہ اپنی کار روک کیوں نہیں رہا ہے؟“ میجر باجوہ نے اُٹھے ہوئے لیج میں کہتے ہوئے اپنے ہونٹ پر سوچ انداز میں ہنسنے لگے۔

”ہو سکتا ہے یہ ہمارا مطلوبہ شخص نہ ہو کوئی اور ہو۔ اور کسی خوف کے باعث کار نہیں روک رہا ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا تو اس بار اول تجربی بولا۔

”ریجنرز کی گاڑی اپنے تعاقب میں آتے دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ وزیر جان سیٹوں کے درمیان نہیں سیکڑتے کر بیٹھ گیا ہو؟“ اس کا نقطہ بھی قابل غور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میجر نے اپنے ایک ساتھی کو آگے جانے والی کار کا ایک ٹائرفلیٹ کرنے کا کہا۔ اس نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک ہی گولی نے کام کر دکھایا۔ ایک دھماکے سے کار کا ٹائر برست ہوا اور وہ دائیں بائیں ڈولنے لگی۔ ہم بھی اپنی جیپ کی رفتار کم کرنا پڑی جبکہ کار ڈولتی ہوئی ٹھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ ہماری جیپ قریب پہنچ کر رک گئی اور ہم سب نہیں تانے نیچے اتر آئے۔ میجر باجوہ کے دوسرے بھائی کی سی پھرتی کے ساتھ کار کی سمت بڑھے اور ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ سب سے پہلے اس کی جامد تلاشی لی گئی، اس کی جیب سے کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئیں جن سے ثابت ہو گیا تھا کہ وہ اسٹیکٹر کا ہی کارندہ ہے۔ ایک کارڈ سے یہ بات واضح ہوئی تھی جو اسٹیکٹر کے مخصوص مونیٹر گرام کا تھا۔ ایک پستول بھی برآمد ہوا تھا۔

میں نے اور والی خیر نے کار کی بھی تلاشی لی۔ سیٹوں سے لے کر کار کی ڈیکی بھی دیکھ ڈالی مگر وزیر جان کا پتا نہیں تھا۔ اس عجیب صورت حال نے ہمیں اُلجھا سادیا تھا۔ شواہد یہی بتا رہے تھے کہ وزیر جان کو اپنے اس کارڈ والے ساتھی کے ساتھ موجود ہونا تھا، مگر وہ یہاں سے بھی گدھے کے سر سے نیلگ کی طرح غائب تھا۔

پاور کے دونوں اہلکاروں نے کارندے کو دوبارے چرکھا

آوارہ گود

تھا پھر اسی طرح میجر باجوہ کے سامنے پیش کر دیا۔ میں یہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

”وزیر جان کو کہاں اور کس مقام پر تم نے آتارا ہے؟“ انہوں نے بار بار اور ٹرک دار آواز میں اس سے دریافت کیا تو وہ بولا۔

”مجھے پاس کے بارے میں نہیں معلوم۔ میں تو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تھا۔“

”تم لوگ ختم ہو چکے ہو۔ اور تمہارا پاس وزیر جان بھی نہیں بچ سکا۔ اب اسی لیے جتنا دور در میں تمہارے منہ سے جھگڑاؤں کے لیے کسی بھی طریقے سے کریز نہیں کروں گا۔“ میجر ریاض باجوہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ بجائے ان کی بات کا جواب دینے کے ڈھٹائی سے بولا۔

”آپ لوگوں کی یہ باورائے قانون کارروائی کسی بھی طرح ایک آزاد ریاست کے زمرے میں نہیں آتی۔ جہاں ہر کسی کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔“

مجھے اس کی چالائی پر غصہ آنے لگا، اس کی گفتگو سے مجھے یہی اندازہ ہوا کہ یہ وزیر جان کا کوئی قریبی ساتھی ہی تھا۔ میجر باجوہ نے اسی طرح بار بار انداز میں کہا۔

”اب تم لوگوں کا یہ حربہ نہیں چل سکتا۔ اس لیے کہ تم لوگ نوادرات کی آڑ میں یہاں کیا کل کھارہے ہو، اس کا ثبوت وہ بلیک کو برا فائل کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اب تم اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیے بغیر جتنا دو۔“

میری یہ غور بحثی نظروں نے تاڑ لیا کہ وہ غیر معمولی اعتماد کا مظاہرہ کر رہا تھا، بولا۔ ”اُس بلیک کو برا فائل کو بنیاد بنا کر اگر اس بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارے کے خلاف کارروائی کی گئی ہے تو یہ تمہاری ایک خطرناک بھول کے سوا کچھ نہیں۔“

”سرا! یہ جان لو مجھ کو ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے میرے حوالے کریں، میں ابھی اس کے منہ سے اُلگا لیتا ہوں۔“ میں نے اس چالاک کارندے کو پریش نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو میجر صاحب نے مجھے مخصوص اشارہ کر دیا۔

میں جیسے پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ گرفت خاصی مضبوط تھی، جس سے اس کی آنکھیں ملٹتوم سے باہر اُبل پڑنے کے قریب ہو گئیں۔

”تم لوگوں کا یہ ڈراما ختم ہو چکا ہے۔ تمہارا وہ بھارتی اہلکار سندھو اس بھی ہماری گرفت میں ہے، اور کیٹیا ایجنٹ

ممتاز خان بھی۔ اب بس ہمیں اپنے جواب کا انتظار ہے، بولو، کہاں چھوڑ کر آئے ہو اپنے اسٹیشن چیف کو؟ خبردار اب کوئی غیر متعلقہ جملہ منہ سے ہرگز مت نکالنا۔“

میری بات پر اس نے ایک بار پھر اپنی وہی بکواس کرنا چاہی تو میں نے اس کے جڑے پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے گراہ خارج کرتا ہوا چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔ مگر میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے پھر دیوچ لیا۔ میرے ایک ہی گھونے نے اس کا چہرہ بگاڑ رکھ دیا تھا۔ میں پھر غرا کے بولا۔

”جواب دو گے یا تمہیں اسی طرح تھمتہ مشق بنانا رہوں۔“

”تم... تم میرے ساتھ غیر قانونی حرکت کر رہے ہو۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

میں نے اس بار ایک مٹکا اس کی ناک پہ بھی جڑو دیا۔ وہ بری طرح تھج مارے گرا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ڈرامے کر رہا تھا، ورنہ اسپیکٹرم کے کارندے اتنے نازک جاں نہیں تھے کہ تھرڈ ڈگری کی اس مار پر درد اور تکلیف کے مارے جیتنے چلانے لگتے۔ اس نے اپنے معزوب چہرے پر ہاتھ رکھ کر خود کو زمین پر گرا دیا۔ میں دانت چپس کر اس پر جھکا مگر اس نے بجلی کی سی ٹھٹھری سے مٹی اپنی مٹھیوں میں دبا کر میرے چہرے پر اچھال دی۔ جو میری آنکھوں سمیت تھوڑی بہت منہ اور ناک میں مٹس گئی۔ میں عارضی طور پر دیکھنے سے قاصر ہو گیا اور کھانسنے لگا۔ اسی وقت مجھے اس کارندے کی کریہہ انگیز چیخیں سنائی دیں، شاید کسی ساتھی نے اس پاداش میں اسے گٹ لگا دی تھی جبکہ مجھے اول خیر نے سنبھالا اور ٹھیکہ جلدی سے جیب کے اندر موجود پانی کی بوتل لے آئی اور میرے منہ پہ پانی کے جھینٹے مارنے لگی۔ میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا مگر میری آنکھوں میں جلن اور تھنوں میں خارش سی ہو رہی تھی۔ مجھے جھپکیں بھی آئیں۔ کچھ حالت سنبھلی تو دیکھا میجر باجوہ کے دونوں ساتھیوں نے کارندے کو دیوچ رکھا تھا۔

بالآخر طے پایا کہ اسے ہیڈ کوارٹر لے جا کر ہی منہ کھلوایا جائے۔ میں اس ناکامی پر بری طرح جھٹلا ہوا تھا۔ وزیر جان کے اس طرح ہاتھ آتے آتے چٹنی پھٹکی کی طرح نکل جانے پر مجھے تھلاہٹ سی ہو رہی تھی۔ مگر اسپیکٹرم کے کارندے پر اس طرح سرعام تشدد کرنا پاور والوں کے لیے مناسب نہ تھا۔ لہذا کوئی چارہ نہ پا کر مجھے بھی خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ البتہ روانہ ہوتے وقت میں نے باجوہ صاحب

سے کہا۔

”سرا اس طرح تو یہ بد بخت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ وقت ضائع ہونے کی صورت میں وزیر جان بہت دور نکل چکا ہوگا۔“

”نہ گھر، نہ شہری، وہ اب ویسے بھی نہیں بچ سکتا۔“ میجر باجوہ نے پرامتداد لہجے میں کہا۔ ”وہ اب بے خانماں و برباد ہو چکا ہے۔ میں اس کی ذاتی رہائش گاہ کی نالاج کو بھی میل کرانے کے احکامات جاری کیے دیتا ہوں۔ چلو اب۔“

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خدا نے میں آج اسپیکٹرم کے خلاف ایک بڑی کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ چوہدری ممتاز کا اس طرح گرفت میں آنا اور سب سے اہم بات کہ وہ اہم فائل ہمارے قبضے میں آچکی تھی جو اسپیکٹرم کی پوری لوکل کمانڈر سمیت، چوہدری ممتاز خان اور وزیر جان کے گٹے کا پھندا بننے والی تھی، یہی نہیں بلکہ تلسی کا ایک اہم اور ناپ ایکٹ سنڈر داس بھی ہماری گرفت میں آچکا تھا۔ اب صرف وزیر جان ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس کی نئی کارندہ بھی پاور والوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے، کچھ مارے گئے تھے۔ بہر حال ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اسپیکٹرم کے کارندے کو بھی راس پر بند کر دیا گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد میں نے میجر باجوہ سے ان عوامل پر تبادلہ خیال کرنا ضروری سمجھا کہ اس کا شاہ آب آئرش کے بعد اس کے منفی یا مثبت اثرات عائدہ اور میرے کشدہ باپ پر کس حد تک مرتب ہو سکتے تھے؟ اس پر وہ مجھے سب سے درست کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے سکے اور کہا کہ جب تک ان کا ایک اہم فہرہ وزیر جان قابو میں نہیں آجاتا، کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

ابھی تک قرائن اور مختلف شواہد سے یہی نظر آتا تھا کہ اسپیکٹرم کی لوکل قیادت میں بے شک ممتاز خان کی بھی حیثیت اپنی جگہ اہم جاتی جاتی تھی، لیکن کلیدی حیثیت، ہمیشہ وزیر جان کو ہی حاصل رہی تھی، لوکل کمانڈر کی حد تک ہی نہیں بلکہ اسپیکٹرم کی عالی قیادت تک یہ باتیں محض قیاس پر ہی مبنی نہیں تھیں، گرفتار شدہ افراد نے بھی یہی کچھ آگاہا تھا۔ بلکہ نئی ایک نے تو یہاں تک بھی بتایا کہ اسپیکٹرم میں لولوش کے بعد وزیر جان کو ”نامز“ تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہذا اس کی اہمیت کو مددگار رکھتے ہوئے اس خدشے کا بھی احتمال تھا کہ ممکن ہے وزیر جان بیرون ملک فرار ہونے کی بھی کوشش کر سکتا تھا۔ یا پھر کوئی دوسرا قدم اٹھانے کی کوشش کرتا۔

ہم تینوں واپس اپنے کوارٹر میں آ گئے۔ میں بہت

تھکن محسوس کر رہا تھا۔ ٹھیکہ ٹاشا بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں نے نہا کر حوکر عام کپڑے پہنے اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ مجھے شدید تھکا ہوا پکا کر اول خیر نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

میں نے اپنا سیل اور ای میل وغیرہ چیک کیا، پھر آنرہ خالدہ سے رابطہ کرنا چاہا مگر نہ اس کی کوئی ای سیل آئی تھی نہ ہی اور کوئی میسج۔ اس سے رابطہ بھی نہ ہو سکا۔ عابدہ کے بارے میں وہی مجھے پل پل کی خبر سے آگاہ کرتی تھی، نیز سرمد بابا اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے، لہذا اب عابدہ کے سلسلے میں آنرہ خالدہ ہی میری آخری امید تھی۔ میں اُسے سرمد بابا کی موت کی اطلاع دے چکا تھا۔

عابدہ کے متعلق سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ جاگ تو دوپہر ہو چکی تھی۔ مجھے جائتا پا کر ٹھیکہ چہرے پہ مسکراہٹ لیے کرے میں آ گئی۔

”چچا کیا تم نے آرام کر لیا۔ بہت تھکے ہوئے تھے تم اسی لیے میں نے ناشتے پر جگا نہیں خیر، کھانا تیار ہے۔“

”ہاں یار! لگا دو کھانا۔“ میں نے کہا پھر اول خیر کا پوچھا۔

”وہ پہلے ہی کھانے کی میز پر براجمان ہو چکا ہے۔“ ٹھیکہ نے کہا۔

میں کچن سے ملحقہ بڑے لاؤنج میں آ گیا جہاں ایک طرف ڈائننگ ٹیبل بھی ہوئی تھی۔ اول خیر اٹھاک سے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

”خیریت ہے، ایسی کیا خاص خبر ہے یہی۔“

”یہ اپنے خان صاحب کے متعلق خبر تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے وزیر خان سے متعلق؟“ میں نے ذرا توجہ کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لوکا کے اہم بھی پڑھ لو۔ وزیر خان پر پچھلے دنوں قانع کا حملہ ہوا تھا، اب اسپتال سے مگر آ گیا ہے۔ اپنی کھلاں والی حویلی میں۔“ میں اس کی بات پر چونکا۔ کھلاں والی سے مجھے کچھ اور بھی یاد آ گیا تھا۔ ایک بہت اہم بات، جو ہوئی میں عید سے ملاقات پر میں نے اس کے منہ سے سنی تھی۔ جب اس نے مجھے سنڈر داس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وزیر جان، لولوش کی طرف سے اُسے اسپیکٹرم کا ”ویڈر ایجٹ“ کا عہدہ تفویض کرنے کے بعد، کھلاں والی میں زیر قیام ایک نئے زیر واد میں منتقل کر دے گا۔ میں اس پر چونکے بیٹا نہ ہاتھ مگر اس وقت حالات ایسے

آوارہ گرد

تھے کہ میں اس سے مزید کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اور جلد ہی بھی کیا تھی، مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ عید کی اتنی ہی لمبی ہوئی تھی۔ تاہم اب وزیر خان سے متعلق خبر پر اس کی آبائی حویلی کا خیال آیا تو مجھے یاد آ گیا۔

میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے لیا اور خبر تفصیل سے پڑھی، جس کے مطابق وزیر خان پر قانع کا شدید حملہ ہوا تھا۔ ایمر جی میں اُسے لاہور کے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں وہ دس بارہ دن داخل رہا تھا اور اب واپس اپنے آبائی گاؤں ”کھلاں والی“ آ گیا تھا۔ انسان کی زندگی میں تو یہ سب چیزیں چلتی رہتی ہیں، کبھی خوشی کبھی غم۔ مگر میری سوئی اسپیکٹرم کے اس نئے زیر وادس پر ایک کرہ کئی تھی کہ آخر یہ کیا معاملہ تھا؟ کس نے کھلاں والی کی زمین وزیر جان کو بیچی تھی؟ اور کس کی اجازت سے؟

نئی اول جہاں روکھنا والے معاملے کے بعد سے میری دوبارہ وزیر خان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی فون پر کوئی بات ہوئی تھی۔ جبکہ میں یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ تسلیم والے معاملے کے دوران ہی یہ بھانڈا اچھوٹا تھا کہ وزیر جان کھلاں والی کی جاگیر یا اس کی زمین کا ٹکڑا خریدنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ بلکہ وہ ہر قیمت پر ایسا کرنا چاہتا تھا۔ اور مجھے یہ اس کے کسی اور جتنی منصوبے کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جس کے نتیجے میں وزیر جان نے اپنی جیتی بیوی سعیدہ کو تسلیم کے ساتھ خفیہ ساز باز میں لگا رکھا تھا۔

”او خیر کا کہ اٹو اس خبر کو کس نے کہاں کھو گیا۔ خیریت تو ہے؟“ میں اول خیر نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میرے اندر ایک فلم سی چل رہی تھی۔ میں ذرا چونکا اور سر جھٹک کر بولا۔

”کچھ نہیں یار! وزیر خان کے ذکر پر ایسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔ پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔“

اس اثنا میں ٹھیکہ کھانا ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ کھانے کے دوران میں نے وہ بات ان دونوں سے بھی شیئر کر دی۔

”اب کیا فائدہ اس کے بارے میں سوچنے کا۔“ اول خیر بولا۔ ”اسپیکٹرم کا یہاں یہاں تک گیا۔ اب یہ وزیر جان بچا ہے، وہ بھی کب تک بچے گا، بلیک کوبرا فائل کی صورت میں اس کے خلاف پاور والوں کے ہاتھ محسوس ثبوت لگ چکے ہیں۔“

”پھر بھی یار! آخر پتا تو چلے کھلاں والی میں کون سی جگہ ان لوگوں نے اپنے نئے زیر وادس کی داغ بیل ڈالی تھی اور کس کے مل بوتے پر؟“ میں نے پڑ سوچ لہجے میں کہا تو اول خیر کے بجائے ٹھیکہ تجھدی سے بولی۔

Italiano®

Permanent Hair Colour Cream

Colour Your Life

Elisa Gupta

- ✓ Gives strength to hair
- ✓ Soft and glossy hair
- ✓ Even coverage
- ✓ No greys



Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner

*Available in 10 Different Shades

مجھے بھی شاک پہنچا ہے۔“ وہ بولی۔ ”عابدہ کا کس عدالت میں پیش ہونے والا ہے۔ اور اس میں سیٹھ منظور وڑائچ کا پیش ہونا لازمی تھا۔“ اس نے وہی کہا جس کا مجھے اندازہ تھا۔ ”آپ نے لائر سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ تو لیا ہوگا۔ میں نے اسی لیے آپ کو سب سے پہلے اس افسوس ناک خبر سے مطلع کیا تھا۔“

”اس سے بات کرنے کے بعد ہی میں نے تمہیں فون کیا ہے۔“ وہ بولی۔ میں دھڑکتے دل سے اس کی بات سننے لگا۔ ”لائر کی کچھ مصروفیات اور عدم دستیابی کے باعث میرا اس سے دیر سے رابطہ ہوا تھا، بہر حال اس نے یہی مشورہ دیا ہے کہ سرمد بابا کی ہلاکت سے عابدہ کا کس کمزور پرستہ سکتا ہے، کیونکہ یہاں کورٹ کے ریکارڈ میں ہمارے لائر نے کیس کے متعلق جواب ڈیٹ دے رکھی ہے اس کے مطابق منظور وڑائچ ہی عابدہ کے سرپرست تھے، اور وہ انہی کے اہلکار پر ہی ان کی ڈاٹران لاء کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ لیکن تم گھبر کر دو اور جلد سے جلد کسی تیز رفتار کوئیررس سے منظور وڑائچ کے ڈیٹہ پر شیکلٹ کی ایک کاپی میرے ایڈریس پر پہنچ دو۔ بلکہ آج ہی پہنچ دو۔“

آنر کی بات نے میری تشویش بڑھادی۔ ”میں آج ہی یہ کام کر لوں گا اس خالہ! لیکن اب کیس سے متعلق فی صورت حال کیا ہوگی؟ لائر کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟ آئی مین کوئی امید؟“

”مسٹر شہزاد! سب سے بڑی امید تو یہ ہے کہ ہماری کوششوں، یہ شمول مسٹر منظور وڑائچ، ہم نے یہ کیس ہی آئی اسے کی کوشش کورٹ میں نہیں جانے دیا، اور اسے نیو یارک سٹی کی لبرل اینڈ اوریجریز سوسائٹیز کی عدالت میں دائر کروانے میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ بائبل ہولارڈ اب بھی عابدہ کے کیس کو ہی آئی اسے کی اسٹی ٹیر کورٹ میں گھسنے کی کوشش میں مصروف ہے، اس سے اس کے عابدہ سے متعلق خطرناک عزائم کا اندازہ... ہوتا ہے، کیونکہ مذکورہ عدالت میں میں چلانے کا مطلب امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے کسی ایک جیل کی ہوا کھانا۔“

میں آنر کی بات پر لرز کر رہ گیا۔ میرا دل جیسے کسی ٹمٹمی میں لے لیا۔ الفاظ میرا ساتھ دینے سے قاصر رہے۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ نہ جانے کتنے ہی اسی طرح دم یہ خودی خاموشی میں بیت گئے۔ پھر اس کی دوبارہ آواز ابھری۔

”اسی لیے میں اس خدشے کا اظہار کر رہی تھی کہ کیس

”ہم کھلاں والی زیر خان کی خیریت پوچھنے کے بہانے بھی جاسکتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہمیں خود بھی ماحول کا اندازہ ہو جائے گا۔“

”مشورہ تو اچھا ہے ٹھیکہ کا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زیر خان کسی کو پہچاننے کے قابل ہوگا بھی یا نہیں؟ میرا مطلب ہے وہ ہمیں پہچان پائے گا؟“ اول خیر نہ کہا۔

”ہم ایک فارمٹی کے طور پر جاگیر گے وہاں۔ زیر خان سے ہاتھ ملانے نہیں جارہے ہیں ہم۔“ ٹھیکہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”زیر خان کو وہاں جا کر سہرا ڈالنے کا میں بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔“ اول خیر نے جھلکا کر کہا۔

”شہزی کا وہاں جانے کا جو مقصد ہے وہ میں سمجھ چکا ہوں، تمہیں یہ بات سمجھنے میں ابھی تھوڑی دیر لگے گی۔“ دونوں میں بحث شروع ہو چکی تھی۔

میرا دھیان عابدہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ آنر خالہ سے بات ہو جاتی تو کچھ ٹہل ہو جاتی۔ مجھے یہ دستور بنجیدہ اور خاموش پاکر دونوں خاموش ہو گئے پھر ٹھیکہ نے میری اس خاموشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

”شہزی! آنر خالہ نے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا۔ ہمیں عابدہ کے بارے میں بھی کوئی بنجیدہ اشیپ اٹھانا ہوگا۔ کیونکہ سرمد بابا کے انتقال کے بعد معاملہ اور ہو چکا ہے۔“

”میں نے دو ایک بار کوشش کی تھی آنر خالہ سے رابطہ کرنے کی، میں خود بھی اس سے سرمد بابا کی موت کے بعد تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ مگر رابطہ نہ ہو سکا تھا۔“ میں نے کہا تو ٹھیکہ نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”تم آسے اس سلسلے میں ایک ای میل یا میسج ہی کرو۔“

بے دلی سے کھانا ختم کر کے میں ٹیبل سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ آنر خالہ کی کال آگئی، میں نے فوراً اچھٹ کر اپنا سیل لیا اور کان سے لگا لیا۔

”ہائے مسٹر شہزاد! کیسے ہو۔ تم شاید مجھے کال کر رہے تھے؟“ دوسری طرف سے اس کی آواز ابھری۔ میں نے فوراً کہا۔

”جی ہاں! مگر آنرنگ مشین میں تمہارا ریکارڈ شدہ میسج سنائی دیتا تھا تم اس وقت بڑی تھیں۔“ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے اب عابدہ سے متعلق کون سا نیا ساتھ میرے علم میں آنے والا تھا؟

”مسٹر شہزاد! سیٹھ منظور وڑائچ کے انتقال کی خبر سے

کمزور ہونے کی صورت میں کہیں عابدہ کا کيس اخٹی میر کورٹ میں منتقل کر دیا جائے۔ ڈیو بیٹری مسٹر شہزاد؟ اس نے لمحہ بھر توقف کے بعد آخر میں پوچھا۔

شاید اس نے میری طویل اور یک ننگ خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہیں کال ڈراپ تو نہیں ہو گئی، سوالیہ کہا۔ میں اس سے باتیں کرتے ہوئے نشست گاہ میں آ گیا تھا، اور خیر اور شکلیہ بھی ڈراپ بعد وہاں آ گئے تھے۔

چونکہ میرے سیل فون کاوائیڈ اسٹیکر آن تھا، اسی لیے شکلیہ اور اول خیر میری میری اور آنسہ کے درمیان ہونے والی دو طرفہ گفتگو کو بے آسانی سن رہے تھے اور میری کیفیات کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ ایسے ہی میں اول خیر نے حوصلہ دینے کے انداز میں میرا کاغذ ہاؤس سے بھیجتا یا تب میں نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

”جج... جج میں سن رہا ہوں۔ میں اسی لیے آپ سے دریافت کرنا چاہ رہا تھا کہ اب ایسی صورت حال میں کیا کیا جاسکتا ہے؟ لاڈلے کوئی مشورہ تو دیا ہوگا آپ کو؟“

”میں اسی طرف آرہی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”میں پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہوں مسٹر شہزاد کہ میں اسٹیٹ فارورڈ لڑکی ہوں اور ٹوڈی پوائنٹ بات کرتی ہوں۔ تمہیں کسی جھوٹی تسلی میں رکھنا چاہتی ہوں نہ ہی بلند بانگ دعوے کر کے تمہیں کسی مغالطے میں رکھنا میرا مقصد ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میری ساری توجہ تمہاری کرل فرینڈ عابدہ کو سی آئی اے، بالخصوص ہاسکل ہولارڈ کے چنگل سے چمڑانے میں مرکوز ہے۔ اور میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہی، وہی کچھ کر رہی ہوں جو میرا ”ایم“ ہے۔ مقصد کی بات کی طرف آتے ہیں تو اب بھی ایک حل ہے کہ مسٹر منظور وڈراج کی ڈائری ان لاء (ہبو) کو سی امریکا آنا پڑے گا۔“

میں اس کی بات پر سن ہو کر رہ گیا تھا۔ عارفہ میرے عابدہ کے ساتھ ”کئی شخص“ تھی، یہ میرے سوا کون جانتا تھا۔ کیونکہ اس حرافہ اور ذلیل عورت نے ہی اپنی گردن... چلنے کے لیے بے چاری عابدہ کو وہاں چھنوا دیا تھا۔ اب عارفہ سے عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کسی مدد کی امید رکھنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے بھیڑیوں کی رکھوالی کے لیے بھیڑیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ کسی سیانے کا قول ہے کہ کبھی بھی اپنے ویل اور ڈاکٹر سے بھی کوئی بات مت چھاؤ۔ آنسہ خالہ کوئی وکیل یا ڈاکٹر تو نہیں تھی، مگر ایک جتنی ہمدرد و دروہ تھی۔ اسی لیے میں نے بھی اس سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور عارفہ کے متعلق سب سچ بتا دیا۔ جسے سن کر چند ثانیوں کے لیے اُسے بھی

ایک پپ سی لگ گئی۔ پھر میں نے ہی اس سکوت کو توڑا۔ ”اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں مس خالہ! ایسی صورت میں کیا کیا جاسکتا ہے۔“

”پھر تو یہ واقعی ایک تکبیر مسئلہ بن سکتا ہے مسٹر شہزاد! کیونکہ مسٹر منظور وڈراج کے بعد اب ایک آخری امید عارفہ ہی بچی تھی اور اسی کی گواہی اس برل اور سیز سوسائٹیز کی کورٹ میں عابدہ کے لیے سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔“ آنسہ خالہ کے لہجے میں پرمٹانت سی تکبیر کو محسوس کر کے میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”کوئی دوسری راہ یا کوئی ایسی صورت جس میں عارفہ کی گواہی کی ضرورت ہی نہ پڑے؟“

”ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے مسٹر شہزاد؟“ وہ بولی۔

”شاید پریشانیوں نے تمہارے اعصاب اور ذہن پر خاصا متفی اثر ڈالا ہے۔“

میں اس کی بات پر چپ سا ہو گیا۔ وہ ایسا کچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہی تھی۔ عابدہ کی پریشانی نے تو میرا دماغ ہی ماؤف کر دیا تھا۔ مجھے خاموش پا کر آنسہ خالہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”اتم فیر تیلی سوری۔ تم نے میرے اس ریمارکس کا برا تو نہیں مٹایا مسٹر شہزاد؟“

”قطعاً نہیں مس خالہ! آپ نے میرے بارے میں بالکل ٹھیک ہی تو ریمارکس پاس کیے ہیں۔ عابدہ کی پریشانی نے واقعی مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ سوچتا ہوں اللہ کے سوا آپ کا سہارا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ آپ جتنی ملیوں دور جتنی ہمدرد گوئیں کیا نام دوں، ماسوائے اس کے کہ آپ کو اپنے اور عابدہ کے لیے ایک فرشتہ ہی کہوں۔“

”پلیز شہزاد! سوری ٹوے۔ میرا مقصد تمہیں ایویشن یا ڈکھی کرنا نہیں تھا۔“ آنسہ بولی۔ ”مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم اور عابدہ کس کرب سے گزر رہے ہو۔ اپنی دے میں ایک مشورہ دوں گی۔ اگر تمہارے اور عارفہ کے درمیان ایسا کوئی ہاٹ ایویشن ہے تو تم اُسے کسی طرح اپنے لیے کنوینس کرنے کی کوشش تو کرو۔ ممکن ہے بات بن جائے۔ مگر جو بھی کرو ڈرا جلدی کرنا۔ اور مجھے بتا دینا تاکہ ہمارا لارٹریس کو سننے انداز سے تیار کر کے کورٹ سے جیش کی تاریخ لینے کی کوشش کرے۔ اور ہاں! سیٹھ منظور وڈراج کا ڈیڑھ سڑکیٹ پہلی فرصت میں بھیج دو۔“

عابدہ کی پریشانی میں مجھے اپنے متعلق اس سے کوئی بات پوچھنے کا یا بارانگ نہ رہا تھا، مگر اول خیر نے جب محسوس کیا کہ میرے اور آنسہ کے درمیان گفتگو اختتام پذیر ہونے والی

ہے تو اس نے فوراً نیچی آواز میں مجھ سے کچھ کہا۔ یہ وہ استفساریہ جملے تھے، جس میں مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن میرے ان دونوں ساتھیوں کو اس کی پوری فکر و توجہ تھی، تاہم میں نے اختتامی کلمات کے دوران ہی اس کا بھی مختصر ذکر کیا تو اس نے اس سلسلے میں مجھے صرف ای میل کے ذریعے ہی معلومات کا تبادلہ کروانے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح کی حساس گفتگو اور معلومات کی ترسیل بہم پہنچانے کے لیے آنسہ خالہ نے اپنی ایک دوسری فیک (fake) میل آئی ڈی @laday sweet کے نام سے بنا رکھی تھی۔ جو یہ ظاہر ایک فکس ویب کیم سائٹ کی تھی۔ تاکہ اس کی ای میل وغیرہ وہاں امریکی خیر اور اداروں میں ٹریس نہ کی جا رہی ہو۔ جبکہ اپنے اصل نام کی ریکل آئی ڈی جوں کی توں تھی۔

میں نے اثبات میں جواب دے دیا اور ”بیٹ وشر“ کے ساتھ آنسہ خالہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اول خیر نے مجھے جو چند جملے لکھ کر دکھائے تھے، وہ آنسہ خالہ سے دریافت کرنا تھا کہ میرے سلسلے میں سی آئی اے کا ایک خصوصی اسالٹ ونگ جس کی بائیس ٹائیکر ٹیک کے نام سے ہاسکل ہولارڈ کے ہاتھوں میں تھیں، اپنے خفیہ آپریشن کے لیے وہ کسی بھی وقت پاکستان وارد ہونے والے تھے، اس سلسلے میں تازہ رپورٹس کیا تھیں؟ وغیرہ۔ اگرچہ اول خیر کے ان لفظوں کو میں نے اشاروں کنایوں میں ہی بدل کر آنسہ خالہ سے پوچھا تھا اور اس نے بھی مجھے اسی انداز میں مختصر ترین جواب دے دیا تھا۔

میں نے فون بے دلی سے ایک طرف صوفے پر چپک کر، جھکے جھکے سے انداز میں اپنا سر صوفے کی پشت سے لگا کر ڈراڈر کے لیے آنکھیں موند لیں۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزرے تو اچانک مجھے اپنی شکل ساعینوں میں اول خیر کی مخصوص آواز سنائی دی۔

”اول خیر کا اے کو پھر تو قہمی ہو رہا ہے؟“ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پچھلی سی مسکراہٹ سے ایک گہری ہمارگی خارج کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں یار! بھلا تمہارے اور شکلیہ جیسے غم خوار اور جاں نثار ساتھیوں کے ہوتے ہوئے میں مایوس کیسے ہو سکتا ہوں۔ بس ڈرا اس کی صورت حال نے پریشان سا کر ڈالا ہے۔ یہی خواہوں سے مدد لینا کسی حد تک آسان ہوتا ہے مگر بات جب دشمنوں سے مدد لینے کی ہو۔ اور وہ بھی ایسے مارا سٹین دشمنوں سے جو بغل میں چمکی چھپائے ہوئے ہوں تو بات اور ہو جاتی ہے۔“

”حیرت ہے، آنسہ خالہ کو تم نے عارفہ کے سلسلے میں اچھا خاصا بریف بھی کر دیا تھا، باوجود اس کے وہ مصر ہے کہ ہمیں عارفہ کو اپنے حق میں کنوینس کرنا ہوگا۔ اُسے کوئی دوسرا حل بھی تو بتانا چاہیے تھا؟“ شکلیہ نے کہا۔

”عابدہ بہن! والے کیس میں سرمد بابا مرحوم کے بعد وہ حرافہ عارفہ ہی ایک اہم شخصیت باقی بچی ہے، جو کمزور پڑتے اس کیس میں جان ڈال سکتی ہے۔“ اول خیر نے کہا۔

”تم بتاؤ شکلیہ! اس سلسلے میں کیا واقعی ہمیں عارفہ کے سامنے کھٹے کھٹے ہوں گے؟“ میں نے ان کی بحث سے بچنے کے لیے فوراً مداخلت کر ڈالی۔ ورنہ تو عارفہ جیسی حرافہ اور مارا سٹین ناگن کو کون سی بین رام کر سکتی تھی؟ اس پر میں خود بھی غور کر رہا تھا۔

”اس ناگن کو دودھ بھی ملا دو گے، تب بھی اس سے بدلے میں زہر ہی ملے گا۔ ہمیں آنسہ خالہ سے ہی اس سلسلے میں مدد لینا ہوگی۔“ شکلیہ نے تنبیہ کی گے کہا تو اول خیر متانت سے بولا۔

”آنسہ خالہ ہزاروں میل دور بیٹھی عابدہ بہن اور ہمارے لیے جو کچھ کر رہی ہے، وہ بلاشبہ اس کا ایک اچھا عمل ہے، اور وہ کم نہیں کر رہی، لیکن جو ہمارے کرنے کا کام ہے وہ ہمیں ہی کرنا ہوگا۔ اس پر یہ اضافی بو بھڑکانے کا کوئی فائدہ نہیں، کیس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے مجبور کرنے پر کوئی قدم اٹھا بھی لے گی تو وہ کمزور بھی ثابت ہو سکتا ہے، اور اس کا فائدہ ہاسکل ہولارڈ کو ہوگا، جو پہلے ہی عابدہ بہن پر دانت کھوسے ہوئے ہے اور اُسے عالمی دہشت گردوں کی ساسی قرار دینے پر ٹکرا بیٹھا ہے، نہانے وہ مردود اس طرح کی ناپاک حرکت کر کے اپنے کون سے مذموم مقصد کی تکمیل چاہتا ہے، تاہم لگتا ہے کہ یہ معاملہ صرف لولووش یا اچیکلرٹم کی دشمنی کا ہی نہیں ہے، اس سے آگے کا بھی ہے۔“

اول خیر کی اس بات نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو اول خیر؟ ڈرا کل کر بولو۔“

”میرا ایک اندازہ ہے، جو میں نے ہاسکل ہولارڈ کی ان تفصیلات کی روشنی میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے، جو آنسہ خالہ نے ہمیں اپنی فیک سیل ایڈریس سے بھیجی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ”نائن ایون“ کے سامنے کے چھپے امریکی یا یہودی لابی کے جو ناپاک مقاصد رہے ہوں گے، اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے سی آئی اے کا یہ مذکورہ ونگ ٹائیکر ٹیک، ہاسکل ہولارڈ کی سرکردگی میں مصروف کار ہے، جو ایک خفیہ ٹاسک کے تحت نائن ایون کا سارا المبادیائے تسلیم کر ڈالنا۔“

زیادہ میں خود بھی انہی اندیشہ شک و سوسوں اور خدشات کا شکار تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ لہذا میں نے کہا۔

”دوستو! انسان کی زندگی تو خود ایک رسک سے عبارت ہے، اس کا کیا بھر و سہا، مگر ایک امید کے سہارے ہم اس زندگی کو گزارتے ہیں۔ ہمیں یہ رسک بہر حال اٹھانا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، ہاں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اس ڈیل کے تحفظات کیا ہوں گے چاہئیں، وہ ہم عارف سے ڈسکس کر کے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے کہ اس میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ اول خبر نے فوراً کہا۔ ٹھیکہ نے ایک اور بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی۔

”یہ ڈیل تو ہوتی رہے گی۔ پہلے میں سرمد بابا کا ڈھکڑھ سرٹیکٹ آئس خالہ کو امریکا روانہ کرنا ہوگا۔ وہ کہاں ہے ہمارے پاس؟“ ٹھیکہ نے بات پر میں نے کہا۔

”اس سلسلے میں پہلے میرا ارادہ سبھی تھا کہ متعلقہ اسپتال سے نکلوا لیں گے مگر وہ شاید ڈیلی کیٹ ہوتا، جبکہ اور ہسپتال سرٹیکٹ عارفہ کے پاس ہی تھا، کیونکہ اسپتال سے سرمد بابا کی ڈیل باڈی اسی نے وصول کی تھی، اس سلسلے میں بھی اس سے بات کر لیں گے۔“

”ویسے کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ تمہارے قانونی طور پر شیئرز کے مالک بننے کے بعد عارفہ اس قدر آرام سے بیٹھی رہی، اس کی فینڈس حرام ہو جانی چاہئیں، مگر اس نے اس سلسلے میں اب تک تم سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا؟“ ٹھیکہ نے اپنے تئیں ایک اہم بات کی تھی۔ میں نے کہا۔ ”وہ شاید اپنی اس شکست پر حد سے زیادہ مایوسی کا شکار ہو گئی ہے، کیونکہ مجھے تو اُسے قطعاً یہ امید نہ ہوئی کہ میں بڑے آرام سے اُسے پلیٹ میں سجا کر شیئرز پیش کروں گا۔“

بہر حال چائے کا ایک ایک کپ پی کر میں اور اول خبر کو رٹر سے روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگے، اس دوران میں نے عارفہ کو ایک عدو فن کھڑا کرنا ضروری سمجھا، رابطہ ہوتے ہی اس نے میری آواز پہچان کر تحیر آمیز لہجے میں کہا جس میں طنز کا ایک مکارانہ تیز بھی پوشیدہ تھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سارے شیئرز چالاکی سے ہتھیانے کے بعد ہمیں مجھ کو فن کرنے کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔“

”ہاں! اصولاً تو بات کی ابتدا آپ کو کرنی چاہیے تھی،

کہا۔ ”ڈیل... میں سمجھ لےجے میں مختصر آہوں۔“

”ہاں! مجھے عارفہ سے ایک ڈیل کرنا ہوگی، ایک سودا۔“ میں نے پھر غور سے انداز میں کہا۔ ”وہ زہریلی ناگن ایک کاروباری ذہن بھی رکھتی ہے اور اس کی کمزوری اس کی لالچی فطرت ہے۔ میں اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔“

”آخر کار کے! کہیں تم اڈیہ سبھنی کے شیئرز تو اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے؟“

میری توقع کے عین مطابق اول خبر نے بالکل درست اندازہ لگا لیا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں اس سے متعلق یہ خوبی آگاہ تھے۔ میں نے اثبات میں اپنے سر کو جھٹھکی دی تو ٹھیکہ نے فوراً ایک تکلیف دہ حیرت سے کہا۔ ”شہزی اتت... تو کیا تم اڈیہ سبھنی کے شیئرز اس کے حوالے کر دو گے؟“

”ہاں! عابدہ کی رہائی کی خاطر اور اسے مصیبت کی اس گھڑی سے نکلانے کے لیے میں اس جیسے لاکھوں مالیت کے شیئرز بھی اس ناگن کے حوالے کر سکتا ہوں۔“ میں نے مضبوط اور محکم لہجے میں کہا۔ ”یوں بھی اصولی طور پر میں نے سبھی کو خود کو ان شیئرز کا مالک نہیں سمجھا، آج سوچتا ہوں تو مجھے خدا کی اس مصلحت پر حیرت محسوس ہوتی ہے کہ شاید اسی دن کے لیے سرمد بابا ان شیئرز کی پاور آف اٹارنی اور خود بخاری میرے سپرد کر گئے تھے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے شہزی کہ عابدہ بہن کے سامنے ان شیئرز کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی، بلکہ دنیا کی ساری دولت ہی بچ ہے، مگر اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ اس ڈیل کے نتیجے میں عارفہ وہی کرے گی جو ہم چاہیں گے؟ وہ ہمیں دھوکا بھی دے سکتی ہے اور اس کا نتیجہ عابدہ کے لیے خدا نہ خواستہ بہت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

ٹھیکہ نے کہا تو اس کے اس خدشے کی توثیق اول خبر نے بھی کر ڈالی، وہ پرتشویش لہجے میں بولا۔ ”کوئی بید نہیں کہ وہ وہاں جا کر ہمارے دشمنوں سے ہم سے زیادہ منفعت دانی ڈیل کر لے اور عابدہ بہن... بن... نہیں شہزی کے! ہمیں اس سلسلے میں بہت سوچ سمجھ کو کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔ کہیں یہ ڈیل یا یہ سودا ہمارے لیے اتھیل مجھے مارو لانا۔ ثابت ہو جائے۔ اگر ہم یہ مقدمہ ہار گئے تو ہمیں اس کے بہت ہی خطرناک نتائج بھگتنا پڑ جائیں گے۔“

اول خبر خاصا متوش سناظر آنے لگا تھا اور اس سے

ایک گھنٹہ فنی سازش اور خود ساختہ قرارداد بننے کی جدوجہد میں ہے، اس کی نمائندہ تم آئس خالہ کو بھی کہہ سکتے ہو، اور دوسرا وہ گروہ ہے جو اسے واقعی ایک نایک سازش کے تحت مسلم دنیا پر تھوپنا چاہتا ہے، اس کا نمائندہ ہمیں امریکی خزانہ یودی باسل ہولارڈ کی شکل میں یہ آسانی نظر آسکتا ہے۔ بلکہ اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو درحقیقت سبکی لابی اس واقعے میں زیادہ موٹ محسوس ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ باسل ہولارڈ کا گروہ اسے بچ ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ لہذا اسی سبب تمہارے ذہن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے بے اختیار یہ خیال آیا تھا کہ عابدہ کا معاملہ کو لووش اور آپٹیکٹرم سے آگے کا ہے۔“

میں بے اختیار غور سے انداز میں سکرایا۔ میرے دونوں ساتھی ذہنی فراست میں کم نہیں تھے۔ میں نے تالی بجا کر دونوں کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھا اور اور بنجیدی سے موجود مسئلے کی طرف آتے ہوئے بولا۔

”تم دونوں کی باتوں کی روشنی میں آخری فیصلہ سبکی طے پاتا ہے کہ عارفہ والا معاملہ ہمیں ہی دیکھنا ہوگا اور اس میں تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لیے مجھے خود عارفہ سے ایک ملاقات کرنا ہوگی۔“

میں ان دونوں کی سنا ضرور تھا، مگر آخری اور حتمی فیصلہ میرا ہی ہوتا تھا۔ جو عموماً انہی کے مشوروں کی روشنی میں ہی ہوتا تھا۔ ان دونوں نے اگرچہ میرے فیصلے پر اثباتی انداز کی خاموشی تو اختیار کر لی تھی لیکن ان کے چہرے پر جھٹکے والے اضطراب کا خود میں بھی شکار تھا۔ آخر اس اہم، حساس اور نازک ترین معاملے میں عارفہ جیسی ناگن کو کیسے رام کیا جاسکتا تھا؟ یہ کوئی ایسا معاملہ بھی نہ تھا کہ عارفہ کی کٹھنی پر گن رکھ کر زور زبردستی سے کروا لیا جاتا۔ اس میں مکمل طور پر عارفہ کی دیانتداری اور غلطی کی ضرورت تھی، اور اس جیسی ناگن سے ایسی توقع رکھنے کو میں دنیا کا احقنا ترین کام سمجھتا، جسے مجھے بہر حال کرنا تھا۔

اصولی طور پر اگر دیکھا جاتا تو اخلاقی طور پر عارفہ کو خود ہی اپنی عہدہ کی مدد کے سلسلے میں پہل کرنی چاہیے تھی، مگر وہ بھی ایسا نہیں کرتی، اس ناگن کو بھگانے کے لیے میرے ذہن میں ایک خیال ملک ہوا تھا۔ ”ڈیل۔“

”لیکن ہم عارفہ کو کس طرح اس پر راضی کر سگے؟ وہ ہم پر پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ حتیٰ فیصلہ کرنے کے بعد ٹھیکہ نے اس کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے

چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ انہیں دہشت گرد بھی قرار دیے جانے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ آج کے حالات اس کی بے بین عکاس ہیں۔“ مجھے اول خبر کی ان باتوں نے سشدرد کر دیا تھا۔ بے شک یہ باتیں میرے علم میں بھی تھیں جو میں نے فنی اور غیر فنی غیر جانبدار مصرعین کے تجزیوں اور نمونے سے حاصل کی تھیں۔ لیکن اب تک اول خبر کے بارے میں میرا خیال یہی تھا کہ اس کا ذہن دیکھی مار کا تھا اور سوچ بھی اس کی یہیں تک محدود ہوگی، لیکن جس طرح اس نے ان سب باتوں کا احاطہ کیا تھا، وہ قابل دید تھیں۔

”تم تو اسے یقین سے یہ سب کچھ رہے ہو جیسے تمہیں الہام ہو گیا ہو۔“ ٹھیکہ نے شاید اس کی عالمی بصیرت سے جل کر کہا، تاہم اول خبر بولا۔

”بی بی! اگر تم ہی وی پر صرف معاشرے کی عکاسی کے نام پر چلائے جانے والے برگر ٹیلیو سے اٹے پڑے، نت نئے ڈیزائن والے ملبوسات اور جدید فیشن کی نمائش کرتے ڈرامے دیکھنے کے بجائے سنجیدگی سے عالمی اخبارات، رسائل اور ڈاکو شماری کا مطالعہ کرو تو تم بھی بے آسانی ان سب باتوں کا تجزیہ کر سکتی ہو۔“

میرے حساب سے اول خبر نے اس بار ٹھیکہ کو زوردارست چوت دی تھی، میں نے کچھ دیر تک دانستہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی کہ دیکھوں ٹھیکہ اسے کیا جواب دیتی ہے؟ درحقیقت میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان اس طرح کی بحث ذہنی جتنا تک کے مترادف تھی۔ بشرطیکہ پٹری سے نہ اترتی۔ میرا خیال تھا ٹھیکہ زچ ہو جائے گی۔ لیکن میں نے دیکھا وہ بڑے اعتماد سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”خوشی ہوئی مجھے تمہاری اس بصیرت کے متعلق جان کر۔ ورنہ تو میں اب تک بھی سمجھ رہی تھی کہ تم دماغ کم اور اسلحہ کا زیادہ استعمال کرتے ہو۔ باقی تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ جس طرح کی تم بصیرت رکھتے ہو، وہ اب پرانی ہو چکی ہے، ناٹن ایون کے درپردہ امریکا یا اس کے اندر بھی بیٹھی مسلم دشمن لابی کے اصل مقاصد کیا تھے، اس سے اب ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی آگاہی ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ پوری ڈیکٹر نہیں ہو سکی، ہاں اب ایک سرو جنگ ضرور چھڑ چکی ہے، ان دو گروہوں کے درمیان، جو اپنے اپنے طور پر اس عالمی واقعے کو بجا سمجھتے قرار دیتے پر ملتے ہوئے ہیں، اور اس کی دلالت میں اپنے اپنے طور پر ثبوت پیش کرنے کے لیے کوشاں بھی رہتے ہیں، ایک وہ گروہ جو اس واقعے کو

اور میں تو آپ کے فون کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔“ میں نے بھی کمال دیکھا ہی سے دانستہ گیند اس کی کورٹ میں اچھا دی، تو وہ اس بار واقعی حیرت سے بولی۔

”اچھا! تمہیں واقعی میرے فون کا انتظار تھا؟ مگر کیوں؟“ وہ ایک جھٹکا میرا جھنکا کا شکار ہوئی۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ شیئرز واپس لینے کے لیے مجھے کسی بھاری ڈیل کی آفر کریں گی۔“ میں نے لہجہ کو واقعی خیر بناتے ہوئے کہا تو چند ثانیے کے لیے اُسے ایک چپ سی کھاگئی، شاید اسے مجھ سے ایسی کسی ”معتنی خیر“ بات کی توقع نہ تھی۔ گویا میرے غلوں اور نیک نیتی سے میرے دشمن بھی اچھی طرح واقف تھے اس کا مجھے آج پتا چلا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کی طویل پڑتی خاموشی پر میں نے اُسے مختصر الفاظ کا ٹھوکا دیا۔

”نک... کچھ نہیں، وہ دراصل میں تمہاری طرف سے ماپوس ہوئی تھی، امید نہیں تھی مجھے کہ تم بھی مجھ سے کسی قسم کا رابطہ کر سکتے ہو۔“

”غلط“ میں نے کہا۔ ”جب تک عایدہ خیریت سے واپس نہیں آجاتی، میرا آپ سے ویسے بھی رابطہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ کمال ہے یہ خوش فہمی آپ کو کب اور کیسے ہو گئی؟“ وہ چندال میرے دھڑکی لہجے میں پوشیدہ ایک خاص قسم کی تہدید کو بھانپ کر بولی۔

”دھمکی مت دو مجھے، میں شیئرز اور ڈیل کے حوالے سے بات کر رہی تھی۔“

میں نے بھی کم از کم اس وقت اس بات کو طویل دینا مناسب خیال نہیں کیا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”شیئرز واپس حاصل کرنے کے لیے آپ مجھ سے کیا ڈیل کرنا پسند کریں گی؟“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ اس پر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ”تم... تم اگر واقعی مجھ سے شیئرز کے بدلے میں کوئی ڈیل کرنا چاہتے ہو تو... اسی وقت ساری باتیں بھلا کر میرے پاس آ جاؤ۔ مجھے یقین ہے، اگر بات اس بج پر آئی گئی ہے تو ہمارے درمیان بھی بغیر کسی ڈیل لاک کے کوئی نہ کوئی ڈیل کامیاب ہو ہی جائے گی۔“

اُس کا چلنے کی جادو کی طرح سر چڑھ کے بولنے لگا۔ اس کے لب و لہجے سے مترنم لالچ، دولت اور حرص و طمع کی بے پناہ بیھوک نے میرے اندر کے مضطرب اندھیاروں میں امید کی ٹھٹھکی کو کو فزون تر کر دیا تھا۔ اور مجھے اس سے کسی کامیاب ڈیل کی توقع ہونے لگی تھی۔

”ڈیش گڈ، آئی ول بی ویر۔“ یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں اور اول خیر عارفہ کی رہائش گاہ کی طرف موجسوئے تھے۔ کار کے اس مختصر سے سفر کے دوران میں ہم نے اس منصوبے پر بھی تبادلہ خیال کیا تھا جو خالصتاً اول خیر کے ذریعہ ذہن کی پیداوار تھا، جس کے مطابق ہم نے عارفہ باسینٹ نوید احمد سانچے والا کو ”تھرڈ پرسن“ بنا کے ان میں سے کسی ایک یا دونوں کے ساتھ رنگون جاکر انڈیسیٹی کے سلسلے میں سودے بازی کرنا تھی اور کسی طرح لولووش کی بیوی انجیلا کو اغوا کر کے، بائبل ہولارڈ پر عایدہ کی رہائی کے سلسلے میں دباؤ ڈالنا تھا۔ مگر قدرت نے یہاں ہمارا کام قدرے آسان کر دیا تھا، اور کسی لیے چوڑے کھینچے میں پڑنے سے بھی بچا لیا تھا۔ لہذا ہم نے اس منصوبے کو ”پلان بی“ کا نام دے کر سر دست پس پشت ڈال دیا تھا کہ پہلے یہ قانونی طریقہ اختیار کر کے دیکھ لیا جائے، جو نسبتاً سہل اور امید افزا بھی تھا۔

عارفہ کی رہائش گاہ سے ابھی ہم ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہی تھے کہ میرا بیل فون گنگنا یا۔ بیل فون پر ایک انجینیئر دیکھ کر میری پیشانی پر نشانی سی نمودار ہو گئی۔ اسکرین پر ابھرنے والے نمبرز کے ابتدائی دو خیمے سے اندازہ ہوا کہ کال بیرون ملک سے تھی، پہلا خیال میرا آفہ خالہ کی طرف ہی گیا تھا، وہ کسی بھی نمبر سے مجھے کال کر سکتی تھی، اگرچہ اس کا نام بھی ڈیلے میں نمایاں ہوتا تھا، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا، کال باہر کی ہوتی مگر نمبر کوکل بھی شو ہوتا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے فون کان سے نکال کر ہیلو کہا تو دوسری جانب ایک بھاری مردانہ آواز سن کر میں چونکا۔ یہ آواز میرے لیے سراسر انجینیئر تھی۔ لہجہ ہندی اردو تھا۔

”شہزاد احمد خان؟“ مجھ سے استفسار یہ کیا گیا تو میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! آپ کون؟“ میرے استفسار پر دوسری جانب خاموشی طاری رہی، اس کے بعد وہی گھمبیری بھاری آواز گونجی۔

”سز شہزاد... ولد... تاج دین شاہ فرخ پور سٹ وراج میں! ابھی ولدیت ہے ناں تمہاری؟“ میں جیسے غن ہو کر رہ گیا۔ بھلا میں اس نام اور اس کے اس عظیم حوالے کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ یہی تو میری اور میرے خاندان کی شناخت تھی۔ باپ کے ذکر نے میرے اندر ایک گھمبیری سی چار دیواری، اول خیر نے میری کیفیت اور کال کی ”نوعیت“ بھانپ کر کار کی رفتار

حد درجہ آہستہ کر دی تھی۔ کال کرنے والے اس انجینیئر نے مجھے میری ولدیت سمیت مخاطب کیا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے میرے گھوٹے ہوئے باپ سے متعلق ہی گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔

”ہاں... ہاں... یہی میری ولدیت ہے، تاج دین شاہ میرا باپ تھا۔“ تم کون ہو؟ کیا تم میرے باپ کے بارے میں جانتے ہو؟“

”اُسے تو ہم بچانے کتے عرصے سے جانتے آ رہے ہیں۔ اور وہ ہمارا ہی بھائی ہے۔“ دوسری جانب عجیب سے لہجے میں کہا گیا تو کیا ایک میرے ٹھکے ہوئے وجود میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی، اور میں نے اپنے ایک ہاتھ سے اول خیر کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیل کا واٹچ اسٹیکر آن کر دیا، تاکہ اول خیر میری گفتگو سن سکے۔ اس نے میرا اشارہ بھانپتے ہی کار سڑک کے کنارے روک دی تھی۔

”تم آخر ہو کون؟ دوست یا دشمن؟“ میں نے بالآخر اپنی دگرگوں سی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے گہری متانت سے پوچھا۔

”ہم نہ دوست تھے نہ دشمن، لیکن ہماری دشمنی سے ہمارے دوست بھی پناہ مانگتے ہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ دشمنی کر کے سراسر گھائے کا ہی سواد کیا ہے۔“ وہ زہر لے لہجے میں بولا اور میں نے اس کی آواز پہچاننے کی تا کا کوشش کرستے ہوئے، دل ہی دل میں یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی کہ آخر یہ کون میرا نیا دشمن پیدا ہو گیا تھا؟ تاہم میں اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا، اور وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

”بس! کچھ اور کچھ دو کے تحت بات ختم ہو جائے تو یہ ہمارے بیچ ایک بہترین معاہدہ قرار پا سکتا ہے۔“ اس کے ٹھہرے اور دہے دے سے لہجے میں مجھے مکاری کی جھلک نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی۔ میں نے جواباً اسی انداز میں مختصر کیا۔

”میں غن رہا ہوں۔“

”ہمارے آدمی کے ساتھ تم نے انجھا نہیں کیا۔ خیر! جب معاہدے کی ہی بات ہو رہی ہے تو ہم بھی دوستانہ طریقہ نفاذ کیا کریں گے۔“

”تمہارا آدمی؟ کون؟“ میں نے اُلجھ کر سوالیہ کیا۔

”سندر داس سکین۔“ اس نے بالآخر بتایا اور میری

سعادت کے قریب جیسے ہم بھٹ گیا۔ سب سے پہلا خیال اس شخص کے متعلق میرے ذہن میں ٹپک ہوا تھا، وہ بلیوٹسی کے چیف کرٹل سی جی بھجوانی کا تھا۔ میں نے اب تک خود کو کافی سنبھال لیا تھا اور تیزی سے کام کرتے ذہن میں جو پہلا خیال ابھرا، اس کے تحت میں نے انجیان بن کر کہا۔

”سندر داس سکین؟ کون ہے یہ؟ اور میرا بھلا اس سے کیا تعلق؟ اور تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔“ یہ کہتے ہوئے میں اب تک اس بات کا اندازہ قائم کر چکا تھا کہ وزیر جان نے گویا چھوٹے ہی بلیوٹسی کے چیف کرٹل سی جی بھجوانی سے رابطہ کر کے اُسے بڑی صراحت کے ساتھ میرے اور میری تازہ کار ”مہم جوئی“ کے بارے میں آگاہ کر دیا ہوگا، بعد ازاں دونوں کے درمیان مزید کچھ ملے بھی پا گیا ہوگا کہ مجھے کیسے ٹھکا یا جائے، اور میرا نمبر بھی اسی نے ہی دیا ہوگا، یوں بھی میرے نمبر کا حصول میرے دشمن کے لیے ناممکن کب رہا تھا؟

”اگر تم نے میرے ساتھ یہی بھونڈا مذاق کرنا ہے تو پھر تم سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہم اپنے سانچی سندر داس کی رہائی کا دوسرا طریقہ بھی آزمانے کا آپشن رکھتے ہیں، مگر تمہارا باپ...“ اس خبیثت نے دانستہ اپنا ٹھنڈا ادھورا چھوڑا تو میں یہی سمجھا شاید وہ بدلہ دل کے رابطہ منقطع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، میں فوراً مستعفی ہوا۔

”تم بلیوٹسی کے کرٹل سی جی بھجوانی بات کر رہے ہو؟“

”مجھے پوری امید تھی کہ تم پڑی پر آ جاؤ گے اور بغیر وقت ضائع کیے معاملے کی بات کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔“ وہ فوراً اندکارانہ لہجے میں بولا، اس کا لہجہ فتح کا تاثر لیتے ہوئے تھا۔ وہ کم بخت میری ازلی کزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے واقعی اپنے اصل ٹریک پر لے آیا تھا۔

”اب تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیا تمہارے بارے میں میرا اندازہ درست نہیں؟“

”سو فیصد درست اندازہ لگایا ہے تم نے۔ مجھے کرٹل سی جی بھجوانی کہتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”اگر معاملے کی بات پر آتے ہیں تو ہم آپس میں کچھ اور کچھ دو کے تحت معاملہ داری طے کر سکتے ہیں۔“

”منظور ہے مجھے، آگے بولو۔“ میں نے فوراً کہا۔ یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ اس وقت بلیوٹسی کا کرٹل سی جی بھجوانی مجھ سے مخاطب تھا، میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے جلد از جلد میرے باپ کے متعلق بتائے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟

کا دوش کرو۔“

”جب تک مجھے اس کے جرم، جو تمہاری نظروں میں ہو سکتا ہے، کے متعلق آگاہی نہیں ہوئی میں کیسے بہ اندازہ لگا پاؤں گا کہ وہ تم لوگوں کے لیے اب بھی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟“

”ٹھیک ہے، پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ بالآخر وہ گلست خوردہ سے بچھ بس بولا۔ میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ ان کی نظر میں میرے باپ کا جرم کیا تھا تو وہ بولا۔

”جرم تو اس کا خیر معمولی نہیں تھا۔ اس نے ہمارے ایک نہایت اہم جاسوس کو کین اس وقت جان سے باز ڈالا تھا، جب وہ اپنا مشن کامیابی سے پورا کر کے اناری کے مقام پر پہنچا تھا۔ خیر اب کیا فائدہ ان باتوں کا۔“

اس نے ایک بار پھر پہلو تکی کرنی چاہی مگر میرے اندر اس برسوں پرانے راز پر سے پوری طرح جان کاری حاصل کرنے کا اڑی تپش کم نہ ہوا، میں جانتا چاہتا تھا کہ میرے باپ نے جو قربانی دی تھی، اس کا حاصل کیا ہوا تھا؟ کیونکہ

رجنر کے ہیڈ کوارٹر کے ریکارڈ روم میں مجھے میرے باپ تاج دین شاہ کے جو فائل تھی، اس میں بھی کچھ معلومات ابھام کا شکار تھی کہ میرا باپ ایک دشمن ملک کے خطرناک جاسوس کے تعاقب میں گیا تھا جو ایک خطرناک ملکی راز

اڈالے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد اس راز سے متعلق آج تک ایسا کوئی نقصان وطن عزیز کو نہیں جھیلنا پڑا تھا، جس کا مطلب لامحالہ یہی لگ گیا تھا کہ فریئر واج میں تاج دین شاہ نے اس دشمن جاسوس کا کامیاب تعاقب کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا، مگر خود بھی نہیں لوٹا

تھا۔ لہذا میں نے اس سلسلے میں اس کا مزہ کھولنے کے لیے کہا۔ ”مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ اگر تمہارا وہ جاسوس بدقول تم لوگوں کے اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن

میرے باپ کے ہاتھوں کل بھی ہو گیا تھا تو پھر تم نے ابھی تک میرے باپ کو زندہ کیوں رکھا ہوا تھا؟ اس پر کل کا مقدمہ بنا کے... آگے مجھ سے نہ بولا گیا، دکھ کا ایک غبار

سامیرے سینے میں اٹھنے لگا تھا جب وہ خودی بول پڑا۔ ”اگر تمہارا باپ ہمارے اس جاسوس کو ہلاک نہیں کرتا تو بہت پہلے جب تمہارا ملک ہماری سازشوں سے دوخت ہوا تھا تو اس مشن کی کامیابی کے بعد اس کا رکت ہو

جانا بھی لازمی تھا۔ مگر انفس تمہارے باپ نے نہ صرف ہمارے جاسوس کو ہلاک کر دیا بلکہ اس کے بیٹے سے وہ راز بھی اڈا کر زائل کر دیا تھا، جو ہمارے لیے اہم حیثیت رکھتا

جواب دے ڈالوں جو اس نے پاکستان کے خفیہ اداروں کے بارے میں کی تھی۔

”کہ اے غبیث انسان! تیری اس بکواس کا جواب میرا باپ ہے، جس نے اپنے وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالا۔ اور تم اس کا بال بھی بکس کر کے، وہ تو ایک گمنام سپاہی کی طرح اپنے وطن کی خدمت کرتا رہا، بغیر کسی

صلے کے لاچ میں وہ دشمن ملک میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے اور غر خرو ہے۔ اسے ذلیل انسان! یہ صرف میرے ایک باپ کی مثال نہیں ہے۔ میرے وطن کا ہر خاص و عام پاکستانی جس کا دل وطن کے لیے دھڑکتا ہے،

وہ بھی اپنے ملک کی خاطر اس سے بھی بڑی قربانی جھیلنے کے لیے خوش خوش اور ہر دم تیار رہتا ہے۔“

بہر طور میں اپنے سینے کے چھلنے طوفانوں کی پہل پر قابو پاتے ہوئے بہ ظاہر پُر سکون لہجے میں مستقر ہوا۔ ”اُسے تم نے کس جرم کے تحت اتنے طویل عرصے سے اپنی قید میں رکھا ہوا ہے؟“

”بس! اپنی بات میں تم خود اس سے پوچھ لیتا۔“ اس نے مکاری سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اتنی آسانی سے اپنی زبان نہیں کھولے گا، اتنا بھی اس غبیث نے میرے باپ کے بارے میں بتایا تھا تو اس میں بھی اس کی مجبوری ہوئی، پھر

مجھے تسلی تھی کہ اس وقت معاہدے کی زیادہ ضرورت اسے محسوس ہو رہی تھی، اور اس کی اسی ”ضرورت“ کو ہوا دے کر ہی اس کے منہ سے مزید تھوڑا بہت اگھوا یا جاسکتا تھا۔ لہذا

میں نے بھی چالاکی سے کہا۔ ”لیکن جب تک میری تسلی نہیں ہوگی تو یہ معاہدہ کیسے طے پاسکتا ہے؟ جبکہ میں اپنے باپ سے متعلق وزیر جان کی زبانی بہت کچھ جان اور سن چکا ہوں کہ وہ ابھی تک تم لوگوں کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔“

”تم کیسی تسلی چاہتے ہو؟“ بالآخر اسے یہ کہنا ہی پڑا، جس کا میں متنی تھا، لہذا اپنے لہجے میں بہ ظاہر بے اعتنائی

سموتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ابھی مجھ سے کہا کہ میرا باپ اب تم لوگوں کے کام کا نہیں رہا اور تم مجھ سے ایک معاہدے کے تحت اُسے میرے حوالے کرنے پر رضامند بھی ہو، مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرے باپ کو تم لوگ بھی بھی نہیں چھوڑو گے۔ ایک طویل عرصے سے وہ تم لوگوں کی قید میں ہے، تو یقیناً تمہارے لیے اہم ہی ہوگا۔“

”وہ اب واقعی ہمارے لیے اہم نہیں رہا، میری بات

کے گھاگ چیف کرنل سی جی بھجوانی کو بے وقوف بنا سکتا ہوں۔ لہذا وہ مجھے اپنے جیسا سمجھ رہا تھا، میں نے بھی اس کی اسی ”سمجھ“ کو مزید پختہ کرنے کے لیے وہ کچھ کہنا مناسب

سمجھا، جیسا کہ وہ میرے بارے میں اندازہ قائم کے ہوئے تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرے بارے میں اس طرح کی تفصیل اسے وزیر جان سے ہی حاصل ہوئی ہوگی۔ لہذا میں نے اس کی بکواس سننے کے بعد دانت تھوڑی دیر کے لیے پُرسوج خاموشی اختیار کی تھی، جیسے میں اس کے فرائس میں آ رہا ہوں۔

تاہم پھر بولا۔ ”یہ حقیقت ہے کہ میری یہاں کچھ لوگوں سے ذاتی نوعیت کی جنگ پہلے ہی سے جاری تھی، جو ہر دیر ممتاز خان اور وزیر جان میرے دو اڈی دشمن تھے، مگر وہ مجھ سے اثر و رسوخ اور طاقت میں نہیں زیادہ تھے، میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتا تھا، لیکن اسی جنگ کے دوران میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وزیر جان کے پیچھے یہاں کے خفیہ ادارے بھی پڑے ہوئے تھے، بس اسی وجہ سے مجھے اپنی طاقت بڑھانے اور

ان کی مدد حاصل کرنے کے لیے مجبوراً شامل ہونا پڑا۔ کیونکہ ابھی ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کیے پتا یہ لوگ وزیر جان وغیرہ پر براہ راست ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں

نہیں تھے، اسی لیے میری پشت پناہی کرتے ہوئے، انہوں نے مجھے ہی آگے رکھا تھا۔“

وہ مجھے جیسا سمجھ رہا تھا، میں نے بھی اسے وہی بتا دیا اپنے بارے میں۔ اس پر اس نے میری توقع کے عین مطابق ایک فاتحانہ تہقیر بلند کیا تھا۔ اور پھر اسی غرور سے بولا۔ ”ہماری افکار میں بھی غلط نہیں ہوتی ہیں۔“

میں نے دل ہی دل میں اس پر بے شمار لعنتیں رسیں کیں پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے مستقر ہوا۔ ”تم میرے باپ کے متعلق مجھے بتا رہے تھے۔“

”تمہارا باپ زندہ ہے، اور ہماری قید میں ہے۔ وہ بہت ضعیف ہو چکا ہے، اب تو وہ کسی کو شاید پہچاننے کے قابل بھی نہیں رہا اور نہ ہی اسے اپنا ماضی یاد ہے ابھی طرح، اس لیے وہ اب دیے بھی ہمارے کام کا نہیں رہا۔“

اس انکشاف پر میرے پورے وجود میں کرب کی ایک لہری دوڑ گئی، اپنے باپ سے متعلق دکھ بھری اطلاع نے مجھے رنجور سا کر دیا تھا۔ صحن میں رفتی اُترنے لگی تھی، اس غبیث کرنل سی جی بھجوانی کے خلاف میرے دل و دماغ میں نفرت و غیظ کی ایک آگ سی شلگ اٹھی تھی، جی تو میرے آئی کہ اسی وقت اس کی بکواس اور اس لغو بیانی کا

”دیکھو، مسٹر شہزاد! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا پاکستان کے کسی قانونی یا خفیہ ادارے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، تم حادثاتی طور پر یا پھر اپنی کسی غرض اور مدد لینے کے لیے رضا کارانہ بھرتی کر لیے گئے ہو۔ پاکستانی خفیہ اداروں کا ہمیشہ سے یہی وتیرہ رہا ہے، وہ اپنے خفیہ مقاصد کی برآری کے لیے ایسے سولین کو بھی نیڈی ایجنٹ بنا کر اپنے ساتھ

شامل کرنے میں کوئی آرمسوز نہیں کرتے، جو ان کے لیے ڈیلی ویز پر بخبری کر سکیں، انہیں صرف اپنے مفادات عزیز...

ہوتے ہیں، جو پورے ہو جانے کے بعد اپنے ایسے ڈیلی ویز خبروں کو خاموشی اور رازداری کے ساتھ غائب کر ڈالتے ہیں۔ لہذا میرا تمہارے لیے سب سے پہلا مشورہ تو یہی ہے

ہوگا کہ تم اگر سبکی کام کسی دوسرے ملک کے لیے کر دو تو تمہیں نہ صرف پورا تحفظ حاصل ہوگا بلکہ عیش و آرام اور دولت بھی ملے گی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم ایک معمولی کوارٹر میں رہتے ہو، ایک معمولی تنخواہ پر گزارا کرتے ہو۔ خیر! تمہارا ذاتی

معاملہ ہے۔ اب بولو تو کام کی بات پر آجائیں؟“ اس نے آخر میں کہا۔

میں اس کی بکواس کو بہ ظاہر خاموشی سے سنا رہا۔ راکا یہی طریقہ رکھتا تھا، وہ اسی طرح برین واٹ کرتے تھے۔ ورنہ

اس نے پاکستانی خفیہ اداروں کے متعلق جو بکواس کی تھی وہ صریحاً گمراہ کن اور غلط تھی۔ میں کوئی نیڈی ایجنٹ تھا، اور نہ ہی اپنی کسی ذاتی ضرورت کے تحت پاور میں ہیلپر یا ڈائریکشن

بھرتی ہوا تھا۔ بلکہ یہ ایک جذبہ تھا میرا اپنے وطن کی خدمت کا اور اس کی جڑوں کو کھوکھلی کرنے والے ملک دشمن

عناصر کے خلاف کمر بستہ ہونے کا۔ جس کی مثال میرا باپ تھا۔ جس نے آج سے کئی برس پہلے دشمن ملک کے جاسوس کا

اپنی جان پر کھیل کر تعاقب کیا اور اس کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔ مگر خود گرفتار ہو کر ابھی تک وطن کے ایک گمنام سپاہی کی طرح دشمن ملک میں ایک قیدی کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں اپنے وطن کے لیے قربانی دی تھی، خود

کوئی نہیں اپنے گھر بار کو بھی قربان کر ڈالا تھا، ان سے ایک طویل جدائی برداشت کی تھی، بلکہ ابھی تک کرب رہا تھا۔ باقی

رہی کرنل سی جی کی بکواس، اور مجھے برین واٹ کرنا، یہ تو ان کے چانکیہ پلان کا ایک حصہ ہی تھا۔ یہ ہمیشہ ضمیر فروشوں اور

وطن فروشوں کو اپنے چانکیہ پلان کے تحت نشانہ بناتے تھے، میں نے بھی کسی جوں و جذبے کا مظاہرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا

تھا کہ یہ میری ماسٹر ٹینک کا حصہ تھا کہ دشمن کو کیسے ہلک کیا جاتا ہے، اگرچہ ابھی مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ بلیو تسی



مرحبا جوشاندہ منزلہ، زکام اور فلو سی چھٹی

مرحبا جوشاندہ اب سیرپ میں بھی دستیاب ہے۔

”سندروس جن لوگوں کے حوالے کیا جا چکا ہے، وہاں سے اسے اگر میں نکال بھی لوں تو طرفین کی حوالگی کی نرم اینڈ کنڈیشن کیا ہوگی؟ علاوہ ازیں اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ یہ معالجہ طے پا جانے کے بعد تم یا تمہارا کوئی حواری مجھے پھنسانے کے لیے اس راز کو آشکارائیں کرے گا، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے، میرا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔“

میں نے آخر میں دانستہ ایسا کہا تھا، تاکہ اس کی ”بدمذہبی“ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ جائے کہ میں تنقید کی اس کی باتوں میں آ رہا تھا یا میں خود بھی ذاتی طور پر اس معاہدے کی کامیاب تکمیل چاہتا تھا۔

”لہذا! یہ بولنی ناں بات۔“ وہ یک دم خوش ہو کر بولا۔ ”اس کی تمہیں بالکل بھی چتا نہیں کرنی چاہیے، ہمارا کام ہو جائے، یہی کافی ہوتا ہے ہمارے لیے، یہ ہمارے اصولوں کے ہی خلاف ہے کہ ہم کام نکل جانے کے بعد مخالف پارٹی کے بارے میں ایسا کوئی فضول قدم بھی اٹھائیں، کیونکہ اگر ہم ایسا کرنے لگ جائیں تو پھر کون ہماری باتوں کا آئندہ یقین کرے گا؟ ممکن ہے ہمیں پھر دوبارہ بھی تم سے کوئی کام پڑ سکتا ہے، اسی نوعیت کا۔“

”سمجھ گیا میں، اب اس کی نرم اینڈ کنڈیشن کی بات کرو۔“ میں نے لہجے میں جوش سانسوٹے ہوئے کہا تو بولا۔ ”مجب سے پہلے تمہیں سندروس کو نکالنا ہوگا، اور اسے کسی محفوظ مقام پر لے کر پہنچو گے، پھر ہمارے فون کا انتظار کرو گے، اس نمبر پر تمہیں میں اب دوبارہ نہیں ملوں گا نہ ہی بات کروں گا۔ میرا ایک آدمی تم سے اب رابطے میں رہے گا، لیکن ضرورت پڑی تو میں بھی بات کر سکتا ہوں، اس کے بعد ہمارا ایک آدمی اپنی سلی کر کے لیے تم سے ملے گا، اور وہی ہمیں ”آئل اوکے“ کا سگنل دے گا جس کے بعد ہمارے حرکت میں آنے کی باری ہوگی یعنی تمہارے باپ تاج دین شاہ کو ہم ساتھ لے کر اٹاری کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچیں گے۔ اور وہیں تم یا تمہارا کوئی آدمی اس کی تصدیق کر کے تمہیں ”اوکے“ کا سگنل دے گا۔ اس طرح دو طرفہ تسلی ہو جانے کے بعد اٹاری ہی کے ایک سرحدی مقام پر دونوں آدمیوں کی ”میچوئل ری پلیسمنٹ“ مکمل میں لائی جائے گی، ڈن؟“

اُس نے مختصر ترین الفاظ میں اس معاہدے کی عملی تصویر پیش کر دی۔ میں نے فوراً رضامندی کے بجائے یونہی چند متعلقہ سوالات کرنا ضروری سمجھا، اور معاہدے سے

تھا۔ بعد میں ہم نے ہر طرح سے کوشش کی لیکن تمہارے باپ نے کچھ بھی اگلے نہیں دیا۔“

اس کے لمحے میں شکست خوردگی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ایسے میں اول خیر بھی آب دیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے خاموش انداز میں حوصلہ دینے کے لیے، دھیرے سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے ہونٹ سمجھ کر اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ میری آواز مارے رقت کے لرزتی محسوس نہ ہو، اس سے کہا۔

”تو تم اس سے وہ راز اگلوانے کے لیے اس پر اتنے عرصے تک تشدد کرتے رہے۔“ میرا غم ایک آنکھ کی آتش فشاں کا روپ دھارنے لگا تھا۔ جسے میں نے ہونٹ سمجھ کر جیسے بڑی مشکلوں سے قابو کیے رکھا تھا۔

”یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے۔ مگر تمہارا باپ بھی سخت مٹی کا بنا ہوا تھا، کچھ بھی اگل کر نہیں دیا۔ میں اُن دنوں انڈین بی ایس ایف میں تھا، پھر انڈین آرمی سے ریٹائر ہوا اور کافی عرصہ ”را“ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہا، اس کے بعد اب تاحیات طبیعتی کا چیف بنادیا گیا اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ اب ہمارے کسی کام کا تو نہیں رہا البتہ تمہارے کام کا ضرور ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے اس غیبیت نے ایک ہلکا سا استہزائیہ قہقہہ لگایا، میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش! یہ غیبیت اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی گردن دیو بجھ لیتا، اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک اس مردودی آنکھیں اور زبان باہر کو نہیں آ جاتیں۔ وہ بڑے آرام سے اپنی بربریت کی داستان سناتا تھا مجھے، بلکہ ایک بیٹے کو، جس کے باپ کا اس غیبیت نے کیا حشر کیا تھا۔

”اگر تمہاری سلی ہو گئی ہو تو اب معاہدے کی بات کر لی جائے؟“ دوسری جانب سے اس نے پوچھا، مجھے یہ سلی ہو گئی تھی کہ میرے باپ نے وطن عزیز کے لیے جو قربانی دی تھی وہ ضائع نہیں گئی تھی۔ لہذا میں نے بھی اپنے دکھ اور غضب ناک کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اسے اثبات میں جواب دے ڈالا تو وہ بولا۔

”معاہدہ سیدھا سادہ سا ہے، ہم تمہارے باپ کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں اور تم ہمارا آدمی سندروس ہمارے حوالے کر دو۔“ اس مکار بھارتی مہادیو چکر کی بات سن کر میں نے ایک بار پھر دانستہ چند ثانیوں کی خاموشی اختیار کرتے ہوئے یہی تاثر دینا چاہا کہ جیسے میں اس کی اس ”آفر“ پر ایک معمولی سی رد و درج کے بعد غور کر سکتا ہوں، لہذا اپنے لہجے کو گوسایا تے ہوئے اس غیبیت سے بولا۔

کچھ روحانی قسم کے تحفظات کا اظہار کیا، جس کی تفسی ہوئے ہی میں نے بھی اس کے ساتھ یہ معاہدہ ڈن کر دیا۔ تاہم ایک اہم سوال جو واقعی میرے نزدیک اہم تھا، اس سے ضرور، روادری کے انداز میں پوچھا۔

”تمہارا وہ آدمی جو سندر داس کے سلسلے میں تشریف لے کر آئے گا، کیا وہ سرحد پار سے آئے گا یا ادھر ہی کہیں وہ رہتا ہے۔“

اس سوال کو پوچھنے کا مقصد میرا یہی تھا کہ میں جانتا چاہتا تھا کہ بلیوٹلس کے اور کتنے خطرناک ایجنٹ یہاں پہلے سے گھسے بیٹھے تھے؟

”مشر شہزاد“ اس کی سمجھ آواز ابھری۔ ”یہ ایک غیر متعلقہ سوال ہے اور میں ان میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تو پھر میں معاہدہ کے کوئی بھجوں؟“

میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے اثبات میں جواب دے دیا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

”او خیر!“ گفتگو اختتام پذیر ہوتے ہی میرے برابر میں اسٹیرنگ سنبالے بیٹھے اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ تھل تھل فون کے وائچر ایکٹرکسٹم سے وہ بھی میرے اور کرل سی جی بجوائی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے اسے کار آگے بڑھانے کا اشارہ کر دیا، اس نے ایک نظر میرے سوچ میں پڑے چہرے پر ڈالی اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس موضوع پر چہر بات کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تھا، ابھی ہمیں عارفہ سے ملنا تھا، جس کی رہائش گاہ سے اب ہم زیادہ دور بھی نہیں تھے۔

وہاں پہنچے تو اُسے اپنا بیٹھن پرایا۔ سر پہر کا وقت تھا۔ چکی اور دانی اسکو لے کر کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اپنے کمروں میں سو رہے تھے یا پھر شلا دیے گئے تھے۔ ایک دو سنے ملازم نظر آئے، پرانے ملازمین میں شریفان اور اس کا شوہر دکھائی نہیں دیے تھے، جن کے بارے میں مجھے بہت پہلے اندازہ تھا کہ وہ سرحد بابا کے مرحوم ہونے کے بعد نہیں رہیں گے۔ تاہم دونوں بچوں سے انہیں بھی محبت تھی۔

معلوم ہوا، وہ چھوڑ کر جاسکے تھے۔ وہ نہ بھی جاتے تو عارفہ اپنے ناروا روپے سے انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھی یہی ہوگا۔ وہ اتنی ہی کینہ پرور اور کم ظرف عورت تھی۔ صرف اپنی عمل داری کی قائل تھی، مجھے یقین تھا کہ اس نے جمال انکل کو بھی اپنی کمپنی سے نکال باہر کیا ہوگا۔ وہ اپنے شوہر یا سہیلی کوئی بھی نشانی یا باقیات پالنے

کی عادی نہیں تھی۔

یہ اس کے حدود درجہ جلائے اور حسد کی نشانی تھی۔ محسن کش تو اپنی جگہ بھی ہی، احساس کمتری اور احساس محرومی کی بھی ماری ہوئی تھی اور بلا کی خود غرض بھی۔ عابدہ کے ساتھ اس نے جو کیا تھا، یہ تقریباً اس پر پوری اترتی تھی۔

ہم ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ شہتر سے متعلق میری نرمی پر اس ناگہن نے بھی فوراً اپنی پچھلی بدل ڈالی تھی ورنہ کہاں تو یہ میری صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی، وہ میرے ساتھ بہت دوستانہ رویے اور خوش دلی کا اظہار کر رہی تھی، لیکن میرے چہرے پر یہ ویسی ہی کسم پٹا طاری رہی۔ اُس نے چائے وغیرہ بھی منگوائی چاہی تھی، لیکن میں نے منہ نہ کر دیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ معاملات کی بات ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”میرے لیے وہ شہتر کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اور نہ ہی ان پر میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔“ اُسے اپنی جانب سنجیدگی سے متوجہ پا کر میں نے کہا۔ ”لیکن بسا اوقات کسٹروڈین جیسی صورت حال میں جب یہی بات ایک خدا اختیار کر لیتی ہے تو بات اور ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ میرا آپ سے بھی کوئی اور کسی قسم کا تعلق نہیں رہا ہے، جو بھی تھوڑا بہت تھا وہ سرحد بابا کے حوالے سے ہی تھا، اب وہ ہی نہیں رہے تو میرا خیال ہے ہمیں بھی کچھ دل و دماغ سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے پر عائد جو بھی وجاہت بنتے ہیں، انہیں باہم رضامندی سے طے کر کے اپنے اپنے راستے پر چلنا چاہئے۔“ میری بات پر اس مکار عورت کی آنکھوں میں خوش فہمی کی ایک چمک سی نمودار ہوئی تھی۔ فوراً چالاک سے مسکرا کر بولی۔

”تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی ہے شہتر! یقین کرو میں خود کو بے حد مطمئن محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن تمہاری واجبات والی بات میری سمجھ میں نہ آسکی، اگر اس کی تھوڑی تشریح کر دیتے تو۔۔۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے اس کی طرف پرستانت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ سرحد بابا اپنی وصیت کے مطابق مجھے ایک بڑی ذمے داری سونپ گئے ہیں جبکہ ایسے میں، خود میرے اپنے کاندھوں پر ان گنت ذمے داریوں کا بوجھ لدا ہوا ہے، اس بوجھ کو میں اضافی بوجھ ہی سمجھتا ہوں، آپ جتنی اور دانی کی ماں ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ایک ماں سے بڑھ کر بھلا کون اپنے بچوں کا بھلا سوچے گی۔ لہذا اس کی تفصیل کی ضرورت اسی لیے مجھے پیش آئی تھی کہ آپ اچھی طرح میری بات سمجھ لیں، اور آپ کے دل میں

کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہے۔“

”میں واقعی تمہاری باتوں کا مطلب سمجھ رہی ہوں شہزاد! لیکن یہ واجبات والی بات۔“

”میں اسی طرف آ رہا ہوں۔“ میں نے ہولے سے کھٹکھٹ کر کہا۔ ”واجبات والی بات سے میری مراد بیویوں وغیرہ کا لین دین نہیں ہے۔“ اتنا کہہ کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کے لیے ایک پرخور نظر ڈالی۔ جب توقع وہاں مجھے اطمینان کے آثار کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

”واجبات سے میری مراد صرف وہ فرائض ہیں جو ہمیں نیک نیت سے پورے کرنا ہوں گے۔“

”کیسے فرائض؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”سب سے پہلی بات تو یہ کہ عابدہ آپ کی محسن تھی، اور ہے۔ لیکن آپ نے اپنی گردن بچانے کے لیے اُس بے چاری کو پھنسا دیا اور سرحد بابا نے بھی اس سلسلے میں جانبداری برتتے ہوئے عابدہ کے بجائے اپنے بیٹے کی بیوہ یعنی آپ کو ہی ترجیح دی، اس سلسلے میں میری ان سے بھی کچھ کلامی ہوئی تھی، لیکن میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اب آپ پر اخلاقی ہی نہیں بلکہ قانونی طور پر بھی یہی فرض عائد ہوتا ہے کہ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں آپ میری مدد کریں۔“ میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے وائٹ سرحد بابا کا اس انداز میں ذکر کرنا ضروری سمجھا تھا، تاکہ وہ یہی سمجھے کہ میرا سرحد بابا سے دل خراب ہو چکا ہے اور اسی لیے میں ان کی سوچی ہوئی ذمے داری سے عہدہ برا ہونا چاہتا ہوں، اگرچہ اس ذمے داری میں مجھے بھی مالی منفعت حاصل تھی۔ لیکن حقیقت یہی تھی سرحد بابا نے درمیانی راہ اختیار کی تھی، اور عابدہ کے لیے انہوں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا، مگر انہوں نے انہیں موقع ہی نہ دیا۔

”میں اس کوئی شک نہیں کہ عابدہ نے میرے لیے قربانی دی ہے، یہ اس کا احسان ہے مجھ پر، مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ سرحد بابا نے بھی تم دونوں پر بہت سے احسانات کیے تھے۔ اور یہ بھی مت بھولو کہ میرے لیے تم نے جو کچھ کیا وہ سرحد بابا کی خاطر ہی کیا تھا۔“ اس نے بڑی مکاری سے جتا تاو میں نے بھی کہہ ڈالا۔

”میری اور عابدہ کی قربانیاں سرحد بابا کے احسانات کے سامنے بچ ہیں، مگر عابدہ کی اب جان پر بن آئی ہے۔“

آوارہ گرد

لیکن ہم اگر اس طرح کی بحث میں الجھ گئے تو آپس میں ہماری معاملے داری رہ جائے گی۔“

”آف کورس! میں بھی یہی چاہ رہی ہوں کہ معاملے کی بات شروع کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“

”سرحد بابا کی اچانک رحلت کے بعد امریکا کی عدالت میں عابدہ کا کیس کھٹائی میں پڑنے لگا ہے، میں نے اس کے لائے سون پر بات کی تھی، اس پر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب ایک ہی صورت ہے کہ اس مقدمے کے دوسرے فریق، یعنی آپ کو عدالت میں پیش ہو کر عابدہ کے حق میں یہ گواہی دینا ہوگی جو ظاہر ہے کہ وہ آپ کے ساتھ لگ آفر کے لیے امریکا گئی تھی اور وہاں ایک سازش کے تحت اُسے پھنسا دیا گیا، لہذا اصل معاملے کی چھان بین یا غیر جانبدارانہ تحقیق کے بجائے عابدہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جو سرعاً انصافی ہے، باقی آپ کو لائے سمجھا دے گا۔“

”او آئی سی تو یہ بات ہے، تبھی میں کہوں کہ یہ اونٹ پہاڑ تلے کیسے آیا ہے۔“

ساری بات سمجھنے کے بعد وہ بڑی مکاری سے بولی۔ اس کے لہجے میں ایسا ایک ایسا جیسے کھچا کھل گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ”اونٹ“ کے کہہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس کے چہرے سے مکارانہ فرقی ترس رہی وہ اب ہوا ہو کے ایک ایک ”آکر“ میں بدل گئی تھی۔ گویا وہ سمجھ رہی تھی کہ میری ذمے داری اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھی بڑے مستحکم اور بے ظاہر پھسکون لہجے میں کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے سامنے اس وقت ہاتھ جوڑے بیٹھا ہوں؟ اور تم سے عابدہ کی مدد کے سلسلے میں بھیک مانگ رہا ہوں؟ ہرگز نہیں، اس خوش فہمی کو تم اپنے دل سے ہی نکال دو۔ کیونکہ میرے پاس اس سے بہتر آپشن موجود ہے، جو یقیناً آسان بھی ہے۔“

”اچھا!“ وہ طنز کاٹ سے بولی۔ ”تو پھر حیرت ہے مجھے کہ تم اتنے آسان آپشن کو رد کر کے پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔“ اس کی گفتگو بے لجز ہر ہل ہوئی جاری تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

”محترمہ عارفہ بیگم! میں اس لیے یہاں آیا ہوں تاکہ تم عابدہ کے سلسلے میں اپنا اصولی کردار ادا کر کے میرے دشمنوں کی ہٹ سٹ سے خارج ہو جاؤ، کیونکہ یہ امر ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ عابدہ تمہارے غلط بیان دینے کی وجہ

سے ملتی رہتی تھی۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس نے اس کی ضمانت کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی ایک وکیل ہائر کر لیا ہو۔ میں نے طنز یہ کہا۔

”ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ تم سیٹھ نوید کو جانتی بھی نہیں۔“

”اب چھوڑو ان باتوں کو۔“ اس نے گفتگو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔

”ابھی بات ہے۔ اب آپ ڈیڑھ سڑٹھٹیک میرے حوالے کر دیں تو میں وہ امریکا لائز کو بائی پوسٹ کر دوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ ابھی میں تمہیں نہیں دے سکتی۔ پہلے نوید سے بات کروں گی۔ اس کے بعد۔“ وہ بولی۔ ”وہ تم یہ متعلقہ اسپتال سے بھی نکلا سکتے ہو۔ اس میں بھلا کیا پریشانی ہے؟“

”وہ ڈیڑھ کیٹ کھائے گا۔“ میں نے کہا۔

”تو کیا ہوا پھر؟ تم اسے کی کلاس دن آفیسر سے ایسٹ کروالو۔ وہ سڑٹھٹیک خود میرے لیے بھی ضروری ہو گا، وہ تو میں تمہیں کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتی۔“

”میں عایدہ کے سلسلے میں تھوڑا سا بھی ابھام چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ویسے میں اس سلسلے میں لائز سے مشورہ لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ڈیڑھ کیٹ سڑٹھٹیک تو تم بھی نکلا سکتی ہو، اس میں کیا قیاحت ہے؟“

”تم پہلے اپنے لائز سے بات کرو، میں تب تک نوید سے بات کرتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ میں اور اول خیر واپس لوٹ آئے۔

میری اور عارفہ کی اس ملاقات سے اول خیر اور شکلیہ زیادہ پُر امید نہ تھے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرنے پر رضامند ہوگی، اور اس کی باتوں سے مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا۔

بہر حال میں نے ڈیڑھ سڑٹھٹیک کے سلسلے میں آنرہ خالدہ سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا، لیکن امریکا کے وقت کے حساب سے وہاں آدھی رات تھی، اسی لیے میں نے اُسے صبح کر دیا۔ اور تب تک میں نے متعلقہ اسپتال سے ایک اور ڈیڑھ سڑٹھٹیک بھی نکلا لیا، تاکہ آنرہ خالدہ کا جواب اثبات میں آنے تو میں فوراً اُسے ارسال کر دوں۔

اپنے کارڈر پہنچے تو شکلیہ نے مجھے بتایا کہ میجر ریاض باجوہ کا فون آیا تھا۔ میں چونکا۔

”کیا کہہ رہے تھے وہ؟“ میں نے شکلیہ کی طرف

مضبوط وکیل سے باطل قرار دیے جارہی تھی، اور میں شاید اس خوش فہمی میں تھا کہ میں اسے مختلف چکر دلوں میں ڈال کر خوف زدہ کر کے اپنا کام نکلا لوں گا۔ حقیقت یہی تھی کہ میں خود بھی عارفہ کے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس سے جنگی اور دانی دنیا میں اکیلے رہ جاتے، کیونکہ سرد بابا کے بعد اب بھلا ان دونوں معصوم بچوں کا دنیا میں اپنی ماں (عارفہ) کے سوا اور کون تھا؟ میں نے اپنی اسی جذباتی کمزوری کو عارفہ سے چھپانے کے لیے شروع میں ہی یہ ظاہر کر دیا تھا کہ میرا سرد بابا سے دل خراب ہو چکا ہے۔ رہی بات سیٹھ نوید سانچے والا پر سرد بابا کو انخو اور بعد ان کے حادثاتی قتل والے کیس کی تو یہ کام پبلک پراسیکیوٹر کے سپرد تھا۔

”یہ میرا دوسرا ہے کہ میں اس سے کیسے اپنی بات منواتا ہوں۔ تم میرے ساتھ معاملے کی بات کرو۔ ہاں یا نہیں؟“ میرا بہت وقت ضائع ہو گیا۔ سب سے پہلے مجھے سرد بابا کے ڈیڑھ سڑٹھٹیک کی ضرورت ہے۔ وہ میں لائز کو امریکا فوراً ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد لائز کی تاریخی لے گا اور تم امریکا روانہ ہو گے اور گرام بناؤ گی، ممکن ہے اس میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی کرنا پڑے۔“

”اور شیئرز میرے حوالے کب کرو گے؟“ اس نے آنکھیں سیکڑ کر میری طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

”عارفہ کی رہائی اور اس کی یہاں یہ خیریت واپسی کے بعد۔“

”اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم بعد میں اس معاہدے سے ہر کیا جاؤ۔“

”اتنا تم بھی مجھے جانتی ہو کہ میں کیا آدھی ہوں۔ عایدہ مجھے مل جائے، میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوگی۔“

”مگر میں اس سلسلے میں تحفظات اور ابھام کا شکار رہوں گی۔ بہر حال میں کسی سے مشورہ کر کے تمہیں کوئی حتمی جواب دوں گی۔“ وہ کچھ نیم رضامندی سے بولی۔

”سیٹھ نوید سانچے والا سے مشورہ کرو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا، ”مجھے حتیٰ کہ مجھ سے اس کا کیا پوشیدہ تھا بھلا۔“

”کیا اس نے اپنی ضمانت کروالی ہے یا پھر جیل میں اس سے ملو گی؟“

”اس کی ضمانت جلد ہونے والی ہے، ویسے میں اس سے ملتی رہتی ہوں۔ کل ہی اس سے مل کر میں تمہیں آگاہ کر دوں گی۔“ میرا اندازہ دست ثابت ہوا تھا۔ وہ سیٹھ نوید

بابا کا چہرہ گھومنا تھا۔ تاہم میں نے اپنے اندر کے نبال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جھانسا نہیں دے رہا ہوں، حقیقت بیان کر رہا ہوں، اور دینے بھی کیا تم پر یہ واجب نہیں ہوتا کہ تم بغیر کسی معاہدے یا معاملے کے اپنی محنت عایدہ کی مدد کرو، جو تم پر اصولی طور پر واجب بھی ہے؟“ میری اس بات نے اُسے شپٹا دیا، مگر دھماکی سے بولی۔

”میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟“

”ٹھیک ہے پھر میں دوسرے آپشن پر غور کر لیتا ہوں۔“ کہتے ہوئے میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تو اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور میرے مقابل کھڑے ہو کر بولی۔

”ٹھیک! اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ان شیئرز کے حقدار ہو تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے، میں نے سرد بابا کی وصیت کو کورٹ میں چیلنج کر دیا ہے، بہت جلد فیصلہ میرے حق میں ہونے والا ہے۔“

”خوش فہمی تمہیں ہے، مجھے نہیں۔“ میں نے کہا، پھر ایک ستائے دار مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چند لمحوں کے توقف سے بولا۔ ”بائی دی دے، جسے تم نے اپنے مستقبل کا جیون سا بھی تار کھا ہے، یعنی سیٹھ نوید سانچے والا۔ وہ بہت جلد پولیس کے سامنے بیچ اٹکے والا ہے کہ سرد بابا کے انخو اور جیل میں تم بھی اس کے ساتھ شامل تھیں۔ کسی وقت بھی پولیس تمہاری گرفتاری کے لیے یہاں چھاپا مارنے والی ہے۔“

”کون سیٹھ نوید سانچے والا؟ میں اسے جانتی بھی نہیں۔“ وہ مکاری سے مسکرا کر بولی۔

”ابھی ٹوک ہے، شاید چل بھی جائے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میں دوسرے آپشن پر عمل پیرا ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں ہی نہیں تم بھی جانتی ہو اچھی طرح کہ لولووش کی ان شیئرز میں جان انگی ہوئی ہے اور شاید تمہارے علم میں نہیں ہے کہ جس سی آئی اے افسر بائسل ہولارڈ نے عایدہ کو حراست میں لیا ہوا ہے لولووش اس کا چھپتا داماد ہے، وہ بڑے آرام سے اور بغیر کسی لمبے چوڑے چکر دلوں میں پڑے، عایدہ کو امریکا سے یہاں پاکستان پہنچا دے گا۔“

”اس کے لیے ایک طویل پروکس کی ضرورت پڑے گی تمہیں اور اس کی کیا ضمانت ہوگی کہ لولووش جیسے اعلیٰ ٹیکنیکل نہیں دھوکا نہیں دے گا؟“ اس نے کہا۔

وہ بلا کی عیار اور شاطر تھی۔ میری ہر بات کو ایک

سے پھنسی ہے۔ اور اگر اُسے خدا انخو اسے کچھ ہو گیا تو سب سے پہلے تمہیں اس کا حساب ڈکانا ہوگا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنے دشمنوں کو بالکل محاف نہیں کیا کرتا اور عایدہ کے دشمن کو تو بالکل بھی نہیں۔“

میری بات پر عارفہ کے چہرے پر ایک پیکا سارنگ آ کے گزر گیا، یعنی طور پر یہ اس کے اندر کا دبا خوف تھا جو شاید اس حوالے سے پہلے ہی اس کے اندر کے بچپنی بنا ہوا تھا۔

”دھمکی دے رہے ہو مجھے؟“ اس نے میری طرف شکی نگاہوں سے دیکھا۔

”دھمکی وہ لوگ دیتے ہیں جو کچھ کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ میری اب تک کی زندگی تمہارے سامنے ہے، میں نے جو کہا وہ کر دکھایا۔“

”تمہارے پاس دوسرا آپشن کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”لولووش۔“

”لولووش؟“ اسے ایک جھٹکا لگا۔ میرا خیال تھا کہ اب میں نے شاید اس کی دھمکی رنگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”نت۔۔۔ تم اسے کیسے جانتے ہو؟“

”بچکانا سوال ہے۔“ میں نے بے پروا انداز میں کہا۔ ”اب معاملے کی بات کریں تو بہتر ہوگا۔“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بولی۔

”تم یہ چاہتے ہو کہ میں عایدہ کے حق میں گواہی دینے امریکا جاؤں اور پھر تم وہ سارے شیئرز میرے حوالے کر دو گے؟“

”ہاں!“ میں نے مختصر کہا تو وہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ سے بولی۔

”اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے اس جھانے میں آ جاؤں گی۔“

اس کی بات پر میرا پیش آسان کو چھونے لگا، یہ عورت نہ ہوتی تو میں اسی وقت اس کی گردن دو بج کر اسے کہتا ”اے غیبی انسان! تم نے جو عایدہ کے ساتھ کیا ہے، اس سلسلے میں مجھے تم سے کسی ڈینگ یا معاہدے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ تم پر واجب ہے کہ تم اپنی محنت کے لیے یہ سب کرو۔ ورنہ تمہاری زندگی کو کچھ بنادوں گا۔“

لیکن میں عارفہ سے اس طرح نہیں کہہ سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں جب بھی میرے دل و دماغ میں عارفہ کے لیے ایسا کوئی جارحانہ خیال آتا تھا تو میری نظروں کے سامنے سرد

سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور تو کوئی خاص بات نہیں کی، بس تمہارا ہی پوچھ رہے تھے کہ آجائے تو میرے پاس بیٹھ دینا۔“
شکلی کی بات سن کر میں اکیلا ہی میجر صاحب سے ملنے ان کے آفس روم کی طرف چلا گیا۔
☆☆☆

ایک بند کمرے میں، میری ون ٹو ون ملاقات میجر ریاض باجوہ سے ہوئی۔

میری ملاقات کے بعد میں نے ان کے چہرے سے ایک فکر سا جھلک محسوس کیا۔ تاہم میں نے اصل بات کی طرف آنے سے پہلے پوچھا۔

”سرا اور رجان کا کچھ پتا چلا؟“
”ابھی تک تو نہیں، لیکن اس کی تلاش جاری ہے۔“
انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”اور سندرداس یا چوہدری ممتاز خان نے کچھ اگلے کر دیا؟“

”اصل مسئلہ ان کے منہ سے کچھ اگوانا نہیں بلکہ تسلیم کروانا ہے، کیونکہ وہ کون ہیں، کیا ہیں یہ سب ہمیں معلوم ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ان کے عجیب سے لہجے نے مجھے چونکا سادیا۔ پتا نہیں کیوں وہ آج مجھے کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بددلی کی سی کیفیات ان کے سنجیدہ چہرے سے مترشح ہوتی نظر آ رہی تھی۔ خاموشی کا یہ وقفہ طویل پکڑنے لگا تو میں نے پوچھ لیا۔

”کیا بات ہے سرا؟ آپ آج کچھ اچھی اچھی باتیں کر رہے ہیں؟“

انہوں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور اپنی کرسی سے اٹھ کر اپنے سیدھے ہاتھ والی اس دیواری طرف جا کھڑے ہوئے جہاں ایک کھڑکی باہر پینڈ کوارٹر کے اس میدان میں کھلتی تھی، جہر صدر ڈرل وغیرہ ہوتی تھی۔ میری نظریں ہنوز ان کے تعاقب میں تھیں۔ وہ چند تانے کھڑے باہر میدان کی طرف تکتے رہے، پھر میز کی طرف آئے اور جھک کر اس کی دروازہ کھولی اور اس کے اندر سے ایک پوسٹ کارڈ سا تر تصویر نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔
”اسے پہچانتے ہو؟“

میں نے حیران حیران سی نظروں سے تصویر پر ایک نظر ڈالی، صورت دیکھی بھائی تھی اور ذرا سا ذہن لٹکانے پر میں اسے پہچان گیا تھا اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ یہ تصویر بھلا یہاں کیسے آئی اور کیوں؟“

”جی سرا! میں اس تصویر کو پہچان گیا ہوں، مگر یہ آپ کے پاس؟“
”کیا واقعی تم اس تصویر والی کو پہچان گئے ہو یا پھر...“

”میں پہچان گیا ہوں سرا! یہ چوہدری ممتاز خان کی جوان سال بیٹی نوشابہ ہے۔“ میں نے فوراً بتایا۔

”ہاں! اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ فرخ نام تھا اس کا۔“ وہ بولے۔ ”جس کے قتل کا الزام تم پر اور تمہارے ساتھی اول خیر پر لگا تھا۔“

”جی... جی ہاں سرا!“ میری آواز جانے کیوں حلق میں اٹکنے لگی تھی۔ میجر صاحب کا بدلا بدلا لہجہ، ممتاز خان کی بیٹی نوشابہ کی تصویر، اور اب میجر صاحب کے منہ سے نوشابہ کے چھوٹے مقول بھائی فرخ کا ذکر۔ یہ سب کیا تھا؟ کون سا نیا محاذ اب کھلنے والا تھا؟ اس نازک وقت کی بساط پر دشمن پھر کون سی نئی چال چلنے والے تھے میرے ساتھ؟ میرے اندر کوئی جیسے حلق چھا کر چلا آیا۔

”شہزاد احمد خان! تمہارے دشمنوں کے ترش میں ابھی بہت تیر باقی ہیں، تم کب تک اور ان کے کون کون سے تیر و تفنگ کا مقابلہ کر دو گے؟“

میرے اندر ایک زبردست سی پچھل گئی تھی۔ میں بے چین تھا یہ جاننے کے لیے کہ آخر یہ کون سا نیا گورکھ دھندا شروع ہونے والا تھا؟

میجر ریاض باجوہ تھکے تھکے سے انداز سے میرے سامنے اپنی چیز پر دو بارہ براجمان ہو گئے۔ پھر بولے۔

”شہزاد! نوشابہ نے اپنے بھائی فرخ کا مژدہ رکھیں ری اوپن کر دیا ہے۔ تمہارے اور اول خیر کے خلاف ایف آئی آر کو اودی ہے۔ پولیس تمہیں کسی بھی وقت گرفتار کرنے والی ہے۔“ میجر ریاض باجوہ نے جیسے میری ساتوں میں دھماکا کیا۔ میں اس وقت جن نازک اور حساس ترین حالات سے گزر رہا تھا، اس میں ایسے کسی نئے محاذ کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ قطعاً نہیں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں کنفیوژن پہ سنائی دیتی محسوس ہونے لگی تھیں، میں غیر چینی نظروں سے میجر باجوہ صاحب کا چہرہ دیکھتا جا رہا تھا اور جب بولا تو مجھے اپنی آواز حلق سے بہ شکل گنگنی محسوس ہوئی۔

”یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے سرا؟ وہ کیس داخل ہی نہیں ہوا تھا کبھی میرے خلاف، ری اوپن کیسے ہو گیا؟ حتیٰ کہ میرے اور اول خیر کے خلاف ایف آئی آر بھی کٹ گئی؟ پہلے کیا نوشابہ سوئی ہوئی تھی؟“

”گلتا ہے اس کی پشت پر کسی کا ہاتھ ہے۔ ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے، جس نے اُسے سارے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے، اُسے اکسایا ہے۔ اور وہ وزیر جان ہی ہو سکتا ہے۔“

”وزیر جان؟ مگر وہ تو روپوش ہے؟“
”یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ روپوش ہے اور اپنی کسی خفیہ کین کا وہ میں بٹھایا سب کر رہا ہے، ہاتھ آجاتا ہمارے تو اور حالات ہوتے شاید۔“

”آپ کا خیال ہے کہ اُس نے نوشابہ کو...“
”ہاں! میں اپنے طور پر کنفرم کر دیا چکا ہوں۔ نوشابہ اپنے باپ چوہدری ممتاز کی رہائی کے سلسلے میں بھی سرگرم ہو گئی ہے اور اپنے باپ کی سیاسی پارٹی سے وابستگی کو ظاہر کرتے ہوئے خود بھی شامل ہوئی ہے۔ بعض ایجنٹ الوقت قسم کے سیاست دان جنہیں سیاہ ست دان کہنا زیادہ بہتر ہوگا، وہ بھی اس کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف بیان بازی کرنے لگے ہیں اور بالخصوص تمہارے ایجنٹ کو زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے ہمارے حوالے آچھلا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری توقع کے خلاف اور قبل از وقت ہو گیا ہے۔ وزیر جان بہت ہی شاطر دماغ کا آدمی نکلا۔ جانتا ہے اچھی طرح کہ کب اور کس وقت کون سے مہرے کوہر کاٹنا ہے۔“

”حیرت ہے سرا! وزیر جان نے اتنی جلدی کس طرح نوشابہ کا مائنڈ سیٹ آپ بدل کر رکھ دیا۔“ میں کوگو سے اندر میں بولا۔

”اسی بات نہیں ہے، نوشابہ کا تیرا اس نے بہت پہلے ہی سے تیار کر رکھا ہوگا۔ نوشابہ کا اب اپنے باپ ممتاز خان کے علاوہ وہ بھی کون کیا ہے؟ وہ باپ کے بغیر خود کو تنہا تصور کرنے لگی ہوگی اور اسی ایجنٹ کو وزیر جان نے استعمال کرتے ہوئے اس کا مائنڈ سیٹ آپ پہنچ کرنے کی کوشش کی ہوگی، بہر حال وہ ایک عورت ہے، تنہائی اُسے عدم تحفظ کا احساس دلاتی ہوگی۔“

”تو پھر اب ایسی صورت حال میں کیا کرنا ہوگا ہمیں؟“ میں نے دھڑکنے والے میجر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ابھی تو مجھے ان سے کرنل سی جی بھجوانی کے سلسلے میں بھی بات کرنا تھی۔

”اس سلسلے میں آج رات ڈی آئی جی جنرل ریجنرز... ہماری خصوصی میننگ ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں ”پاور“ کو ہنگامی بنیادوں پر ڈراپ کرنا پڑے۔“ وہ بولے، اور مجھے ایک اور جھکاؤ لگا۔

آوارہ گرد

پاور کے خاتمے کا مطلب تھا، شکلیہ اور اول خیر نے سر و سامان ہو جاتے۔ جبکہ پولیس بھی ہمارے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ پریشانیوں اور انگڑائی کی پلنگار سے میرا حلق سوکھنے لگا تھا۔ ہماری حیثیت ہی کیا تھی؟ ایک رضا کار، اور ڈی لی وچز کی۔

”تم گلہ نہ کرو شہزاد! اگر ایسا کوئی فیصلہ ہوا بھی تو میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔“ انہوں نے شاید میرے چہرے سے پریشانی کے آثار بھانتے ہوئے کہا۔

”سرا میری پریشانی اپنی جگہ لیکن آپ سے ایک اور اہم معاملے پر بھی ڈسکشن کرنا چاہی، کچھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں؟“

”ہاں، تم بولو، میں سن رہا ہوں، تم کون سے معاملے کی بات کرنا چاہتے ہو؟“ وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے، تو میں نے انہیں پلیوٹکسی کے سی جی بھجوانی سے نوٹک گفتگو کے بارے میں پوری صراحت سے آگاہ کر دیا اور اس سلسلے میں مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہیے تھا، اس کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ سب باتیں سننے کے بعد ان کے چہرے کی تنجید کی بڑھ گئی، ہنگاموں کا ایک جال سا ان کے ماتھے پر پھیل گیا۔

کچھ تانے کی پروسچ خاموشی کے بعد بولے۔ ”یہ معاملہ بھی بہت حساس نوعیت کا ہے، ایسے میں جبکہ ہمارے خصوصی ونگ پاور کے سلسلے میں آخری فیصلہ کیا جانے والا ہے، ہم ایسی مہم جوئی کا رسک نہیں لے سکتے۔ یہ بہت رسک من ہوگا، اگر سندرداس فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو بہت مشکل کھڑی ہو جائے گی، جبکہ ایسے میں ہم پہلے ہی سمیر حالات سے دو چار ہو چکے ہیں، اور پلیوٹکسی کے کھاگ ایجنٹ اتنے ہل نہیں ہیں کہ ہم انہیں اس طرح آسانی سے غل دے سکیں۔“ مجھے میجر باجوہ صاحب کی بات پر حیرانی سی ہوئی۔

”لیکن سرا! میرا منصوبہ بے داغ ہے۔ اس کے لیے پاور کے چار ایجنٹ کافی ہوں گے میرے ساتھ۔“

میری بات پر وہ مٹی خیر انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ ”جنگلین انہیں اپنا یہ رسک منصوبہ اسی لیے بے علم لگ رہا ہے کہ تم اپنے باپ کو بھاری خفیہ ایجنسی کی قید سے بچھڑوانا چاہتے ہو۔“

میجر ریاض باجوہ کی اس بات سے مجھے ایک تکلیف دہ حیرت ہوئی تھی، آج پہلی بار میں نے ان کی بات سے شدید اختلاف کیا تھا۔

”تو کیا سرا میرے باپ کی رہائی کی ذمہ داری آپ لوگوں پر عائد نہیں ہوتی؟ کیا وہ اس کی ذاتی کام سے سرحد پار گیا تھا؟ اس نے اپنا گھر بار وطن کی خاطر قربان کر ڈالا، اور اپنی جان کی بازی لگا کر دشمن ملک کے ایسے خطرناک جاسوس کو کسی کے ملک میں جہنم واصل بھی کیا، جو ایک خطرناک ملکی راز چرالے جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کیا اس کا یہ حق نہیں بنتا کہ اس کی رہائی اور وطن واپسی کے لیے ہم کچھ کریں۔ اور پھر آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ یہ میرا محض ایک ذاتی مسئلہ ہے؟ بہت افسوس ہوا سر مجھے آپ کی بات پر۔“

”تم خود بخود جذباتی ہو رہے ہو جنٹلمین!“ میجر ریاض باجوہ نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کیا ثبوت ہے کہ کرنل سی جی بھجوانی تمہاری ایک جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تمہیں ہلکے کر رہا؟ کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ جس تاج و تین شاہ کی بات کر رہا ہے، وہ زندہ بھی ہے۔“ مجھے میجر باجوہ کا بچہ بے رحمی کا عکاس محسوس ہوا۔ میں ان کا احترام کرتا تھا اس لیے کوئی سخت جواب دینے سے گریزاں ہی رہا، لیکن وہ فوراً نرمی سے بولے۔

”دیکھو! جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ بیوٹکسی والے تم سے ہم کھیل رہے ہیں۔“

”اگر یہ کفر ہو جائے کہ میرا باپ زندہ ہے تب آپ کا کیا رد عمل ہوگا؟“ میں نے اپنے تئیں باجوہ صاحب سے رائے چاہی تو وہ بولے۔

”باوجود اس کے سندر داس جیسے اہم اور خطرناک فہرے کو ہم اپنے قبضہ گرفت سے نہیں نکال سکتے۔“

”سر! میری آپ سے ریکویسٹ ہے، اس موقع سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے، اس طرح نہ صرف ہم یہاں گھسے بیٹھے ”را“ سمیت بیوٹکسی کے ایجنٹوں کا سراغ لگا لیں گے بلکہ اس طرح میرے باپ کو بھی رہائی مل جائے گی۔ میرا باپ ایک غازی ہے، وطن کا غازی، کرنل سی جی بھجوانی کی باتوں سے میں نے اندازہ لگائے کہ اس کی کوشش کی کہ میرا باپ اب واقعی ان کے لیے.... کارآمد نہیں رہا ہے، اور اسی لیے انہوں نے اس آجٹن کو استعمال کرنے کا سوچا ہوگا کہ میری اس جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے آدمی کو حاصل کر لیں۔ ان کی اس امید اور ڈیل کی وجہ بڑی فحش اور سمجھ میں آنے والی ہے! پلیز سر! مجھ پر بھروسہ کریں۔“ کہتے ہوئے میں نے ملکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا،

مجھے ان کا چہرہ کسی گہری سوچ میں متفرق محسوس ہوا تو مجھے اُمید ہوئی اور میں پہلے سے بھی زیادہ محکم لہجے میں بولا۔ ”سر! پاور ہتی ہے یا نہیں، بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وطن عزیز کا ہر جہر وطن ایک ”پاور“ ہے۔ اور یہ پاور درحقیقت اللہ کی پاور ہے۔ میں اور میرے دونوں ساتھی (ٹھیکر اور اول خیر) بے شک یہاں سے بے دخل بھی کر دیے جائیں تو کوئی پروا نہیں، میرا آپ سے وعدہ ہے سر! ہم آپ سے ملاقات سے پہلے بھی پاور تھے اور اب بھی ہیں اور انشاء اللہ رہیں گے، بھلا آپ کو ہم سے آج تک بھی کوئی شکایت ہوئی ہے؟ ہم نے آپ سے ٹریننگ لی ہے سر! میرے دونوں ساتھیوں کو بھی سٹیشن انفارمیشن صاحب نے کافی حد تک ٹریننگ کیا ہے، لیکن ہمارا اصل ہتھیار ہمارا ایک جذبہ ہے۔ ہم تو جے کے قریب ہیں، لیکن محض ایک ٹھرم کی لوشل ممانہ ختم کرنا بڑی بات نہیں، یہ ایک ایسے آٹو کیس کی طرح جیسی ہوتی ہے جس کا اگر ایک ٹینٹیکل (Tentacle) کاٹ دو تو چند دنوں بعد دوسرا نکل آتا ہے، جبکہ ہمیں اس کا سر چلانا چاہیے، آپ کے بھی علم میں ہے ہوگا کہ ہمارے بیرونی دشمنوں نے اسے ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہانک کر لیا ہے، لہذا اس حقیقت سے آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا سر! کہ ملک اس وقت بہت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اس طرح کی سازشیں ماضی میں بھی ہوتی رہی ہیں، وطن عزیز اس وقت بیرونی سازشوں کے زخموں میں بھی ہے، ہمارے دشمن آپہنیں میں کچھ جوڑ کر چکے ہیں، ٹھیک ہے ملک کے بعض وسیع تر مفادات کو مد نگاہ رکھتے ہوئے، کچھ سخت فیصلے بھی ہمیں جھینے پڑتے ہیں، اور بعض ملک دشمن عناصر سیاست کی آڑ میں بھی اپنے ذاتی مفادات کے حصول سے نہیں چوکتے، اور جہاں ان کی گردن پھنکتی ہے وہ بلبلار کو ”عوامی کارڈ“ کیلئے کی کوشش کرتے ہیں، اور کیا آپ بھول گئے سر؟ پاور سیکریٹ سروس بھی تو اسی کا تو ذکر کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی تاکہ ہر کوڑ ہر سے اور لوہے کو لوہے سے کاٹا جائے، تاکہ کو ہاتھ کھما کر چکڑیں یا سامنے سے، بات تو ایک ہی ہے سر، یہ ٹھیک ہے کہ پاور طشت از بام ہوگئی، اور اب اسے ختم کیا جا رہا ہے، لیکن کیا اس سے پاور کا مقصد ختم ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں سر! اس سے کیا فرق پڑے گا؟ رہی بات میری اور میرے ساتھیوں کی متوقع گرفتاری کی، تو آپ بے فکر رہیں، مجھے ایسے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا تجربہ ہے، وہ میں دیکھ لوں گا، مگر اس وقت جو کام ضروری ہے وہ مٹانا ہوگا۔ پلیز سر! آئی ہمیں ریکوریڈ ہو، آخر میں یہی کہوں گا کہ وطن کے جس جال

نثار سپاہی کی آزادی کے لیے جو فحش کوشاں ہے، وہ بھی، اسی بہادر اور محب وطن سپاہی کا بیٹا ہے۔ میرا وعدہ ہے سر، میں سندر داس کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گا۔“

میجر ریاض باجوہ سے یہ سب کہتے ہوئے میری آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ ایک عجیب سے جوش تھے میرے وجود کا رواں رماں قمر شمس سا ہو رہا تھا۔ میری لرزتی نظروں کے سامنے میجر باجوہ کا چہرہ ان کے اندرونی جذبات کا عکاس نظر آنے لگا۔ میری ہر جوش باتوں کی اثر پذیری ان کے نثرے سے عیاں تھی۔

پھر وہ اپنی چیز سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ”ویل ڈن جنٹلمین!“ کہتے ہوئے اپنے دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھے، میں نے بھی اپنی گری چھوڑ دی اور فرط جوش سے ان کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ وہ میرا کاندھا چھتچھا کر بولے۔

”شہزاد احمد خان! مجھے تم پر اور تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دوبارہ اپنی چیز سنبھال لی، اور ساتھ ہی مجھے بھی پیٹنے کا اشارہ کیا۔ پھر میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولے۔

”شہزاد! ہم کسی بھی صورت میں اپنے مشن کو اُدھورا نہیں چھوڑتے، ہاں، مصلحتاً ماموعہ صل کے تحت اس میں قفل آسکتا ہے یا کچھ تبدیلیاں لانی پڑتی ہیں، تم نے پاور سے متعلق اور باوجود باتیں کی ہیں، ان کی ممانہ کی وجہ سے ہی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں یہ چانس دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”تحریک یو سوچ سرا“ خوشی کے باعث یہ اظہار مسرت میرے لبوں پہ آگیا۔ ”سر! میں انشاء اللہ ہمیشہ کی طرح آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

آوارہ گرد

مجھے میری ماں سے ملوایا ہے، یہ ذریعہ بھی اسی کا ہی عطا کردہ ہے، بہت مردانہ و خداداد۔ یہ اس رب کریم کا وعدہ ہے سر!“ میری بات پر ریاض باجوہ نے ایک بار پھر بڑی گر جوش سے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور... میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں“ میں نے ”پھر ذرا توقف سے بولے۔“ یہ تو شکر ہے کہ سندر داس ابھی تک میری ہی کسٹڈی میں ہے۔ لیکن میں زیادہ دیر اسے اپنی کسٹڈی میں نہیں رکھ سکتا۔ جی اچھ کیوں کہ احکامات کے مطابق مجھے جلد ہی اُسے ان کے شہر دکرنا ہے۔“

”میں کچھ گیس! میں انشاء اللہ بہت جلد یہ مشن مٹانے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا چوہدری ممتاز خان کو جی اچھ کیوں کہ حوالے کر دیا گیا ہے؟“

”ہاں!“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”ہمارے لیے کیا حکم ہے سر! آئی میں، کیا ہم یہاں سے کہیں اور شفٹ ہونے کی تیاری کریں؟“

”ابھی نہیں، پہلے اپنا یہ مشن مٹاؤ، دیکھتے ہیں پھر، ابھی میٹنگ کے بعد ہی فیصلہ ہوگا، تاہم تم تینوں خود کو ذمہ داری طور پر اس کے لیے تیار رکھو۔“ میں نے ان کی بات پر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور رخصت ہوتے وقت میجر صاحب نے میری اس جانب بھی توجہ دلا دی تھی کہ کوشاں والے کیس کے سلسلے میں کوئی اچھا سا ویل بھی ہانک لوں، وغیرہ۔

☆☆☆

میں اپنے کارٹر پر بیٹھ کر ٹھیکر اور اول خیر کو اپنا ہتھیار پایا، مگر میں ان کے چہرے دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ دونوں ہی مجھے خامے شکر اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔

”تم دونوں کو کیا ہوا؟ تم دونوں خامے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

”شہزی! کیا میجر صاحب سے تمہیں کچھ بتا نہیں چلا؟“ ٹھیکر نے مجھ سے مخاطب ہونے میں پہل کی تو مجھے ان کے چہروں سے ٹھیکر پریشانی اور تشویش کا کچھ اندازہ ہوا۔

”ہاں! کوشاں کی بات تو میں کر رہے ہوں؟“

”ہاں! اس کے! ابھی ابھی ایک ٹھرم کی وی جیتل میں ہم نے اُسے ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔ میرا دل ایسا بے چین ہوا کہ جی چاہا ہی وقت تمہارے پیچھے جاؤں اور تمہیں مطلع کر دوں۔“

”چل رہی ہے پریس کانفرنس یا ختم ہوگئی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر تنبیہ کی تو پوچھا تو اس بار ٹھیکر نے جواب دیا۔

”ختم ہو گئی ہے، مگر شہزی! اس لڑکی نے تمہارے خلاف بڑی بکواس کی ہے اور... اس نے تو تمہیں اشاروں کتابوں میں اسٹیمپڈ ٹکٹ کا اور تمہانے کن کن لوگوں کا ٹاؤٹ بھی قرار دے ڈالا ہے۔ بہت زہرا ٹھہر رہی تھی وہ تمہارے خلاف۔“

”تم بتاؤ شہزی! بھجر صاحب نے تم سے کیا کہا۔“

اول خیر نے پُر فکر نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں تب تک نشست گاہ میں آ بیٹھے تھے، جہاں ٹی وی آن تھا۔

میں نے انہیں اپنے اور بھجر صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ میں اپنے نئے مشن کے سلسلے میں ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ساتھ ہی ان دونوں کو بھی تسلی دی کہ انہیں اس نئی صورت حال سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن شکلیہ کے مقابلے میں اول خیر کے چہرے پر عدم اطمینان کے آثار جوں کے توں موجود رہے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا، پھر میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”کیا بات ہے اول خیر! تم کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہو؟“

”پریشانی کی بات تو ہے کا کے!“ وہ پُر تنکیر آواز میں بولا۔ ”میرا خیال تھا پہلے نوٹا پیڈ والے معاملے سے منٹ لیتے، اس کے بعد اس مشن میں ہاتھ ڈالتے، پھر عارف سے بھی ہم نے عابدہ کے سلسلے میں معاملہ داری کی بات شروع کر رکھی ہے۔ یار کا کے! ٹوکنا شے ہے؟ تو نے بیک وقت اتنے سارے معاملات میں ٹانگ بچھنا ہی ہے۔ کس معاملے کو پہلے دیکھنا ہے اس کا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا۔“ وہ بے چارہ آخر میں الجھ سا گیا تھا۔

”شہزی! جو کر رہا ہے وہ ٹھیک ہی کر رہا ہے۔“ شکلیہ نے کہا۔ ”حالات کی یلغار ہی ایسی ہے ہم پر کہ یہ سارے معاملات جو تمہاری ناقص عقل میں الجھن کا باعث بن رہے ہیں، درحقیقت ان سب کے تانے بانے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک جھین ہے جسے کڑی درکڑی سلجھانا ہے۔“

شکلیہ نے اپنی فہم و فراست کے مطابق ”حالات دوراں“ کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا، ان سارے مذکورہ معاملات کا ”لنک“ نہیں نہ نہیں اور کسی نہ کسی حوالے سے آپس میں ملا ضرور تھا، اور حالات کا دھارہ ابھی ایسی ہی تھا کہ اس پر اسی طرح بہا جائے۔

اگرچہ مجھے شکلیہ کی اس بات میں وزن محسوس ہوا تھا لیکن میں نے دانستہ اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے چہرے پر پرجوش خاموشی طاری رکھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اول خیر اس کے جواب میں کیا کہتا ہے؟ لہذا وہ مجھے خاموش پا کر اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

”میں تم سے زیادہ شہزی کے قریب رہا ہوں، اور شروع سے لے کر اب تک کے سارے حالات کا بھی گہرا مشاہدہ رکھتا ہوں بلکہ ان کا مجھے تجربہ بھی رہا ہے۔ شطرنج کی اس چار دانگ پچھلی بازی میں کب اور کہاں مہرہ کھسکا نا چاہیے، اس کا بھی مجھے بہ بخوبی اندازہ ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ بیک وقت اتنے سارے معاملات کو ہاتھ میں لینے کی وجہ سے کسی ایک معاملے پر گرفت کمزور ہونے لگتی ہے، اور انسان صحیح طور پر انصاف نہیں کر پاتا، جبکہ یہاں ہر معاملہ اپنی جگہ نازک اور حساس نوعیت کا ہے، کوئی ایک معاملہ بگڑا تو سب درہم برہم بھی ہو سکتا ہے۔“

”لو! تم نے تو خود ہی میری بات کی تصدیق کر ڈالی۔“

شکلیہ نے پورے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔ اور اول خیر بھونچکی سی صورت بنا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا، ان نازک گھڑیوں میں بھی میرے اندر وہی کا شوق چھوٹا تھا، مگر بڑی مشکل سے میں نے اسے اپنے ہونٹوں پر ”چھپنے“ سے روک رکھا۔ وہ اسی اعتماد سے آگے بولی۔

”تمہاری آخری بات سے یہ وضاحت ہو گئی کہ یہ سارے معاملات ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور ایک کو چھوڑیں تو دوسرا سر اٹھا کر اڑے آ جائے گا۔ اور بد قسمتی سے یہ سب ایک ساتھ ہی سر پہ آن پڑے ہیں۔ کسے حل کیا جائے اور کسے چھوڑا جائے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ سب معاملات ساتھ ساتھ ہی فیصلے کرنے کے مستحق ہیں۔“

میں اب منتظر تھا کہ اول خیر کیا جواب دیتا ہے؟ لیکن میرا مقصد یہ دیکھنا نہیں تھا کہ دونوں میں سے کون زیادہ ذہین تھا اور کون کم۔ بلکہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق ایسی کوئی سوچ بھی ہی نہیں۔ شکلیہ کی عقل و فراست کی کسوٹی کچھ اور تھی، جبکہ اول خیر کی فہم و فطانت اور تھی۔ اور دونوں ہی نئی زمانہ ضروری بھی تھیں۔ شکلیہ کی سوچ کا تھوڑا ”ٹچ“ مجھ سے میل کھاتا تھا، جبکہ اول خیر اس کے الٹ تھا۔ شکلیہ کی سوچ ”اچھی“ سے متعلق تھی تو اول خیر کی ”کبھی“ سے وابستہ۔ وہ دور اندیشی کو ملحوظ رکھنے کا عادی تھا اور شکلیہ کو کل پر بھروسہ نہیں تھا۔ اُسے کل پر توشیح ہوئی تھی، نہ جانے کیا ہو اور جو ہو وہ ابھی منشاء یا جائے، اول خیر دور بین تھا تو شکلیہ خوردبین۔ اور

میں ان دونوں کی باتوں کی روشنی میں اپنی عقل کی مشترکہ کسوٹی پر کوئی ایک فیصلہ صادر کر ڈالتا تھا۔ میں اسی کا منتظر تھا، جب اول خیر نے جواب میں کہا۔

”جاو جو اس کے ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ کون سا معاملہ اپنی ترتیب اور اہمیت کے لحاظ سے پہلے آتا ہے۔“

”انگریز عقل!“ میں بھی تو یہی کہنا چاہ رہی تھی۔ ”وہ بولی۔ تب میں نے بھی گفتگو کو کتنی شکل دیتے ہوئے درمیان میں کہا۔ ”عارف کے جواب کا ہمیں انتظار ہے، یہاں ہیڈ کوارٹر میں اب ہمارا کیا مستقبل ہوگا، یہ مہاجر باجوہ صاحب ہمیں کل صبح تک بتا دیں گے، کرنل سی جی کے سامنے نے ہم سے خود رابطہ کرنا تھا، کب؟ یہ بھی اندازہ میرے میں ہے۔“

وزیر جان کا کھوج اور نوٹا پیڈ والا معاملہ ایسا ہے جس کے لیے ہمیں پہلے سوچنا ہوگا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ ضروری نوٹا پیڈ کے معاملے کو دیکھنا ہے، جس نے میرے اور اول خیر کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر بھی کنوا دی ہے۔“

شکلیہ نے میری بات پر اپنے سر کو کھینچ کر جینٹل دی تھی۔ میں نے ذرا زیادہ نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھا، وہ ہنوز کسی نامعلوم سی الجھن کا شکار دکھائی دے رہا تھا، اس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہو، مگر کہنے کی شاید ہمت نہیں پارہا تھا۔

اسی وقت میرے سئل کی تیل کنگنائی، ایسے میں سئل کی تیل بھی اچانک دل دھڑکا دیتی تھی۔ میں نے سئل پر تھم دیکھا تو ایک نئی سوچ نے میرے اعصاب پر یلغار کر دی۔ کال زہرہ بانو کی بھی، میری جب سے ان کے ساتھ کل کلامی ہوئی تھی جب سے مجھے کم ہی امید تھی کہ وہ مجھ سے دوبارہ رابطہ کریں گی۔

ماں بھی وہیں تھیں، لیکن ہے ان سے متعلق انہوں نے مجھ سے کوئی بات کہنا ہو، میں نے سئل کان سے لگا کر پوچھا۔

میرے اور زہرہ بانو کے درمیان چونکہ کچھ ذاتی معاملات بھی تھے، اسی لیے میں نے اس کا اسپیکر وائپر نہیں کیا تھا اور دوسرے کمرے میں آ گیا تھا۔

”شہزی! کیسے ہو؟“ دوسری طرف سے اُن کی وہی لپکدار، اپنائیت اور ملاعت آمیزی میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ جس کی تہ میں مجھے ہمیشہ ایک حسرت کا درد ناک لوج سامنے محسوس ہوا کرتا تھا۔

اوارہ گرد

لہجے کی معنی خیزی نے مجھے ذرا گڑبڑا سا دیا، ایسا واقعی میرے ہونٹوں سے روا روای اور بے اختیاری میں نکل گیا تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑیں۔

”تم نے جاننے کے بعد مجھ سے پھر کوئی رابطہ ہی نہیں کیا، مگر مجھے تمہاری ہر وقت فکر رہتی ہے۔ سوچتا تھا کہ اس روز کی الزام تراشی کے بعد تم سے کوئی بات نہ کروں گی لیکن یہ بھلا میرے لیے کہ اور کہاں ممکن ہو سکتا ہے؟ مگر تم تو رہے ہمیشہ کے بے مروت، ماں جی کے یہاں ہی فون کر لیتے کہ ہمارے مجھے ہوئے دل کو ایک خوش فہمی کا سہارا ہی ہو جاتا۔ ہمیں دیکھو بچوں کی طرح تمہارے ساتھ لڑتے ہیں اور دل میں کوئی بغض رکھے بغیر بچوں ہی کی طرح سب کچھ بھول بھال کر خود ہی من بھی جاتے ہیں۔ کیا تم اس روز کی ناراضی ابھی تک اپنے دل میں رکھے ہوئے ہو شہزی؟“ انہوں نے آخر میں پوچھا۔

ان کے گداز لب و لہجے میں بہت درد تھا، بہت سوز تھا، ان کی آواز اور ان کے لہجے میں دور کہیں کی حسرت زدہ و ناراض تکتی کی کک بھی تھی، جس کا اظہار بھی شاید ان کے لیے عذاب ناک تھا۔ یہی وہ نب کچھ آشکارا کرتا تھا کہ وہ شکست خوردگی کا کتنا بڑا گھاؤ کھائے ہوئے تھیں۔ لیکن مجھے آج یہ سب کیوں محسوس ہوا تھا؟ خود سے سوال کیا تو میرے اندر سے بھی ایک آہ نکل گئی۔ میری آنکھیں بھی تو کسی کی منتظر تھیں؟ میں بھی تو عابدہ سے جدائی کا رخم کھائے ہوئے تھا۔ موسم بھراں کے اس بے برگ دیوار چمن کی زمین پر گرے ہوئے خزاں رسیدہ چوں میں خود میں بھی تو شامل تھا جو حسرت بھری نظروں سے اس درخت کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جن پر بھی وہ جھول کر موسم بھار کے گیت گایا کرتے تھے، مگر وہ اب نو حال کنساں تھے۔ تو کیا... میرا اور زہرہ بانو کا ڈکھا سا جھگڑا کیا تھا؟ تو کیا... اب میں اور زہرہ بانو اور الفت کے دوا ایسے ہم رکاب بن چکے تھے، جن کی بے نشان منزلیں بغیر کسی سبک میل کے طے ہو رہی تھیں، آہ... شاید آج مجھے صحیح سمتوں میں زہرہ بانو کے ڈکھا کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ ہاں آج... میرا دل بے اختیار ان کی طرف کھینچے لگا تھا۔ آج مجھے اول خیر کی وہ بات یاد آ رہی تھی جو اس نے زہرہ بانو کے ساتھ ہونے والی میری فحی کے نتیجے میں ان کی حمایت میں مجھ سے کہی تھی۔

”انسان اپنی پہلی محبت کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اور وہ بھی ایسی محبت جو دوائی جدائی کا جاں کسل احساس بھی رکھتی ہو۔ یہی شے انسان کو ہمیشہ ایک ایسی احساسِ محرومی سے

دو چار کھتی ہے کہ لاشعوری طور پر اپنے محبوب جیسی جھلک یا مستعار کی گئی اس سے متعلق کوئی نشانی کے لیے اس کا دل تڑپتا رہتا ہے۔ اور پھر کا کے انکو تو پورا ہی لیتق شاہ ہے۔ اس لیے تھوڑا ہی بات سمجھنے کی کوشش کیا کہ اور اتنی وسعت اپنے دل میں رکھا کر کہ کچھ حقیقتوں کے آگے ایک کمزور انسان بے بس ہوتا ہی ہے۔ یہی حال اس بے چاری بیگم صاحبہ کا بھی ہے۔

اول خیر کے یہ الفاظ یاد کر کے آج مجھے کا جیسے میرا بھی زہرہ بانو جیسا حال ہونے لگا ہے۔ عایدہ کی جدائی نے مجھے بھی تو ایک ایسی ہی احساس محرومی سے دو چار کر دیا تھا، جس میں لاشعوری طور پر وہ کسی ایسے انسان میں اپنے پھچھڑے محبوب کی جھلک دیکھتا ہے، جو اس کے قریب رہتا ہو۔ جس سے ایک عرصے سے تعلق داری رہی ہو۔ اگر زہرہ بانو مجھ میں لیتق شاہ کی مماثلت کے حوالے سے اپنی کسی لاشعوری اپنائیت میں مبتلا تھی، تو کیا میں بھی ان کی نرمی، ملائمت آمیزی اور ان کے لہجے سے متروک دار فائدہ انداز کا پیاسا ہو رہا تھا، کیا میں بھی لاشعوری طور پر اپنی کسی احساس محرومی کو دور کرنے کے لیے کسی مستعار گھڑیوں کا متلاشی تھا؟ یا پھر یہ آج زہرہ بانو کے لب و لہجے اور انداز خطاب کا شکار تھا؟

”کیا سوچتے لگے شہزی!“ دوسری جانب سے دوبارہ ان کی لوح دار آواز آئیں، جس نے مجھے خیالات کے بھنور سے اُبھار دیا۔ نیچا لے کیوں ان کی آواز آج میرے دل کی تڑپ بڑھاتی تھی۔ پریشانیوں کی یلغار میں کسی کا شیشا اور اپنائیت بھرے لہجے کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے۔ اور یہی اثر پذیری مجھ پر حاوی ہونے لگی تھی۔ اس قدر کے بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہو گیا۔

”زہرہ! ہم... میں بہت پریشان ہوں... آج ایسا لگتا ہے جیسے مسائل کا پورا المیہ میرے سر پر آن کر رہا ہے۔“ چلے آؤ پھر میرے پاس۔ ”وہ بے اختیار جیسے دار فائدہ انداز میں بولیں۔“ ایسے وقتوں میں انسان کی اپنے کا ہی سہارا ڈھونڈتا ہے۔ آج اوں میں تمہاری خنجر ہوں۔“ انہیں شاید تازہ حالات کا علم نہ تھا اور ایسے میں مجھے انہی کے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

”گاڑی بھجوا دوں میں؟ لیبل دادا اور میرے آدمی جنہیں لینے آجائیں گے۔“ ”جی، میں خود ہی آجاتا ہوں۔ آپ سے اور بھی... موضوعات پر گفتگو کرتی ہے مجھے۔“ ”میں خنجر ہوں۔ بلا تاخیر چلے آؤ شہزی!“ ”آپ ناراض تو نہیں ہیں مجھ سے۔ اس روز کی تلخ

انہوں نے وہ سب بھلا دیا اور مجھ سے بات کیے پراندرہ سکیں وہ۔ یہ تو نے اور بھی اچھا کیا کہ ان سے اپنے اس دن والے روئے پر دی محضرت بھی کر لی۔ چل کا کے اجا۔ اب بغیر کسی غلط فہمی کے پہنچ جان کے پاس۔ اور اپنی ساری پریشانی بتا دے انہیں۔ اب تو ہمارا یہاں سے بھی پوری باسٹر کچھو کچھو گول ہونے والا ہے۔ کوئی پروا انہیں اللہ مالک ہے، اور مجھے یقین ہے کہ میجر صاحب ہمیں اس طرح تنہا تو نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ انہوں نے تجھ سے وعدہ کیا ہے۔ لیکن پتا نہیں بعد کے حالات کیا ہوں۔ بیگم صاحبہ کی اور بات ہے، وہ ایک دردمند دل رکھنے والی خاتون ہیں۔ ادارہ چلانے والے یا ملکی معاملات چلانے والے لوگوں کے ہاتھ نہیں نہ کہیں بندھے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن بیگم صاحبہ اور ان کا گروہ ہی ایک ایسا ادارہ سمجھو جو صحیح معنوں میں لوہے کو لوہے سا کاٹتا ہے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہوتے۔ چل کا کے! بیگم ولا۔ آج بیگم صاحبہ کو اپنی ساری پریشانی بتا دے، کچھ مت چھپانا ان سے۔“

”خوبی میرے ساتھ چلے گا۔“ میں نے سمجھ لیا۔ ”میں تیار ہوں۔“ اس نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو اٹھائی پنجش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم دلا کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمیں پولیس کا بھی ڈر تھا۔ مگر میجر باجوہ صاحب نے اس سلسلے میں مجھے اتنی تسلی تو دے رکھی تھی کہ جب تک میں یہاں ہوں، وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم دلا پہنچ چکے تھے تو شام ٹھکنے لگی تھی۔ میں بے دھڑک اول خیر کو لے کر اندر داخل ہوا۔ شاید میرے آنے کی اطلاع گیٹ پر موجود سچ محافظوں کو کر دی گئی تھی۔ میں جہاں سے گزرتا، میرے لیے دروازے واہ ہوتے چلے جاتے۔ اول خیر البتہ مصلحتاً اپنے یاروں دوستوں کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ کیبلں دادا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر کسی سے پوچھنے پر پتا چلا کہ بیگم صاحبہ نے ہی اسے باہر کہیں کسی کام سے بھیجا تھا۔

خوب صورت مرکزی محرابی دروازے کی چوٹ پار کر کے جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا تو چونک پڑا۔ سامنے زہرہ بانو کھڑی دکھائی دیں۔ اگرچہ اس میں کوئی چونکنے والی بات نہیں تھی وہ ہمیشہ میرا یہاں آنے پر عموماً اسی طرح ہی خود آکر استقبال کرتی تھیں، لیکن آج کی بات اور تھی، آج کی

ملاقات اور تھی، آج لگتا تھا جیسے کچھ خاص ہو۔ اور وہ اسی... ”خاصیت“ سے ہی تیار ہو کر میرے سامنے کھڑی تھیں۔ پوری تیاری کے ساتھ، تیاری بھی نہیں۔ جیسے آج ان کی شادی کا دن ہو۔ ان کے عتائی ہونوں کی غرضی اور اس پر چھلکی دل آویز مسکراہٹ۔ ایسا کیوں تھا؟ میں یہی سمجھا تھا کہ تاریخی ڈھلنے کی خوشی میں ایسی ڈھلپٹوں جیسی جج و جج اس کا التزام قرار پایا ہو؟ ہلکا آسانی مہین لباس، جو دکنے میں بالکل ساگر مہر پر کار تھا، ایسا کہ ان کے بھرے بھرے جسم پر بالکل تھا۔ میں ایک تک پہلے تو انہیں دیکھتا ہی رہ گیا، وہ اپنے دلنشین ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے میری طرف کج کج قدم اٹھاتی ہوئی بڑھیں اور میں جیسے ان کے ٹرانس میں ان کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے اپنا نازک اندام سا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا اور میں نے بھی بے اختیار ان کا سر میں ہاتھ تمام لیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہاں آکر ایک سنگھ ایک سکون کا احساس ہونے لگا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لیے کسی اندرونی گوشے کی طرف بڑھنے لگیں۔ ان کے بدن کی عطر یز بکھت میرے حواسوں پہ چھا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے دل و دماغ کا سارا بوجھ کہیں باہر چھوڑ آیا ہوں۔ اسی وقت مجھے ماں جی کا خیال آ گیا۔ میں نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھ لیا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہیں اور آرام کر رہی ہیں۔ آؤ ہم کچھ دیر تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اپنے اپنے اندر کا بوجھ اتارتے ہیں۔“

وہ مجھے... دلا کے کسی گوشہ تنہائی میں بے کمرے میں لے آئی۔ کمرے کی فضا بھی معطر تھی، روم فریشر میں گلاب کی خوشبو مہک رہی تھی، کمرے کی روشنی فقط اتنی ہی تھی کہ کچھ قریب سے سمجھائی دے سکے، سامنے مسکری تھی، سرخ گاؤں کے نیچے فنی اسٹائل کے سرہانے کے پاس دھڑے، جیسے من کے ہنڈیوں کے خنجر تھے۔

”بیٹھ جاؤ یہاں۔“ اس نے مجھے مسکری پریشاد یا اور خود چلتی ہوئی، ڈیرنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے موتیے کے گہرے اٹھلائی اور بالکل میرے پاس میرے قریب بیٹھ گئی۔ بھروسہ کی دل آویز خوشبو زہرہ بانو کے بدن کی مہک میں رل مل کر حواسوں پر ایک عجیب سا نشہ طاری کر رہی تھی۔ کراڑیادہ بڑا نہیں تھا، مگر چہتا خنجر تھا اتنا ہی قربت کا احساس چکار ہا تھا، بڑھا رہا تھا۔ ایسے میں زہرہ بانو نے موتیے کا وہ گہرا میری طرف بڑھا دیا اور بہت دیر سے بولی۔

”یہ میرے یہاں سجادو۔“ اس نے اشارے سے

بتایا۔ میں نے سمجھا اس کے ہاتھ سے لیا اور تھوڑا آگے جھک کر اس کے ایک کان کے پاس الٹا دیا، میرے ہاتھ جھنجھنے سے قفل ہی اس نے میرا ہاتھ وہیں قہار کر دیا اور اپنا مرمیں نازک مگر جلتا جلتا گال میرے گھر دے بالوں بھرے ہاتھ سے لگا دیا۔ ایک پیش، ایک تپ سی میرے اندر اٹھی تھی۔ ایسے میں میرا اور اس کا چہرہ قریب، قریب تر ہو گیا۔ اس قدر کہ سانپوں کی بازگشت بھی ایک دوسرے کو صاف سنائی دینے لگی تھی۔

”شہزی! لگتا ہے آج تم زندگی کی ایک طویل سڑک پر دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہو۔ اور... اور آج میرے کاندھے پر اپنا سر رکھنے چلے آئے ہو۔ ہے ناں؟“

”ہاں زہرہ، میں واقعی بہت تھک سا گیا ہوں اور شاید ٹوٹ بھی رہا ہوں۔ شاید مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش بھی جہاں میں کچھ وقت آرام اور سکون سے سو سکے گزار دوں۔“

”شہزی! میرا بھی یہی حال ہے، میں بھی شاید آج ٹوٹ رہی ہوں، بکھر رہی ہوں، آؤ کہ ہم ایک دوسرے کو بچا لیں، نہ میں تمہیں ٹوٹنے دوں نہ تم مجھے بکھرنے دو۔“ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آگئی، بہت قریب۔ اس کی آواز میں جاوہر ایک مرحمتا، جو مجھے ٹرائس میں لے رہا تھا۔ وہ سر کوئی تھیں بولی ”لیتی؟“

”عابدہ۔“

ایک فیسول کی وادی تھی جہاں وہ میرا ہاتھ پکڑے مجھے وہاں اتار رہی تھی اور میں بھی اترے جا رہا تھا۔

پتا نہیں کب اور کس وقت میری آنکھ کھلی تھی اور میں جیسے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ ہوش و خرد کا یارا ہوا تو سب یاد آنے لگے۔ وہ سب کچھ میرے لیے قطعاً ناقابل عمل ہی نہیں بلکہ ناقابل تصور بھی تھا۔ میں نے شکر کیا کہ یہ سب ایک خواب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نہ میں لیتق شاہ کی جگہ لے سکتا تھا، نہ زہرہ بانو، عابدہ کی۔ تو پھر یہ کیا تھا اور کیسا خواب تھا؟

میں نے بچی بچی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش میں دیکھا اور اہل کر رہ گیا۔ وہی ماحول تھا، وہی کمر تھا اور وہی مسہری کی جہاں میں عابدہ سے بے وفائی کا شرکب ہوا تھا۔ مگر وہ کہاں تھی؟ زہرہ بانو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے چکر سا آگیا۔ دماغ گھومنے لگا۔ خود کو یقین دلائے لگا۔ شہزاد احمد خان اتنا کمزور کب سے ہو گیا۔ وہ اگر ہر میدان کا شہسوار تھا

اور اب تک بہادری سے اپنے حالات اور دشمنوں سے غصے چلا آ رہا تھا تو پھر یہاں کیوں بزدلی پر آمادہ ہو گیا؟ کیسے؟ کیوں؟ کیا میرے ساتھ اس بار اس نے سازش کھیلی تھی، جسے اپنا بھٹا آیا تھا؟

اسی وقت کمرے کی دم پر خود فضا میں تالی جتنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور میری آنکھیں یہ غیر یقینی منظر دیکھنے کے لیے کھلی گئیں۔

وہ عابدہ تھی۔ سنا ہوا امر جھپایا ہوا چہرہ لیے، آنکھوں میں شکوہ و شکایت کے دیپ جلائے، ہونٹوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی۔

”واہ شہزی! میں تو نہیں مر آؤں سمجھتی تھی مگر تم نے تو اپنی مرداگئی بہنوں پر ایک غیر عورت کے ساتھ خوب دکھا دی۔ کیا تم اسے مرداگئی کہو گے، ہاں؟ نہیں شہزی۔ کم از کم ایسی مرداگئی تو نہیں بالکل شیوا نہیں دیتی تھی، تم نے بس میرا قہار یہی انتظار کیا؟ میری محبت کا یہی پاس تھا تمہاری نگاہوں میں، جسے تم نے آج ہوس کی سولی پر چڑھا دیا۔ یہ کیا تمہارا جذبہ محبت تھا شہزی! جس نے تمہیں اس قدر کمزور بنا دیا کہ تم نے پناہ کے لیے میری ہاتھوں کے بجائے کسی اور کی لفٹوں کو سہارا بنالیا۔ میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی شہزی، بھیجی نہیں اور شاید تم بھی خود کو کسی معاف نہیں کر پاؤ گے۔ تم نے آج میرا مان توڑا ہے۔ میرا دل، میرا اندر توڑ دیا ہے۔ تو کیا میں بھی خود کو بکھرنے سے بچانے کے لیے کسی غیر مرد...“

”عابدہ...! میں چلا اٹھا اور مسہری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت کمرے میں روشنی ہو گئی۔ سامنے زہرہ بانو کھڑی تھی جو اس وقت مجھے ایک زہریلی نان کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ میں مجھے ایک فاتحانہ سی چمک محسوس ہوئی تھی جو میری اس خوش فہمی کو بل کے بل ہوا کیے دے رہی تھی۔ جو میرے اندر ایک موہوم سی امید چکائے ہوئے تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ مگر زہرہ بانو کی مسکراہٹ نے مجھے دھلا کر رکھ دیا تھا اندر سے۔

ایک سوالیہ نشان آنکھوں کی طرح جیسے میرے حلق میں آن لگا تھا کہ کیا واقعی یہ ”سب کچھ“ ہو چکا تھا؟

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

معین الدین نے کمری پر بیٹھے ہوئے کمری کو گھما کر دفتر کا معائنہ کیا۔ اس کے سامنے گلاس ٹاپ میز تھی۔ جدید ترین مصنوعی لکڑی کی بنی یہ میز شاید حال ہی میں یہاں لگی تھی کیونکہ اس سے ابھی تک خوشبو آ رہی تھی۔ فرش پر گہرے ہرے رنگ کا قالین تھا۔ اگرچہ یہ پرانا تھا مگر صاف سقا قالین تھا۔ ایک طرف پوری دیوار کے ساتھ کتابوں اور چیزوں کے لیے ریک تھا۔ ریک کا چھلہ حصہ فائلیں رکھنے کے لیے تھا اور اس پر بڑے اہتمام سے مضبوط

ایک انٹرویو میں ہونے والی پرامن باتوں... علم دانہ سب اس سے پریشان تھے

جنونی کیفیات کسی نہ کسی واقعے کا پیش خیمہ ہوتی ہیں... ماضی نے اسے ایسے جنون میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ شریفانہ اطوار چھوڑ کر جرم کی راہ پر ہوا تھا... بولناک اور جنون پسندی کی یہ عادت اسے مسلسل اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار کر رہی تھی...

جنونی

سریم کے حنان



لاک لگا ہوا تھا۔ میز کے دوسری طرف دو عدد دای ڈیزائن کی لیکن کسی قدر ہلکے معیار کی کرسیاں تھیں اور ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک نوٹس بورڈ سیٹ میج سیٹیل کے تھا۔ کمرہ دیرسای تھا جیسا کہ ایک سترہ گریڈ کے افسر کا ہونا چاہیے تھا۔ معین نے فیڈرل سول سروس کا امتحان کامیابی سے بلکہ امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ٹیسٹ وائٹریو کے بعد وہ اپنی جاب پر آیا تھا۔

آج اس کا دفتر میں پہلا دن تھا۔ وہ یہ طور سیکشن آفیسر پوسٹ ہوا تھا۔ کمرے کے عقب میں دیوار پر کھڑکی کے ساتھ لگا ہوا ڈنڈا اسے فی الحال بند تھا کیونکہ سرما کا آغاز تھا اور موسم خشک ہو گیا تھا۔ اسے سی کے بجائے اس نے کھڑکی کھول لی تھی جس سے عمارت کے عقب میں واقع جنگل سے خوشبو آمیز سرسراہٹ ہوئی ہوا آرہی تھی۔ دو دن پہلے وہ اپنے شہر سے یہاں وارد ہوا تو کسی جدوجہد اور کوشش کے بغیر اسے آفسرز ہاسٹل میں کمرہ مل گیا۔ کیونکہ انہوں نے اس کی آمد سے پہلے اس کے لیے کمرے کا بندوبست کر لیا تھا۔ فی الحال اس کے پاس گاڑی نہیں تھی مگر خالو نے اپنی ایک چھوٹی کار اسے استعمال کے لیے دے دی تھی۔ کیونکہ خالد اس سے بہت پیار کرتی تھیں اس لیے خالو مہربان تھے۔

آج پہلا دن تھا اور کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ کونے میں دیوار کے اوپر لگا ہوا ایل ای ڈی ٹی وی خراب تھا یا شاید افسر نے اسے اپنے کمرے کے خراب ایل ای ڈی سے بدل دیا تھا۔ بہر حال یہ کام نہیں کر رہا تھا۔ سامنے چند فائلیں ایک پلاسٹک ٹرے میں رکھی تھیں۔ ہولڈر میں چین اور دوسرے لوازمات تھے۔ میز پر کمپیوٹر کی کئی کئی اس نے چارج لیٹے ہی متعلقہ افسر منیر رحمان سے کمپیوٹر کا مطالبہ کیا تھا اور اس نے یقین دلایا تھا کہ دو دن کے اندر اس کی میز پر نیا کمپیوٹر موجود ہوگا۔ یہاں وائی فائی نہیں تھا ورنہ وہ اپنے موبائل پر کچھ وقت گزاری کر لیتا۔ اسے سیمہ کا خیال آ رہا تھا جو اس کی منگیت تھی اور ان دنوں تعلیم حاصل کرنے کے لیے یو کے میں تھی۔ وہ اس کا پ اور وائس ایپ پر ایک دوسرے سے رابطہ میں رہتے تھے۔

دہشت گردی کے واقعات کے بعد دارالحکومت کے اہم سرکاری اداروں میں جبر نصب کر دیے گئے تھے اور یہاں موبائل فون سروس کام نہیں کرتی تھی۔

پہلے وائی فائی تھا مگر وہ بھی اسی خدشے کی وجہ سے بند کر دیا، اب صرف وائر کی مدد سے انٹرنیٹ استعمال کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے کمپیوٹر لازمی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دروازہ کھلا اور اس کا بیون سران بابا اندر آیا۔ اس کا نام سران عبدالعزیز تھا مگر دفتر میں سب ہی اسے سران بابا کہتے تھے۔ وہ تقریباً پچیس برس کا دہلا پتلا لیکن مستعد آدمی تھا۔ وہ گزشتہ پینتیس برس سے یہاں کام کر رہا تھا۔ جس وقت وہ بھرتی ہوا تو چچے اسی کے لیے تعلیم کی شرط نہیں تھی اسی وجہ سے وہ بھرتی ہو گیا ورنہ وہ صرف تین جماعت پڑھا ہوا تھا۔ اب چچے اسی کے لیے بھی میٹرک کی تعلیم لازمی تھی۔ معمولی تعلیم کے باوجود طویل ملازمت نے اسے ادب و آداب سکھا دیے تھے۔ وہ بہت شفیق لہجے میں بات کرتا تھا اور ہر جملے میں سرسور استعمال کرتا تھا۔ اپنے افسر کا اشارہ ابرو ہچکتا تھا اور اسی وجہ سے اسے عرصے سے اسی جگہ کام کر رہا تھا۔

”سر، کسی چیز کی ضرورت ہے؟“
”جائے لے آؤ۔“ معین نے کہا۔ ”آج کوئی کام نہیں ہے اس لیے پوریت ہے۔“
”سر، کام بہت ہے۔“ سران بابا نے کہا۔ ”مگر گزشتہ ایک سال سے یہاں جو بورہا ہے اس وجہ سے اس دفتر کے لیے کام کر رہا ہے۔“

معین نے بھی اس بارے میں سنا تھا مگر سرسری سا اور وہ ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس پوسٹ پر آنے والے تین افسران گزشتہ ایک سال میں غیر ملکی موت کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ معین نے سران بابا سے کہا۔ ”ہاں میں نے سنا تھا۔ تم چائے لے آؤ اس کے بعد مجھے اس بارے میں بتانا۔ کچھ وقت ہی کٹ جائے گا۔“

سران بابا چلا گیا۔ معین نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس کا دفتر چوتھی منزل پر تھا۔ یہاں سے جنگل اور اس کے عقب میں دور پہاڑوں کا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ لگی ہوئی تھی اور اس میں سارا منظر بہت واضح تھا۔ سران بابا چائے کی ٹرائی سجا کر لایا اور صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ اس کی حرکات نمی تلی اور موزوں تھیں۔ صاف پتلون قمیض اور سلیپے سے بنے بالوں اور داڑھی کے ساتھ وہ اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ سر اور داڑھی کے بیشتر بال سفید ہو گئے تھے۔ معین نے چائے

لیجے ہوئے کہا۔ ”میں نے سرسری سنا ہے، یہاں کیا ہوا تھا؟“
سران بابا کے چہرے پر دکھ چھا گیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ ”تاہم کس کی نظر لگ گئی اس دفتر کو سر۔ جب میں نوکر ہو کر آیا تو یہاں میرا شاہ صاحب تھے۔ ان کے ساتھ میں چار برس رہا۔ بہت اچھے آدمی تھے اور بہت خیال کرتے تھے۔ پھر وہ چلے گئے اور دوسرے افسران آتے رہے۔ ایک سال پہلے صغیر صاحب آئے۔ یہ کہتے ہوئے سران بابا کے چہرے پر دکھ کا تاثر گہرا ہو گیا۔ ”بہت خوب صورت اور اچھے نوجوان تھے۔ وہ براہ راست پوسٹ پر آئے تھے۔ مگر مشکل سے ایک مہینہ نہیں گزارا تھا کہ لفٹ میں گر گئے۔“

”میں؟“
”نہیں جی، وہ پریشان تھے۔ اصل میں ان سے ایک اہم فائل مس ہو گئی تھی۔ اوپر سے دباؤ تھا اور غمی خیز جاب تھی۔ پریشانی میں آدمی کا دماغ کہاں کام کرتا ہے۔ شام کو جاتے ہوئے انہوں نے لفٹ کا بٹن دبا یا اور دروازہ کھلا تو وہ سمجھے کہ لفٹ آگئی ہے۔ انہوں نے بے دھیانی میں اندر قدم رکھ دیا مگر لفٹ اوپر تھی۔ وہ نیچے گر گئے۔۔۔“ سران بابا چپ ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”شام چھ بجے کے بعد ایک لفٹ آن ہوئی ہے وہ بند کر دی جاتی ہیں۔ کوئی ساتھ بھی نہیں تھا اس وقت تک ساری بلڈنگ خالی ہو گئی تھی۔ صفائی کرنے والے نے لفٹ کا دروازہ کھلا دیکھ کر جھانکا تو۔۔۔“

”ان کے گھر والوں پر تو قیامت گزرتی ہوگی۔“
”غریب گھر سے تھے۔ ادھر کسی سے دوستی اور جان پہچان نہیں تھی۔ ان کی میت بھی میں ان کے گاؤں لے گیا تھا۔“

”افسوس ہوا۔“ معین نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔ ”تم چائے اچھی پیتے ہو۔“
سران بابا خوش ہو گیا۔ ”برسوں سے یہاں ہوں صرف ایک بار لپنڈا پینڈا کھانا پڑتا ہے سر۔ اللہ کی مرضی ہو تو اور بات ہے ورنہ کبھی کسی کو شکایت نہیں ہوئی۔“
”اچھا اس کے بعد کیا ہوا؟“

”ادھر چار مہینے دفتر خالی پڑا رہا۔ میں صبح آتا اور صفائی کر کے بیٹھ جاتا اور شام کو گھر چلا جاتا۔ کام کا عادی ہوں اس لیے فارغ بیٹھا پڑا تو بہت مشکل ہوئی۔ پھر

کا مران صاحب آ گئے۔ ان کے والد بھی بورڈ کرٹ رہے ہیں۔ اچھی فیملی سے تعلق تھا۔ تھوڑے شوقین مزاح تھے مگر دل کے بہت اچھے تھے، مجھ سے عزت سے پیش آتے تھے۔ بلکہ وہ کہا میں نے آج تک جتنے بھی افسروں کے ساتھ کام کیا کسی بھی نے بے عزت نہیں کیا۔ غلطی ہوئی تو اکیلے میں بلا کر ڈانٹا۔ سب کے سامنے کسی نے بے عزت نہیں کیا۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو معین شاید اتنی لمبی بات نہ سنتا مگر اس وقت وہ سننے کے موڈ میں تھا۔ اسی لمحے سران بابا کو بھی احساس ہوا کہ وہ زیادہ بول رہا ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”سر، اگر آپ کہیں تو میں مختصر الفاظ میں سناؤں، بوڑھا آدمی ہوں اور آدمی بوڑھا ہو کر زیادہ بولنے لگتا ہے۔“

”نہیں بابا تم تفصیل سے سناؤ۔ آج کام نہیں ہے وقت اسی طرح گئے۔“

سران بابا نے مطمئن ہو کر بات جاری رکھی۔ ”کا مران صاحب بھی اچھے خور و جوان آدمی تھے۔ ان کی دوسری پوسٹنگ تھی۔ ایک سال وہ دوسرے سیکشن میں رہے تھے۔ پھر یہاں تبادلہ کر لیا۔ آرام سے دفتر آتے تھے اور جلدی چلے جاتے تھے مگر اپنا کام پورا کرتے تھے۔ اگر کسی دن کام زیادہ ہوتا تو وہ دیر تک بھی رکتے تھے مگر روز کا کام روز کرتے تھے۔ جب جلدی جاتے تو مجھے بھی چھٹی کرنے کو کہہ دیتے تھے مگر جب دیر تک رکتے تو مجھے کہتے کہ میں وقت پر چلا جاؤں۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگتا کہ افسر کام کر رہا ہو اور میں چھٹی کر کے چلا جاؤں۔ انہیں چائے پانی یا کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو خود اٹھنا پڑتا۔ انہیں بھی بس دس مہینے گزارنا نصیب ہوئے۔“

”ایک دن چھٹی کے وقت وہ میز میوں سے اتر رہے تھے کہ ان کا پاؤں سلپ ہوا یا نہ جانے کیا ہوا۔ وہ نیچے گرے اور ان کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ اتفاق سے اس دن وہ دیر تک رکتے تھے اور میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں ذرا جلدی چلا گیا۔ نہ جانے کئی دیر بڑے رہے۔ پھر رات کے چوکیدار نے انہیں دیکھا تو ایبوسولٹس بلوائی اور انہیں اسپتال لے جایا گیا مگر ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کا بہت دیر پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اگلے دن میں دفتر آیا تو یہاں سوگ کا سماں تھا۔ کا مران صاحب کے والد بیرون ملک تھے ان کے انتقال کا سن کر آئے تھے۔ پورا دفتر ان سے تعزیت کرنے گیا تھا۔ میں بھی گیا تھا مگر وہاں بڑے

بڑے لوگ تھے۔ ہم جیسے چھوٹے ملازمین کو موقع ہی نہیں ملا۔ بس باہر سے عمارت کے واپس آ گئے۔

”پولیس نے تفتیش کی تھی؟“

”ہاں جی پولیس آئی تھی اور اس نے پوری تفتیش کی اور پھر اسے حادثہ قرار دیا۔ جیسے صغیر صاحب کا واقعہ حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔“

”معمین نے دیکھی لی۔ وہ بھی حادثہ ہی تھا۔“

”دیکھا جائے تو حادثہ ہی تھا لیکن اصل قصور تو لفٹ کی خرابی کا تھا اور ان لوگوں کا تھا جو اس کی مرمت کے ذمے دار تھے لیکن کسی کو کچھ نہیں کہا۔ ایک بندہ اپنی جان سے گیا اور مجھے نے کوئی ایکشن ہی نہیں لیا۔“

”معمین نے نرمی سے کہا۔ ”ایسا نہیں ہے، ایکشن اس وقت لیا جاتا ہے جب کوئی قصور وار ہو۔ کیا لفٹ میں پہلے سے خرابی تھی؟“

”ہاں نہیں لیکن اس وقت تو لفٹ خراب ہی تھی۔“

”تب ہو سکتا ہے کہ لفٹ خراب ہی اس وقت ہوئی ہو اور صغیر کا وقت آ گیا ہو بھی وہ اس کا شکار ہوا۔“

”سراج بابا کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے متفق نہیں تھا۔ پھر اس نے بات آگے بڑھائی۔ ”سب سے بُرا عفت صاحب کے ساتھ ہوا۔ دیکھا جائے تو انہوں نے خود اپنے ساتھ برا کیا۔ وہ بیٹے کے عادی تھے۔ دفتر میں بھی پیٹے تھے۔ کام کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کا تعلق ایک بڑے جاگیر دار گھرانے سے تھا۔ خاندان کے کئی بندے وزیر مشیر لگے ہوئے تھے۔ انہیں ملازمت کی پروا کہاں ہوتی۔ چائے پانی کا شوق نہیں تھا، کام کی پروا نہیں کرتے تھے اس لیے میری ضرورت بھی کم پڑتی تھی۔ بہت ہوا تو شراب کے گلاس دھولا لیتے تھے۔ آتے ہوئے بول ساتھ لائے اور بیٹا شروع کر دیتے تھے۔ اکثر اتنی پی جاتے کہ مدھوش ہو جاتے اور چھٹی کے بعد بھی میٹیں پڑے رہتے تھے۔ سارا دفتر چھٹی کر کے چلا جاتا پروہ ہوتے تھے۔“

”وہ یہ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ اس روز بارش ہوئی تھی اور ٹھنڈا چانک ہی بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے ہنر آن کرنے کو کہا۔ وہ بہت نشے میں تھے۔ میں نے ہنر آن کر دیا۔ چھٹی کا وقت آیا تو وہ سو رہے تھے۔ میں ان سے اجازت لے کر جاتا تھا ورنہ وہ ڈانٹتے تھے مگر جب ایک گھنٹا دو ہو گیا اور رات ہو گئی تو مجبوراً میں چھٹی کر کے گھر چلا گیا۔ چائیں کیا ہو، گیس پریش میں مسئلہ ہوا تھا یا بیڑ میں۔ وہ بند ہو گیا مگر گیس خارج ہوئی رہی۔ کراہتا تھا۔ اس لیے

گیس باہر نہیں نکلی اور عفت صاحب کا دم گھٹ گیا۔ جب انہوں نے اپنی بیوی کا فون ریس نہیں کیا تو انہوں نے ملازم کو بھیجا۔ ان کی گاڑی یہاں پارکنگ میں موجود تھی۔ اوپر آ کر ان کا کراہتا ہوا وہ دم گھٹنے سے مر چکے تھے۔ کیونکہ ان کا تعلق ایک بڑے گھرانے سے تھا اس لیے باہر کا رخ کئی پولیس تفتیش کرنے آ گئی اور مجھے بھی پکڑ لیا۔ مگر میرا کیا قصور تھا، دو دن تھا میں بند کر کے چھوڑ دیا۔“

”ہاں اس میں تمہارا کیا قصور۔“ ”معمین نے تاکید کی۔

”اس کے بعد چھ مہینے تک دفتر بند پڑا رہا، میرا مطلب ہے کہ خالی رہا۔ اب آپ آئے ہیں۔“

”معمین مسکرایا۔ ”دیکھو مجھے کتنے عرصے یہاں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔“

”اللہ نے چاہا تو آپ اس دفتر سے ترقی پا کر جائیں گے۔“ ”سراج بابا نے دعائیہ انداز میں کہا۔

”موت و زندگی اور والے کا ہاتھ میں ہے۔“

”معمین نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ عمارت کو کہ اللہ دونوں جہانوں میں اچھا کرے۔“

”جی، سراسیمہ ہی ہوگا۔“ ”سراج بابا نے کہا پھر چائے کا پوچھا اور اس کے مزید چائے کا مع کرنے پر خرابی واپس لے گیا۔ کچھ دیر بعد سیما کی کال آ گئی۔

”مبارک ہو آج جو آئنگ ہے۔“

”ہو بھی گئی۔“ ”معمین نے جواب دیا۔ ”مکرمج سے بیٹھا کھانا مار رہا ہوں۔ وہ بھی عمارت دار نہ یہاں مارنے کے لیے نکلیاں بھی نہیں ہیں۔“

”ادھ سواری! اصل میں، میں ابھی اچھی ہوں اور یہاں صبح ہوئی ہے بلکہ نام نہاد ہی صبح ہے۔ آسان پر گہرے بادل ہیں اور نہایت تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ ستر سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا مگر آدھے گھنٹے بعد کلاس ہے۔“

”کس جنم میں خود کو پھنسا لیا ہے۔ اس سے اچھا تھا کہ یہاں ہوئیں اور میں نہیں اپنے ساتھ لے آتا۔ صبح بہت بوری ہو رہا ہوں۔“

”بس پایا کی خند کہ یو کے سے ڈگری لینے ہے۔“

”سیمانے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ورنہ میرا کون سا ارادہ تھا اور ساؤ وہاں کا حال احوال؟“

”جواب میں معمین نے اسے اپنے پیش روؤں کا احوال سنایا جو آئنگ کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے تھے۔ آخر میں اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”دیکھو میری باری

کب تک آتی ہے۔“

”اللہ نہ کرے۔“ ”سیمانے دل کر کہا۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مگر یہ سب کیا ہے؟“

”اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے۔“

”کہیں ان اموات میں کسی شخص کا ہاتھ نہ ہو۔“

”دکس کا ہاتھ ہو سکتا ہے، وہ تینوں بالکل الگ الگ الگ ہیں منظر کے لوگ تھے۔ کوئی انہیں کیوں مارنے لگا۔“

”ممکن ہے اس سیٹ پر کسی کی نظر ہو۔“

”سیمانے جان تم بائولوجی میں ماسٹر کر رہی ہو۔ کرنا بائولوجی میں نہیں۔ بھلا ایک سیٹ کی خاطر کون تین بندے مار سکتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ بظاہر حادثہ لگے اور اس سیٹ پر تو میں آیا ہوں، اگر مارنے والا اتنا ہی چالاک تھا تو اسے اس سیٹ پر آنا چاہیے تھا۔“

”ہو سکتا ہے کہ کوئی چکر ہو۔ اصل میں لگا تار تین اموات اتفاق یا حادثہ نہیں ہو سکتیں۔“

”یہ دنیا اتفاقات کا گھر ہے، یہاں ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔“

”پلیز تم مقام پر ہٹنا۔“ ”سیمانے التجا کی۔ ”سیٹ والی بات میں نے ایسے ہی کی تھی۔ مگر سوچو کہ اس دفتر سے تعلق رکھنے والے تین افراد غیر فطری موت کا شکار ہو چکے ہیں۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔“

”سیمانے اس بات نے معمین کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا۔ ”او کے میں سوچوں گا۔“

”سراج بابا نے اسے خاصی حد تک معلومات دی تھیں لیکن واقعات کے اصل حقائق سے وہی لوگ واقف ہو سکتے تھے جنہوں نے ان کیوں کی تفتیش کی ہوگی۔

پھر معمین نے دفتر کے بجائے کلب میں اس موضوع پر بات کرنا مناسب سمجھا۔ ہاسٹل کے بعد اس نے جو دوسری جگہ دیکھی تھی وہ آفسر کلب تھا۔ کلب کیا ایک الگ دنیا تھی جسے بیورو کریش نے اپنی مرضی سے بنایا ہوا تھا اور وہاں ہر سہولت اور تفریح تھی۔ معمین کی خالو سے ملاقات یہیں ہوئی تھی اور انہوں نے اس کا تعارف اپنے سرکل میں کرایا تھا جس میں معمین بھی آنے والے وقتوں میں شامل ہوتا۔ فی الحال تو یہ طاقتور بیورو کریش کا ایک گروپ تھا جس میں نیا فرد ای وقت شامل ہوتا تھا جب ایک فرد ریٹائر ہو کر یہاں سے نکل جاتا تھا۔ معمین کی باری بہت دور تھی۔ خالو نے اسے نصیحت کی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک دو دن کلب کا چکر لگاتا

جنسوں رہے کیونکہ جو مسائل یہاں آسانی سے حل ہو جاتے تھے وہ دفتر میں بہت مشکل سے ہی حل نہیں ہوتے تھے۔

☆☆☆

ایک مہینے بعد جا کر معمین کا حلقہ سیٹ ہوا تھا۔ کلب میں ابتدائی دن بہت بور گزرے تھے۔ نئے افسران ابھی تک اکیڑی کی تربیت سے نہیں نکلے تھے اور وہ بات بھی ٹاپ تول کر کرتے تھے۔ درمیانے درجے کے افسران نیچے والوں کو منہ نہیں لگاتے تھے جیسے اوپر والے نیچے والوں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ معمین کو ذرا مشکل پیش آئی مگر وہ زبان کا تیز اور ہنسنے ہانسنے والا آدمی تھا اس لیے اسے زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ اس نے نیشنل آرٹ کالج سے گریجویشن کیا تھا اور اس کا اس کی شخصیت پر گہرا اثر آیا تھا۔ جنید اور صدیق اس کے اچھے دوست بن گئے تھے۔ اتفاق سے وہ بھی دوسرے شہروں سے آئے تھے اور ہاسٹل میں مقیم تھے۔ جنید آبی بی میں تھا جبکہ صدیق پولیس کے امور کی دیکھ بھال کرنے والے ایکشن سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دوران میں اپنے پیش روؤں کی غیر فطری موت اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ اس بارے میں پولیس رپورٹس تو دیکھے گا۔

”سراج بابا کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ کام آیا تو اتنا آیا کہ اسے سرکھانے کی فرصت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ اس نے صرف سیمانے رابطے میں رہنے کے لیے فوری جی انٹرنیٹ والی فانی ڈیوائس لے لی تھی جسے وہ ساتھ لاتا اور دفتر میں کمپیوٹر کی پولیس میں لگا دیتا تھا۔ مگر کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ مشکل سے چند ایک صبح سیمانے کو کرتا تھا اور اس کے آئے صبح شام کو یا رات کو ہاسٹل میں جا کر سنا اور جواب دیتا تھا۔ ہفتے میں تین دن اس نے کلب کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔ جنید اور صدیق تقریباً سارے ہفتے آتے تھے۔ اس لیے معمین کی ان سے ملاقات لازمی ہوتی تھی۔ معمین دفتر سے سیدھا نہیں آتا اور چند گھنٹے وہاں گزار کر اور ڈنر کے بعد واپس جاتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے وہ گپ شپ کرتے تھے یا پھر اسنوکر کھیلتے تھے۔ ایک شام اسنوکر میں صدیق نے شات مارتے ہوئے اس سے کہا۔

”ہوشیار رہنا۔۔۔ تمہارا دوسرا مہینا شروع ہو گیا ہے۔“

”ہوشیار کس سے؟“ ”معمین نے سنبھل کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”مہینے اپنے تین پر پولیس کا انجام یا نہیں ہے؟“

”معمین نے شات مارا۔ ”بالکل یاد ہے بلکہ میرے

ہوں نے مکمل رپورٹ بھی دی تھی جو یقیناً پولیس رپورٹ سے خاصی بہتر ہوگی۔“
”شاید۔“ صدیق نے سر ہلایا۔ ”ویسے میں نے کل فائل دیکھی ہے۔“
”میں نے پہلی بار دیکھی لی۔“ کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں لیکن میرے دفتر آنا ہوگا۔“
”میں اپنا دفتر چھوڑ کر تمہارے دفتر آؤں۔“ معین ہنسا۔ ”نہیں، تم کل فائل یہاں لے آنا کسی سادہ کور میں۔“
”تاکہ سارا حکمہ جان جائے کہ ہم یہاں دفتر کی فائلیں لاتے ہیں اور افسران کو روکڑنے کا موقع مل جائے۔“
”اوکے تم مجھے اس کی کاپی لا دینا۔“ معین نے متبادل پیش کیا اور اس بار صدیق مان گیا۔ اس نے اگلے دن معین کو فائل کی کاپی لا دی۔ اس میں پولیس کی رپورٹس تھیں اور پوسٹ مارم کی رپورٹیں بھی۔ معین نے فائل اپنے بریف کیس میں رکھی۔ اس رات وہ دیر سے ہاسٹل پہنچا تھا۔ اس لیے فائل نہیں دیکھ سکا۔ اگلے دن دفتر میں سراج بابا نے جانے اور لوازمات سرور کرنے کے دوران اپنے تین سابق افسروں کا ذکر کیا تو معین نے اسے بتایا۔ ”میں نے ان کیسروں کی فائل منگوائی ہے لیکن ابھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔“
”کیا اس میں الگ سے کوئی بات ہوگی سر؟“
”ہاں پولیس اور ڈاکٹر کی رپورٹیں بہر حال ہماری معلومات سے زیادہ ہوتی ہیں۔“

”اس سے کیا ہوگا۔ جانے والے تو جاپچکے ہیں سر۔“
سراج بابا نے افسردگی سے کہا۔
”معین نے ابھی تک نہیں سوچا تھا کہ وہ رپورٹ دیکھ کر کیا کرے گا۔ سراج بابا کی بات سے اسے خیال آیا اور اسے لگا کہ سیمیا کی بات اس کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ شاید سیمیا اس نے رپورٹ منگوائی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ان حادثات کے پیچھے کوئی اور کہانی ہو۔“
سراج بابا چونکا۔ ”سر، آپ کا مطلب ہے کوئی بندہ اس میں ملوث ہو سکتا ہے؟“

”اس دنیا میں ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔“
”اگر ایسا ہے تو اسے پکڑا جانا چاہیے۔ مگر پولیس نے تو کسی کو بھی نہیں پکڑا۔“
”تم جانتے ہو ہماری پولیس کی کارکردگی جب تک اوپر سے دباؤ نہ پڑے یہ حرکت نہیں لیتی کرتے۔“
”صغیر صاحب عام سے گھرانے سے تھے سر لیکن

کامران اور عظمت صاحب تو بڑے گھرانوں سے تھے۔ پولیس نے ان کے لیے بھی کچھ نہیں کیا۔“
اگر انہیں شک ہوتا کہ موت کی وجہ حادثہ نہیں ہے اور اس میں کوئی فرد ملوث ہے تو وہ پولیس پر دباؤ ڈالنے اور پھر پولیس دوسرے انداز میں گفتگو کرتی مگر انہیں شک ہی نہیں ہوا۔“

سراج بابا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”شک تو یہاں بھی کسی کو نہیں ہے۔ پر لوگ جب کرتے ہیں کہ ایک ہی دفتر میں آنے والے تین نئے افسران کی اموات ہوئی ہیں۔“
”کسی پر شک بھی کیا جاتا ہے؟“
”بعض لوگ میر صاحب پر شک کرنے ہیں مگر وہ ایسے آدمی نہیں ہیں۔“

”معین، میر رحمان کو جانتا تھا۔ وہ ایڈمن آفیسر تھا اور نیچے سے ترقی کر کے اوپر آیا تھا۔ وہ اپنے ریک میں سب سے سنیئر آدمی تھا اور اگر اسے سترہ گریڈ مل جاتا تو اس پوسٹ کا وہی حقدار بنتا مگر فی الحال وہ سولہ گریڈ کا افسر تھا۔ یہاں کی انٹرنیٹ اور عمارت کی مینیجنگ ایس کے پاس تھی۔ وہ ذرا اکھڑا اور غصہ ور قسم کا آدمی تھا۔ بعض اوقات افسران بالا سے بھی گھبرا کر بیٹھتا تھا شاید اسی وجہ سے وہ پچیس برس میں سولہ گریڈ تک پہنچا تھا۔ لیکن اس میں شرم نہیں تھا کہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس کی نظر سے اس کی فائل مکمل تھی۔ اس کے پاس ماسٹر کی ڈگری بھی تھی۔ میر کی عمر پینتالیس سال تھی مگر اپنی مضبوط جسمیت اور بے دارغ پیڑے کی وجہ سے وہ پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا اور پینتیس کا بھی اس وجہ سے کہ اس کے بال کینٹی سے سفید ہو گئے تھے۔ اگر وہ انہیں رنگ لیتا تو اور بھی کم عمر لگتا۔ وقت کا حد سے زیادہ باندھتا تھا۔ شدید قسم کا طوفانی موسم بھی اسے وقت پر دفتر آنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ چند ہفتے پہلے بدترین قسم کی خراب سیاسی صورت حال میں بھی وہ دفتر آنے والے چند ملازمین میں شامل تھا۔ معین سے اس کا دو تین بار ہی واسطہ پڑا تھا اور اس نے میر کو سرد مزاج شخص پایا تھا۔“

سراج بابا نے اگرچہ اسے اچھا انسان قرار دیا تھا مگر معین سوچتے پر مجبور ہو گیا۔ دیکھا جائے تو میر شک کا حق دار بنتا تھا۔ پچیس سال کی طویل ملازمت کرنے کے بعد بھی وہ جس سیٹ پر صرف اس لیے نہیں آ سکا تھا کہ سترہ گریڈ کا نہیں تھا۔ اس پر مقابلے کا امتحان دینے والے براہ راست آرہے تھے۔ یہ بات اسے طیش دلانے کے لیے کافی تھی۔ معین نے سراج بابا سے پوچھا۔ ”اس عمارت کی مینیجنگ

کی ذمہ داری میر رحمان کے پاس ہے؟“
”جی، میر صاحب کے پاس ہے۔“ سراج بابا نے کہا۔ ”مگر یہ اضافی ذمہ داری ہے جو ان پر ہے۔ وہ اصل میں انٹرنیٹ کے انچارج ہیں۔“
”اس کا مطلب ہے لفٹ کی مرمت اور دیکھ بھال ان ہی کے ذمہ آتی ہے؟“

”جی، ان کے ذمہ آتی ہے لیکن وہ ایسے آدمی نہیں ہیں جو اپنی ذمہ داری پوری نہ کریں۔ جیسے ہی ان کے پاس کوئی درخواست یا شکایت آتی ہے وہ اس پر فوری ایکشن لیتے ہیں۔“

یہ معین نے بھی دیکھا تھا کہ عام سرکاری دفاتر کے مقابلے میں یہاں مرمت کا کوئی بھی مسئلہ فوری حل کیا جاتا تھا۔ نہ تو بلب خراب ہوتے تھے اور نہ ہی ٹیبلٹیں تھیں۔ اس کے کمرے میں سنے ماڈل کا کمپیوٹر دو دن بعد ہی لگ گیا تھا۔ عمارت کی صفائی سترہ بجے تک ملتی تھی اور انہیں ایک دھبہ یا کافو کا ٹکڑا پڑا نظر نہیں آتا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب میر کی مستعدی اور انتظام کاری کا نتیجہ تھا۔ وہ دفتر میں اپنے ساتھ کے ملازمین سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور شام چھ بجے اپنی سیٹ سے اٹھ جاتا تھا۔ اسے شاذ ہی شام چھ بجے کے بعد یا کب شپ کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ آج کام زیادہ نہیں تھا۔ معین ساڑھے پانچ بجے دفتر سے اٹھ گیا۔

اس کا کلب جانے کا موقع نہیں تھا اس لیے وہ ہاسٹل چلا گیا۔ فریش ہو کر اس نے میس کا رخ کیا۔ ڈنر کے بعد وہ پھر کمرے میں آیا۔ اس نے اپنے لیے جانے منگوائی اور فائل نکال لی۔ جانے آئی تو وہ فائل دیکھنے لگا۔ پولیس رپورٹ خاص نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ پولیس نے پہلے سے ذہن بنا کر گفتگو کی تھی اور واقعات کو حادثہ قرار دے کر جان چھڑائی تھی۔ جن لوگوں سے بیانات لیے تھے وہ بھی اس فائل میں شامل تھے۔ البتہ پوسٹ مارم رپورٹس قابل توجہ تھیں۔ پہلے افسر صغیر کی موت گردن ٹوٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ گردن نیچے کرتے ہوئے ایک راڈ سے ٹکرانے سے ٹوٹی تھی۔ اس کے علاوہ اسے تین فریکچر بھی ہوئے تھے لیکن یہ ذمہ جان لیا نہیں تھے۔ کامران کی موت دماغ پر آنے والی شدید ضرب سے آئی تھی۔ ضرب گدی سے اوپر لگی تھی۔

رپورٹ کے مطابق کامران ایک فلور کی سیڑھیوں سے نیچے گرا تھا۔ سیڑھی کوئی تین فٹ لمبی تھی۔ بلڈنگ میں

فلور کی اونچائی بارہ فٹ تھی۔ معین نے عمارت کی سیڑھیاں دیکھی ہوئی تھیں۔ یہ آسان اور آرام دہ سیڑھیاں تھیں۔ قد بچے اونچ پوڑے اور چھانچ اونچے تھے۔ دونوں طرف رینگ لگی تھی۔ کنارے ماربل کے اور گولڈ لائے لیے ہوئے تھے۔ رپورٹ کے مطابق کامران کے سر کی چوٹ کسی دواغ موٹی چیز سے ٹکرانے کا نتیجہ تھی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس نے دماغ کا یہ حصہ تباہ کر دیا تھا اور موت فوری واقع ہوئی تھی۔ سر کی ضرب کے علاوہ باقی جسم پر معمولی سی چوٹیں آئی تھیں اور کوئی فریکچر نہیں ہوا تھا۔ باقی چوٹیں اتنی معمولی تھیں کہ سر پر ضرب نہ لگی ہوئی تو کامران شاید کپڑے چھاڑ کر کھڑا ہو جاتا اور ڈاکٹر کو دکھانے کی زحمت بھی نہ کرتا۔

سب سے سادہ پوسٹ مارم رپورٹ عظمت کی تھی۔ اس نے بہت زیادہ بیانیہ اور نشے کو بڑھانے کے لیے اس نے نشہ آور گولیوں کا استعمال بھی کیا تھا جیسا کہ بہت زیادہ عادی شرابی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک پیگ میں دو پیگ کا نشہ کر لیتے ہیں۔ مدہوشی کی حالت میں وہ کمرے میں گیس بھر جانے سے دم گھٹنے سے ہلاک ہوا۔ نشے کی زیادتی کی وجہ سے وہ اس فائل نہیں رہا کہ اپنی جان بچانے کے لیے کچھ کر سکے۔ اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے موت سے ہلکنا ہوا تھا اور غالباً اسے موت کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ فائل میں گواہوں کے بیانات دیکھنے کے بعد معین نے فائل ایک طرف رکھ دی اور سوچنے لگا۔ جہاں تک صغیر کی موت کا تعلق ہے، وہ یقیناً حادثہ تھا ورنہ لفٹ کے یہ مسئلہ پیدا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

البتہ اسے کامران اور عظمت کی اموات کھنگ رہی تھیں۔ آخری میز پر کس چیز نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر اتنی شدید ضرب لگائی کہ دماغ براہ راست متاثر ہوا اور موت فوری واقع ہوئی تھی۔ عظمت کی پولیس رپورٹ میں نشہ آور دوا کی گولیوں کی برآمدگی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس نے کال کر کے صدیق سے تصدیق کر لی تھی کہ پولیس کو عظمت کے پاس سے نشہ آور گولیاں نہیں ملی تھیں۔ اگلے دن اس نے دفتر آتے ہوئے اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں کامران گرا تھا۔ یہاں اوپر سے لے کر نیچے تک کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو کامران کے سر پر لگتی تو اتنی شدید چوٹ آتی۔ شام کو اس نے کلب میں صدیق سے اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔

”سوال یہ ہے کہ اگر یہ کام میر رحمان نے کیا ہے تب

بھی اس کے خلاف کیا ثبوت ہے۔ وہ ایک سرکاری افسر ہے، اسے صرف شبہ کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جاسکتا جب تک کوئی حوثی ثبوت نہ ہو۔

”ایک تو ہمارے ہاں پولیس کو فوراً گرفتاری کی پڑ جاتی ہے۔“ معین نے کہا۔ ”بھائی ساری دنیا میں پولیس پہلے ثبوت اور گواہیاں تلاش کرتی ہے اور جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بندہ اب بچ کر نہیں جاسکے گا تو پھر گرفتار کرتی ہے۔ تم ثبوت تلاش کرواؤ۔“

صدیق ہنسنا۔ ”بھائی وہ دنیا کی پولیس ہے۔ ان کی تربیت دوسری ہوتی ہے، ہماری پولیس کی تربیت تم جانتے ہو۔“

”اس کے باوجود وہ واردات سے دو گھنٹے پہلے باخبر ہو جاتی ہے کہ واردات ہونے والی ہے۔“ جنید نے لطیفہ بیان کیا۔

”یاد میں سنجیدہ ہوں کیونکہ سہ ماہی معاملے میں سنجیدہ ہے۔“ معین نے کہا۔ ”تین افراد کا مارا جانا اتفاق نہیں ہو سکتا ہے۔“

صدیق سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں پولیس حکام سے بات کرتا ہوں۔ مگر بات آف دی ریکارڈ ہوگی کیونکہ میں اس قسم کی کسی درخواست کا مجاز نہیں ہوں۔ ایک ڈی آئی جی سے رشتے داری ہے اس سے بات کرتا ہوں۔“

جنید بھی سنجیدہ ہو گیا تھا، اس نے معین کو مشورہ دیا۔ ”تم محتاط رہو، اگر تمہارے خیال میں ان واقعات کے پیچھے کوئی فرد ہے تو تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔“

معین کو اب تک یہ خیال نہیں آیا تھا۔ واقعی اسے محتاط رہنا چاہیے۔ تین مہینے سے دو حادثے بلندی سے گرنے سے ہوئے تھے جبکہ ایک مہینے سے دم گھٹنے کا کیس تھا۔ اس نے فیملہ کیا کہ وہ اب مہینہ دفتر میں استعمال نہیں کرے گا۔ اس کی جگہ اے سی استعمال کرے گا۔ یہ پرانے طرز کا اے سی تھا۔ بورک مائش بھی دیتا تھا۔ اسی طرح وہ لفٹ اور سیڑھیوں کے پاس محتاط رہے گا۔ صغیر کو پیش آنے والے حادثے کے بعد عمارت کی تمام ہی لفٹس بدل کر ان کی جگہ جدید ترین لفٹس لگائی گئی تھیں جن کے دروازے اسی صورت میں کھلتے تھے جب لفٹ دروازے کے سامنے آچکی ہو۔ اگلے دن وہ کلب پہنچا تو وہاں ایک نئی صورت حال تھی۔ جنید نے اسے مبارک باد دی۔ ”میرے بھی سترہ گریڈ کے لیے پروموشن ہو رہا ہے۔ کچھ دن بعد وہ اس کلب میں نظر آئے گا اور شاید تمہاری

سیٹ پر بھی۔“

معین نے اسے گھورا۔ ”تمہارا مطلب ہے؟“

”میرا کوئی مطلب نہیں ہے کیونکہ میرے نزدیک یہ احتمالہ بات ہے۔“ جنید نے کہا۔ ”صدیق کے پاس بھی کچھ ہے بتانے کے لیے۔“

صدیق بولا۔ ”میری بات ہوئی ہے اور کیس انجینل براؤن کو بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے تمہارے پوائنٹس آگے کر دیے ہیں اور اب ان پر تفتیش ہوگی۔“

”انجینل براؤن والے کب تک حرکت میں آئیں گے؟“ معین نے پوچھا۔ ”یقیناً اس کے لیے انہیں میری وفات کا انتظار نہیں ہوگا۔“

”یاد سرکاری مشینری کو استعمال کرنا آسان نہیں ہے۔“ اس رات سہ ماہی بات ہوئی تو اس نے پھر تفتیش کا اظہار کیا اور اس سے کہا کہ وہ محتاط رہے۔ سہ ماہی نے کہا۔ ”میں نے اس پر غور کیا ہے۔ تینوں افراد دفتر کی عمارت میں حادثے کا شکار ہوئے۔ یعنی خطرہ نہیں ہے۔“

”یہاں صرف ایک آدمی ہے جس کا نام لیا جاسکتا ہے۔“ معین نے اسے منیر کے بارے میں بتایا۔ ”مگر پولیس نے سرے سے قتل کا سوچا ہی نہیں اس لیے کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔“

”مگر قاتل بھی شخص ہے اور تینوں افراد کو اسی نے قتل کیا ہے تو یہ بہت چالاک ہے۔“ معین کہیں بہت ہوشیار رہتا ہوگا۔“

چند دن بعد کھٹکے کے انڈر سیکرٹری نے منیٹنگ روم تھی۔ مقصد کارکردگی میں اضافہ اور اخراجات میں کمی تھی۔ حکومت کی طرف سے ایک سرکلر تمام سرکاری محکموں کو بھیج دیا گیا تھا کہ اخراجات میں دس فیصد تک کمی لائیں۔ منیر اس منیٹنگ میں موجود تھا۔ اس نے مخصوص بے باک انداز میں انڈر سیکرٹری سے کہا۔ ”سر، اخراجات میں کمی ہو جائے گی مگر اس سے کارکردگی لازمی متاثر ہوگی۔“

”وہ کیوں؟“ انڈر سیکرٹری نے بد مزگی سے کہا۔ ”کیونکہ سب ہاں میں ہاں مل رہے تھے یا خاموش تھے، یہ پہلی معترض آواز تھی۔“

”کیونکہ کوئی یا تو عام ملازمین کے لیے مخصوص مراعات سے ہوگی یا پھر بلڈنگ میٹنی نہیں سے۔ دونوں صورتوں میں کارکردگی متاثر ہوگی۔“

”فضول اخراجات سے گریز بھی کیا جاسکتا ہے۔“ ایک چمچ افسر نے منیر سے کہا۔

”سر، میرے پاس میٹنی ٹیم کی ذمہ داری اضافی ہے۔“ منیر نے کہا۔ ”میں سو فیصد کام کا قائل ہوں، آدھا ادھورا کام مجھ سے نہیں ہوگا کیونکہ اس سے میری ساکھ پر حرف آئے گا۔ اگر ایسا ہوا تو میں یہ ذمہ داری چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

انڈر سیکرٹری نے کڑے تیوروں سے منیر کی طرف دیکھا۔ ”آپ کے پاس اخراجات میں کمی کی کوئی تجویز ہے۔“

”بالکل ہے سر۔ بلڈنگ کو سینٹرلی اے سی کرنے کا منصوبہ زیر التوا ہے، مگر آنے سے پہلے اسے مکمل کیا جائے تو بجلی کے بل میں نصف کمی ہوگی۔ اسی طرح سر مائش ٹیم کا بل کم ہوگا۔ باغ کی ترمیم و آرائش کے لیے جن غیر ملکی پودوں اور درختوں کا پلان ہے اس کی جگہ مقامی پودے لگائیں جائیں تو اخراجات میں خاصی کمی آئے گی۔“

منیر کی ان تجویز پر افسران کا منہ بند گیا تھا۔ خاص طور سے ان افسران کا جو ان منصوبوں سے براہ راست فائدہ اٹھا رہے تھے۔ معین کی توقع کے عین مطابق منیر کی تجویز پر سرے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ باقی میٹنگ میں وہ سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔ میٹنگ کے بعد جب وہ باہر نکل رہے تھے تو معین نے کسی کو کہتے سنا۔ ”اس کی کسی نے نہیں سنی اور نہ اس کے اوپر آنے کا چانس ہے۔“

”ہاں جب تک دو تین افسر اور نہیں مارے جاتے۔“ کوئی دوسرا ہنسنا۔ معین نے مڑ کر دیکھا مگر بھیڑ میں اسے بولنے والے نظر نہیں آئے تھے۔ بہر حال ان کی بات اور اشارے واضح تھے۔ گویا یہ بات کھٹکے کے لوگوں کے ذہن میں تھی۔ منیر رحمان کا رویہ ایسا تھا کہ ترقی کے خانے میں اس کے لیے اچھے رہنما کس مشکل سے ہی کسی افسر کے قلم سے نکل سکتے تھے۔ وہ اسی طرح اوپر آسکتا تھا جب مطلوبہ اہلیت کا آدمی سیٹ کے لیے دستیاب نہ ہو۔ وہ دفتر کی طرف جا رہا تو اتفاق سے منیر اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ معین نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ نے اچھی تجاویز پیش کیں۔“

”اور آپ نے اس پر ردعمل بھی دیکھ لیا۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ”اوپر سے آنے والوں کا رویہ یہی ہوتا ہے۔“

منیر کا اشارہ سول سروس کی طرف تھا۔ معین نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ آپ بھی اب سترہ گریڈ میں آچکے ہیں اور سب ایک سے نہیں ہوتے ہیں۔“

منیر اخیال ہے وہ اپنے وقت پر گیا ہوگا اور دوبارہ ایمر جنسی ڈور سے اندر آیا ہوگا۔ اگر یہ باہر سے نہیں کھلتا ہے تو اس نے اسے پہلے ہی ان لاک کر دیا ہوگا۔ اندر آکر وہ

جنونی

”جو ایسے نہیں ہوتے ہیں وہ میری طرح دھکے کھاتے ہیں۔“ منیر کہتے ہوئے اپنے آئین کی طرف مڑ گیا۔ معین کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سول سروس والوں کے لیے اس کے اندر بچی بھری ہوئی تھی اور وہ صاف ظاہر تھی کہ وہ اب تک ادھر نہیں آسکا اور اس کا ذمہ دار وہ سول سروس سے آنے والوں کو سمجھتا تھا۔ معین سوچ میں پڑ گیا کہ کیا وہ اس کا بدلہ یوں لے رہا تھا۔ وہ ذہین اور سازشوں سے شاسا تھا۔ معین مختصر عرصے میں جان گیا تھا کہ جتنی سازشیں یہاں سرکاری محکموں میں ہوتی ہیں اتنی دنیا میں اور کہیں نہیں ہوتیں۔ کارمان اور عظمت کی موت کا آسانی سے بندوبست کیا جاسکتا تھا۔ صغیر کی موت اگرچہ ایک پیچیدہ حادثہ میں ہوئی تھی لیکن دیکھا جائے تو یہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ رات جب اس نے سہ ماہی سے بات کی تو اس نے معین کی سوچ کی تائید کی۔

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ صغیر کو لفٹ کا دروازہ کھول کر نیچے پھینکا جاسکتا تھا۔“

معین کو تجربہ تھا کہ پرانی طرز کی لفٹوں کے دروازے جبکہ لفٹس فلور پر نہ ہو ذرا سا زور لگانے سے کھل جاتے ہیں۔ جدید لفٹوں میں ایسے لاک ہوتے ہیں جو اس وقت تک دروازہ نہیں کھلتے دیتے جب تک لفٹ فلور پر نہ آجائے۔ اگر ایمر جنسی میں کھولنا ہو تو اس کے لیے مخصوص چابی ہوتی ہے جسے بینوں کے پینل کے ساتھ بے مخصوص خانے میں ڈالنے سے لفٹ کا دروازہ کھولا جاسکتا تھا مگر یہ چابی صرف مخصوص لوگوں کے پاس ہو سکتی ہے۔ معین نے پوچھا۔ ”اس نے صغیر کو اندر کیسے پھینکا ہوگا؟“

”دھوکے سے یا بے بس کر کے۔“ سہ ماہی نے جواب دیا۔ ”کیونکہ اس وقت عمارت میں کوئی اور نہیں تھا اس لیے کسی نے نہیں دیکھا۔“

”وہ انٹرنس لابی کے کیمروں سے کیسے بچا ہوگا؟“ معین نے پوچھا۔

”یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے، وہ ایڈمن میں ہے اور اس کے پاس ایمر جنسی ڈور کی چابی لازمی ہوگی۔“

”یو آر جیسس۔“ معین نے کہا۔ ”لیکن اگر وہ نہیں گیا ہوگا تو کیمروں کی ریکارڈنگ سے اس کا پتا بھی چل سکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ اپنے وقت پر گیا ہوگا اور دوبارہ ایمر جنسی ڈور سے اندر آیا ہوگا۔ اگر یہ باہر سے نہیں کھلتا ہے تو اس نے اسے پہلے ہی ان لاک کر دیا ہوگا۔ اندر آکر وہ

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیسرفیس

ٹی ٹی کی فیسرفیس گولیوں کی صورت میں لکائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگ نکھار دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں آسٹیل سے رنگ نکھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ و بے، آنکھوں کے گرد گھٹتے چہرے اور گردن کی جھریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ غرائین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے کیساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ اپنی اور کمرٹھیں لئے پھر سکیں فیسرفیس کماکان کے لئے بہت آسان ہے۔

www.facebook.com/top.treatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو صفا اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سونا، ٹورین (نشوہر کا مادہ) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں مکمل اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!



HELPLINE

042-35789145&6,0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

ملک بھر کے ہر ایچ ایم ایڈیکل سنٹر، ہومیو پیتھک سنٹر اور دوا خانہ پر دستیاب

II

صاحب اور اس طرف گیا تھا۔ اس نے منیر کے دفتر کی طرف اشارہ کیا۔ ”پر میں دیکھ نہیں سکا صاحب، اس وقت میں صفائی کرتا آگے جا رہا تھا۔“

معین تیز قدموں سے منیر کے دفتر تک پہنچا۔ اس ہال نما کمرے کو پارٹیشن کیا گیا تھا اور آخری حصے میں منیر کا دفتر تھا۔ وہ اس وقت اپنے بیس بیئر کے ساتھ کچھ کر رہا تھا۔ معین ٹھٹکا کیونکہ اس نے براؤن رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ جب وہ ہاتھ جھڑتا کھڑا ہوا تو اسے دیکھ کر چونکا۔ ”معین صاحب آپ.....“

”کوئی مسئلہ ہے بیئر میں؟“

”ہاں اس کو آؤ بیگ آف کرنے والی دائرہ چلی ہو گئی تھی، اسے ٹائٹ کر رہا تھا۔“

”یہ دائرہ اگر ڈھیل رہ جائے تو بیئر آف ہونے کے بعد بھی گیس خارج ہوتی رہے گی۔“

”آف کورس، بہت سے لوگ اس چیز کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔“

”اور حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔“ معین نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اوپر یقیناً خاصی سردی ہوگی۔ مگر آپ کا کوٹ خاصا گرم ہے۔“

”اوپر.....؟“ منیر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں ابھی آپ چھت سے آ رہے ہیں۔“

”میں آدھے گھنٹے پہلے دفتر آیا تھا اور تب سے بیئر کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔ پہلے میں نے ملٹیک بلائے کا سوچا مگر بجٹ کٹ پلان یاد آیا۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بڑھ گیا تھا۔ ”میں نے سوچا کہ خود ٹھیک کر لوں۔ اوپر تو میں دو دن پہلے گیا تھا۔“

”آپ کو یقین ہے کہ آپ اوپر نہیں گئے۔“

اس بار منیر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”آپ کو یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”کچھ نہیں۔“ معین نے کہا اور مڑ گیا۔ اسے یقین تھا کہ گملا اسی نے پھینکا تھا اور اب معصوم بن رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس رکا اور بولا۔ ”اگر میں پارکنگ میں ایک قدم اور بڑھتا ہوں تو شاید کل آپ میری سیٹ کا چارج لے رہے ہوتے۔“

منیر نے پوچھا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے مگر وہ وہاں سے نکل آیا۔ اس نے غارت کے سیکورٹی چیف کو اس واقعے کی اطلاع دی مگر اس کا ذکر کرنے سے گریز کیا کہ اسے منیر

چھپ گیا ہوگا جب تک سب نہ چلے جائیں۔ صغیر کے بارے میں اسے معلوم ہوگا کہ وہ ویرنک رکے گا۔ اس نے اپنا کام کیا اور ایمر جنسی ڈور سے ہی واپس چلا گیا۔

معین، سہا کی ذہانت کا معترف ہو گیا تھا اور اس نے اگلے دن کلب میں فخر کے ساتھ اس کا خیال پیش کیا۔ مگر صدیق اور جنید دونوں ہی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ جنید نے کہا۔ ”خیال آرائی کرنا آسان ہے لیکن اسے ثابت کرنا ہرگز... آسان نہیں ہے۔“

”جبکہ ہونے والی بھائی نے اسے ویسے ہی چالاک ثابت کر دیا ہے کہ اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔“

معین کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”تم لوگ کیا چاہتے ہو کہ اصل تفتیش کا آغاز میرے مرڈر سے کیا جائے۔“

”دیکھو دوست ہم قضا و قدر کے قائل ہیں۔ اگر تمہاری موت اسی طرح لکھی ہے تو تم اور ہم سب کوئی اسے ٹال نہیں سکتے۔“ صدیق نے کہا۔ ”باقی رہی تفتیش تو میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کیس براؤن کے پاس کیس جائے گا۔“

”یعنی عراق سے تریاق آئے گا۔“ معین نے گہری سانس لی۔ ”تب تک یہ غریب بچ پائے گا یا نہیں۔“

اگلے دن وہ ڈراڈر سے دفتر پہنچا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ انٹرنس لابی کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ بروقت رکا تھا کیونکہ اس کے رکتے ہی اوپر سے ایک گملا آ کر زمین اس کے قدموں میں گرا تھا۔ اگر وہ روانی سے چل رہا ہوتا تو گملا اس کے سر پر گرتا۔ نیچے گر کر گملا جس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ کتنی رفتار سے آ رہا تھا۔ معین نے بے ساختہ اوپر دیکھا تو اسے براؤن رنگ کی جھٹک دکھائی دی۔ یہ جھٹک اسے اوپر دیوار کے ساتھ رکھے گملوں میں خالی گملے والی جگہ دکھائی دی تھی۔ جس گملے کی جگہ خالی تھی، وہ اس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ معین تیزی سے بھاگا اور اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ لابی میں موجود لوگ اسے یوں آتے دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ وہ لفٹ اور بیڑیوں والے حصے تک آیا۔ اس کی نظر تین نمبر کی لفٹ پر مرکوز تھی۔ وہ اوپر سے اتری تھی اور چوتھے فلور پر رکی تھی۔ اس نے جن دہانچے نیچے آئے گی، جب وہ کھلی تو خالی تھی یعنی اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ چوتھے فلور پر پہنچا اور اس نے سامنے صفائی کرتے موٹیہر سے پوچھا۔

”ابھی لفٹ سے کون آیا تھا؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”کوئی آیا تھا

پر شبہ ہے۔ البتہ یہ بتا دیا تھا کہ جب اس نے اوپر دیکھا تو اسے براؤن رنگ کے لباس کی جھلک نظر آئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سیکورٹی چیف اس کے ساتھ جانے وقوع پر کھڑا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ”گلا اسی جگہ سے گرا ہے۔“
”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“ معین نے سر دلچسپی میں کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ یہ گرا کیسے؟“
”یہ دیکھنا پڑے گا جتنا کہ کیونکہ ہوائیں چل رہی ہیں اور اتنا وزنی گلا خود سے نہیں کر سکتا۔“
دو پریک یہ خبر ساری عمارت میں پھیل چکی تھی۔ اس کے ساتھ کے لوگ اس سے پوچھنے آ رہے تھے اور وہ انہیں بتاتا کرتا تھا۔ شام تک یہ اطلاع سیرک بھی پہنچ گئی کیونکہ اس کی کال آئی تھی۔ ”معین صاحب، آپ صبح سیدھے میرے دفتر آئے تھے اور مجھ سے اوپر سے آنے کے بارے میں پوچھا تھا۔“
”ہاں۔“

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔“
”تب ایسا کون کر سکتا ہے؟“
”میں نہیں جانتا سر۔“ منیر نے غصے لہجے میں کہا۔ ”مجھے ابھی دفتر میں ہونے والی سرگوشیوں کا پتا چلا ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، نہ آج اور نہ آج سے پہلے۔“
”معین کو اب طش آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ سب آپ پولیس کو بتائیے گا۔“
مگر کچھ دیر بعد انڈر سیکریٹری نے آکر معاملات سنہال لیے تھے۔ اس نے سب کو زبان بندی کا حکم دیا اور منیر کو معین کے ساتھ بلا کر بات کی۔ معین نے الزام لگایا کہ اس کے تین پیش روؤں کی موت میں منیر کا ہاتھ تھا اور آج اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر گلا اس کے سر پر گرتا تو وہ مردہ خانے میں لیٹا ہوتا۔ منیر نے ان الزامات کی تردید کی۔ ان دونوں کی بات سننے کے بعد انڈر سیکریٹری نے کہا کہ اس معاملے کو فی الحال پولیس کے سپرد نہیں کیا جا رہا ہے لیکن محکمہ اپنے طور پر تحقیق کرے گا۔ اس نے ان دونوں کو اس معاملے میں خاموش رہنے کا حکم دیا۔ اگلے روز معین دفتر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ منیر گرفتار ہو گیا ہے اور اسے پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ فی الحال وہ میٹنگ روم میں پولیس والوں کی تفتیش کا سامنا کر رہا تھا۔ وہاں انڈر سیکریٹری بھی موجود تھا۔
گرفتاری کی وجہ اس کے دفتر کی کینٹ سے ایک

چھوٹا بیس بال کا بلا ملا تھا جس پر خشک خون اور بالوں کے آثار تھے۔ اسی طرح اس کی کینٹ سے بیئر کے وہ تارے تھے جو گر کر ہونے پر مڑ جاتے ہیں اور سرد ہونے پر سیدھے ہو کر بیئر کو گیس کی فراہمی روک دیتے ہیں۔ منیر نے بے کو اپنا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بیئر کے تاروں کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ اس کا بیئر اکثر مسئلہ کرتا ہے تو وہ کچھ انسانی تارے لے آیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر بیئر کی فوری مرمت کر سکے۔ بلاخوش لکڑی کا تھا اور ابھی اس پر لگے خون اور بالوں کا تجربہ کرنا تھا۔ اگر یہ خون اور بال کا مران کے بلڈ گروپ اور بالوں کے اسٹرکچر سے پیچ کر جاتے تو منیر اس کے قتل کے الزام میں پکڑا جاتا۔ فی الحال پولیس نے اسے شہسبک بنیاد پر گرفتار کیا تھا۔ معین خوش تھا۔ وہ اپنے دفتر میں آیا اور اس نے سراج بابا کو بتایا تو اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”سر، پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ منیر صاحب چھوٹ جا میں گئے۔“
”تم اب بھی اسے بے گناہ سمجھ رہے ہو؟“
”نہیں سر، یہ قانونی معاملات ہیں میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں مجھے حیرت ہوئی اگر وہ قاتل نکلتے تو۔ پھر سر بڑے لوگوں کو سزا کہاں ہوتی ہے۔ اب تو وہ بھی سترہ گریڈ کے فسر ہو گئے ہیں۔“
”وہ قاتل ہے اسی نے ان تینوں کو قتل کیا ہے۔“
”مران اور عظمت کے قتل میں استعمال ہونے والی چیزیں اس کے پاس سے نکلی ہیں اور جب وہ پولیس کی بار کھانے کا تو منیر کے قتل کا اعتراف بھی کرے گا۔“
”نہیں سر، وہ اس قتل کا اعتراف نہیں کرے گا۔“
سراج بابا نے کہا اور بات بدل دی۔ ”آپ کے لیے چائے لاؤں سر۔“
”معین نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔
”ہاں اس وقت میں ضرورت بھی محسوس کر رہا ہوں۔“
چائے نوشی کے دوران معین حالات پر غور کرتا رہا۔ اسے حیرت تھی کہ منیر جیسے ہوشیار اور چالاک آدمی نے اپنے خلاف ثبوت دفتر کی الماری میں رکھے تھے۔ آخر اسے کیا سوچھی تھی۔ ورنہ نیک چھوٹے بے اور چند تاروں کو ٹھکانے لگانا کون سا مسئلہ تھا۔ اسی وجہ سے وہ پکڑا گیا تھا۔ گزشتہ روز گرنے والے گیلے کے ٹکڑے بھی پولیس کے حوالے کر دیے گئے تھے کہ ممکن ہے ان پر منیر کے منکر پرش ہوں۔ جب منیر کو لے جایا جا رہا تھا تو وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں

کیا ہے۔ کسی نے اس کے خلاف سازش کی ہے، اسے پھنسا دیا ہے اور وہی اصل قاتل ہے۔ نہ جانے کیوں معین کو اس پر ترس بھی آیا تھا مگر یہ لگائی بات تھی۔ اب اس کا خیال تھا کہ منیر جیسے لوگوں کی جگہ بھائی گھاٹ ورنہ جیل کی کوشش تو ہونی ہی چاہیے۔ وہ اتنا پر جوش ہو رہا تھا کہ اس نے اسی وقت سہا کو کال کر کے منیر کی گرفتاری کا بتا دیا۔ وہ بھی خوش ہوئی۔ زیادہ خوش اس بات کی تھی کہ معین کو اب خطرہ نہیں رہا تھا۔
”وہ جائے بھاڑ میں، مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی تھی کہ تمہیں خطرہ ہوگا۔“

اگلے دن پتا چلا کہ منیر ضمانت پر رہا ہو گیا ہے۔ عدالت نے بے پر لگے خون اور بالوں کے تجربے سے پہلے اس کا ریاضہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ رپورٹ آنے میں چند دن لگتے۔ معین کی قدر مایوس ہوا تھا مگر پھر اسے اپنی ہی بات یاد آئی کہ گرفتاری اہم نہیں ہے سزا دلوانے والے ثبوت اور گواہیاں اہم ہیں۔ اگر اس کے خلاف ثبوت مل گئے تو وہ دوبارہ گرفتار ہو سکتا تھا۔ منیر ضمانت پر رہا ہو گیا تھا مگر وہ ملازمت سے معطل تھا۔ جب تک اس کے کیس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا اسے دفتر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ معین اس لیے زیادہ فکر مند نہیں تھا کہ منیر کا داخلہ دفتر میں بند تھا اور وہ ٹھنوک تھا اس لیے کوئی غلط حرکت کرنے سے گریز کرتا۔
اس دن موسم بہت زیادہ سرد تھا۔ صبح سے وقفے وقفے سے بارش جاری تھی۔ دفتر میں پارکنگ سے نکل کر انٹرنس الٹی تک آتے آتے اس کا برا حال ہو گیا تھا حالانکہ اس نے اوپر کوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ موسم کی وجہ سے اسٹاف کے خانے لوگ نہیں آتے تھے اور جو آتے تھے وہ بھی جلدی چھٹی کر کے بھاگنے کی فکر میں تھے۔ دو بجے کے بعد لوگ جانا شروع ہوئے اور چار بجے تک عمارت تقریباً خالی ہو گئی تھی۔
”معین کام کر رہا تھا۔ اس نے سراج بابا سے کئی بار کہا کہ وہ بھی چلے جائیں۔ اس کے پاس کچھ قاتلیں آئی تھیں اور وہ انہیں چیک کر کے ہی جانا چاہتا تھا مگر سراج بابا نے جانے سے انکار کر دیا۔“ سر، میں آپ کے ساتھ ہی نکلوں گا، مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑ دیجئے گا۔“
پانچ بجے سراج بابا نکلیں گیا اور دس منٹ بعد آیا تو غلبت میں تھا۔ اس نے معین سے کہا۔ ”سر، میرے ساتھ چلیں، منیر صاحب کے دفتر میں کچھ گڑ بڑ ہے۔“
”معین اٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیسی گڑ بڑ؟“
”آئیں سر، میں دکھاتا ہوں۔“ سراج بابا نے تیز قدموں سے آگے جاتے ہوئے کہا۔ معین نے راستے میں کئی

جنونس

بار پوچھا مگر اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ وہ بدکن آفس ہال میں داخل ہوئے اور منیر کے کینن کی طرف بڑھے۔ سراج بابا نے دروازے پر رک کر آگے اشارہ کیا۔ میز کے پیچھے سے دو ناٹیں جھانک رہی تھیں۔ معین بے ساختہ آگے آیا اور جھک کر دیکھا اور اچھل پڑا، یہ منیر تھا جو بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر کہہ کر کھنا چاہا تھا کہ کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ پکڑا کر گر پڑا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے ہاتھ بیروں سے جیسے جان نکل گئی، اس نے دھندلائی آنکھوں سے دیکھا۔ ضرب ایک پیپر ویٹ سے لگائی گئی تھی اور پیپر ویٹ سراج بابا کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ اس نے جھک کر معین کو دیکھا اور بولا۔ ”سر، آپ ابھی ہوش میں ہیں۔“
”سراج۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ یہ سب تم۔۔۔۔۔؟“ معین نے ٹوٹے الفاظ میں کہا۔
”ہاں یہ سب میں نے کیا ہے اور اس شخص کی وجہ سے کیا ہے۔“ اس نے منیر کی طرف دیکھا۔ ”اس ذیل آدمی کی وجہ سے منیر کو حادثہ پیش آیا۔ وہ نیانیا آیا تھا اور اس سے ایک اہم فائل مس ہو گئی۔ اس شیطان صفت آدمی نے اس چھوٹی سی بات کو بہت بڑا مسئلہ بنا دیا اور منیر کو انکوارسی کی دھمکیاں دینے لگا۔“
”منیر کو۔۔۔۔۔ اس نے مارا؟“
”نہیں، وہ حادثے کا ہی شکار ہوا تھا مگر اس کی وجہ یہی شخص تھا۔ اس نے اسے اتنی ٹیشن دی کہ وہ بے خیالی میں لفٹ کے خلا میں گر گیا۔“
”معین کا سر اب بھی چکر رہا تھا اور ہاتھ بیروں میں جان نہیں تھی مگر اس کی زبان کسی قدر قابو میں آ رہی تھی۔
”کا مران اور عظمت؟“
”انہیں میں نے مارا کیونکہ وہ منیر کی سیٹ پر آئے تھے۔ مجھے گوارا نہیں ہے کہ اس سیٹ پر کوئی اور آئے۔ پھر اسے بھی پھنسا دیا تھا۔“ سراج بابا نے منیر کی طرف اشارہ کیا۔ معین کو اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کمزور اور معمولی سا سراج بابا جس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ دوسرے اسے اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس سے سوائے خدمت کے اور کسی کام کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ اس نے دونوں جوان افسروں کو قتل کیا تھا۔ رفتہ رفتہ معین کو یقین آنے لگا کیونکہ اس نے اسے بھی نہایت آسانی سے قابو کر لیا تھا۔ اس نے منیر کی طرف دیکھا، اس کا سینہ

حقیقت

عرفان اظہار

کہتے ہیں کہ حقیقت زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی... اور یہ بھی سچ ہے کہ لوگوں کی حقیقت کبھی پتا نہیں چلتی... ایسے ہی چہروں کا احاطہ کرتی تحریر... جو اپنے قول و فعل اور دل و دماغ میں یکسر مختلف تھے... غیر معمولی انداز میں کامیابی کا سفر طے کرنے والوں کا پُر المیہ ماجرا...



مغرب سے موصول شدہ ایک عجیبے انداز و اطوار کی روایت...

”گرہی، تمہارا بازو! تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر نے تمہیں اس بارے میں احتیاط کرنے کو کہا ہے۔“
”اوہ، وہ بوڑھا یا گل؟“ گرہی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”وہ تو چاہتا ہے کہ میں بستر پر پڑی رہوں اور دن بھر کوئی کام نہ کروں۔ میرا بازو اچھا ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو!“ اس نے اپنا بازو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر کھڑکی کے اوپری کنارے کے نیچے کریب پیچہ کا پردہ

”ہائے ہنی، میں گھر آ گیا۔“ جارج نے اپنا برفیہ کیس ایک کرسی پر اور اپنی چابیاں اور ڈرائیونگ کی ٹیگ بچن کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
”میں یہاں ہوں، ڈیڑھ ذرا کاؤنٹر پر رکھا ہوا کریب پیچہ تو میرے پاس لے آؤ۔“
جارج نے جب گرہی کو لیونگ روم کی کھڑکی کے سامنے ایک سیڑھی پر موجود پایا تو چلتے چلتے رک گیا۔

جنونس

”مجھے گوارا نہیں کہ میرے بیٹے کی سیٹ پر کوئی آئے۔“ سراج بابا نے کہا تو اس کے تاثرات جنونی ہو گئے تھے۔ ”جو بھی آیا میں اسے قتل کر دوں گا۔“
”تم کب تک... ایسا کرو گے؟“

”میں ہمیشہ ایسا نہیں کر سکوں گا۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”مگر جب تک یہاں ہوں اور آزاد ہوں ایسا کرتا رہوں گا۔ ابھی آپ کو اس پیچہ ویٹ سے قتل کر دوں گا۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا پیچہ ویٹ دکھایا۔ پھر منیر کی میز پر رکھے پیچہ ویٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس پر منیر کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اس پر خون لگا دوں گا تو ایسا لگے گا جیسے منیر نے اسی سے آپ قتل کیا ہے اور خود بھی مقابلے میں زخمی ہوا۔ پولیس آکر اسے لے جائے گی۔ کوئی اس کی بات نہیں سنے گا کیونکہ سارے ثبوت اس کے خلاف ہوں گے اور اسے پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔“

”تم نے دو... بے گناہ قتل کر دیے۔“ معین نے کہا۔

”آج اس میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔“ سراج بابا آگے آئے۔ اس نے پیچہ ویٹ والا ہاتھ بندھ کر معین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی حالت خاصی حد تک بہتر ہو گئی تھی۔ معین نے اسے پیچھے دھکا دیا۔ سراج بابا ذرا دور جا کر پھر دوبارہ جنونی انداز میں اٹھا۔ معین بھی اٹھ گیا تھا۔ اس نے سراج بابا پر نظر رکھتے ہوئے میز پر ہاتھ مارا تو ایک چیز اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ جیسے ہی وہ آگے آیا اور اس پر وار کرنے کی کوشش کی معین نے پیچہ نافٹ اس کے پیٹ میں اتار دی۔

☆☆☆

ہسپتال میں معین سر کی مرہم پٹی سے فارغ ہوا تو ایک پولیس انسپکٹر اس سے بیان لینے کے لیے موجود تھا۔ منیر بھی ہسپتال میں تھا، اسے ہوش نہیں آیا تھا مگر اس کی حالت بہتر تھی۔ سراج بابا کا ری ڈرم کے باوجود بخ گیا تھا اور اس کی حالت بھی بہتر تھی۔ پولیس نے اس سے ابتدائی بیان لے لیا تھا، اس نے اعتراف کیا کہ سب اسی نے کیا ہے۔ کامران اور عظمت کا قتل، اس کے بعد منیر کے خلاف سازش کی اور معین کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ معین بیان دے کر عینکی میں ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا سر دکھ رہا تھا اور وہ آرام کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے یہاں کو بتانا چاہ رہا تھا کہ اس کا اندازہ بالکل غلط تھا۔

حرکت کر رہا تھا یعنی وہ زندہ تھا۔ سراج بابا نے اسے بھی سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا تھا۔ خون اس کے سر سے بہہ کر اس کے چہرے پر آ رہا تھا۔
”منیر یہاں کیسے آیا؟“

”میں نے کال کر کے بلایا ہے۔“ سراج بابا نے اطمینان سے کہا۔ ”آفس کے نمبر سے کال کی اور آپ کی آواز میں کی۔“

”منیر کی آواز میں؟“
”جی سر، آپ کی آواز کی نقل اتارنا آسان ہے سارا دن سننا رہتا ہوں۔“ اس نے بالکل معین جیسی آواز میں کہا۔ ”یہ دھوکا کھا گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دفتر میں آکر آپ سے ملے کیونکہ آپ کے پاس کچھ ایسے ثبوت ہیں جو اس کی بے گناہی ثابت کرتے ہیں۔ یہ سن کر یہ دوڑا آیا اور میں نے اسے آرام سے قابو کر لیا۔“

سراج بابا یوں سکون سے کہہ رہا تھا جیسے اسے کوئی غلٹ یا خوف نہیں رہا تھا۔ یوں لگ رہا جیسے حالات مکمل طور پر اس کے قابو میں ہوں۔ یہ اس لحاظ سے درست تھا کہ عمارت خالی ہو چکی تھی۔ سردیوں میں صفائی کرنے والا علمہ بھی جلدی چھٹی کر جاتا تھا۔ اس لیے اب یہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود معین اسے باتوں میں نہ لگا تا تو وہ اپنا منصوبہ بتانے کے بجائے اسے قتل کر چکا ہوتا۔ معین بہتر محسوس کر رہا تھا مگر وہ خود کو کمزور ہی ظاہر کرتا رہا۔ وہ سانس کھینچ کھینچ کر لے رہا تھا اور ٹوٹے پھوٹے انداز میں بات کر رہا تھا۔ ”تم ہم... دونوں کو... مار دو گے؟“

”صرف آپ کو سر۔“ سراج بابا نے بدستور مودب لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ زندہ رہے گا اور پھانسی چڑھے گا تب میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔“
”تم اس سے... کس بات کا... بدلہ لے... رہے ہو؟“

سراج بابا نے منیر کی طرف دیکھا۔ ”کیونکہ یہ میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ صغیر میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ میں نے اسے پڑھا یا لکھا۔ جب اس نے سول سروس کا امتحان دیا تو میں اس سے لائق ہو گیا کہ بھی میری نوکری اس کے لیے طعنہ نہ بنے۔ اتفاق سے اس کی پوسٹنگ یہاں ہوئی جہاں میں چیرا ہی ہوں۔ میں اپنے بیٹے کا چیرا ہی بنا رہا۔ صرف اس کی خاطر۔“
”معین کو ایک بار پھر جھٹکا۔ صغیر، سراج بابا کا بیٹا تھا۔ یہ ایک اور ناقابل یقین بات تھی۔“ ہمارا کیا... قصور ہے؟“



پڑوں کا اخبار زیادہ دلچسپ ہے!

فاصلے تک قدم بڑھانے اور پھر کھودنا شروع کر دیا۔
”جارج کیا یہ تم ہو؟“ گریسی کی سرگوشی کے مانند دلی دلی آواز ابھری تو بیٹے جارج کے ہاتھوں سے گر گیا۔ وہ تیزی سے گھوما اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
بالآخر اس کی نگاہ گریسی کے چہرے پر پڑی جو ان کی دوسری منزل کے بیڈروم کی کھڑکی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ گریسی نے اپنا سر مزید باہر نکال لیا۔ ”یہ تم ہی ہونا، ہنی؟ تم کیا کر رہے ہو؟“
”شش... تم پڑوسیوں کو نیند سے جگا دو گی۔ میں ایک منٹ میں اوپر آتا ہوں۔“

جارج نے اپنے اوزار واپس گیراج میں رکھ دیے اور گریسی کے پاس چلا گیا جو نیچے چلن میں آچکی تھی۔
”تم رات کے تین بجے وہاں باہر کیا کر رہے تھے؟“ گریسی نے تشویش سے پوچھا۔
”مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ بلاک پارٹی کے لیے تحائف کے آئٹمز زمین میں چھپانے کا کام ابھی سے شروع کر دیا جائے۔ سوان کے لیے لڑھا کھود رہا تھا۔ پارٹی کا تھیم بال ٹیمت ہے، ہے نا؟“
”میں ڈیر، لیکن ہمیں آدمی رات کو چیزیں گڑھوں میں چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چند پڑوسیوں کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ہم اپنے عقیقہ میں سے پودے اور جھاڑیاں کاشت کرنا چاہتے ہیں اور تم ایک پختہ بنانے والے ہو اس لیے ہم کھدائی کر رہے ہیں۔ تم دن کی روشنی میں جو کچھ کریں گے، اس پر ہمیں کسی قسم کی تیرانی نہیں ہو

کر رہا تھا۔ لیکن اس کی طرز زندگی کو بہتر بنانے کے لیے۔“
”کاش تم نے یہ سب مجھے پہلے بتایا ہوتا۔ میں اپنے اخراجات میں کی کر سکتی تھی۔“
”اوہ نو! ہمارا حساب کتاب ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم بھی کبھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ مجھے بھی اپنے لیے کشتی خریدنے یا مکان کی ترمیم نوکے قابل ہونا چاہیے تھا۔ افسوس، اس نے مجھ سے الگ ٹھیک جو کچھ کمایا، اس رقم سے ہم اپنے لیے ایک بڑا مکان خرید سکتے تھے اور پھر بھی سیر و تفریح پر جانے کے لیے رقم کی بچت کر سکتے تھے۔ یہ کہہ کر وہ ایک اور جام تیار کرنے کے لیے بار کی طرف پلٹ گیا۔

”جارج، کیا تمہیں واقعی تیسرے جام کی ضرورت ہے؟ میں جانتی ہوں کہ تم آپ سیٹ ہو لیکن ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔۔۔“
”نہیں، میرے خیال سے نہیں۔ میں اس وقت آٹو پائلٹ پر آچکا ہوں۔“ اس نے جھک کر گریسی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں جب تک تم جتنا ہوا کھانا تیار کر لو۔ آج رات کھانے میں کیا ہے؟“
”جانتی ہیں۔ سب کچھ ڈی فراسٹ ہے اور سلاو بھی تیار ہے۔ اگر تم چاہو گے تو ہم فریش پر کھانا کھا سکیں گے۔“
”ہاں یہ عمدہ رہے گا۔“ جارج نے کہہ کر کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔
گریسی ابھی اس نے سیر میز کی ایک طرف رکھ دی۔

☆☆☆

رات کے تین بجے جب گریسی سو رہی تھی تو جارج چپکے سے بیڈ پر سے نیچے اتر آیا۔ وہ دیے پاؤں ہاتھ روٹھ میں گیا اور کام کرنے کا وہ لباس پہن لیا جو اس نے بیڈ پر جانے سے پہلے ایک طرف تیار رکھ دیا تھا۔ پھر گنگ شوز پہن کر آہستہ قدموں سے زینے کے راستے چلی منزل پر آ گیا اور گیراج میں چلا گیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ گزشتہ ہفتے دروازے کو کھل دے چکا تھا اس لیے کوئی چرچاہٹ نہیں ہوئی۔
اس نے گیراج کے دروازے کے پاس رکھی ہوئی فلیش لائٹ اٹھائی اور دوسری طرف چلا گیا جہاں ریک کے برابر دیگر اوزاروں کے ساتھ بیچے بھی لٹا سٹ سے رکھا ہوا تھا۔ تختہ پردی اوزار سجے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے شیفٹ پر ایک اضافی ترپال بھی جوڑی ہوئی تھی۔
جارج نے بیچے اور ترپال اٹھا لیے اور مکان کے عقیقہ جسے میں چلا گیا۔ اس نے احاطے کی جانب میں فٹ کے

روبانہ ہو چکا ہوگا۔“ جارج نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا اور بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔ اسے یہ گھونٹ آگ کے گولے کے مانند پیچھے منہ میں جاتا ہوا محسوس ہوا۔
”کیا تمہیں یقین ہے؟ میں جانتی ہوں کہ فریک کے غائب ہونے اور اس کی جگہ اس نے سبز فیر کے آنے سے تم بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہو لیکن ہنی اگر تم سے یہ ملازمت چھوٹ جاتی ہے تو میں کسی جگہ کام کرنے واپس چلی جاؤں گی۔ میں کام نہ کرنے کو کس کر رہی ہوں۔ کاش میں انہیں اس بات کی اجازت نہ دیتی کہ وہ مجھے ریٹائر کر دیں۔“ گریسی نے اپنا جام نیچے رکھ دیا اور اپنی پوری توجہ جارج پر مرکوز کر دی۔

”فریک کے غائب ہونے کے بارے میں... ایک ڈیولپمنٹ ہوئی ہے۔ یوئیس ہر ایک سے پوچھ چکے کر رہی ہے۔ وہ تو ایک قانونی اکاؤنٹ کو بھی لے آئے تھے۔ جب فریک غائب ہوا تو ایک بہت بڑی رقم بھی غائب تھی، گریسی!“
جارج نے اپنا جام دوبارہ بھر لیا اور لیوینگ روم میں بیٹھ لگا۔ ”جو بات میں نے تمہیں بھی بتائی وہ یہ تھی کہ فریک برسوں سے میرے پیسٹر اکاؤنٹ کو اپنے تصرف میں لا رہا تھا۔ ابتدا میں تو یہ صرف ایک یاد دہی تھی۔ وہ یہی کہتا تھا کہ وہ انہیں ہاؤس اکاؤنٹ میں منتقل کر رہا ہے۔ ہر مرتبہ جب بھی میرا کوئی اچھا اکاؤنٹ مضبوط ہو جاتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ہم کچھ رقم پس انداز کر سکتے ہیں تاکہ کہیں گھومنے پھرنے جا سکیں تو... فریک وہ اکاؤنٹ لے اڑتا تھا۔ میں اس کی نیم میں سب سے بہترین سبز میں ہوں لیکن میرا کمیشن گرتا جا رہا ہے۔ جب فریک نے گزشتہ گریموں میں میں کشتی خریدی اور چند ماہ قبل اپنے گھر کی نئے سرے سے ترمیم و آرائش کی تو مجھے شبہ ہو گیا اور تب میں نے کھاتے چیک کرنا شروع کر دیے۔ میں نے دریافت کیا کہ ہر مرتبہ وہ چند ماہ تک انتظار کرتا ہے اور پھر وہ اکاؤنٹ اپنے پاس لے آتا ہے۔“
”اوہ ڈیر! اچھا تو یہ بات تھی۔ جس نے تمہیں اس قدر بدحواس کر دیا تھا۔ ادھر میں یہ سوچتی تھی کہ فریک اتنا عمدہ شخص ہے کہ میرے اسٹروک کے بعد اس نے میرا کتنا خیال رکھا اور مجھے پھول بھجوائے تھے۔ وہ ایک باریکری عبادت کے لیے اسپتال بھی آیا تھا... آپ کو لوگوں کی حقیقت بھی نہیں چلتی، ہے نا؟“
”ہاں، میرا خیال بھی یہی ہے۔ وہ میری رقم چور ہوا تھا اور مجھ سے کہتا تھا کہ میں اور محنت کروں۔ میں سخت محنت

لگانے کا عمل برقرار رکھا۔“ اور میرا بقیہ جسم تو اس سے کہیں زیادہ تیزی سے صحت یاب ہو چکا ہے۔“
”چلو ٹھیک ہے... لیکن تم کام کرنے کے معاملے میں حد سے زیادہ تجاؤ نہ کرنا۔“ جارج نے اس کا ہاتھ لہجہ میں گریسی نے نظریں اٹھا کر جارج کی طرف دیکھا اور اس کی فکر مندی پر بے ساختہ ہنسنے لگی۔ ”تم بالکل نہ گھبراؤ۔ اگر صفائی ستھرائی اور کھانے پکانے کے کام میں مدد کی سے کر رہی ہوں تو یہ چھوٹی سی سیر میز مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔“
جارج نے کرب پیچہ گریسی کو ہاتھ دیا اور پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ ”یہ عمدہ تاثر دے رہا ہے لیکن تم یہ اندرونی سجاوٹ کیوں کر رہی ہو؟“

”جارج آرتھر فلٹن! پیلیز مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم بھول چکے ہو اس سال ہم ہیڈوین بلاک پارٹی کی میزبانی کر رہے ہیں اور وہ بھی گزشتہ سال کی اس منت ساجت اور عاجزی کے بعد جو تم نے مجھے رضامند کرنے کے لیے کی تھی۔“ گریسی نے اپنی انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن جارج اس کی مسکراہٹ دیکھ کر کبھی گیا کہ وہ اس کے ساتھ چمچیر چھاؤ کر رہی ہے۔
”مجھے دھیان ہی نہیں رہا کہ مہینہ ختم ہونے کو ہے۔۔۔۔۔ میں یقیناً سوچنے سے زیادہ اپنے کاموں میں الجھا رہا ہوں۔“ جارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم ڈرنک کو؟“
جب گریسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو جارج اپنے لیے جام اٹھیلے لگا۔ پھر اس نے لگا ہوا اٹھا کر گریسی کی طرف دیکھا تو وہ اسے نکلے جا رہی تھی۔
”جارج، کیا دفتر میں معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں؟ تم نے گزشتہ شب کہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اب تمہارے لہجے میں وہ یقین نہیں ہے۔“ گریسی سیر میز سے نیچے اتر آئی اور جارج کے ہاتھ سے اس کا جام لے لیا۔
جارج نے اپنے لیے دوسرا جام تیار کر لیا اور پھر وہ دونوں آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے۔
”ہنی، سب کچھ ٹھیک ہے۔ یا کم از کم ٹھیک ہو جائے گا۔“
”ٹھیک ہو جائے گا سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یا تو سب کچھ ٹھیک ہے یا پھر ٹھیک نہیں ہے۔ کیا سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“
”اب بالکل ایسی بات بھی نہیں ہے۔ نیا میجر بیٹر بہت شدت کے ساتھ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ مجھے تو خدا تھا کہ کہیں وہ مجھے ملازمت سے برخاست نہ کر دے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں بے داغ ہوں۔ وہ آج سہ پہر شکار گاہ کے لیے

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

ترقی جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلجھری
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی
ملٹی ایوارڈ ہولڈر



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9- اپریل 30 بجے
9- اگست 30 بجے
9- دسمبر 30 بجے
فون: 0300-8566188
موبائل: 2261636

AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

لاہور

پشاور

14- فروری تا 27 فروری
14- جون تا 27 جون
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر
گلف سینٹر
آفس نمبر: 16
فون: 0300-8566188

11- فروری تا 14 فروری
11- جون تا 14 جون
11- اکتوبر تا 14 اکتوبر
پیشانی سینٹر
فون: 0521) 2218215-9
موبائل: 0300-8566188

ملتان

کراچی

28- مارچ تا 6- اپریل
28- جولائی تا 6- اگست
28- نومبر تا 7- دسمبر
پیشانی سینٹر
فون: (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

13- مارچ تا 27 مارچ
13- جولائی تا 27 جولائی
13- نومبر تا 27 نومبر
پیشانی سینٹر
فون: 708-708
موبائل: 021-7012068-9
0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

بدھ کی رات ڈنر کے بعد جارج نے نیند کی ایک گولی
پیش کر گریسی کے مشروب میں چپکے سے ملا دی۔ لیکن گریسی
نے مشروب پینے سے انکار کر دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ رات
کو سونے سے پیشتر پیا جانے والا مشروب مجھے ہلکی نیند کا
عادی بنا رہا ہے۔ آج رات میں مشروب پیے بغیر سونے
جاری ہوں۔“

جارج دل ہی دل میں اپنی بیوی کو کون سے لگا لیکن
ظاہر میں مسکراتے ہوئے اسے سونے کے لیے بستر پر بھیج
دیا۔ ”میں کاؤچ پر سو جاؤں گا، گریسی۔ شاید میری وجہ سے
تمہاری نیند خراب ہوتی ہے۔“

گریسی چند ہی منٹ بعد لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھوں
میں نیچے، چادر اور کبل تھے۔ ”مجھیں میرا اکتنا خیال ہے،
ڈیئر، جیسی تو میں تم سے اتنا پیار کرتی ہوں۔“ گریسی نے
شب بخیر کہا اور سونے کے لیے بیڈ پر چلی گئی۔

جارج رات میں ایک بار پھر اپنے اوزار لینے کے
لیے گیارہ بجے میں چلا گیا۔ اس نے کھدائی... سے قبل ایک بار
پھر میں فٹ کا فاصلہ تا پا اور پھر کھدائی شروع کر دی۔ جلد ہی
اس کا بیڈ تریپال کے سخت پلاسٹک سے ٹکرا گیا۔ اس نے
تریپال کے خاکے کے اطراف میں احتیاط سے کٹی پٹانا
شروع کر دی۔ پھر اس نے مٹی میں دبے لپٹے ہوئے تریپال
کو گڑھے سے باہر کھینچ کر فالتو تریپال کے اوپر ڈال دیا اور
اس وزنی تریپال کو گھٹینا ہوا گیارہ بجے میں لے گیا۔
اس نے وہ لپٹا ہوا تریپال اوزاروں کے شیف کے
نیچے چھپا دیا۔

واہ! اس نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔
یہ کام بھی ہو گیا۔ اب میں پارٹی ختم ہونے کے بعد اسے
دوبارہ گڑھے میں دفن دوں گا۔

جارج نے جتنی سے پہلے دفتر سے چھٹی کر لی تاکہ آخری
نجات کی تہاڑی میں گریسی کا ہاتھ بٹا سکے۔ اس نے پارٹی کے
خزانے باہر نکلنے کے گڑھوں میں دفن ہونے میں گریسی کی مدد کی۔
وہ اس بات پر خاصا خوش تھا کہ ایک دن قبل پڑوں راشنل کے
بیٹوں نے اس کے جھکے کا خاصا کام نفاذ کیا تھا۔ اب کوئی بھی
تازہ کھدی ہوئی اس ریت کے بڑے سے ڈھیر پر کوئی توجہ
نہیں دے سکتا تھا جو حاٹے کے پاس موجود تھی۔

پھر جارج نے گریسی کے ساتھ ل کر مکان کے اندر
اور صحن میں وہ اشارے اور ٹیکو نصب کر دیے جو خزانہ تلاش
کرنے والوں کو پھنسا سکتے یا ان کی راہنمائی کر سکتے تھے۔ یہ
خزانے کی تلاش کا ایک دلچسپ کھیل تھا اور ہیلوین پارٹی کا

مٹی۔ راشنل اپنے دونوں لڑکوں کو جھرات کو ہمارے یہاں
بیچ رہی ہے۔ وہ گڑھے کھود کر مٹی نکال دیں گے۔ تم فکر
مت کرو۔ جیسے تک سب کچھ تیار ہو جائے گا۔“

جارج کے حلق سے جواب میں صرف ایک غراہٹ
ہی بلند ہو کر رہ گئی۔ جب وہ دوبارہ سونے کے لیے بیڈ پر
پہنچے تو جارج کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھتا رہا۔ وہ باقی تمام
رات بیڈ پر لیٹا جا کھاتا رہا۔

صبح کے اخبار میں صفحہ اول پر فریک کی تصویر نمایاں
طور پر چھپی ہوئی تھی۔ چاشیے میں تصویر کے ساتھ ایک پتیان
انگریز کہانی بھی بیان کی گئی تھی کہ گریسی پورا آرٹیکل پڑھنے کے
بعد اپنے شوہر کی جانب متوجہ ہوئی۔

”جارج ڈیئر، آرٹیکل میں لکھا ہے کہ فریک نے ڈیئر
ساری رقم کاغذیں کیا ہے۔ کیا یہ تمہارے اکاؤنٹس کی رقم تھی؟“
”اوہ نہیں۔ ہمارے اکاؤنٹس سے اسے کمیشن ملا
تھا۔ اس نے یقیناً کمیشن کے اکاؤنٹس سے بھی رقم چوری کی
ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے آڈیٹر کی رپورٹ افشا
کر دی ہوگی کیونکہ ہمیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا گیا
تھا۔“ جارج نے کافی کا آخری ٹھونٹ بھرتے ہوئے کہا اور
اخبار اٹھالیا جو گریسی نے اس کی جانب بڑھا دیا تھا۔

اس نے آرٹیکل پر سرسری نگاہ دوڑائی اور اس کے
ہونٹوں سے مٹی کی آواز نکل گئی۔ ”واؤ، دس لاکھ ڈالر سے
زیادہ کی رقم! میرا خیال ہے کہ اب تو وہ اس کی تلاش میں
پورا زور لگا دیں گے۔“

”آرٹیکل میں لکھا ہے کہ اس نے یورپ کے لیے
ہوائی جہاز کا ایک ٹکٹ خریدا ہوا تھا۔ اس کی آخری منزل
تازقستان تھی۔“ گریسی نے بتایا۔

”ہوں۔ پھر تو اس کی واپسی خوش قسمتی سے ہی ہو
گی۔ اس لیے کہ امریکا کے ساتھ ان کا حوالگی ملزم کا کوئی
معادہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میرے سنے میجر پیٹر
کو مجھ پر یقین کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“

جارج کو اپنے پیٹ کی مروڑ کی کیفیت میں خاصی
بہتری محسوس ہوئی اور اسے سکون آ گیا۔ گزشتہ کئی ہفتوں کی
بے چینی کے بعد اسے پہلی بار قمر آ رہا تھا لیکن ابھی ایک کام کو
نہماتا باقی رہ گیا تھا۔

اس رات جارج جب بھی بیڈ پر سے کھٹکے کی کوشش
کرتا، گریسی کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ ”جارج! اطمینان سے
پڑے رہو۔ تمہارے بار بار کروٹیں بدلنے سے مجھے بھی مٹی
نیند نہیں آئے گی۔“

ایک روایتی حصہ تھا۔

ان کی آخری تیاری مکان کے اندر آٹھ سو کو چھپانا تھا جو پارٹی کے ان شرکاء کے لیے تھے جو خانے کی تلاش میں صحن کی کھدائی میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اس رات کھانے پینے کا دور چلا رہا اور ان کے پڑوسی مختلف اقسام کی ڈشیں اور شروبات لاتے رہے۔ آدھی رات کے قریب گریسی نے ہر جوڑے یا واحد فرد میں وہ کلیو اور اشارے تقسیم کر دیے جو خانے کی تلاش میں مدد دے سکتے تھے۔ پھر ان سے کہا: ”جاؤ اور مالِ قیمت تلاش کرو۔“

جارج نے پہلے ہی بہت سے پہلے مستعار لے رکھے تھے تاکہ ہر کوئی جو باہر صحن میں کھدائی کرنے کا خواہش مند تھا، اس کھیل میں بھرپور شرکت کر سکے۔ وہ چکن ہی میں رک گیا اور اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگا جبکہ گریسی باہر چلی گئی اور خانے کی تلاش کے کھیل کا جائزہ لینے لگی۔

اس وقت جارج کے ہاتھ سے شروپ کا جام گرتے گرتے بچا جب چند منٹ بعد اس نے کسی کو یہ چیخنے ہوئے سنا۔ ”ارے، سب لوگ ادھر دیکھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے بلیک بیئر ڈک کی باڈی تلاش کر لی ہے۔ اسے باہر کھینچنے میں کوئی میری مدد کرے۔“

گریسی نے جب وہ تریپال دیکھی تو پہننے لگی۔ ”مبارک ہو! ہاں، بلیک بیئر ڈک ہونا چاہیے۔ ہمیں آج رات گرانڈ پرائز ملے گا۔“

بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے تریپال کو باہر کھینچنا شروع کر دیا جبکہ دیگر گڑھے کے اندر سے مٹی ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔

جارج کو انہیں روکنے میں بہت دیر ہو گئی اور وہ اس وقت بے ہوش سا ہونے لگا جب اس نے تریپال کی تہ کھلنے کے بعد اس کے اندر سے پارٹی کے ڈھانچے کے بجائے اپنے سابقہ باس کے چہرے کو کھیا ہوتے دیکھا۔

جارج نے سہارے کے لیے گریسی کا بازو تھاما تو وہ اس کی جانب گھوم گئی۔ ”جارج، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم جی نہیں لگ رہے ہو؟“

☆☆☆

پولیس نے پارٹی کے شرکاء کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

دو پولیس افسر جارج کے ساتھ باہر موجود تھے جبکہ دیگر دو لیوٹننٹ گریسی سے سوالات کر رہے تھے۔

حقیقت

”مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تریپال کے اندر کیا ہے۔ پڑوس کے ان دو لوگوں نے وہ تریپال گیران میں تلاش کی تھی۔ میں نے انہیں پارٹی کھیل کے راز میں شریک کرتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کھپٹی ہوئی تریپال کو باہر گڑھے میں دفن کر دیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس طرح جارج کو بھی حیران کر دوں گی۔“

”اور تمہیں یقین ہے کہ حال ہی میں کوئی اور تمہارے صحن کی طرف نہیں آیا تھا۔۔۔ جی کی کد رات گئے بھی؟“

”اوہ نہیں، جارج ہی وہ واحد فرد تھا جو رات گئے ادھر گیا تھا۔۔۔ اوہ مائی گاڈ اس کا مطلب ہے۔۔۔“

”ہاں سبز جارج۔ ہمیں یقین ہے کہ تمہارے شوہر نے اپنے باس کو قتل کر دیا تھا اور کھاتوں میں اس طرح ہیرا پھیری کر دی تھی کہ یہ ظاہر ہو چکے کارپوریٹ اکاؤنٹس میں عین اس کے باس نے کیا ہے۔ جارج کے سابقہ باس فریک سے متعلق وہ کہانی ہم نے اخبار میں سازش کے طور پر چھپوائی تھی تاکہ ہمیں اس عین کو ثابت کرنے کے لیے وقت مل جائے۔“

☆☆☆

پولیس جارج کو حراست میں لے کر چلی گئی۔ پولیس کے جانے کے بعد گریسی اپنے بندہ روم میں آگئی۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے گریسی نے اپنا جیوری کس چیک کیا جس کے اندر اس نے شہر سے باہر واقع ایک چمنازیم کے لاکر کی چابی چھپائی ہوئی تھی۔ اس نے وہاں اپنی رجسٹریشن ایک فرضی نام سے کرائی تھی اور چھ ماہ کی آزمائشی مدت کا کرایہ بھی نقد جمع کر چکی تھی۔ اس نے لاکر میں کام کے چند بلوسات کے علاوہ ایک بڑا سا چمنازیم بیگ بھی محفوظ کیا ہوا تھا۔

اس چمنازیم بیگ میں دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کی رقم نقدی کی صورت میں موجود تھی۔ اس نقد رقم کا بیگ اس نے اس وقت دریافت کیا تھا جب گیران میں پہلی بار لپٹی ہوئی تریپال چھپی دیکھی تھی اور تلاش لینے پر لاش اور رقم کا عقدہ کھلا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ جارج کو یہ وضاحت کرنے میں سستی دشواری پیش آئے گی کہ وہ رقم کہاں غائب ہو گئی جبکہ فریک کی لاش بدستور تریپال میں لپٹی ہوئی تھی۔

وہ یہ جملہ بار بار دہراتے ہوئے نیند کی آغوش میں چلی گئی کہ۔۔۔ ”آپ کو لوگوں کی حقیقت بھی پتا نہیں چلتی۔۔۔ ہے نا؟“

☆

جیتنے کے صرف چھ ماہ کے اندر وہ اتنی مقبول ہو گئی کہ مخالف پارٹی کا چیئر مین بھی اس کی تعریف کے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اب وہی انجیلا اس کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سیٹل اتارے اور نیم دراز ہو کر اپنے پاؤں ڈش بورڈ پر رکھ دیے جس سے اس کی ٹانگیں عریاں ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے میز کے ہاتھ کپکپائے اور اس نے مضبوطی سے اسٹیرنگ ویکل سنبھال لیا۔ یہ نظارہ ہی ایسا تھا کہ کوئی پارسا فحش بھی اس سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ میز کو دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ یہ عورت سرتاپا پرکشش ہے۔

کئی ہال میں ہونے والا استقبال اس کی توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا، اور پھر ان دونوں کا گمراہ پارکنگ لٹ میں ہوا۔ لیکن وہ اس طرح طے جیسے یہ کوئی اتفاق نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ ملاقات ہو۔ ان کے درمیان مختصر سی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مختلف ترقیاتی منصوبوں مثلاً نئے کھیل کے

ان رنگین و پریشان لحوں کی سوغات... جس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی...

اتفاقات حسین ہی نہیں... سنگین بھی ہوتے ہیں... وہ بے حد خوش تھا... حسن اتفاق سے اسے ایک طرح دار حسینہ کی قربت مل گئی... لمحوں نے کروٹ لی اور ایک بیک... وہ اس پر بارش کی طرح مہربان ہوتی چلی گئی... اور پھر ایک اور اتفاق نے اس کی زندگی کو شدید سنگینی سے دوچار کر دیا...

بیچارہ

سکندر حسین



Famous Urdu Novel
Free pdf Library

میدان، اس کی کمپنی کا زیرِ تعمیر آفس کپلیکس اور اسٹالیر ویلڈ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا کیونکہ اس کی کمپنی کے سٹی کوئٹل کے ساتھ دو بڑے معاہدے ہوئے تھے اس لیے فطری طور پر ان کے درمیان اس سلسلے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

اچانک ہی انجیلا نے اپنے پرس سے سیل فون نکالا اور بولی۔ ”جیسے اپنے لیے ایک جیکسی منگوانا ہوگی۔“

”کیا میں تمہیں اپنی گاڑی میں لفٹ دے سکتا ہوں۔“

ہینئر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ بھول گیا تھا کہ کسی عام عورت سے نہیں بلکہ شہر کی ہینئر سے بات کر رہا ہے۔

انجیلا نے حیرت سے اسے دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اوہ۔“

ہینئر نے اپنی بیوی کا نمبر ملا یا لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اس نے پیغام چھوڑ دیا۔ ”مجھے گھر آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ راستے میں پیٹر کے پاس رکوں گا۔“

بہتر ہوتا کہ وہ فون کر کے پیٹر کو بھی بتا دیتا۔ وہ گھر پر اکیلا ہی ہوگا۔ جب سے اس کی بیوی اہلی مری تھی، وہ اپنا بیشتر وقت گھر پر ہی گزارتا تھا لیکن یہ اس کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ انجیلا پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس کا شوہر دیپک اینڈ گزائر نے آڑ نہیں کیا ہوا ہے اور اس کا بیٹا بھی رات کو دیر سے گھر آئے گا۔ گویا ہر طرح سے حالات ان کے لیے سازگار تھے۔

اس نے انجیلا کی طرف دوبارہ دیکھا اور میں اسی لمحے وہ بھی اس کی جانب گھومی۔ دونوں جانب سے نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ وہ جھپٹتے ہوئے بولا۔ ”آگے سے دائیں جانب۔“

”ہاں اور اس کے بعد بائیں طرف۔ گویا تم جانتے ہو کہ میں کہاں رہتی ہوں؟“

”یقیناً تم میٹر کی رہائش گاہ میں ہی رہتی ہوگی۔ وہ مکان ہماری کمپنی نے ہی پندرہ سال پہلے بنایا تھا۔“

”تم جانتے ہو کہ ابھی میرا گھر جانے کا موڈ نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ اگلے موڑ سے پہلے اس نے کہا۔ ”بہت گرمی ہے۔“

واقعی سال کے ان دنوں میں اتنی گرمی نہیں ہوتی لیکن پچھلے ایک ہفتے سے ہوا میں نمی کا تناسب بڑھ گیا تھا اور گرمی سے لوگ بے حال ہو رہے تھے۔ اسی مناسبت سے مردوں نے شارٹس اور عورتوں نے ڈھیلی ڈنگ والے کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ ایک اخبار نے اس گرمی کو خاموش قاتل قرار دیا تھا کیونکہ یہ بوڑھے لوگوں کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔

”واقعی بہت گرمی ہے۔“ انجیلا نے دوبارہ کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ یہ گویا ایک طرح سے براو راست

دعوت تھی اور ایسی جرأت صرف وہی کر سکتی تھی۔ زیادہ پہننے کی وجہ سے وہ کچھ ڈی نہیں چلا سکتی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں تھی۔

”چلو ساحل پر چلتے ہیں، مزہ آجائے گا۔“

”تم تیرنا چاہتی ہو؟ ہینئر نے پوچھا۔“

”شاید۔“

پارکنگ لٹ میں بہت کم روشنی تھی اور سب لوگ وہاں سے جا چکے تھے اور پارکنگ میں کوئی کار نہیں تھی۔ وہ جگہ بالکل پرسکون لگ رہی تھی۔ ہینئر نے گھڑی دیکھی۔ سوا گیارہ بج رہے تھے۔ ”تم گھر جانا چاہ رہے ہو؟“ انجیلا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”شاید تمہارے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔“

اس نے اپنا گلا صاف کیا اور غل ہوتے ہوئے بولا۔ ”نہیں، میں بالکل تھیک ہوں۔“

انجیلا نے اپنا ہاتھ اس کی ران پر رکھا تو ہینئر کے پورے بدن میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ اس نے اپنے بکھرے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ وہ اور انجیلا اس وقت عجم تھے۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا لیکن اس کا جسم دماغ کی نہیں مان رہا تھا اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی اور انجیلا کی طرف جھک گیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے پیچھے ہٹی اور پھر اس کے مزید قریب آگئی۔

اس کے بعد وہ کار سے باہر آگئی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اس کی جانب کا ایک جھکے سے دروازہ کھول کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم آرہے ہو؟“

پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ہینئر کو باہر کھینچ لیا اور سمندر کی طرف دوڑنے لگی۔ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس کے قدم دو تین مرتبہ لڑکھڑائے لیکن وہ سنبھل گیا۔ آگے ایک تنگ راستہ تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرمی اور اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

☆☆☆

فیڈور اور ہینیٹ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے فٹ پاتھ پر ٹہل رہے تھے۔ وہ اس طرح نمی کھینچ کر آ رہے تھے۔ اسکول میں ہونے والی پارٹی میں جانا بے کار تھا۔ وہاں وہی دوست ہوتے جن کی شکایتیں روزانہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ان لوگوں کے بغیر کچھ وقت گزارا جائے اور وہ دونوں ایسی ہی تنہائی چاہتے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر فیڈور نے ہینیٹ کو اپنی طرف کھینچا اور

اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ بھی اپنے ہاتھوں سے اس کا سر سہلانے لگی۔

”میں واقعی تمہیں پسند کرتی ہوں۔“ لڑکی نے سرگوشی میں کہا۔

”کتنی زیادہ۔“ فیڈور نے پوچھا۔

”یہ میں نہیں بتا سکتی۔“ اس نے شوشی سے کہا۔

فیڈور نے ایک بار پھر اسے گلے سے لگا یا اور وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ وہ ایک چھوٹے سے کار پارکنگ پہنچے جہاں صرف ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی لائٹس روشن تھیں اور ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک بی ایم ڈیو کار تھی۔ فیڈور نے اس میں جھانک کر دیکھا۔ ”اس میں تو کوئی نہیں ہے۔“

”یہ میری بات ہے۔“ ہینیٹ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈرائیور کہاں چلا گیا؟“

”ممکن ہے کسی لڑکی کے ساتھ ٹیلوں کے پیچھے ہو۔“ فیڈور نے اختیار بول پڑا۔

ہینیٹ کے چہرے پر سرفنی دوڑ گئی۔ فیڈور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ موسم گرما کے آغاز میں باپ نے اسے ایک

بے چارہ

خالی میدان میں اپنی ریٹائٹ کار چلانے کے لیے دیا تھی۔ ابتدا میں اسے گھیر بدلنے میں تھوڑی سی مشکل ہوئی لیکن اس نے جلد ہی اس پر قابو پا لیا۔ باپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال جب وہ امتحان پاس کرے گا تو وہ اسے ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ دلوا دے گا۔

”اس میں تو چابیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔“ اس نے انکیشن سوچ کر آن کیا اور کار اسٹارٹ ہو گئی۔ ہینیٹ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

”چلو، ایک چکر لیتے ہیں۔“

فیڈور بولا۔ ”بالکل نہیں۔“

”وگم آن فیڈور، صرف ایک منٹ کے لیے۔“

اسی پارکنگ لٹ میں ایک چکر لیں گے۔“

”میرے پاس تو لائسنس بھی نہیں ہے۔“ اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”اس وقت کوئی لائسنس نہیں مانگے گا۔“ وہ اپنا چہرہ

اس کے قریب لاتے ہوئے بولی تو وہ اس کے قریب کی گرمی سے پگھل گیا اور یورس لگا کر گاڑی پارکنگ لٹ سے باہر نکال لی۔

کفن بہ دوش

اپنی بھرتی سے جڑے ایسے حصے کہ اپنی جہاں زندگی قد مقدم پر قرض اصل دیکھنے پر مجبور ہے آخری صحت پر **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کا خاص انداز

سلطانہ

ماضی کے گم شدہ لمحات کا ایک ہی نشست میں اعادہ کرتی عبرت

اثر کہانی۔ **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم کی روانی

شیش محل

اسما قادری کے قلم سے پل پل رنگ بدلتی، دلوں کی دھڑکن تیز کرتی زندگی کے بے شمار رنگوں کو موتی ایک دہرا داستان

ماروی

وہم و گمان سے ماوراء واقعات کا تسلسل..... **محی الدین نواب**

کے خیالات کی پرواز..... مراد، مجیب اور ماروی کا کشمکش

فروری 2016 کا

دلکش شام

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

مزید

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ملک صحت و حیات کی مثال داری

”تمہیں ڈرائیونگ تو آتی ہے نا؟“ بیٹیٹ نے پوچھا۔
”یقیناً ہم دیکھتی جاؤں۔“ اس نے پہلا کیئر ڈال کر گاڑی
آگے بڑھائی۔ درختوں کی قطار کے پاس پہنچ کر اس نے
اسٹیرنگ گھمایا۔ گاڑی کا اسٹیشنن جواب تھا۔

”بہت مزہ آ رہا ہے۔“ بیٹیٹ خوش ہوتے ہوئے
بولی۔ ”بس یونہی چلاتے رہو۔“

فیڈور کو خود بھی بہت مزہ آ رہا تھا۔ ایک قیمتی کار اور پہلو
میں خوب صورت لڑکی۔ ایسے مواقع زندگی میں بہت کم ملتے
ہیں۔ پھر کیوں نہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس نے بیٹیٹ
کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اس کی آنکھیں خوشی سے
چمک رہی تھیں۔

”دو منٹ کے بعد وہ مرکزی شاہراہ پر آگئے۔ فیڈور نے
کہا۔“ بہتر ہے کہ ہم واپس چلیں۔ مجھے گاڑی موڑنے کے
لیے کوئی جگہ دیکھنی چاہیے۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی واپس
جانب کر کے انڈیکسٹر آن کر دیا۔ ذرا سا آگے گاؤں جانے
کے لیے ایک موڑ تھا لیکن وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔
وہاں ٹریفک پولیس ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ ان سے دور ہی رہا
جائے۔ آگے ایک موڑ تھا جہاں سے وہ یوٹرن لے سکتا تھا۔
اس نے رفتار آہستہ کی لیکن عین اس وقت عقب میں ایک
بارن کی آواز سنائی دی۔ وہ ذرا سا اچھلا۔ عقب میں ایک
کنورٹبل کا انجن غرا رہا تھا اور اس میں دوڑ کے سوار تھے۔

بیٹیٹ نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ اتارا، اور
چلاتے ہوئے بولی۔ ”کینیٹ۔“

فیڈور کی ناگہان پکپکان لگیں اور اس کی ہتھیلیاں پسے
سے تر ہوئیں۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ پھسلنے لگے۔

”ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“ بیٹیٹ غصے سے بولی۔

فیڈور نے سوچا کہ شاید وہ اسے متاثر نہیں کر سکا۔ اس
نے بے دلی سے سوچا پھر بڑی احتیاط سے گاڑی موڑ لی اور
گاڑی کو پہلے گیزر میں ڈالے گا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک
زوردار آواز آئی اور انجن بند ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ بیٹیٹ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے دوبارہ جانی
گھمائی تو گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ اس نے پہلا کیئر ڈال کر گاڑی
سے پاؤں ہٹا لیا۔ اچانک ہی پیچھے سے تیز روشنی پڑی۔
گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور زوردار گری آواز آئی اور وہ دونوں
اپنی جگہ پر جم کر رہ گئے۔

فیڈور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ گاڑی کو کس طرح
پارکنگ لائٹ لے کر واپس جائے۔ بیٹیٹ اس کی کوئی مدد نہیں

کر سکتی تھی بلکہ وہ روئے جا رہی تھی۔

”وہ بہت تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔“ فیڈور نے اپنے
آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے نہیں دیکھ سکا اور
اچانک ہی اس نے گاڑی کو ٹکر ماری۔“

وہ جیسے تیسے گاڑی کو پارکنگ لائٹ میں اس جگہ لے آیا
جہاں وہ پہلے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال
کر اسٹیرنگ صاف کیا پھر وہ کار سے باہر آ گیا لیکن بیٹیٹ
اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ گرمی کے باوجود اس پر پکپکاہٹ طاری
ہوئی۔

”باہر آ جاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ
کسی وقت بھی واپس آ سکتے ہیں۔“ فیڈور نے کہا پھر وہ محوم کر
کار کی دوسری جانب گیا اور دروازہ کھول کر بیٹیٹ کا بازو پکچھے
لگا۔

”ہمیں کچھ کرنا چاہیے تھا۔“ وہ تاک میں سے آواز
نکالتے ہوئے بولی۔

”تم باہل ہو گئی ہو۔“ فیڈور نے فنی میں سر ہلاتے
ہوئے کہا۔ ”کیا تم تصور کر سکتی ہو کہ ہم کس مشکل میں
ہوئے؟“

”لیکن ممکن ہے۔۔۔۔۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔

”بالکل نہیں۔“ اسے ہلکی سی چوٹ آئی ہوگی۔ اچھی بات
یہ ہے کہ اس نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ٹھیک ہی ہوگا، مجھ
پر بھروسہ رکھ لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم کار سے اتر کر اسے
دیکھتے اور اس معاملے میں ملوث ہو جاتے۔“

☆☆☆

وہ دونوں اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے کبھی الگ
نہ ہونا چاہتے ہوں۔ ہینز اور انجیلا ڈمگاتے قدموں سے کار کی
طرف آئے۔ کار کی ہیڈ لائٹ روشن تھیں اور ڈرائیور کی طرف
کا دروازہ پورا کھلا تھا۔ ہینز ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس
نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا لیکن کار کی چابیاں نہیں
تھیں۔ وہ تیزی سے کار کی طرف لپکا۔ چابیاں انجیٹن میں لگی
ہوئی تھیں۔

”کیا کوئی گڑبڑ ہے؟“ انجیلا نے قریب آ کر پوچھا۔ وہ
کار سے باہر آ گیا اور اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں ڈال
دیے۔ خاموشی کا ایک لمحہ آیا اور گزر گیا۔ وہ انجیلا سے مستقبل
کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن فی الوقت یہ مناسب
نہیں تھا۔ وہ کار کی طرف جھکا اور اس کا سیدھا ہاتھ بوٹ پر
گیا۔ بڑی عجیب بات تھی کہ انجن ابھی تک گرم تھا۔ شاید گرمی
کی وجہ سے اسے ششہا ہونے میں زیادہ وقت لگے۔

”ہمیں اب چلنا چاہیے۔“ ہینز نے کہا اور انجیلا نے تائید
میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد انہوں نے ایوبلیس
کے سائرن کی آواز سنی۔ اپنے گھر سے سو میٹر کے فاصلے پر
انجیلا نے کہا کہ وہ یہیں اتر جاتی ہے۔ ہینز نے اسے اپنی
طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن انجیلا نے اسے روک دیا اور
بولی۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، انجیلا دروازہ کھول کر باہر جا
چکی تھی۔ پانچ منٹ بعد وہ بھی اپنے گھر پہنچ گیا۔ بظاہر یہی لگ
رہا تھا کہ اس کی بیوی میرین سوچتی ہے۔ اس نے اپنے لیے
دسلی کا ایک گلاس بنایا اور دیریں پر چلا گیا اور آنکھیں بند کر کے
انجیلا کے تصور میں گھوما۔ وہ ابھی تک اس کی قربت کے سحر
میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے گلاس خالی کیا اور شاور لینے کے بعد
خاموشی سے اپنے بستر پر چلا گیا۔ میرین نے کوئی حرکت نہیں
کی، پانچ منٹ بعد اس کی آواز ابھری۔ ”ذیر ہو گئی۔“

”ہاں، راستے میں ایک بار میں رک گیا تھا۔“ اسے یہ
بہانہ غیر ضروری لگا لیکن اس کے ذہن میں یہی بات آ سکتی تھی۔
”جیڑ کیا ہے؟“

”ہاں وہ ٹھیک ہے۔“ ہینز نے آنکھیں بند کرتے
ہوئے کہا۔ ”شب بخیر۔“

☆☆☆

فیڈور کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے دیکھا کہ
اسکرین پر بیٹیٹ کا نام آ رہا تھا۔
”تم نے کچھ سنا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”اس موٹر بائیک والے کی بات کر رہی ہو۔ ابھی کچھ
معلوم نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ سو موٹار کے اخبار سے ہی کچھ
پتا چل سکے گا۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔“
بیٹیٹ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”پولیس کے پاس، وہ کیوں؟“ فیڈور چونکتے ہوئے
بولا۔

”ہماری گاڑی سے اس کی ٹکر ہوئی ہے فیڈور اور یہ جرم
ہے۔“

”اس نے ہمیں مگر ماری، ہم نے نہیں۔“ اگر ہم ایٹمانہ
بندر تھیں تو کبھی کوئی نہیں جان سکے گا کہ اس کار میں ہم دونوں
تھے۔ امکان یہی ہے کہ اس موٹر سائیکل سوار نے ہمیں نہیں
دیکھا ہوگا۔ اس لیے وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔“

کچھ دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا پھر
بیٹیٹ نے پوچھا۔ ”کیا آج ہم نہیں مل سکتے ہیں؟“

بے چارہ

”مجھے ہوم ورک کرنا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اور میری ماما
چاہتی ہیں کہ سہ پہر میں ان کے ساتھ مانی کے پاس جاؤں۔“
اچانک ہی کچل چکی اور چند لمحوں میں آسمان بادلوں
سے بھر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ فیڈور نے
کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اتنی تیز بارش ہو رہی تھی کہ سڑک کے
پارمکانات بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ اب سو موٹار کو اسکول میں ملاقات ہو
گی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد بیٹیٹ نے پھر اسے فون کے ذریعے
پیغام بھیجا۔ ”ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔“

اس نے جوابی پیغام میں کہا۔ ”اس بات کو بھول جاؤ اور
مجھ پر بھروسہ کرو۔“

☆☆☆

ہینز نے انجیلا کو فون کرنے کے لیے کئی بار رسیو اٹھایا
لیکن ہر مرتبہ نمبر ڈائل کے بغیر واپس کر ڈیل پر رکھ دیا۔ وہ
جانتا تھا کہ جو کچھ ہوا، وہ محض ایک رات کا ملاپ تھا۔ اسے یاد تو
رکھا جاتا ہے لیکن بار بار دہرائنا ممکن نہیں۔ اسے امید تھی کہ وہ
بھی اس رات کو یاد رکھے گی لیکن یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔
میرین بچن میں مصروف تھی۔ ہینز نے اپنے دوست بیٹر کو فون
کیا اور جلدی جلدی اسے سارا واقعہ سنانے کے بعد کہا۔ ”میں
نے میرین کو یہی بتایا ہے کہ تمہارے ساتھ تھا۔“

”گو یا مجھے جائے وقوعہ سے تمہاری عدم موجودگی کی
شہادت دینا ہوگی۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”مسٹر ہینز۔“ اس کی ٹیکر میزری نے انٹر کام پر کہا۔
”پولیس کا فون ہے۔ کیا تم ابھی بات کر سکتے ہو یا انہیں کہہ
دوں کہ وہ بعد میں فون کریں۔“

”مجھے لائن دو۔ ابھی بات کر لیتا ہوں۔“

ہلکی سی کلک کے بعد دوسری جانب سے ایک بھاری
مردانہ آواز سنائی دی۔ ”میں جان کمر بول رہا ہوں۔ کیا میں
ہینز برگ مین سے مخاطب ہوں۔“

”میں ہینز برگ مین ہی ہوں۔ بولو کیا بات ہے؟“

”مسٹر برگ مین، میرا تعلق پولیس سے ہے اور میں
ایک نظر تمہاری کار دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میری کار؟ کیوں؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”میں آدھے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

جان کمر نے مزید کوئی بات کے بغیر فون بند کر دیا۔
ہینز کے ذہن میں پہلی بات یہی آئی کہ کار میں انجیلا

جنوری 2016ء کے دلکش اور عنایتوں سے بھرپور پاکیزہ کے ساتھ سال نو کا شاندار استقبال



پاکیزہ

ماہنامہ

نگہت سیما اور در ثمن بلال کے دل گداز ناولوں کی اگلی اقساط

قیصرہ حیات نے آخری امید میں روشن کیے امیدوں کے دیے

نایاب جیلانی کا دلنشین مٹی ناول دیار صبح کے اجالوں میں

ناہید سلطانہ اختر کی ایک اور خوب صورت تحریر تقدیر، شینہ گل، سعدیہ عزیز آفریدی اور سمیرا یونس ہارون کی خصوصی کاوشیں

پودوں کے بارے میں معلومات دیتی ہما بیگ کی خصوصی تحریر.....

نامور مصنفہ سیما یاسمین مجتبیٰ سے بھرپور ملاقات

اختر شجاعت اور

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

کے روح پرور اسلامی مضامین

اس کی علامت

نامور رائٹرز..... جیسے ام ثمامہ، نزہت حبیب، ہاجرہ ریحان،

سیما بنت عاصم، ندا حسنین وغیرہ کی بے انتہا دل پرز تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ تفصیلی معلومات..... منت مضمین اور دیگر تعمیری اور اصلاحی سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

ایک موٹر سائیکل سوار کار سے ٹکرا گیا۔ اسے شدید چوٹیں آئیں۔ اس لیے ہم اس علاقے کی تمام لی ایم ڈیو کارڈوں کو چیک کر رہے ہیں۔

میتز کچھ نہیں بولا۔ وہ ابھی تک کبیر کی بات نہیں سمجھ پایا تھا۔

☆☆☆

بچ کے وقت فیڈر اور بینیف کی ملاقات ہوئی تو وہ بولی۔ ”میں نے لی وی پر یہ خبر دیکھی ہے۔ ایک چوبیس سالہ لڑکا وہ موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ اسپتال میں ہے اور اسے بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔ یہ سب ہماری غلطی سے ہوا۔“

”اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں ہے۔“ فیڈر نے کہا۔

”ہماری کار کی رفتار برائے نام تھی اور تمام لائٹس مل رہی تھیں۔ اس نے ہمیں ٹکرائی، یہ یونیورسٹی کی غلطی ہے۔“

”اگر ہم وہاں نہ جاتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔“ بینیف نے کہا۔

”لیکن اس سے ہماری غلطی تو ظاہر نہیں ہوتی۔“ اس نے تصوری آنکھ سے دیکھا کہ وہ کار سے اتر کر گیا ہے۔ وہ لڑکا زخمی حالت میں سڑک پر پڑا ہوا تھا اور دس میٹر کے فاصلے پر اس کی موٹر سائیکل کا پہیہ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ اگر وہ مر گیا تو وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور زندہ رہا تو کوئی نہ کوئی فون کر کے ایسویلیس اور پولیس کو بلا لے گا۔ اوہ میرے خدا، پولیس۔ اگر اس کے والدین کو معلوم ہو گیا تو وہ اسے مار ڈالیں گے۔

”وہ بے وقوف انتہائی تیز رفتاری سے بائیک چلا رہا تھا۔“

”لیکن۔“ بینیف اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔“

فیڈر نے دیکھا کہ بینیف کی بہترین دوست دیویان ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بینیف کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں وہاں سے چل دیے۔

دوسرے دن پولیس آفیسر کبیر نے میتز کو مزید تحقیقات کے لیے پولیس اسٹیشن بلا دیا۔ ایک نوجوان آفیسر اسے دفتر واپس چھوڑنے آیا۔ میتز نے اپنی سیکرٹری کم کو بتا دیا کہ وہ ایک میٹنگ میں مصروف ہے لہذا اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اس نے اپنا سیل فون بھی بند کر دیا۔ پھر اس نے میٹنگ کی کار نکالی اور کئی گھنٹے تک بے مقصد ڈرائیونگ کرتا رہا کیونکہ اس کی اپنی کار پولیس اسٹیشن میں بندھی۔ ساری دوپہر بارش ہوتی رہی۔ اس نے گاڑی ایک کینے کے سامنے روکی، اپنے لیے کافی اور سیڈھوچ کا آرڈر دیا اور اپنے بکھرے ہوئے خیالات

کی موجودگی کی کچھ نشانیاں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اس کے بالوں کا گچھا یا پر فیم کی خوشبو وغیرہ۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا پارکنگ لائٹ تک گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر پتھر میتز پر ہاتھ پھیرا اور کچھ سوچنے کی کوشش کی لیکن اسے ایسی کوئی علامت نہیں نظر آئی پھر اس نے کار کے گرد ایک چکر لگایا تو اسے ایک بڑا سا ڈینٹ اور پتھر سائڈ کے عقبی حصے میں گہری خراشیں نظر آئیں جبکہ دایمیں جانب پیچھے کی لائٹ بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے کار کو کسی نے پیچھے سے ٹکرایا تھی لیکن کہاں؟ اس پارکنگ لائٹ میں تو یہ ممکن نہیں۔ گھر میں وہ اپنی گاڑی پورچ میں کھڑی کرتا ہے اور کل وہ پورے دن نہیں گھبرا گیا۔ پرسوں البتہ اس نے گاڑی ضرور چلائی تھی لیکن یہ کب ہوا؟ کیا پولیس یہی معلوم کرنے کے لیے آ رہی ہے؟ اس طرح کے کئی سوالات اس کے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔

دفتر میں واپس آکر وہ اپنی میز پر بیٹھا اور شاپنگ سینٹر کی فائل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد سیکرٹری نے اسے بتایا کہ مسٹر کبیر استقبالیہ پر اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

”تم سب ل کر خوشی ہوئی میتز برگ مین۔“ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہ ہم پہلے کار دیکھ لیں۔“

وہ دونوں پارکنگ گئے۔ کبیر نے ٹھوم پھر کر لی ایم ڈیو کا جائزہ لیا اور ڈینٹ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ کیسے لگا؟“

میتز نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”لگتا ہے کہ کسی نے اس وقت ٹکرائی جب گاڑی کہیں پارک ہوئی ہوگی۔ میں نے بھی ابھی ہی دیکھا ہے۔“

کبیر نے اس جگہ اگلی پھیری جہاں خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور بولا۔ ”لگتا ہے کہ یہ زیادہ پرانی نہیں ہیں۔“

یوندا باندی شروع ہونے لگی تو میتز نے کہا۔ ”ہمیں اندر جانا چاہیے۔“

کبیر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور بولا۔ ”تم ہفتے کے روز نصف شب کے قریب کلب اسٹریٹ سے تو نہیں گزرے تھے؟“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کبیر ہا ہے لیکن ضرور کوئی سنجیدہ بات ہے۔ پولیس محض چند خراشیں دیکھنے کے لیے کسی کے دروازے پر نہیں آتی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہفتے کے روز؟“

”ہاں، ہفتے کی شب اس علاقے سے ایک کار سٹ روئی سے گزر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ڈرائیور کسی کی تلاش ہے۔ ایک عینی شاہد کا کہنا ہے کہ وہ لی ایم ڈیو تھی۔ عین اس وقت

کو جمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

سازے چار بجے وہ وہیں دفتر آیا تو سیکریٹری نے اسے مطلع کیا کہ مشرک اس بات کرتا جا رہے ہیں۔ لہذا وہ انہیں فون کر لے۔ کمر نے اسے پولیس اسٹیشن آنے کے لیے کہا تاکہ اس سلسلے میں مزید بات کی جاسکے۔ اس بار کمر نے اسے گاڑی کی پیشکش نہیں کی۔ مجبوراً ہینر کو گیس کے ذریعے جانا پڑا۔ اس مرتبہ کمر کے پاس ایک اور شخص بھی موجود تھا جس نے اپنا تعارف مولڈر کہہ کر کروایا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی مطلب کی بات پر آگئے اور ہینر کو بتایا گیا کہ تباہ شدہ موٹر سائیکل پر رنگ کے نشانات بی ایم ڈبلیو کے رنگ سے ملے ہیں۔

”لیکن اس رنگ کی تو کوئی بی ایم ڈبلیو گاڑیاں شہر میں ہوں گی۔“ ہینر نے کہا۔

”یہ رنگ کے دھبے تمہاری کار سے ہی لگے ہیں اور یہ مت بھولو کہ تمہاری کار پر ڈینٹ اور خراشیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔“

ہینر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کسی نے میری کار کو اس وقت ٹکر ماری جب یہ کہیں کھڑی ہوئی ہوگی۔“

”یقیناً یہ واقعہ حال ہی میں پیش آیا ہے۔ حیرت ہے کہ تم نے آج سے پہلے اس کا نوٹس نہیں لیا؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ جتنے کے روز نصف شب کے قریب تم کہاں تھے؟“

”ایک پرانے دوست پیٹر لیکٹر کے پاس۔“

انہوں نے پیٹر کا نام لکھا اور اس کا پتہ فون نمبر پوچھنے لگے۔ ہینر نے سوچا کہ پولیس اسٹیشن سے نکلنے ہی اسے پیٹر کو فون کرنا ہوگا پھر اسے احساس ہوا کہ اگر اس پر شک کیا جا رہا ہے تو شاید وہ اسے نہ جانے دیں۔ ایسی صورت میں اسے میرین کو فون کرنا ہوگا کہ وہ اس کے لیے پکڑے، تو تھ پیسٹ اور برش لیتی آئے۔

”گویا تم سٹی ہال کی تقریب ختم ہونے کے بعد اپنے دوست سے ملنے گئے تھے؟“ لکھا تھا کہ وہ پورا ہوم ورک کر چکے تھے۔

”ہاں، وہ میرا پرانا دوست ہے۔ اس کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور اب وہ تنہا ہے۔“

”اور وہ پچھلے اسٹریٹ پر رہتا ہے۔“ کمر نے ہینر کو معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ جس جگہ یہ حادثہ ہوا تھا۔ وہ راستے میں پڑی تھی۔

☆☆☆

”کیا کوئی گڑبڑ ہے؟“ میرین نے پوچھا۔ اس وقت وہ اپنی پسندیدہ آرام کرسی میں بیٹھا دھسکی کے ٹھونٹ لے رہا تھا۔

”نہیں، کچھ نہیں۔“

”تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ لگتا ہے کہ کوئی بات تمہارے دماغ میں گردش کر رہی ہے۔“

اس نے میرین کو بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے کہ کل یا پرسوں یہ خبر اخبار میں آجائے چنانچہ اس نے میرین کو بھی وہی کہانی سنا دی جو وہ پولیس کو بتا چکا تھا کہ وہ سٹی ہال کی تقریب سے فارغ ہو کر پیٹر سے ملنے گیا اور وہاں سے کمر آگیا اور جہاں تک اس کے علم میں ہے، اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا لیکن یوں لگتا ہے کہ کسی موٹر سائیکل سوار نے کہیں میری کار کو ٹکر ماری ہے اور اب وہ انتہائی نگہداشت کے پونٹ میں ہے۔

”یہ واقعہ کب پیش آیا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن ایسا ہی ہوا ہے۔“ اور اچانک ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ سب کیسے ہوا ہوگا۔ یوں لگا جیسے کوئی نا دیدہ شاہد اس کے کان میں سرگوشی کر رہا ہے۔ جب وہ انجیلا کے ساتھ سٹیوں کی آڑ میں مصروف تھا تو کوئی شخص اس کی کار لے کر سیر کرنے چلا گیا اور راستے میں کہیں موٹر سائیکل نے اس کی گاڑی کو ٹکر ماری۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ وہیں اپنی کار کے پاس آیا تو اس کا انجیلا خاصا گرم تھا۔ جس کسی نے بھی یہ حرکت کی تھی، وہ اس امید پر کار کو وہاں ہی جگہ چھوڑ کر چلا گیا کہ سارا الزام کار کے مالک پر آئے گا۔

”خدا اسے غارت کرے۔“ وہ اپنی عقلی پڑمکارتے ہوئے بولا لیکن میرین کا کہنا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔

”میں اس موضوع پر بات کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔“ اس نے میرین سے کہا اور کھانا کھا کر اپنے ہوم آفس میں چلا گیا۔ میرین اس کے لیے کافی بنا کر لائی۔ کافی ختم کرنے کے بعد اس نے پیٹر کو فون کیا جس نے بتایا کہ وہ خود ہی اسے فون کرنے والا تھا کیونکہ پولیس والے ابھی ابھی اس کے پاس سے گئے ہیں۔

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں نے تمہاری بات کی تائید کر دی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تم نے یہ کہا پولیس کے لیے گھڑی ہوگی۔“

”ہاں، دراصل میں نے میرین کو یہی بتایا تھا کہ وہ گھر آؤں گا کیونکہ مجھے پیٹر سے ملنے جانا ہے، تم تو اسے

جانے ہو۔“

”لیکن پولیس کیوں آئی تھی؟“ پیٹر نے پوچھا۔ ”کیا تم کسی مشکل میں ہو؟“

ہینر نے اسے سب کچھ سچ بتا دیا کہ جب وہ ساحل پر کسی کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا تھا تو کوئی شخص اس کی کار لے کر چلا گیا اور ایک حادثے میں موٹر سائیکل سوار زخمی ہو گیا۔ ”اور یہ واقعہ اس جگہ پیش آیا جو تمہارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے جبکہ میں تمہارے پاس نہیں آیا تھا۔“

”اور اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ تم جتنے کی شب میرے پاس نہیں آئے تھے تو میرے ساتھ کیا ہوگا۔ یہی کہ میں نے پولیس سے جھوٹ بولا تاکہ جانے حادثہ سے تمہاری غیر موجودگی ثابت کی جاسکے۔“ ہینر نے اس کی آواز میں برقی محسوس کی۔ ”اس طرح تو میں بھی بعد از جرم اعانت کا مرتکب ٹھہرایا جاؤں گا۔“

”امتحان بات میں تم کرو۔ تمہیں نہیں معلوم تھا کہ اس کا حادثے سے کوئی تعلق ہے۔ تم نے سوچا ہوگا کہ میرین کی ناراضی سے بچانے کے لیے میری مدد کرے ہو۔“

”لیکن اب میں جھوٹا سمجھا جاؤں گا۔“

ہینر نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے اور کیا سوچے۔ ساری باتیں اس کے دماغ میں گڈھڑ ہورہی تھیں۔ اس کے لیے یہ دوا بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اپنے پرانے دوست سے کہا۔ ”تم وہی کرو جو تمہیں کرنا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھوڑی دیر بعد اس نے انجیلا کا فون نمبر تلاش کرنا شروع کیا۔ جتنے کی رات جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی ابھار نہیں ہوتا چاہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس حادثے کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو نکال بچاتا تو نہ جانے اسے کتنے برس جیل میں رہنا پڑے۔ اب صرف ایک شخص ہی اس کی مدد کر سکتا تھا جس نے اس کی کار چرائی تھی لیکن وہ بھی اس چوری کا اقرار نہیں کرے گا۔ ہینر کو اس بات کا پورا یقین تھا۔

میرین کو بھی جلد یا بدیر حقیقت کا پتا چل جاتا اور وہ یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے جتنے چلائے سے نہیں روکے گا اور جب تک اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا، وہ ایک لفظ بھی نہیں کہے گا۔ اس نے دھسکی کی بوتل نکالی۔ اپنے لیے ایک گلاس بھرا۔ نیچے جا کر برف نکالی۔ اس دوران میرین اسے نہیں نظر نہیں آئی۔ دھسکی کے چند

بے چارے گھونٹ لینے کے بعد اس میں انجیلا کو فون کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔

”ہیلو۔“ ایک فون عمر لڑکے کی آواز سنائی دی۔

”میرا نام ہینر برگ مین ہے اور میں تمہاری ماں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”میں اسے بلاتا ہوں۔“

وہ تصویر کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ لڑکا اپنی ماں کے پاس کارڈ پلے فون لے کر گیا ہے۔ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ ”مہربانانوں، کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔“

وہ نہیں سن سکا کہ جواب میں انجیلا نے کیا کہا البتہ اسے لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ”کیا تم دوبارہ اپنا نام بتانا پسند کرو گے؟“

”ہینر برگ مین۔ مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

”ہینر برگ مین۔“ لڑکے نے دہرایا۔ ”وہ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔“

ایک منٹ بعد اسے انجیلا کی آواز سنائی دی۔ ”میں نہا رہی تھی۔ کھوکیا بات ہے؟“

”وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ نہا رہی تھی تو اس نے یہ بات اسے کیوں بتائی، اس نے اسے حادثے کے بارے میں بتایا لیکن اسے یوں لگا جیسے اسے خبر مل چکی ہے۔

”میں پولیس کے پاس جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ساتھ جائیں اور انہیں سچ بتا دیں۔“

”میں نہیں جانتی کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو۔“ اس نے زبردستی قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ ساحل کے کنارے خالی پارکنگ لاٹ، تم سمندر کی طرف بھاگیں، میں نے تمہارا تعاقب کیا اور پھر۔۔۔۔“

”یقیناً تم نے کوئی خوب صورت خواب دیکھا ہے اور پھر سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم نے وہاں کچھ کیا تھا؟“

”ہاں، ہم نے بہت کچھ کیا تھا۔“

”یہ تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔“

”بہت ہو چکا انجیلا۔ اب یہ مذاق ختم کرو، ہمیں۔۔۔۔“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے انجیلا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر دیکھتا رہا پھر پوری قوت سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”گشتی!“

☆ ☆ ☆

دراز دست

روبینہ رشید

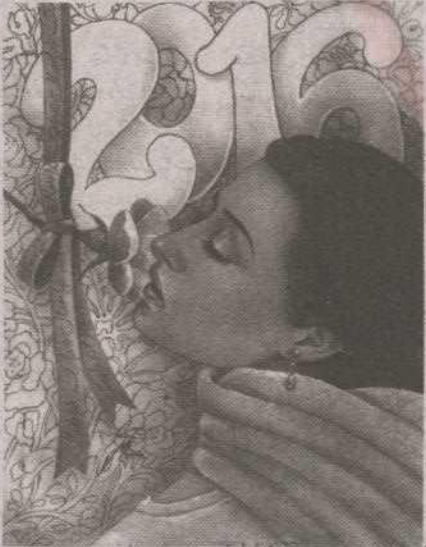
خدا کی طرف سے برائی کبھی نہیں آتی... وہ ہمیں عقل اور علم کے دریا سے اسی لیے سرفراز کرتا ہے کہ ہم غلطیوں اور ہلاکت خیز گڑھوں سے بچتے رہیں... اس کے باوجود عقل فہم، ذی ہوش نادان انسان ایسی راہوں کا انتخاب کر بیٹھتا ہے... جس کا نتیجہ صرف اور صرف تباہی کی صورت میں نکلتا ہے... دوستی کے خوب صورت رشتے کی آبیاری خلوص نیت... اپنائیت قربانی اور جاں شناسی سے کی جاتی ہے... تبھی یہ بندھن اتوٹ بندھن میں بندھتا ہے... ایسی ہی تین دوستوں کی کہانی جو یک جان دو قالب تھیں... ایک ہی ساز پر تینوں کے دل دھڑکتے تھے... مگر اچانک ہی ان کے جسم و جاں کا تعلق درہم برہم ہو گیا... وہ ایک دوسرے سے جدا کر دی گئیں... تار تار لمحوں کی زخم زخم اور دریدہ کہانی...

جنہوں... رشتوں اور نفرتوں کی زنجیر سے بندھی ایک قاتل کہانی...

آ رہا تھا۔

کمر انہم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ لڑکی کرے کے سین درمیان کھڑی تھی۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ روشن آنکھیں، سنہری رنگت اور چمکتا ہوا چہرہ اس لکڑی روشنی میں بھی نمایاں نظر دھیرے قدم اٹھاتی صوفے کے قریب بیٹھی۔ اس کے



اور پھر اس سے ایک ٹیڈٹ بھی ہو گیا۔

”یہ حادثہ اس کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا۔“ بینیت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا لیکن اس کی ماں نے کسی ان کی کر دی اور بولی۔

”اس کے بعد وہ پولیس کو اطلاع دے یا ایبویٹس کو فون کے بغیر جانے حادثہ سے فرار ہو گیا۔ میں نہیں جانتی کہ کون اس جرم کی کیا سزا تجویز کرے گا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ تم اور فیڈور بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس بے گناہ آدمی پر الزام ڈال دیا جائے۔“

”بیاری لڑکی، زندگی میں سب کچھ صحیح نہیں ہوتا۔ کیا یہ جائز ہوگا کہ فیڈور کا مستقبل صرف اس لیے تباہ ہو جائے کہ اس اچھے موٹر سائیکل سوار نے یہ دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ فیڈور کس طرف جا رہا تھا اور اس کی کار سے ٹکرا گیا۔“

بینیت نے قائلین پر نگاہیں جمادیں جیسے اسے امید ہو کہ فیڈور کی ماں کے سوال کا جواب وہاں لکھا ہوگا۔

”ہاں، یہی مناسب رہے گا کہ پولیس کو کچھ نہ بتایا جائے۔“ بینیت نے آہستہ سے کہا۔ فیڈور کی ماں نے جو تصور اسے دکھایا وہ بڑی بھیاں تکھی۔ اگر پولیس کو بتا دیا جاتا تو فیڈور پر ایک نہیں کسی الزام لگ جاتا۔ کار چوری کا الزام۔ بغیر لائسنس گاڑی چلانے کا الزام۔ پولیس کو اطلاع دے یا ایبویٹس کو فون کے بغیر جانے وقوعہ سے بھاگ جانے کا الزام۔ یہ سارے الزامات بہت سنگین تھے اور فیڈور کا مستقبل تباہ ہو جاتا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اسے کھوتا نہیں چاہتی تھی چنانچہ فیڈور کی ماں کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر گفتگو کا رخ دوسرے موضوعات کی طرف مڑ گیا۔ وہ اسکول کی باتیں کرتے رہے۔ نیا سال ابھی شروع ہوا تھا لیکن پڑھائی زور و شور سے ہو رہی تھی۔ وہ اپنے پروفیشنل اور اسائنمنٹ کی باتیں کرنے لگے۔ ساڑھے چھ بجے بینیت نے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو کافی پرسکون اور مطمئن تھی۔ اس نے فیڈور کی ماں سے کہا۔ ”ہم سے باتیں کرنے کا شکریہ میڈم۔“

”میڈم۔“ فیڈور کی ماں چونکتے ہوئے بولی۔ ”جیہیں مجھ سے اتنا پُر تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے صرف انجیلا کہہ سکتی ہو۔“

☆☆☆

آخری پیریز ختم ہونے کے بعد فیڈور اور بینیت کی ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اخبار میں خبر دیکھی؟“

فیڈور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بینیت نے کہا۔ ”انہوں نے اس بے چارے کو گرفتار کر لیا ہے جبکہ اس نے کچھ نہیں کیا۔“

”ہم نے بھی کچھ نہیں کیا۔“ فیڈور نے کہا۔

بینیت نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور بولی۔

”لیکن ہم اس کی کار لے گئے تھے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو...“

”یہ کیا تم نے اگر گرگڑا رکھی ہے۔ میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔“ فیڈور نے برہمی سے کہا۔

”ہمیں پولیس کو بتانا چاہیے۔ میں رات کو سو نہیں سکتی اور اسی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ وہ بے چارہ جیل میں ہے جبکہ وہ بالکل بے قصور ہے۔“ اس نے فیڈور کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں چاہو گے کہ وہ یہ سزا بھگتے۔“

”تمہارا خیال ہے کہ میں جیل چلا جاؤں۔“

”تم جیل نہیں جاؤ گے اگر تم پولیس کو بتا دو کہ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا تھا اور اس میں کسی کی غلطی تھی۔“

”تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

”میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔“ بینیت نے اعتراف کیا پھر اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ ”ہم تمہاری مما سے بات کر سکتے ہیں۔ وہ تمام قانونی معاملات سے واقف ہیں۔ چلو ان سے کہتے ہیں۔“

فیڈور کچھ ہچکچا رہا تھا لیکن بینیت نے کچھ اس طرح اسے دیکھا کہ اسے اس کی بات ماننا پڑی۔ وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ وہ شام چھ بجے تک گھر آجائے۔“

☆☆☆

”نہیں، میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کروں گی۔“

فیڈور کی ماں نے کہا۔

”کیا تم سچ بتانا نہیں چاہتیں؟“ بینیت حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں نہیں جانتی کہ یہ کوئی مناسب بات ہوگی۔ خاص طور پر فیڈور کے لیے۔ اس کے پاس تو لائسنس بھی نہیں ہے اور تم شائع عام پرسن کر رہے تھے۔ یہ قانون کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ تم جانتی ہو کہ بغیر لائسنس ڈرائیونگ کرنا جرم ہے

وہ سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

”اسی لیے کہتی ہوں حواسوں میں رہا کرو۔“
”اب تو ہو گیا نا... میں ابھی جا کر لے آتی ہوں۔“
”مغہرہ... اب اتنی شام گئے اکیلی جاؤ گی کیا؟“
تھوڑی دیر میں احمر آجائے تو اس کے ساتھ چلی جانا۔
”مگر ما...“

”بس آنے ہی والا ہو گا وہ۔ بحث مت کرو، میں اس وقت تمہیں اکیلے بیٹھنے سے رہی۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو۔“ وہ حتی انداز میں بولی۔

زویا ہانگ کر سانس نہ رکھی پر بیٹھ گئی۔ احمر اس کا بڑا بھائی تھا۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور یہ اس کی واپسی کا وقت ہی تھا۔

چند لمحوں بعد ہی باہر سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ زویا اچھل کر کھڑی ہوئی اور باہر کی جانب چلی۔

”ارے زویا، اسے اندر تو آنے دو۔ ہاتھ منہ دھو لے کچھ کھالی لے۔“ رخشندہ کہتی رہ گئیں۔

”نہیں ماما... تو نا تم... کل ٹیسٹ ہے تیاری بھی کرنی ہے۔ ہم آتے ہیں ابھی۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ چند لمحوں میں عینی کے گھر پہنچ گئے تھے۔ موٹر سائیکل رکتے ہی وہ تیزی سے اتری۔ عینی کے گھر کا باہر کا دروازہ معمول کے خلاف صرف کھلا ہوا تھا۔ زویا نے جبرت سے دروازے کو دیکھا پھر مڑ کر بھائی کی جانب نظر ڈالی جو اسے ہی گھور رہا تھا پھر اس نے اندر قدم رکھنا چاہا۔

”رکو، میں بھی آ رہا ہوں۔“ احمر نے آخری لمحے میں فیصلہ کیا۔ ”تمہاری۔۔۔ دونوں حق سبیلیاں ہیں بھی گھر میں کہ نہیں؟ اور اگر ہیں تو آخر یہ اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟“

”آجایے بھائی۔“ زویا بولی۔ ”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“

لے پھر میں وہ چھوٹا سا پورچ عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہو گئے۔

”عینی! منشا، کہاں ہو تم دونوں؟ یہ دروازے کیوں کھلے ہیں، ماما آئی آپ کہاں ہیں؟“ زویا نے زور سے پکارا مگر اس کی صدا بیکار ثابت ہوئی۔ احمر نے اندر داخل ہو کر بلب کا سوچ دیا۔ سکوت اتنا تھا کہ گج کی ہلکی سی آواز نے بھی زویا کو ڈرا دیا تھا۔ اچانک ہونے والی روشنی کے

تھی۔ درمیان میں آنے والا میدان تو بالکل ہی سنسان پڑا تھا۔ زویا کو نہ جانے کیوں عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ وہ تیزی سے لیے لیے قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پانچ منٹ میں وہ گھر کے اندر گئی۔

”کیا ہو گیا زویا؟ اتنا ہانپ کیوں رہی ہو؟ کیا بھاگتے ہوئے آئی ہو؟“ رخشندہ نے بیٹی کو تشریش سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تیز تیز آئی ہوں ماما، ڈر لگ رہا تھا۔“ وہ پانی پیتے ہوئے بولی۔

”ڈر... وہ کیوں؟ منشا ساتھ نہیں تھی؟“ انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں ماما... وہ چھ بجے تک نکلے گی۔ میں آج جلدی آگئی ہوں نا۔“

”وہ کیوں بھلا؟“

”اس لیے کہ میری ماما کے ہاتھ میں درد ہے اور آج کھانا میں بناؤں گی۔“ وہ ماں کے گلے میں بائیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”میری پیاری بیٹی۔“ رخشندہ نے مسکرا کر اسے خود سے لپٹا لیا۔ یہ بیٹیاں بھی اللہ کی رحمت ہیں۔ بظاہر کمزور مگر کتنی بڑی طاقت... وہ سوچ کر رہ گئیں۔

”اگلے دو گھنٹے وہ بچن میں مصروف رہی تھی۔ اسے منشا اور عینی کا خیال آ رہا تھا۔ وہ دونوں مزے سے فلم دیکھ رہی ہوں گی، اس نے بچن سے نکلے ہوئے سوچا۔

”ماما! میں فرسک کا ہوم ورک کر رہی ہوں، کچھ یاد بھی کرنا ہے کل ٹیسٹ ہے اور آپ کو بتانا ہے تاکہ فرسک کی کچھ کیسی خطرناک، زہریلی سے کم نہیں ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”بہت بری بات ہے زویا، استاد کا احترام کرو گی تو ہی کچھ یاد آ گی۔“ ماں کی تنبیہ پر وہ آنکھیں گھماتے ہوئے کمرے میں محسوس گئی مگر پانچ منٹ بعد ہی دوبارہ باہر نکل آئی۔

”اب کیا ہوا؟ ہو گئی پڑھائی؟“ رخشندہ نے اسے گھورا۔

”نہیں ماما... گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”کیا ہو گیا؟“

”مجھے واپس جانا پڑے گا میں فرسک کی کتاب اور کاپی دونوں عینی کے گھر پر بھول آئی ہوں۔ اسے کام دکھانے کے لیے باہر نکالیں پھر شاید واپس رکھنا بھول گئی۔“

ہے کیپوٹر کو استعمال کرنے کے لیے۔۔۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“ عینی ہنس کر بولی۔ ”مگر مائینڈیاں تو ہیں نا، اسکول میں تو ایک کلاس بھی نہیں چھوڑ سکتے، کالج میں تو لڑکیاں جب چاہیں کلاسیں بنگ کرتی ہیں۔“

”خیر یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“ زویا نے اسے گھورا۔

”اچھا! اچھا! دادی اماں، نو لکچر... چلو فلم دیکھتے ہیں، ریسرسل تو ہوئی نا۔“

”نا بابا... تم لوگ دیکھو، مجھے آج جلدی گھر جانا ہے۔“ زویا بولی۔

”کیوں یارا ابھی تو صرف چار بجے ہیں ہم تو چھ سات بجے تک ریسرسل کرتے ہیں نا۔“ منشا بولی۔

”ہاں مگر کل امی کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اس لیے آج کھانا میں بناؤں گی۔“ زویا نے بتایا۔

”اچھا... بھگوانی بی... پھر تو تم جاؤ اور جو کچھ بنانا کل اسکول میں بھی لے کر آنا۔“ عینی بولی۔

زویا کو واقعی جلدی تھی۔ وہ چند لمحوں بعد ہی بیگ اٹھائے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

وہ تینوں بچپن کی سبیلیاں تھیں۔ پبلی جماعت سے ایک ساتھ پڑھ رہی تھیں۔ ان کے شوقی، شاعری کا پرہیز ناپسند بھی تقریباً ایک ہی جیسی تھیں۔ ان کی دوستی نے ان کے گھر والوں کو بھی تعلق کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔

عینی کے والد اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے، اس کی امی ایک بیٹی بار میں کام کرتی تھیں۔ منشا کے والد ڈاکٹر تھے۔ اس کی مائیں اور عینی جیسے جبکہ زویا دو بھائیوں کی اگلیوں بہن تھیں۔ اس کے والد تعمیراتی شعبے سے منسلک تھے اور ان کا شمار اچھے آرکیٹیکٹس میں ہوتا تھا۔

تینوں ہی ہر سال اسکول اسٹوڈنٹ ویک میں پیش پیش ہوتی تھیں۔ اس سال کے سالانہ ڈرامے میں انھیں بہترین کردار ملے تھے۔ عینی کے گھر پر ایک ملازمہ کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا اس لیے ریسرسل کے لیے اس کے گھر کا انتخاب کیا گیا تھا۔ تینوں اسکول سے ساتھ آئیں، ریسرسل اور کبھی بھار ہوم ورک بھی ساتھ ہی کر لیا کرتیں۔ پھر منشا اور زویا اپنے گھر کی راہ لیتیں۔ ان دونوں کے گھر قریب قریب تھے مگر آج زویا کو جلد لکھنا پڑا تھا۔ اس کا گھر عینی کے مکان سے آٹھ دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ اندرونی رہائی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس وقت وہاں بہت کم آمد و رفت

ہاتھوں میں کچھ تھا جسے اس نے محبت سے سینے سے لگا رکھا تھا۔ صوفے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی اور اس نے ہاتھ میں موجود چیز کو بائیں ہاتھ کی جانب رکھی گول میز پر اچھال دیا۔ وہ ایک بڑا اور خوب صورت پھول تھا جو دیکھنے میں اصلی محسوس ہو رہا تھا مگر درحقیقت اسے محل سے تیار کیا گیا تھا۔ پھول گویا ہوا میں اڑتا ہوا میز پر رکھے بڑے سے کارڈ سے لگایا جس پر بڑے بڑے حروف میں 2016ء مبارک کے حروف چک رہے تھے۔ پھول کے وزن سے وہ کارڈ زمین پر جا گرا۔ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھایا پھر گردن کو عجیب سے انداز میں گھما کر زمین پر پڑے کارڈ اور پھول کو دیکھا اور پھر اچانک ہنسا شروع ہوئی۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں دیوانہ وار حرکت کر رہی تھیں۔ مسلسل بے طرح ہنسنے کی وجہ سے اس کی گردن کی رگیں پھول ہی کی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی اور بے حس و حرکت ہوئی۔

کمرے میں یکھت گہری خاموشی چھا گئی۔ اس سکوت کو صوفے پر تشریف فرما دو رنگی ناظرین کی زوردار تالیوں نے توڑا تھا۔

”زبردست، بہت ہی اچھا... زویا قسم سے تو تو اداکارہ ہی بننا، کتنا غضب کا پر فارم کرتی ہے۔ ایسے ہی تو پھر ہر بار تجھے ہی ڈرامے کی ہیروئن نہیں بنادیتیں۔ مدعو بالا ہے تو ہماری...“ عینی صوفے سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی زمین پر گر گئی زویا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں تو بچ میں ڈری ہو گئی تھی۔“ منشا اب تک صوفے پر جچی بیٹھی تھی۔ ”لائٹ کھولو عینی۔“ وہ لڑتی آواز میں بولی۔ منشا دہلی پتلی سانولی سی لڑکی تھی۔ اس کے طبع چہرے پر ہلا کی کشش اور مصویت تھی جبکہ عینی گوری رنگت اور خوب صورت بھوری آنکھوں کی مالک تھی۔ وہ دونوں بھی زویا کی ہم عمر تھیں۔

”ڈر پوک کہیں کی۔“ زویا ہنستے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”اس بار غرائی میٹرنگ کلاس کو ہی ملے گی۔ دیکھ لیتا... یوں بھی یہ ہمارا آخری سال ہے اسکول میں۔“

”ہاں پھر تو کالج ہو گا، زبردست الف ہو گی۔“ عینی صوفے پر گرتے ہوئے بولی۔

”تو اب کیا کی ہے تیرے پاس؟“ زویا رشک بھرے لہجے میں بولی۔ ”مونا بکس اور اپنا الگ کیپوٹر بھی...“

سب کچھ تو ہے... ہماری طرح نہیں کہ بھٹل تھوڑا نا تم ملتا



اس ڈمی چوکیدار کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی انسان ادھر ضرور آئے گا..... کئی روز ہو گئے مڑے کا کھانا کھائے!

جانب بھی گہرا نظم آ رہا تھا۔ اس کا ایک پیراس کے جسم کے نیچے غیر قدرتی انداز میں مڑا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈر کر بھاگی ہو اور پھر مڑ جانے کی وجہ سے گر گئی ہو جس کے بعد شفا کا قائل نے اسے اپنا نشانہ بنایا ہو۔

احمر بجلی کی تیزی سے آگے بڑھا اور نتاشا کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ دل ہی دل میں اسے کافی عرصے سے پسند کرتا آ رہا تھا۔ اس وقت اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس کا ذہن چلا چلا کر ہر امید سے انکاری ہو رہا تھا مگر دل ٹانگیں کے ممکن ہونے کی آس لگائے ہوئے تھا۔

”یہ... یہ زندہ ہے... نتاشا زندہ ہے سانس لے رہی ہے۔ ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔“ وہ زور سے چلایا۔ پھر اس نے موبائل کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، سیل وہاں نہیں تھا۔

”زویا میرا موبائل لاؤنج میں گر گیا ہے... اسے اٹھا لاؤ۔ ہمیں فوراً ایبونیٹس کو بلانا ہے، جلدی کرو زویا فوراً فون ملاؤ...“ معنی کے لیے ہم اب کچھ نہیں کر سکتے مگر نتاشا کو بچانے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔“ وہ تیزی سے بولا۔

زویا نے جواب میں سر ہلایا اور لاؤنج کی طرف بھاگی۔ نتاشا زندہ تھی، اس خیال نے اس کے اندر طاقت سی بھردی تھی۔ پولیس اسٹیشن اور ایبونیٹس اور گھر پر فون کرنے کے بعد وہ پھر بچن کی طرف بھاگی... اسے نتاشا کو روکنا تھا۔ ہر صورت میں، معنی کے بعد وہ اسے بھی ٹھوہنے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ پھر... اچانک اس کے ذہن میں

جھماکے کے بعد جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئیں تو جو منظر اس کے سامنے تھا، اسے دیکھ کر وہ ساکت سی رہ گئی۔

سامنے رکھا کھین کا بڑا سا صوفہ اپنی جگہ سے خاصا آگے آیا ہوا تھا۔ تیوں کرسیاں زمین پر لٹکی ہوئی تھیں۔ گول میز پر کچھا کڑھائی دار میز پوش زمین پر پڑا تھا اور اس پر رکھا لیپ کرچیوں کی شکل میں بکھرا پڑا تھا۔

”یہ... یہ سب کیا ہے؟“ احمر بڑبڑایا۔ ”اور وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں بھائی...“ زویا رو ہانسی آواز میں بولی۔ ”وہ شاید اندر والے کمرے میں ہوں یا اوپر... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”تم میرے پیچھے آؤ...“ احمر بولا۔

زویا سے چلا نکلی نہیں جا رہا تھا۔ خوف کی شدید لہر نے گویا اس کے جسم کو جما سا دیا تھا۔ یہاں یقیناً کچھ بہت غلط ہوا تھا۔

احمر نے چند قدم آگے بڑھ کر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بہن کو اپنی جگہ جمادیکھ کر وہ پلٹا اور اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا۔

وہ دو قدم ہی چلے تھے کہ ایک قدرے ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا۔ وہ دونوں ہی آواز سن کر اپنی جگہ ساکت سے ہو گئے۔

”کوئی ہے...“ احمر بے ساختہ بولا۔

”معنی ہوگی... معنی... نتاشا... میں ہوں زویا اور بھائی بھی ہیں۔ کہاں ہو تم لوگ جواب دو۔“ وہ زور سے بولی۔ اس کی تیز آواز کے بعد یکدم خاموشی سی چھا گئی اور پھر کسی کے قدموں کی تیز آواز سنائی دی جیسے کوئی بھاگ رہا ہو۔ احمر اور زویا وہیں کھڑے کچھ نہ سمجھ پانے والے انداز میں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ گیٹ کے بند ہونے کی آواز نے انہیں چوکا دیا۔

”کوئی ہے باہر...“ زویا لرزتی آواز میں بولی۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ احمر اسے تقریباً کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا جبکہ احمر کو اچھی طرح یاد تھا کہ اندر آنے کے بعد اس نے دروازے پر لگا لوہے کا کھٹکا لگایا تھا۔ وہ لپک کر باہر نکلا مگر وہاں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا، وہ جو کوئی بھی تھا اسے اس علاقے کے بارے میں خاصی معلومات تھیں اور وہ لمحے بھر میں منظر سے غائب ہو چکا تھا۔

ایک خیال نے کروٹ لی، نتاشا ہی تو بتا سکتی تھی کہ یہاں آخر ہوا کیا تھا؟

☆☆☆

ایس بی جعفر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا شمار ڈپارٹمنٹ کے بہترین افسران میں ہوتا تھا۔ ایک معصوم لڑکی کے اس طرح کے بہیمانہ قتل اور دوسری کے شدید زخمی ہونے کی خبر نے اسے جھجھوڑا لایا تھا۔ وہ خود دو بیٹیوں کا باپ تھا۔

نتاشا کو اسپتال لے جایا جا چکا تھا جبکہ عینی کی لاش کو بھی ضروری فرانک مرطوں سے گزرنے کے بعد لے جایا جا رہا تھا۔

یعنی، نتاشا اور زویا کے والدین موقع وارادات پر پہنچ چکے تھے۔ نتاشا کے گھر والے تو آتے ہی اسپتال کی طرف بھاگے تھے جبکہ زویا کی والدہ عینی کی پاں کے پاس بیٹھی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر سرسبز ہواڑے بیٹھی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں کی کو جانتی ہی نہ ہوں۔ توڑی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

”آپ کو کچھ درکار ہے؟“ رشیدہ نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”میں... میں عینی کو دیکھ لوں۔ اسے سردی زیادہ لگتی ہے اور سوتے میں چادر اتار کر پیچیک دیتی ہے۔“ وہ نہایت سادگی سے بولیں۔ رشیدہ اور وہاں موجود تمام ہی افراد انہیں دیکھتے رہ گئے پھر رشیدہ کو جیسے ہوش سہا آیا۔

”کیسے بھائی... آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”میں نے کمرے میں۔“

”نہیں آپ وہاں نہیں جا سکتیں۔“ انہوں نے نرمی سے ان کے بازو تھامتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیونکہ وہاں نہیں ہے۔ وہاں پولیس ہے ان کی تحقیقات چل رہی ہیں۔“

”تو... تو پھر... میری عینی کہاں ہے؟“ وہ پریشان ہو کر بولیں۔

”میری بیٹی بہت جلدی ڈر جاتی ہے رشیدہ اتنا سادہ ہے تنہا سا اس کا... میں اس کو لے کر آئی ہوں۔“

”نہیں بھائی۔“ رشیدہ روتے ہوئے بولیں۔ ”وہ یہاں نہیں ہے وہ اپنے رب کے حضور جا چکی ہے بھائی۔ انسانوں کے درندے بن جانے کی شکایت لے کر... وہ اب نہیں ہے بھائی... نہیں ہے۔“

”رشیدہ... کیوں... کیوں کیا ایسا میری بیٹی کے ساتھ۔“ وہ اب چلا چلا کر رو رہی تھیں۔ سوال کر رہی تھیں۔ ”کیوں ہوا ایسا؟ میری بیٹی نے کسی کا کیا لگاڑا تھا؟ میرے پاس تو صرف وہ تھی نا... کیوں...؟“ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ رشیدہ اور زویا نے بمشکل انہیں بستر پر لٹایا پھر یہی طے کیا گیا کہ ان کے بھائی کے اسلام آباد سے آنے تک انہیں زویا کے گھر لے جایا جائے گا ان کی کیفیت عجیب تھی کبھی وہ سب بھول جاتیں اور عینی کی باتیں کرتیں جیسے وہ ابھی آجائے گی اور کبھی یوں تڑپ تڑپ کر روتیں کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا انسان کتنے خواب دیکھتا ہے، ارادے، منصوبے بناتا ہے یہ جانے بغیر کہ وہ ان سب کے پورے ہونے تک خود بھی پانی رہ پائے گا کہ نہیں۔ واپسی کا سفر تو طے ہے ہی صرف اس کا شیدول مسافر کے علم میں نہیں ہوتا مگر بھر کمال یہ ہے کہ جانے والا سامان پیک کرنا تک بھول جاتا ہے۔

یعنی کے ماموں اسلام آباد سے آگئے تھے اور پوسٹ مارٹم کے بعد اسے سپرد خاک بھی کر دیا یا تھا۔ دوسری طرف نتاشا اسپتال میں موت سے لڑ رہی تھی۔ وہ دوبارہ صدمہ کے اسپتال بھی ہو پائی تھی مگر صرف شیشے سے ہی نتاشا کو بیٹھیں اور ننگیوں میں جکڑا دیکھ پائی تھی۔ وہ آئی سی یو میں تھی اور اب بھی خطرے میں تھی۔

زویا خود سکتے کی کیفیت میں تھی۔ اس کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آ رہا تھا، کوئی بات کرتا تو ہوں ہاں میں جواب دیتی ورنہ خاموش بیٹھی رہتی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھی کہ کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”نہیں میں اس کی اجازت فی الحال آپ کو نہیں دے سکتا... میری بیٹی بہت بڑی حالت میں ہے، اسے سخت صدمہ پہنچا ہے، وہ دونوں اس کی عزیز ترین سہیلیاں تھیں اور وہ صرف دو گھنٹے پہلے انہیں چھوڑ کر آئی تھی، کیا آپ اس کی ذہنی کیفیت نہیں سمجھ سکتے؟ اس وقت وہ بیان دینے یا آپ کی مدد کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔“ وہ اپنے بابا کی آواز بھی دونوں بعد پہچان پائی تھی۔ ہمیشہ نرم اور مدہم لہجے میں گفتگو کرنے والے بابا اس وقت خاصے غصے میں تھے۔

”میں سمجھتا ہوں احمد صاحب مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سمجھیں۔ زویا کا بیان بہت ضروری ہے۔ ایک بیٹی جا چکی ہے دوسری کی جان دہرے خطرے میں ہے۔“

”دہرا خطرہ...؟“

”جی، دہرا خطرہ... نتاشا اس وارادات کی عینی گواہ بھی ہے۔ اس لیے قاتل اسے ختم کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔“ ایس بی جعفر نرمی سے کہہ رہا تھا۔

”میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں، میں بھی بیٹیوں کا باپ ہوں اور اس بیٹی کی خون میں بھری لاش مجھے اب تک راتوں کو چکا رہتی ہے۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ ہے احمد صاحب کہ ہماری تحقیقات کی روشنی میں خود زویا بھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔“

”کک کیا...؟ زویا کو کیا خطرہ ہے؟“ اس بار احمد صاحب کا لہجہ بدل گیا۔

”دیکھیے وہ جو کوئی بھی تھا، وہ ان بچیوں کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان اوقات میں یہ تین بچیاں وہاں ہوں گی۔ شاید ان میں سے کوئی ایک اس کو جانتی بھی ہو، اس روز اس کے حساب سے وہاں تین لڑکیاں موجود ہونی چاہیے تھیں۔ یہ زویا کی خوش قسمتی تھی کہ وہ وقت سے پہلے گھر آگئی۔ اگر یہ کوئی نفاذی مریض ہے تو وہ اپنے احوال سے کام کو پورا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔“

”اوہ... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ بابا کی آواز میں اب تشویش ہی تشویش تھی۔

”میں زویا کی حفاظت کے مکمل انتظامات کرنے ہوں گے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

زویا ایس بی کے ہٹل کے مکمل ہونے سے پہلے کمرے سے نکل آئی تھی۔

”میں نے سب سنا ہے ایس بی صاحب! میں آپ کی پوری مدد کر دوں گی۔ عینی کو تو میں نے کھودیا مگر نتاشا... مگر ہم اسے بچا سکتے ہیں اور اس... اس مجرے انسان کو سزا دلا سکتے ہیں جس نے یہ سب کیا ہے۔“ وہ بمشکل بول پارہی تھی۔ ”مگر مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹا، میں آج تمہارا بیان نہیں لے رہا ہوں۔ تم اچھی طرح سوچو... ان دونوں بچیوں نے کوئی بات تم سے کی ہو، کوئی ایسی بات جو اس سارے مسئلے میں ذرا بھی مدد کر سکتی ہو۔ تم یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ہم کل بات کریں گے، ٹھیک ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

”اور اب جب تم نے پوری بات لی ہے تو تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ تمہارے باپ نہیں جاؤ گی، سمجھتی ہو؟“

”جی...“ وہ جواب میں صرف یہی کہہ پائی۔

”فی الحال مجھے تم سے صرف ایک ہی بات کا جواب چاہیے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”جی...“

”یعنی کے گھر میں جو لازمہ کام کرتی تھی، اس کا کہنا ہے کہ تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد عینی نے اسے چھٹی دے دی تھی... تمہیں کچھ یاد ہے کہ جب تم وہاں تھیں وہ موجود بھی کہ نہیں...؟“

”وہ اس وقت تو تھی، اس نے ہی ہمیں کھانا دیا تھا۔“

زویا فوراً بولی۔ ”مگر عینی اسے چھٹی کیوں دے گی وہ تو رات تک گھر پر رہتی تھی۔“

”ہاں... مگر اس کا بیان یہ ہے کہ عینی نے اسے زبردستی چھٹی دی تھی۔ خیر دیکھتے ہیں، میں چلتا ہوں تم سوچو، کل بات کریں گے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ زویا کچھ دیر وہیں بیٹھی بابا کو اس اور بھائیوں کو ہدایات دیتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر کمرے میں آگئی۔

اسے ایس بی صاحب کی بات سن کر ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ عجیب سی بے چینی کی کیفیت تھی۔ بس خیالات کی بھرمار تھی۔ اس روز آخر اس کے جانے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟ عینی نے ماسی آئی کو چھٹی کیوں دی ہوگی؟ وہ بہت ڈر پوک تھی اس لیے آئی کے آنے سے پہلے بھی ماسی کو جانے نہیں دیتی تھی پھر اس دن ایسا کیا ہوا کہ اس نے اسے چھٹی دے دی؟ اور وہ کس؟

وہ کون تھا؟ ایس بی صاحب نے کہا کہ وہ ان کے معمولات جانتا تھا ایسا کون ہو سکتا تھا؟

کون...؟ کیوں اور کیسے...؟

اس کے ارد گرد بے شمار سوالیہ نشان رقص کر رہے تھے۔ اسے ان سب کے جواب تلاش تھے۔ عینی کے لیے... نتاشا کے لیے اور خود اپنے لیے بھی...

سوچتے سوچتے اس کا وجود تھک سا گیا تھا۔ اچانک ایک خیال نے کسی تیز سنی کے مانند اس کے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا، اسے حادثے سے چاروں پہلے کی دو پہر یاد آئی۔

”یہ تو آج کل ہر وقت اپنے فون میں مسمی کیا کرتی رہتی ہے؟“ زویا نے ریہرسل کے دوران عینی کو سمجھ کر پر لگے دیکھ کر چڑ کر پوچھا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ جواب میں کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”نہیں... زویا ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ نتاشا نے اس کی تائید کی۔ ”کل بھی تو کلاس میں بیگ کے اندر ہی اندر موبائل چپک کر رہی تھی۔“

”اسکول لے کر آئی تھی سیل فون؟“ زویا نے اسے گھورا۔ ”سمجھ کو پتا چل جاتا تو ضبط ہو جاتا ہنسنے سے نا؟“



زنا نشاندہ

”اچھا اور تمہارا کہنا ہے کہ وہ کچھ عرصے سے موبائل کا بہت استعمال کر رہی تھی؟“

”جی، وہ زیادہ تر ایس ایم ایس اور واٹس ایپ پر لکھتی تھی۔“

”تم تینوں اتنی قریبی دوست ہو، اس نے پھر بھی تم دونوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ کچھ عجیب بات نہیں ہے؟“ ایس بی اے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی... ہم نے کہا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد بتا دے گی۔“

”اور... اور کیا تھا؟ پوری بات یاد کرنے کی کوشش کرو، زویا۔“

”اور... اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے ابھی اجازت نہیں ہے اور یہ کہ وہ ہمیں جلد ہی سر پرانز دے گی۔“ زویا نے سوچتے ہوئے بولے۔

”کس کی اجازت؟“

”میں نے بھی یہ پوچھا تھا مگر وہ بات ٹال گئی تھی۔“

”پھر تم نے اس سے دوبارہ نہیں پوچھا؟“

”نہیں، ہم لوگ اس ہفتے بہت مصروف رہے تھے۔ اس لیے موقع ہی نہیں ملا۔“

”کیا متا شا کو بھی معلوم نہیں؟“

”نہیں۔“

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”اگر اسے معلوم ہوتا تو مجھے ضرور بتاتی، مگر...“

”مگر کیا...؟“ ایس بی اے اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

گا۔

”آپ کو یقین ہے؟“

”دیکھو، اس بارے میں کوئی بات تو نہیں ہوئی ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کا فون گھر میں ہی ہوگا اور اب اسے پولیس کی تحویل میں ہونا چاہیے۔“ اصرار بولا۔

”ہم ایس بی صاحب سے اس بارے میں پوچھ سکتے ہیں؟“ زویا نے سوال کیا۔

”ہاں کیوں نہیں، وہ کل آئیں گے تم سے بات کرنے تو کل ان سے پوچھ لیں گے مگر کیا تمہارے خیال میں اس فون میں کوئی خاص بات ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے کوئی سراغ مل سکے؟“

”پتا نہیں بھائی، مگر پچھلے کچھ عرصے سے یعنی ہر وقت کسی کو مہاجر کرتی تھی۔ پتا نہیں کسے؟ اس نے کہا تھا کہ وہ جلد ہی بتا دے گی اور وہ سر پرانز ہوگا۔“ زویا کی آنکھیں بھر آئیں۔

”میں نے سوچا شاید اس کے فون سے کچھ پتا چل سکے۔“

”یہ بہت اہم بات ہے مجھے یقین ہے کہ اس کے فون سے کچھ معلومات ملیں گی۔“ اصرار نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”تم اب آرام کرو، رات بھی بہت ہوگئی ہے اور ہاں ایک بات غور سے سنو۔“ وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”جہاں پریشان ہونے یا ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو بھی تمہارا ہال بھی بیک نہیں کر پائے گا۔ میں ہوں تمہارے ساتھ، باا یا ہیں، امی اور ہم سب ہیں۔“

”جی بھائی، مجھے معلوم ہے۔ مگر وہاں یعنی اور اسپتال میں متا شا کیلے ہیں۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی پھر چپ چاپ کرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”نہیں... ہمیں وہاں کوئی موبائل نہیں ملا۔ نہ مینی کا، نہ متا شا کا، کسی کا بھی نہیں۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس کے پاس موبائل تھا؟“ ایس بی جعفر اس کی پوری بات سن کر بولا۔

”بالکل... سو فیصد، سر مینی کے پاس موبائل تھا۔“ زویا نے ایک معروف کمپنی کا نام اور ماڈل بتاتے ہوئے کہا۔

”وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اسے تصویریں اور ویڈیوز بنانے کا بہت کڑ تھا۔ اکثر تو بتائے بغیر ہی ویڈیو اور کچھ بنا لیتی تھی۔“ زویا سانس لینے کو رکھی۔

”اور سر، متا شا کے پاس فون نہیں تھا، نہ ہی میرے پاس ہے۔“

یعنی کا سیل فون وہ خاموش گواہ ہو سکتا تھا جو اس روز پیش آنے والے خوفناک حادثے کی تفصیلات فراہم کر سکے یا پھر وہ راستہ جس پر چل کر اس سب کے پیچھے موجود انسان نما خون آشام درندے کا سراغ لگایا جاسکے اور... وہ ایک مضبوط ثبوت بھی تو ہو سکتا تھا۔

یعنی کا سیل فون کہاں تھا؟ بے چینی اسے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ مینی کی اس بربریت سے موت متا شا کی المناک حالت اور خود اس کی زندگی، ذہنی سکون کے لیے اسے وہ سیل درکار تھا۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اسے کس سے پوچھنا چاہیے۔ کون مدد کر سکتا تھا؟ اس شام مینی کے گھر سب سے پہلے وہ اور بھائی پہنچے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکلی اور اصرار کے کمرے کی طرف لپکا وہ کمپیوٹر پر کام میں مصروف تھا۔

”کیا ہوا زویا؟“ وہ اسے دشت کے عالم میں اپنے دروازے پر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں بھائی، میں ٹھیک ہوں۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔“ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”پوچھو۔“

”بھائی اس روز... وہاں مینی کے گھر... وہ بولتے بولتے انک سیل مینی۔ لے بھر میں اس روز اس گھر کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گویا فاسٹ فارورڈ میں رپوائنڈ ہو گیا تھا۔

”ہاں بولو زویا۔“ اصرار کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

”بھائی، تب وہاں مینی کے ارد گرد یا کمرے میں کوئی سیل فون نظر آیا تھا؟“ یا آخر آواز نے الفاظ کا ساتھ دیا۔

”فون...“ اصرار دو لمحے سوچنے کے بعد بولا۔

”نہیں... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”بھائی، مینی کے پاس ایک فون تھا، وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اسے وہیں نہیں ہونا چاہیے اس کے گھر میں...“

”اچھا... پہلے تم یہاں بیٹھو۔“ وہ اسے پاس رکھی کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”اس کے فون کو وہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کمرے میں گر گیا ہو یا اس بستر کے نیچے کیس پڑا ہو۔ ہم اس وقت اس پریشان تھے اس لیے نہ دیکھ پائے ہوں مگر پولیس نے پورے گھر کی تلاشی لی تھی۔ ہر چیز کی جانچ پڑتال کی تھی انہیں یقیناً وہ فون مل گیا ہو۔“

”ارے، کیسے پتا چلے گا۔ میں نے بند کر کے رکھا تھا۔“ یعنی بے پروائی سے بولی۔

”مگر رکھا ہی کیوں؟ اسکول میں کیا ضرورت تھی؟“

”ہے ایک بات... بتا دوں گی بعد میں... مگر اس شرط پر کہ تو پھر نہیں دے گی مجھے...“

”بتانا... کیا چپا رہی ہے؟ بول نا...“ متا شا اس کی کرسی پر ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اگلے ہفتے بتاؤں گی... وعدہ...“

”تو آج بتانے میں کیا مسئلہ ہے؟“ متا شا مصرعی ہو گئی تھی۔

”ابھی مجھے بتانے کی اجازت نہیں ہے۔“ اس نے شوشی سے آنکھیں نہچائیں۔

”کس کی اجازت نہیں ہے؟ کس نے منع کیا ہے تجھے؟ وہ بھی ہمیں بتانے سے؟“ اس کی بات پر زویا اچھل پڑی تھی۔

”یعنی، میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں تم کسی غلط جکر میں تو نہیں پڑ گئی ہو نا۔“

”نہیں زویا... بس اب اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ ایک سر پرانز ہے۔ میں خود بتا دوں گی تم دونوں کو...“ یعنی سیل کو بند کر کے دراز میں ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

”تو جگہ کھڑی ہے نا؟“ زویا مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں جگہ بالکل جگہ... دیکھ متا شا اس کا بڑا کو... پیچھے پڑ گئی ہے میرے...“ یعنی، متا شا کے پیچھے چھپتے ہوئے بولی۔ پھر بات آئی مینی کی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ان چار پانچ دنوں میں میٹ اور فٹنشن کی مصروفیت میں یہ بات ان سب کے ذہنوں سے نکل گئی تھی۔

سیل فون... یعنی کے پاس جدید سیل فون تھا۔ تمام انہیں اور سروسز سے لیس... وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی مگر اس شام... اس شام اس کے ٹوٹے پھوٹے خون میں ڈوبے وجود کے آس پاس اس کا سیل فون موجود نہیں تھا۔

زویا بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے سوالوں کا جواب شاید اس سیل میں دستیاب ہو سکتا تھا۔

کوئی پیغام... واٹس ایپ پر کوئی میسج، کسی تصویر یا ویڈیو کی شکل میں...

”ہوسکتا ہے اس شام میرے گھر آجانے کے بعد یعنی نے اسے بتادیا ہو۔“ زویا ہنسی سے بولی۔
 ”ہم...“ ایس نے کچھ سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔
 ”اب تصور پر کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ایس نے فون پر کسی ایسے شخص سے بات کی، جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ شاید اس شام اس نے اسے ہی گھر بلایا ہو۔
 اس شخص کے کہنے پر ہی ایس نے ملازم کو کچھ دے دی ہو گی۔ جیسا کہ تم سب نے بتایا کہ ایس بہت ڈرتی تھی مگر اس روز اسے یہ اطمینان تھا کہ شاہناش کے ساتھ موجود ہے اور وہ جو کوئی بھی تھا یعنی کو اس پر پورا یقین ہوگا۔ آنے والے کو یقین تھا کہ گھر پر صرف تین نو عمر لڑکیوں کے سوا کوئی نہیں ہو گا۔ شاید ایس کی بھی اس سے پہلی ملاقات ہوگی۔“

”اگر اس روز میں تمہارے لیے جلدی آنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو شاید میں بھی ایس اور شاہناش کی طرح اس کا شکار بن چکی ہوتی۔“ زویا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ”کاش میں کتنا ہی لینے جلدی چلی جاتی تو وہ دونوں بچ جاتیں... شاید...“ وہ سسکی لے کر بولی۔
 ”نہیں... اگر ایسا ہوتا تو وہ درندہ تمہیں کبھی زندہ نہیں چھوڑتا۔“ ایس نے جھفر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔
 ”اب سوال یہ ہے کہ میں کاش کا موبائل کہاں کیا؟“ اصرار بولا۔ ”کھل تلاشی کے بعد بھی اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مکان پر نہیں ہے۔“
 ”وہ ہاں نہیں۔“ ایک کینکروہ وہاں تھا ہی نہیں۔“ ایس نے بولا۔

”کیا مطلب؟“
 ”مطلب یہ کہ یقیناً اس شخص کو معلوم تھا کہ ایس کے موبائل سے اس کا سراغ لگایا جاسکتا ہے اس لیے وہ موبائل ساتھ لے گیا۔“
 ”جی۔“ اصرار سے سر ہلایا۔ ”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔“
 ”زویا تمہارے پاس ایس کی نمبر ہے؟“
 ”جی ہے، میں دیتی ہوں۔“ زویا کے نمبر لکھ کر دینے کے دوران ہی ایس نے بی ڈنٹر فون ملا لیا تھا۔
 ”ہاں اکرام، یہ نمبر لکھو، مجھے اس کے بارے میں مکمل رپورٹ درکار ہے یہ فون اس وقت کہاں ہے؟ بند ہے یا آن ہے؟“ جیسے ایک ماہ میں اس فون سے کس کو کالز کی گئی ہیں اور کتنے ایس ایم ایس کا ریکارڈ بھی چاہیے۔
 ”وہ فون ساتھ لے گیا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ ہم اسے اس نمبر سے کھود نکالیں گے۔“ شکر یہ زویا۔ تم مزید سوچو اور

اگر تمہیں کسی بھی حوالے سے کچھ بھی یاد آئے تو فوراً مجھے بتاؤ۔“
 ”کیا ہم اسے ڈھونڈ پائیں گے؟ کیا واقعی ایس کا قاتل پکڑا جاسکے گا؟“ اس خیال نے اس کے وجود میں طاقت سے بھر دی۔
 ”انشاء اللہ وہ ضرور پکڑا جائے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“ ایس نے بی مضبوط لہجے میں کہا۔ ”مگر اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ہر وقت ضرورت ہوگی۔“
 ”میں سب کچھ کروں گی سر، ہر وہ کام جو آپ کہیں گے۔ بس وہ پکڑا جائے اسے سزا مل جائے۔“ زویا کی آواز رنڈھ گئی۔

☆☆☆

ایس نے جانے کے بعد وہ اسی ادیفز میں بیٹھ رہی تھی۔ یعنی گزشتہ مہینے ڈیڑھ سے کچھ بدلی بدلی سی لنگ رہی تھی۔ فون پر اس کی مصروفیت بھی بہت بڑھ گئی تھی پھر واقعی یہ عجیب بات تھی کہ دن رات ساتھ رہنے کے باوجود ان دونوں کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ جینوں ایک دوسرے سے بھی کچھ نہیں چھپاتی تھیں مگر اس بار کچھ ایسا خاص تھا جس کی وجہ سے اس نے ان دونوں کو کچھ بھی بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔
 اور وہ خود بھی... کتنی آسانی سے اس کی جانب سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔

ٹیسٹ، ڈرائے، ہنسی مذاق، کھیل کود میں اسے یہ دھیان ہی نہیں رہا کہ ایس کی زندگی میں کیا ہو رہا ہے۔ کاش اس نے اپنی آنکھیں کھول لی ہوتیں۔
 کاش اس دن جب ایس نے اسے بعد میں بات کرنے کی ٹال مٹول کر رہی تھی وہ خند اور جھگڑا کر کے اسے اسی وقت بتانے پر مجبور کر دیتی۔ کاش...

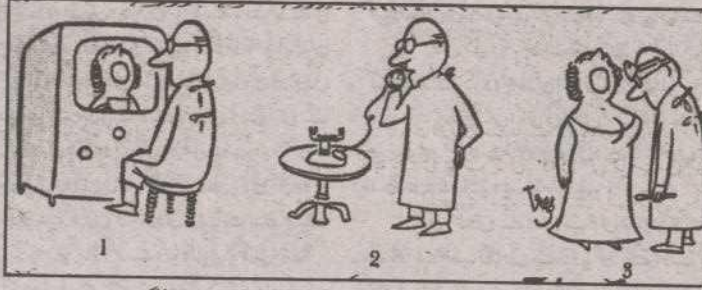
شاید اس طرح کچھ بدل جاتا... شاید اس طرح اس کو تکلیف دہ انداز میں دنیا سے رخصت نہ ہونا پڑتا۔ زویا کی آنکھیں بھر آئیں۔
 ہم کل پر کتنا یقین رکھتے ہیں جبکہ کل جب تک آج کا لبادہ نہ پہن لے صرف ایک خیال ہی ہوتا ہے۔ دور سے بہت قریب نظر آنے والا خیال... اس نے گہری سانس لی۔ ”مجھے بھی یہ خیال حقیقت کا لباس پہن ہی نہیں پاتا۔ اسے کل سے آج بننے کا بورڈنگ پاس نہیں مل آیا اور وقت کی فلائٹ چھوٹ جاتی ہے پھر کاش اور شاہناش زندہ کی بھرپور خراشیں لگاتے رہتے ہیں اور بسا اوقات پچھتاوے کے

ناخن اتارنے تیز نکلتے ہیں کہ وقت کا سر ہم بھی ان خراشوں کو مندل نہیں کر پاتا۔
 ”زویا... زویا...“ رخشیدہ کی آواز گویا اسے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔
 ”جی ماما۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”یہ دیکھو... کون آیا ہے تم سے ملنے...“ وہ بیٹی کے قریب آتے ہوئے بولیں۔
 ”کون ہے ماما؟“ اس کی آواز میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔
 ”میں اور کون...“ مسکراتی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”اودہ لیتی آئی...“ وہ دست سے کھڑی ہو گئی۔
 لیتی اس کی ماما کی کزن تھیں خاندان کی پہلی بی بی بی بی بی خاتون۔ وہ مقامی یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ ان کی عمر چونتیس پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دبلی پتلی نازک سی جسمات اور معصوم مسکراتے چہرے کی مالک، لوگ انہیں اکثر طالبہ ہی سمجھتے تھے۔ زویا کی وہ پسندیدہ خالہ تھیں۔ وہ بچپن سے ہی ان جیسا بننے کی کوشش کیا کرتی تھی اور ان کی ہر بات بہت آسانی سے سمجھ اور مان بھی لیا کرتی، زویا کی حالت دیکھتے ہوئے رخشیدہ نے لیتی کو فون کر کے بلایا تھا۔
 ”کیسی ہو زویا؟“ وہ اسے گلے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

”ٹھیک ہوں آئی میں تو... مگر شاہناش اور ایس...“ لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔
 ”اؤ نہ بول... میری گڑبا تو بہت ہمت والی ہے نا۔“ وہ اس کی آواز میں آنسو محسوس کرتے ہوئے بولیں۔ ”وہیے ہمت والے لوگ بھی اگر کسی رولیا کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔“ ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی زویا کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ انہوں نے اسے کچھ دیر خاموشی سے روئے دیا پھر خود سے الگ کر کے اس کے آنسو پونچھے اور بستر پر بٹھا دیا۔ رخشیدہ اسے روتا دیکھ کر آگے بڑھیں مگر لیتی نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔
 ”جو ہو بہت ہی برا ہوا بیٹا مگر اب تمہیں ہمت کرنا ہو گی زویا اس سب سے باہر آنا ہوگا ورنہ تم بھی اپنی زندگی کی طرف لوٹ پاؤ گی اور نہ ہی شاہناش کی مدد کر پاؤ گی۔“ وہ نرم لہجے میں بولیں۔
 ”میں یہ سب کرنا چاہتی ہوں اس سب سے باہر آنا بھی چاہتی ہوں اور شاہناش کی مدد بھی کرنا چاہتی ہوں مگر کچھ ہو

نہیں بارہا...۔ شاہناش آنکھیں ہی نہیں کھول رہی اور میں جب بھی آنکھیں بند کرتی ہوں تو ایس کی خون میں ڈوبی حالت... اس کی آنکھوں میں جما خوف، دہشت اور درد میری نظروں کے سامنے آ جاتا ہے آئی، اس نے اپنے آخری لمبے کس طرح گزارے ہوں گے۔ میں جب سوچتی ہوں نا تو میرا دل لرز جاتا ہے اس شام وہ گھر... جہاں ہم نے اتنے اچھے دن اور شامیں ساتھ گزاریں، اتنے مزے کیے، اتنی تفریح کی، دعوتیں اڑائیں وہ ہی گھر اس شام ان کے لیے ہائیڈ پائوس بن گیا ہوگا۔ کتنا ڈریں ہوں گی وہ؟ کوشش تو کی ہوگی نا خود کو بجانے کی... مگر بچ نہیں سکیں۔“ وہ روتے روتے کہے جا رہی تھی۔ ”صرف ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا... اتنی بڑی... سزا، مان لیتی ہوں کہ اس کی غلطی تھی اس نے کسی اجنبی پر یقین کر لیا اور اس حد تک کہ اسے گھر میں بلا لیا۔ شاید اس اجنبی نے قاتل نے اس سے یہ کرنے کو کہا ہوگا مگر اس نے یہ سوچا بھی نہیں ہو گا، وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس کی دوست بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس گھر میں اور اس محلے میں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اسے تو یقین ہوگا نا کہ وہ یہاں اپنے گھر میں محفوظ ہے۔“
 ”ہاں زویا، یہی سوچا ہوگا۔ بعض اوقات ایک چھوٹی سی غلطی انسان کی زندگی برباد کر دیتی ہے۔ یعنی نے یہ سب سوچا بھی نہیں ہوگا جو ہو گیا۔“ وہ تانسف سے بولیں۔
 ”اور... آئی، شاہناش... اس کی تو غلطی بھی نہیں تھی وہ تو صرف اپنی دوستی میں شکار بن گئی پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“
 ”یہ سوچنا ضروری ہے بیٹا... کاش ایس نے بھی سوچا ہوتا، تم جانتی ہو کہ ایس کی سب سے بڑی غلطی کیا تھی؟“
 ”اس قاتل پر بھروسہ کرنا۔“ زویا گالوں پر پھیلے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔
 ”نہیں بیٹا اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اسے جو نہیں کرنا چاہیے تھا وہ اس نے کیا جبکہ وہ خود بھی تھی کہ یہ غلط ہے اور اسے یہ نہیں کرنا چاہیے۔ آپ دونوں کے ساتھ جب بھی جیتے ہیں پریشان رہتے ہیں۔ مصیبتوں میں پھنستے رہتے ہیں۔ تم نے قرآن پڑھا ہے نا، وہ بھی کہ اللہ نے نہیں بنائے کسی انسان کے سینے میں دونوں... دو دراستوں پر ایک ساتھ نہیں چلا جاتا بیٹا، ہم ہمیشہ وہی بات چھپاتے ہیں جو ہم خود جانتے ہیں کہ درست نہیں ہے ورنہ جس چیز کو ہم صحیح سمجھتے ہیں وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں نا۔ وہ بیٹی جانتی تھی کہ وہ غلطی کر رہی ہے اگر جانتی نہ ہوتی تو فوراً تم لوگوں کو یا اپنی



باپ رے! فون پر شکایت کرنا غضب ہو گیا... یہ تو خود ہی پہنچ گئی

یوں بھی وہ کب تک چھپا رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ متاشا پر حملے کی کوشش ضرور کرے گا صرف وہی اس کے خلاف نجات اور گواہ ہے۔ یہی کوشش اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگی۔

”اور اگر اس نے ایسا نہ کیا ایس بی صاحب تو کیا یہ دونوں بچیاں اسی طرح خوف کے عالم میں زندگی گزاریں گی اور تین کو بھی انصاف نہیں ملے گا؟“ آئی نے چپچپے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ایسا نہیں ہوگا ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں اور جیسے ہی کچھ سامنے آتا ہے میں آپ کے علم میں لاؤں گا۔“ ایس بی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”اس وقت تک آپ کو زویا کا بہت خیال رکھنا ہے اور زویا تمہیں کچھ اور یاد آئے؟“

”نہیں سر“ وہ سر ہلا کر بولی۔

اس کی ساری توجہ متاشا کی طرف تھی۔ کھڑکی کی دوسری جانب آئی سی یو کے خاص ہیڈ پروڈ اس کے سامنے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور جسم کے مختلف حصوں سے ٹکلیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دل البتہ دھوک رہا تھا۔ زویا اس کے قریب جانا چاہتی تھی اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر اس وقت یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ سب جو کبھی ان کا معمولی تھا اب اچانک ناممکن بن کر رہ گیا تھا۔

زویا چند لمحوں سے دیکھتی رہی پھر کورڈیڈور کی طرف چل دی۔ اسے اس وقت نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ نہ آئی کی آواز جو اسے پکار رہی تھی نہ ایس بی جعفر کا رکنے کا مشورہ... اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور وہ جلد از جلد وہاں سے دور چل جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اسی لمحے کورڈیڈور کی دوسری جانب وہ کھڑا تھا۔ وہ تیس بیس سال کا قدرے طویل القامت شخص تھا۔ اس کے

مسکرائیں۔

”جی ہاں آئی، مجھے بہت اچھا لگے گا۔“ وہ بھی جواباً مسکرائی۔ وہ اس حادثے کے بعد پہلی بار اس طرح مسکرائی تھی۔ دروازے پر کھڑی رشتہ نے اطمینان کی سانس لی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد زویا بھی وضو کے لیے ہاتھ روم کی جانب بڑھی۔ واقعی اس قیامت کی شام سے اب تک اس نے اپنے رب سے صرف شکایتیں کی تھیں، آنسو بہاتے تھے شکر کا ایک سجدہ بھی نہیں کیا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ کافی دیر سجدے میں پڑی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

چائے پیتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک ہی خیال چکر رہا تھا۔ یعنی کون نمبر سے پولیس کو کیا معلوم ہوا ہوگا؟ کیا کوئی ایسا سراغ مل پایا ہوگا جو اس نامعلوم گھناؤنپ اندھیرے میں تھوڑی بہت ہی سہی روشنی کر سکے۔

☆☆☆

”اس کے فون نمبر سے سارا ریکارڈ مل گیا ہے گزشتہ ماہ میں ایک نمبر ایسا ملا ہے جس سے عینی کے فون پر مسلسل کال کی جاتی رہی ہے اسی نمبر سے اسے مسیجر بھی بھیجے جاتے رہے ہیں، ہم نے اس نمبر کو نمٹیں کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ نمبر تین سال پہلے لاہور سے کسی ماہ جین نامی کسی خاتون کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔ اس وقت سم کے حصول کے لیے کسی خاص طریقہ کار یا مہم بات نہیں لی جاتی تھی، لہذا آئینش کی کڑی صرف نام پر آکر کر گئی ہے جس دکان سے یہ سم لی گئی وہ بند ہو چکی ہے۔“

ایس بی جعفر کے لہجے میں قدرے مایوسی سی تھی۔ زویا، لہجے کے ساتھ متاشا کے اسپتال آئی تھی وہیں ایس بی سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

”اوہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اس نمبر کو استعمال نہیں کر رہا؟“ لہجے نے پوچھا۔

”جی، وہ بہت زیادہ چالاک ہے، عینی کا فون اڑا لینے کے باوجود اسے اندازہ ہوگا کہ ہم اس کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس لیے اس نے وہ سم دوبارہ استعمال ہی نہیں کی غالباً اسے تو ذکر نہیں چھپک دیا ہوگا یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی لوکیشن ٹریس نہیں کر پائے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس اس وقت بالکل اندھیرے میں ہے؟“

”فی الحال مگر ایسا رہے گا نہیں۔ تفتیش جاری ہے

ماں کو بتائی... بتائی نا؟ وہ سمجھتی تھی، ذہن کے کسی گوشے میں اسے احساس تھا کہ وہ غلط ہے مگر وہ برائی کے ٹرائس میں آگئی اور دوسری غلطی اس کی امی سے ہوئی، انہوں نے اپنی زندگی اپنی بیٹی کے لیے وقف کر رکھی تھی مگر اسے سب کچھ فراہم کرنے کی کاوش میں خود اس سے دور ہو گئیں۔“

”ان کی بھوری بھی آئی... کام کرنا۔“

”ہاں بیٹا! مگر قریب رہنے کے لیے ہر وقت ساتھ رہنا ضروری نہیں ہوتا، صرف ایک دوسرے کو سمجھنا اور ذہنی طور پر، قربت ضروری ہے۔ سچ کو یہ یقین اور اعتماد دینا کہ وہ اپنی ماں سے ہر بُری سے بری بات بھی شیر کر سکتے ہیں۔ کوئی ہے جو ان کی ہر بات کو سمجھ سکتا ہے اور بُرے سے بُرے حالات یا قصور میں بھی ان کی مدد کر سکتا ہے۔ ماں کا عہدہ بہت ڈیمانڈنگ ہوتا ہے اسے نہ صرف بچوں کو چھینے کا قرینہ بھی سکھانا ہوتا ہے بلکہ ان کے لیے کسی بھی ہنگامی صورت حال میں زندگی کی جانب لے جانے والا دروازہ یا لائف سیونگ ڈرگ بھی بننا پڑتا ہے۔ وہ سائنس دان جو بچوں کو ان کی اپنی غلطیوں کی ترقی و صواب اور پریشانیوں کی برسات سے بچا سکے۔ ماں سے زیادہ کوئی اولاد سے پیار نہیں کر سکتا۔ یہ تو طے ہے مگر ذرا سی بھول سب کچھ بکھر ڈالتی ہے۔“ لہجے انفرادی سے بولیں۔ ”اللہ عینی کی امی کو صبر عطا کرے۔“

”آمین۔“ زویا دیر سے بولی۔

”متاشا کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔ سر پر لگنے والی شدید چوٹ کی وجہ سے وہ کوما میں ہے۔ ڈاکٹر اگر بہت پر امید ہیں تو نا امید بھی نہیں ہیں۔ اسے کبھی بھی ہوش آسکتا ہے۔ ہم سب کو اس وقت کا شدت سے انتظار ہے اور اس شام وہاں کیا اور کیسے ہوا یہ بھی صرف وہ ہی بتا سکتی ہے۔ پولیس کے مطابق اس کی زندگی کو شدید خطرہ ہے وہ قاتل اسے ختم کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے اسی لیے اسے سخت حفاظتی انتظامات میں رکھا گیا ہے۔“

زویا نے بتایا۔

”اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔ اور ہم سب کی مدد فرمائے، زویا تمہیں اللہ کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے اس نے تمہیں بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہونے سے بچا لیا ہے۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ ”چلو تم منہ ہاتھ دھو کر باہر آؤ ہم لی کر چائے پیتے ہیں۔ میں آج بہت تھک گئی ہوں اور ہاں تمہیں بتا ہے تاکہ میں تمہارے ساتھ کچھ دن رہوں گی۔ اپنا کمر شیئر کر لو گی نا مجھ سے؟“ وہ

والا ریوڑ... ذرا سی گڑبڑ ہمارے اندر کے خوف کو دل و جان پر طاری کر دیتی ہے اور پھر ہم اپنے ارد گرد چلتے پھرتے لوگوں کو اپنے جیسا انسان سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ افسوس سے کہہ رہے تھے۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔ اس بی جعفر بہت فرض شناس افسر ہے اب نہ جانے اس کی جگہ کون اس کیس کو دیکھے گا بہر حال اب ایک بات طے ہے کہ اب ہمیں اور زیادہ محتاط ہونا پڑے گا جب تک وہ ذیل انسان پکڑا نہیں جاتا، زویا اکیلے نہیں جائے گی۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔ اس میں بہت خطرہ ہے اور احتیاط ہر صورت میں بہتر ہے۔“ لیتی نے کہا۔

”اور اگر وہ کبھی پکڑا نہ گیا باا...“ زویا جو تب سے خاموش تھی اچانک بولی۔ ”پھر کیا میں ساری زندگی اسکول نہیں جاؤں گی، کچھ بھی نہیں کروں گی؟“ اس کے لہجہ میں کچھ ایسی عجیب بے بسی تھی جس نے بابا کے دل کو بچہ سادہ تھا۔

”نہیں میری جان ایسا کیوں ہوگا۔“ وہ اسے خود سے لپٹاتے ہوئے بولے۔ ”تم اسکول جاؤ گی۔ بہت کچھ کر دگی بس جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا میں، احریا تمہاری ماں تمہارے ساتھ ہوں گے۔ تمہیں چھوڑنے لانے کے لیے... ٹھیک ہے نا، اس سے ہم بھی مطمئن رہیں گے۔“

رات خاصی دیر کے بعد باا خرابی میں بیٹے کے خطرے سے باہر آنے کی خبر ملی تھی۔ اسپتال پر نفری بڑھادی گئی تھی اور نتاشا کے خاندان سے دو افراد کو آئی سی یو میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ سب اس سب کے بعد ہی سوئے لیئے تھے مگر زویا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر لیئے کروٹیں بدلتے ٹھک گئی تو اٹھ کر لاؤنج میں رکھے کمپیوٹر پر جا بیٹھی۔ وہ اور احمر کمپیوٹر پر وقت گزارنے کے لیے روز لڑا کرتے تھے۔ اور اب کتنے ہی دن سے یہ کمپیوٹر استعمال ہی نہیں ہوا تھا۔ گیمز میں دل نہ لگا تو اس نے فیس بک کھولا۔ اس نے یعنی اور نتاشا تینوں نے ایک سال قبل میں بک پر ہیجڑ بنائے تھے۔ اور اسے استعمال بھی کرتی تھیں۔ زویا کو روزانہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک کمپیوٹر استعمال کرنے کی اجازت تھی جسے وہ الف یا گیمز میں گزارتی تھی۔ گزشتہ دس دنوں سے تو زندگی ہی اچھل پھل ہو گئی تھی۔ اسے فیس بک کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ بیچ کھلتے ہی اسے دوسری کی ریکویسٹ نظر آئیں۔ فیس بک پر اس کے ساتھ اسکول کی سہیلیاں اور چند گزرتا وغیرہ اید تھیں۔ احمر نے اسے سیکوریٹی

لیتی اس کی بات کا جواب دینے ہی لگی تھی کہ ایک تیز رفتار پولیس کار ان کے سامنے آ کر رکی۔

”بی بی میں انسپٹر کامران ہوں آپ کو ڈی ایس پی صاحب نے کال کیا ہوگا۔“ کار سے ایک مضبوط کاغذی کا اوپریٹر پولیس افسر باہر نکل آیا تھا۔

”جی۔“ لیتی کے جواب سے پہلے وہ ان کے لیے دروازہ کھول چکا تھا۔

”آپ کا یہاں اس طرح کھڑے رہنا خطرناک ہے۔ پلیز اندر بیٹھیے آپ کو گھر پہنچانے کی ذمہ داری میری ہے۔“

چند لمحوں میں کامر کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے آئی؟“ آپ ایک دم اتنی پریشان نظر آ رہی ہیں؟“ جی بتائیے نتاشا ٹھیک ہے نا؟“ زویا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”بی بی، زویا بی بی، نتاشا ٹھیک ہے۔“ اس کے سوال کا جواب انسپٹر نے دیا تھا۔ ”حملہ تو بہت پلاننگ سے کیا گیا تھا مگر وہ پھر بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”حملہ؟“ زویا کی آنکھیں پھلکی گئیں۔

”ہاں، دھماکے والا بم جو صرف آواز پیدا کرتا ہے کو بھارتی اسپتال میں جھکڑ پھینکا اور دھوکے کے ہم چھانڈ کر لوگوں کو ڈرانے کی یہ کوشش اصل میں نتاشا کو مارنے کی سازش ہی تھی۔“ وہ بولا۔

”اوہ... پھر...؟“

”ایس بی جعفری نے جان پر کھیل کر نتاشا کو بچا لیا ہے۔ وہ اس وقت شدید زخمی ہیں گولی ان کی گردن میں گئی ہے بس دعا کریں کہ وہ بچ جائیں۔“

☆☆☆

ایس بی جعفر کو گولی لگنے کی خبر نے گھر پر سب کو بی تشویش زدہ اور پریشان کر دیا تھا۔ بابا فون پر پولیس والوں، ڈاکٹر اور نتاشا کے خاندان والوں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے تھے۔

”یہ معاملہ ایک واردات سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے جو آدی پولیس سے بھرے اسپتال میں اس قدر گڑبڑ مچا سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ وہ فون سے فارغ ہو کر صوفے پر بیٹھی۔ ”جانتے ہیں آپ لوگ اس کے ان دھماکوں کے چکر میں دو افراد کی ہلاکت اور کتنے ہی زخمی بھی ہوئے ہیں ایک تو ہم تو نہیں بھیڑ بننے جا رہے ہیں ایک دوسرے سے بے نیاز صرف اپنے لیے تحفظ چاہتے

تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے بیٹا، چلو یہاں سے۔“

”نہیں آئی، ہم بھاگ نہیں سکتے، ہر بار اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”اچھا رکھو، میں ایس بی کو کال کر کے ان سے نتاشا کی خیریت اور تفصیلات معلوم ہو سکتی ہے۔“ انہوں نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ زویا نے سر ہلایا۔

کافی گھنٹیوں کے بعد جب فون ریسو نہیں ہوا تو لیتی نے جواب طلب نگاہوں سے زویا کو دیکھتے ہوئے فون بند کر دیا۔

”میں تھوڑی دیر میں پھر کوشش کرتی ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ مصروف ہوں مگر کسی بھی صورت میں ہمارا یہاں اس طرح کھڑا رہنا مناسب نہیں ہے۔ نہ ہی ان حالات میں تم اندر اسپتال میں جا کر نتاشا کی کوئی مدد کر سکتی ہو پلیز میری بات مانو اور یہاں سے چلو فی الحال۔“ وہ زویا کا بازو پکڑ کر بولیں۔

ابھی زویا جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ لیتی کا فون بج اٹھا۔

”اوہ، ایس بی صاحب، جی آپ کیسے ہیں؟“ نتاشا ٹھیک ہے نا؟ اسپتال میں کیا ہوا ہے؟“ لیتی نے فون ریسو کرتے ہی سوالات کی بارش کر دی۔

”جی۔“ وہ چند لمحوں کے لیے چپ چاپ دوسری طرف سے دیے جانے والے جواب میں رہی مگر ان کا چہرہ واضح طور پر پتلا سا بن گیا تھا۔

”جی ہاں، ہم گیت سے باہر ہی لٹکے ہیں اور فوراً گھر کے لیے روانہ ہو رہے ہیں... اچھا جیسے آپ مناسب نہیں میں انتظار کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور خالی خالی نظروں سے زویا کو دیکھنے لگیں۔

”کیا ہوا ہے آئی؟“ نتاشا ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں، نتاشا بالکل ٹھیک ہے زویا۔“ انہوں نے آہستگی سے جواب دیا۔

”شکر ہے خدا کا۔“ زویا نے گہری سانس لی۔ ”پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ اور ہمیں کس کا انتظار کرنا ہے۔“

”وہ انسپٹر کامران کو بھیج رہے ہیں وہ ہمیں گھر پہنچا دیں گے۔“ وہ اسی طرح کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

”مگر کیوں؟ ہم چلے جائیں گے نا۔“ وہ غور سے لیتی کا چہرہ دیکھ کر بولی۔ ”کیا بات ہے آئی... آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔“

شاید کل ایک دو روز میں وہ تمہیں نتاشا سے بات کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ نتاشا غالباً بات سن سکتی ہے بس ری ایکٹ نہیں کر سکتی۔ شاید تمہاری موجودگی اس کے لیے طاقت بن سکے... اگر تم اسی طرح اس کے سامنے رہیں تو اس کا نتیجہ اور بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں نہیں روؤں گی۔ بالکل نہیں روؤں گی آئی، آئی پراس۔“ وہ اپنے گالوں کو تھیلیوں کی پشت سے پونچھتے ہوئے بولی۔ ”اور کیا کہاؤا کرنے، کیا چل کر پوچھیں اندر؟“

”نہیں، اب ہم چلتے ہیں وہ کل ہمیں فون کریں گے۔“ لیتی نے اس کا ہاتھ تھا ہوا اور گیت کی طرف قدم بڑھائے۔

ابھی وہ گیت تک پہنچے ہی تھے کہ اسپتال سے دھماکے کی آواز آئی۔ وہ دونوں تقریباً اچھل ہی گئیں۔ اسپتال کی عمارت میں نہیں دور سے دھواں سا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا بظاہر کوئی توڑ پھوڑ تو نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس دھماکے کی آواز اور پھر دھوکے نے لوگوں میں مری طرح جھکڑ مچا دی تھی۔

لوگ چیختے چلاتے دروازے کی طرف لپکتے تھے۔ ایسے میں بزرگ اور بچے گر رہے تھے، عورتیں چلا رہی تھیں۔ لمحہ بھر میں اسپتال میں قیامت کا سا سماں ہو گیا تھا۔ لیتی نے لمحے بھر میں حواس قابو میں کر کے زویا کو کمر سے پکڑ کر دروازے کے باہر گھسٹ لیا تھا۔

”یہ... کیا ہو گیا آئی؟ کیا کوئی بم پھٹا ہے؟“ زویا کی سانس پھول رہی تھی۔

”پتا نہیں... بم تو نہیں لگتا کیونکہ عمارت کو کچھ نہیں ہوا ہے پھر بھی یقیناً کچھ برا ہوا ضرور ہے اور اس سے بھی برا یہ کہ لوگ دوسروں کو پھلتے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔“ لیتی افسوس سے بولی۔

”بہر حال تم تیز چلو، ورنہ اس جھکڑ سے ہمیں بھی چوٹ لگ سکتی ہے۔“

”نہیں آئی۔“ زویا سڑک پر آ کر لیتی کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

”کیوں؟“

”آئی نتاشا اسپتال میں ہے آپ سب ہی تو کہہ رہے تھے کہ اس کی جان کو خطرہ ہے اور اب یہ دھماکا... پتا نہیں اندر کیا ہوا ہے؟ وہ کیسی ہے؟ کہیں یہ سب اس کی جان لینے کو نہیں کیا جا رہا؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرے دل میں اس طرح کے دوسوے آ رہے ہیں مگر اس صورت میں بھی اس وقت



کتابی شکاری..... ٹرافیاں بازار سے مل جاتی ہیں

یہ معاملہ بہت ہی توجہ طلب تھا مگر وہ اس بارے میں کچھ بھی کہنے یا بتانے سے پہلے اس کی یقین دہانی چاہتی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سراسر غلط سمجھ رہی ہو کوئی اور بھی اس قسم کے مامک کا گور بنا سکتا تھا اور ایسی آئی ڈی رکھ سکتا تھا۔ اس نے سوچا۔

آئی کے سونے کے بعد بھی وہ سب لوگوں کے اپنے کمروں میں جانے اور سونے کے بعد تک بستر پر لیٹی رہی پھر وہ کمرے سے نکلی اور لاؤنج میں رکھے کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھی۔ کمپیوٹر آن ہونے تک وہ اسکرین پر نظر میں بجائے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن 100 میل فی گھنٹہ کے حساب سے دوڑے جا رہا تھا۔ بھی اس کے تصور میں یعنی کا منکر اتا، شرارتی چہرہ آ جاتا، ابھی اس کی خون میں تھری لاش منظر پر چھا جاتی تو بھی ڈیروں بیڈوں میں چھپی بے حس و حرکت نشا نظر آتی۔

فیس بک پر لاگ ان کرتے ہوئے بھی وہ عجیب سی الجھن میں پھنسی ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ سب کچھ جانتا چاہتی تھی تو دوسری طرف سخت خوف زدہ بھی تھی۔

اگر وہ واقعی وہی ہو تو...؟

اس کا اس طرح اسے نتیجہ کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

کیا وہ اس کی اگلی شکار تھی؟ یہ سوچ ہی اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

لاگ ان ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ریکویسٹ اور میسجز کے نوٹرز پر نظر ڈالی۔ ان میں ایک ریکویسٹ اور ایک پیغام موجود تھا۔

زویا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کیا اسے سب کو اس آئی ڈی کے بارے میں بتانا چاہیے؟ اور اگر وہ غلط سمجھ رہی ہو تو؟ پھر اسے یقین تھا کہ اگر اسے غلط فہمی بھی ہوئی ہو، وہ دو مختلف باتوں کو ملانے کی غلطی بھی کر رہی ہو تب بھی بابا اور گھر والے اس کی حفاظت کے خیال سے اسے پھر کمپیوٹر بھی استعمال نہیں کرنے دیں گے۔

”کچھ نہیں بابا... چنانچہ کیوں چکر سا آ گیا تھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”مسلل اتنا کچھ ہو بھی تو رہا ہے۔ انسان کے اعصاب جواب دے ہی جاتے ہیں تم آرام کرو زویا... اور کچھ بھی مت سوچو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ رخشہ بیٹی کا سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

”ہاں، ویسے بھی اب رات ہو چلی ہے، کل بھی تم بہت دیر سے سوئی تھیں چلو اب سو جاتے ہیں۔“ لبتی نے کہا۔

”مگر ایس بی صاحب زویا سے بات کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ ہوش میں آتے ہی بات کرو ایسے۔“ اصرار کیا۔

”بات کرو زویا؟“ بابا نے پوچھا۔

”آپ کر لیجیے بابا... میں اب ٹھیک ہوں بس جھکن کی ہو رہی ہے۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے تم آرام کرو۔“ ان کے جواب پر وہ دھیرے سے بولی اور کمرے کی طرف چل دی۔ وہ اس وقت صرف سوچنا چاہتی تھی۔

کئی کو بھی کچھ بتانے سے پہلے اسے خود یہ سب سمجھنا تھا، کسی نتیجے پر پہنچنا تھا۔ وہ مزید سوالات یا گفتگو سے بچنے کے لیے آئی کے بستر پر آنے سے پہلے ہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

یہ سب کچھ بہت الجھا ہوا تھا۔

الجھن کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ بہت ہی بُرا تھا۔ یہی الجھن میں نہیں تھی کہ ایسا اس کے ساتھ کیوں اور کس لیے ہوا۔ مگر جو کچھ ان دونوں میں ہو رہا تھا، وہ اس سے زیادہ سوال کھڑے کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ معاملہ رکنے والا نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھا غالباً اپنا دھورا کام مکمل کرنے کے لیے بہت زیادہ پیہرہ تھا اس حد تک کہ اس نے پولیس کی موجودگی کے باوجود ہسپتال جیسی بھیڑ بھاڑ والی جگہ پر اس قدر ہنگامہ کھڑا کرنے کا خطرہ مول لیا تھا۔

پھر اگر وہی اسے فیس بک پر پیغامات بھیج رہا تھا تو پھر

”کیونکہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا۔“ وہ ہلکی آواز میں بولے۔

”کیا...؟“

”ہاں زویا، میں نے اسے دیکھتے ہی گولی چلائی کیونکہ جب وہ آئی سی یوش داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ریو اور موجود تھا۔ میں دھماکوں کی آواز سے ہی سمجھ گیا تھا کہ

نشا کو لاقحہ خطرہ ہسپتال کے اندر آ گیا ہے اور میں اس کے حوالے سے کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں اس کا انکشاف نہیں ہو سکتا... کیونکہ اس نے اپنے چہرے پر ماسک پہن رکھا تھا۔“

”ماسک...؟“ زویا زور سے بولی۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیوں فیس بک کی ماسک والی آئی ڈی گھوم گئی۔

”ہاں، اور ماسک بھی ایسا کہ انسان اسے دیکھتے ہی دہشت زدہ ہو جائے۔ انتہائی خوفناک، سفاک اور بھانک چہرے کا ماسک جس کے دہانے سے خون کے قطرے نکلنے نظر آ رہے تھے مگر تم پریشان نہ ہونا، ہم اس ماسک کے بارے میں تفتیش شروع کر چکے ہیں شاید اب یہی ماسک ہمیں اس تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوگا۔“

وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر زویا گویا کچھ نہ ہی نہیں رہی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے خون پٹکا ہوا بھانک ماسک لہرا رہا تھا اور LOVE TO KILL کی بازگشت اس کی سماعت میں دھماکے کر رہی تھی۔

”کیا یہ وہی تھا؟“

اس قدر ممانعت... اتفاق کیسے ہو سکتی تھی؟

اگر یہ وہی تھا تو وہ اسے بار بار پیغامات کیوں بھیج رہا تھا؟

کیوں؟ سوالیہ نشان پھیلتے پھیلتے اس کے اعصاب پر طاری ہوتا جا رہا تھا اور پھر کرا، خون، فون سے آئی ایس بی جعفری کی ہیلو ہیلو کی پکار، اس کے ارد گرد موجود پیار کرنے والے چہروں کی فکر اور سب کچھ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔

☆☆☆

جب اس کی آنکھ کھلی تو سب اس کے ارد گرد موجود تھے۔

”بیٹا، کیا ہوا ہے زویا؟ کس بات کی فینشن ہے بیٹا؟

ایسا کیا کہا انہوں نے؟ بولو بیٹا۔“ اس کے سمجھنے کے بعد بابا نے پوچھا۔

خطرے کے منہ میں کودنے والی بات ہے۔“ وہ بولے۔

”تو اب کیا میں ساری عمر منہ چھپا کر ایک کونے میں بیٹھی رہوں گی بابا۔ جب میں یہ کر رہی تھی تو آپ سب ہی مجھے ہمت سے کام لینے کو کہہ رہے تھے اور اب جب میں اس سب کا سامنا کرنے کو تیار ہوں تو آپ ہی مجھے روک رہے ہیں... میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں بابا، انہوں نے اس حملہ آور کو دیکھا ہے، وہ اس کا حلیہ بتا سکتے ہیں... شاید... اس سے مجھے کچھ یاد آجائے۔“ اس نے کہا۔

”شاید واقعی میں نے اسے دیکھا ہو۔“

”اگر یہ بات ہے تو تم کو ضرور ایسی بی سے بات کرنی چاہیے مگر اس کے لیے وہاں جانا ضروری نہیں ہے۔“ لبتی بولیں۔

”تم ان سے فون پر بھی بات کر سکتی ہو اگر وہ کر سکیں، تمہیں اس سب کو فیس کرنا ہے جرات کے ساتھ مگر عقل کے ساتھ بھی... ہے نا؟“

”جی آئی! ٹھیک ہے فون پر ہی کہی...“ وہ دھیرے سے بولی۔

ایس بی صاحب سے رابطہ رات گئے جا کر ہو پایا تھا۔ زویا کی بات سن کر ایک لمحے کو دوسری طرف سکوت سا طاری ہو گیا۔

”بتائیے سر کیا تھا وہ؟ آپ نے تو اسے دیکھا تھا نا؟ اس میں ایسی کیا بات تھی جسے دیکھتے ہی آپ نے گولی چلا دی؟ آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہی مجرم ہے؟“

”زویا! اسے دیکھنے کے ایک سیکنڈ میں ہی میں کیا کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ ہسپتال کے غلے یا عام مریضوں وغیرہ میں سے نہیں ہے۔“ وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے۔

”کیا مطلب؟ یعنی وہ اتنا ہیسا تک ہے؟“ زویا پھر پری ہی لے کر بولی۔

”نہیں مگر اس وقت لگ رہا تھا۔“

”میں بھی نہیں سر، ویسے کیا آپ اس کا انکشاف ہو رہا ہے؟ اس طرح اسے پکڑنے میں آسانی ہوگی۔ اگر وہ ہمیں جانتا ہے تو شاید کبھی سامنا ہوا ہو... یا پھر انکشاف دیکھ کر مجھے یاد آجائے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ایسے حالات میں یہی پریکٹس ہوتی ہے اور 10 میں سے 8 مرتبہ یہ عمل کامیاب بھی ہو جاتا ہے یا پھر کامیابی کی کوشش میں اہم کردار ادا کرتا ہے مگر اس بار یہ ممکن نہیں ہے۔“ ان کی آواز میں تھکاوٹ سی تھی۔

”کیوں سر؟“

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP دی وی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

ترتیب بدلی اور لاگ ان کو کلک کیا۔ اگلے لمحے عینی کا بیج اس کے سامنے تھا۔ وہ کامیاب ہوئی تھی۔ زویا مسکرائی۔ عینی کے صفحے پر یادوں کا خزانہ بکھرا ہوا تھا۔ تصویریں، لطف، چیمبر جھاڑ، کارٹونز... وہ چند لمحوں کے لیے مہبت سی رہ گئی۔

انہوں نے جس آخری پوسٹ پر ایک ساتھ کمٹس کے تھے، وہ دوستی پر ہی تھی۔ عینی نے لکھا تھا۔ ”توڑیں گے دم اگر تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔“ اور اس میں ان دونوں نے ٹھیک کیا تھا اور واقعی وہ دونوں آخری لمحے تک ساتھ رہے تھے۔ زویا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اسے چب سے اپنی زندگی یاد تھی۔ وہیں سے عینی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے گالوں پر پھسل آنے والے آنسوؤں کو صاف کیا اور عینی کے بیج کا جائزہ لیا۔ اس پر ایسا کچھ نہیں تھا جس سے اس بارے میں کچھ معلوم ہو پاتا۔

زویا کو یقین تھا کہ عینی کے بیج سے اسے LOVE TO KILL کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہو جائے گا۔ فریڈ زسٹ میں جانے سے پہلے اس نے عینی کے چیٹ میسر کو کھولا۔

دہشت کا دوسرا اجنبی پہلے سے زیادہ شدید اور ساکت کر دینے والا تھا۔ عینی کے میسر میں LOVE TO KILL کے کئی پیغام موجود تھے جو شاید ان کی آخری چیٹ پر مشتمل تھے۔

یہ اس واردات سے پہلی والی رات کو ہونے والی چیٹ تھی اس میں LOVE TO KILL نے عینی سے کہا تھا کہ وہ ایک دو دن میں ہی اس سے ملنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ اسے شہر سے باہر جانا پڑ جائے اور وہ کئی مہینوں کے بعد واپس آئے۔ عینی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوراً ہی کچھ کرے گی جس پر اس نے اس سے کہا تھا کہ وہ لوگ پریکٹس کے لیے جمع ہوتے ہیں وہ تب ہی اسے بھی بلا سکتی ہے، اس طرح وہ اس کی سہیلیوں سے بھی مل لے گا۔ عینی نے جواباً لکھا تھا کہ وہ موقع ملے ہی اسے ایس ایم ایس کرے گی جس کے جواب میں اس نے تحریر کیا کہ وہ اس سے زیادہ دور نہیں ہو گا وہ بیسے ہی کے گی، وہ پندرہ مئی منٹ میں پہنچ جائے گا مگر ملاقات میں ان تینوں کے سوا کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے مطابق اس کی سہیلیاں تو اس کی رازدار ہو سکتی ہیں مگر کسی اور کی موجودگی عینی کو بدنام کر سکتی ہے اور وہ اس کی عزت پر کوئی بات نہیں آنے دینا چاہتا۔

زویا نے نفرت سے اس کے پیغام کو دیکھا۔ عزت کی

(قبول) کیے بغیر اس کے بارے میں کچھ جانا نہیں جاسکتا تھا۔

زویا نے گہری سانس لی۔ دو لمحے سوچتی رہی پھر فریڈ شپ ریکویسٹ فولڈر کھول کر اس کی ریکویسٹ کو کنفرم کر دیا اب وہ LOVE TO KILL کے دوستوں میں شامل ہو چکی تھی اس بار جب وہ اس کے صفحے پر گئی تو اسے وہاں موجود پوسٹ اور کافی کچھ نظر آیا۔

اس کا دل ڈرم کی طرح بج رہا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس تک پہنچ گئی ہے اور اسے اس کے بارے میں اب سب کچھ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو جائے گا۔

زویا نے ایڈٹ کے بشن پر کلک کیا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ نہ ہی پورے صفحے پر LOVE TO KILL کی کوئی تصویر موجود نہیں تھی۔ اس نے جو چند پوسٹ کی ہوئی تھیں وہ بھی عام ہی تھیں۔ اگر اس کے اور دوست تھے تب بھی کوئی ایسی سیٹنگ کی گئی تھی کہ زویا انہیں نہیں دیکھ پاری تھی۔

زویا نے مایوسی سے سر ہلایا، یہ طے تھا کہ اس صفحے کے ذریعے اس تک نہیں پہنچا جاسکتا تھا۔ لاگ آؤٹ ہوتے ہوئے اچانک ایک خیال نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

وہ عینی کا فیس بک بیج بھی تو کھول سکتی تھی۔ وہ عینوں ایک دوسرے کے پاس ورڈ جانتی تھیں۔ انہوں نے ایک ساتھ ہی فیس بک پر اکاؤنٹ بنائے تھے۔ تناشائے چند ماہ کے بعد فیس بک کا استعمال بہت کم کر دیا تھا۔ اس کے گھر کے کمپیوٹر میں کچھ خرابی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ فیس بک استعمال نہیں کر پاتی تھی۔ بس یہی عینی کے گھر جمع ہوتے تو وہ تینوں اپنے اپنے صفحے کھولتے تھے۔

اس نے ذہن پر زور دیا... اسے عینی کا پاس ورڈ پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے یاد آ گیا۔ عینی کی تاریخ پیدائش ہی اس کا پاس ورڈ تھی وہ اس کے آگے چند لفظ لکھی تھی، ان کی ترتیب کے بارے میں وہ تو زویا کی کنفیوژن تھی۔ زویا نے اس کی آئی ڈی لکھ کر پاس ورڈ ڈالا مگر وہ غلط نکلا۔ اس نے حرفوں کی ترتیب تو زویا کی بدل کر پھر بیج کھولنے کی کوشش کی۔ اس بار بھی اس کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔

شاید وہ عینی کا بیج نہیں کھول پائے گی۔ اس نے دکھ سے سانس لیا۔

اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر حرفوں کی

اس نے ڈرتے ڈرتے ماؤس کو کھینچا... ایرواب ریکویسٹ کے اوپر تھا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد اس نے فولڈر پر کلک کیا، اگلے لمحے وہ سنی رہ گئی۔

اس کے سامنے وہی انتہائی دہشت ناک اور خوف زدہ کر دینے والا ماسک تھا جس کے ہونٹوں سے خون چک رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا ایس بی نے بتایا تھا۔ اس کے نیچے سرخ رنگت میں LOVE TO KILL کے الفاظ چمک رہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے اس کی کور بکچر اور آئی ڈی کو گھورتی رہی۔ اس کا دل اور دماغ چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ یہ وہی ہے۔ سوال پھر وہی تھا کہ اسے اس طرح ریکویسٹ بھیجنے سے اس کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس سرعت سے اسے تھام کر رہی تھی اور زویا سے بھی رابطے میں تھی۔ زویا یہ سب پولیس کو بتا سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی ریکویسٹ کی موجودگی کے دو ہی مطلب ہو سکتے تھے یا تو وہ یہ تھا ہی نہیں۔ یہ مشکل تھا لیکن یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا اور یا پھر وہ جو بھی تھا، وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتا اور اس کا دوسرا اور واضح مقصد یہی تھا کہ وہ زویا کے پیچھے تھا۔ زویا کا ہاتھ لرزنے لگا۔

اس کے بیج کے فولڈر میں بھی ایک پیغام موجود تھا۔ اس نے کلک کیا اور وہ فولڈر کھل گیا۔

جو کچھ اسکرین پر سامنے آیا تھا، اس پر نظر پڑتے ہی زویا کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کا سارا وجود کسی پتھر کے مانند جامد و ساکت ہو گیا تھا جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے تھا، اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس کے سامنے LOVE TO KILL کا دوسرا پیغام تھا۔

”اچھو! کام اذیت ہوتا اور منزل تک نہ پہنچنا ناکامی... مجھے ناکامی سے نفرت ہے اور میری اصل منزل تم... ہوں صرف تم...“

☆☆☆

دہشت کے پہلے دھچکے کے بعد سنبھلتے ہی زویا نے LOVE TO KILL کا ایف بی صفحہ کھولا۔ صفحے پر اس کی آئی ڈی اور دو کور بکچر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یعنی بات یہی تھی کہ اس صفحے پر خاص سیکورٹی لگی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی فریڈ شپ ریکویسٹ کو ایکسپٹ

سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں بیٹا تم جو جانتی ہو، جو یاد آتا ہے سب بتا دو تاکہ اسے بھلا جا سکے۔ یہ تمہاری حفاظت کے لیے بہت ضروری ہے متاثرہ... اس کی ایسی اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔“

”زویا... زویا کہاں ہے؟“ رخشندہ کو اچانک اس کا خیال آیا وہ دروازے کی طرف نکلیں۔

”ارے تم یہاں کیوں کھڑی رہ گئیں زویا؟“ انہوں نے اسے خود سے لپیٹتے ہوئے اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”تم بھول گئیں آئی نے گھر پر کیا سمجھایا تھا اگر تم رو کی تو وہ اور زیادہ پریشان ہوگی بیٹا، اس کی طبیعت خراب ہے۔ بہت زخمی ہے وہ، پھر جو کچھ اس پر ہوتا ہے وہ بھی جانتی ہو تمہیں ہمت کرنا ہوگی، اس کے سامنے خود پر کنٹرول رکھنا ہوگا ڈاکٹر نے بہت شرائط کے ساتھ اس سے بات کرنے کی اجازت دی ہے۔ زیادہ اسٹریس اس کے لیے بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ دوبارہ کوما میں بھی جاسکتی ہے۔ اسے تو یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ میں نہیں رہی ہے۔ تم... ان کی بات سن کر زویا نے سر ہلایا اور اپنے آنسو رگڑ کر صاف کیے۔

”گڈ گرل... چلو آؤ اندر... تمہاری موجودگی سے اسے ہمت ملے گی شاید وہ تمہیں آسانی سے سب کچھ بتا سکے۔“

زویا ان کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں داخل ہوئی۔ متاشا نے اسے دیکھ کر بے ساختہ اسٹینے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر اور اس کی امی نے اسے روک لیا۔

”متاشا...“ زویا اس کی طرف بڑھی اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ متاشا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر زویا کے لیے بھی خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

”متاشا... پلیز مت روؤ۔ مت ڈرو... یہاں دیکھو سب لوگ ہیں تمہارے گھروالے، میرے گھروالے، پولیس والے، ڈاکٹر... اب تم بالکل محفوظ ہو، کوئی بھی تمہیں انگلی نہیں لگا سکتا۔ ٹھیک ہے نا۔“ وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

متاشا کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی مگر آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”آرام سے... خود پر زیادہ پریش مت لو۔“ ڈاکٹر، متاشا کے ساتھ مل کر شیٹوں پر نظر رکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں... گھبراؤ نہیں متاشا... اگر اس وقت تم سے نہیں بولا جا رہا تو کوئی بات نہیں۔ ہم بعد میں بات کر لیں گے۔ مگر تم پریشان مت ہو۔“ زویا اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔

متاشا نے اس کا ہاتھ مغبولی سے تھام ہوا تھا۔

”زویا... زویا... عینی...“ وہ بے شکل بول پانی تھی۔

زویا ایک لمحے کو کچھ بول نہیں پائی پھر دیر سے بولی۔

”وہ بھی ٹھیک ہے۔“

”نہیں...“ متاشا نے سر ہلانے کی ناکام کوشش کی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”کیا کہہ رہی ہو تم...“ زویا بولی۔

”میرا خیال ہے کہ بہت ہو گیا ہے اب اسے آرام کرنے دیں۔“ ڈاکٹر بولا۔

”ڈاکٹر صاحب اب وہ بول پائی ہے ہو سکتا ہے کہ کچھ بتا پائے۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”ہو سکتا ہے مگر یہ اس کی اپنی صحت کے لیے بہت خطرناک ہو سکتا ہے، اس کی حالت بگڑ سکتی ہے میں نے آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ تھوڑی سی بات کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے صرف ایک دو باتیں اور کرتے دیں۔“

”اوکے اگر مجھے لگا کہ معاملہ بڑھ رہا ہے تو آپ کو فوراً رکنا ہوگا۔“

”عینی نہیں ہے...“ متاشا بے شکل بولی۔

”کیا کہہ رہی ہو... وہ بھی اسپتال میں ہے۔“ زویا اس سے نظر چرا کر بولی۔

”نہیں زویا... اس نے اسے مار ڈالا تھا تم جھوٹ بول رہی ہو... وہ مر گئی ہے۔“ اس کی سانس پھول رہی تھی اور سینے میں ہلکے ہلکے جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

”تم کو کیسے پتا ہے؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔ ”تم اس کو پہچان سکتی ہو؟ کیا تھا وہ...؟“ متاشا...

متاشا ان سوالوں کا جواب نہیں دے پائی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کھٹا ہوا تھا۔ جیسے اسے وہ سب کچھ نظر آ رہا ہو۔ زویا کے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

”تم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا وہ کیسا نظر آتا تھا۔ اس نے یہ سب کیوں کیا؟ اس شام وہاں کیا ہوا تھا؟ بولو متاشا... بیٹا مت کرو۔“

”اس نے... اس نے عینی کو مار ڈالا... وہ عینی کو بار بار

آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی، اس کی آنکھ کھلی تو آئی اس پر بھی ہوئی تھی۔

”آئی کیا ہوا...؟“ آپ رات کو کیوں جاگ رہی ہیں؟“

”رات...؟“ بیٹا صبح کے 10 بجے ہیں، اسپتال سے اچھی خبر آئی ہے زویا...“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”اچھی خبر؟ کیسی اچھی خبر؟“ اس نے چٹوھیائی ہوئی آنکھوں سے آئی کو دیکھا۔

”اسپتال سے فون آیا تھا متاشا کو ہوش آ گیا ہے زویا...“

”کیا...؟“ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی۔

”ہاں... اسے ہوش آ گیا ہے۔ پر وہ کچھ بول نہیں پارہی ہے۔ ڈاکٹر زکا کا خیال ہے کہ تمہاری موجودگی اس کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔“

”اور شکر ہے اللہ کا، میں تیار ہو رہی ہوں۔ ہم ابھی چلیں گے نا...“ زویا تیزی سے بستروں سے نکلے ہوئے بولی۔

اس لمحے عینی کا فیس بک پیج، اس کے پیغامات LOVE TO KILL سب کچھ اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

وہ بس فوراً متاشا کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔

متاشا کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔

وہ بے شکل آنکھیں کھول رہی تھی۔ ان آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے جن میں خوف و ہشت، بے بسی ملی ہوئی تھی۔ سر پر بندھی بیڈوں اور گنگے میں موجود کارکنی وجہ سے وہ اپنے سر کو حرکت نہیں دے پارہی تھی۔ اس کا ایک بازو پلاسٹر میں تھا اور دوسرے پر بھی چوٹوں کی وجہ سے بنایا موجود تھا۔ اس کی ایک ٹانگ تین جگہ سے فربج تھی اور اس وقت پلاسٹر میں تھی۔ تکلیف گویا اس کے چہرے پر تحریر تھی۔

زویا دروازے پر کھڑی اسے ایک تک دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھیں متاشا کی حالت دیکھ کر آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ رخشندہ اور باقی سب کمرے میں چلے گئے تھے مگر اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے بیٹا کہ تم تکلیف میں ہو، اس سب کو یاد کر کے تمہیں زیادہ تکلیف ہوگی مگر تمہارا بولنا، سب کچھ بتانا بہت ضروری ہے اگر تم نہیں بولو گی تو ہم اس تک کیسے پہنچیں گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟“ ڈی ایس پی باقر بہت نرمی سے کہہ رہی تھی۔

اس نے عینی کے فیس بک پیج پر موجود چیٹ کو کالی کر کے ڈیلیٹ ٹاپ پر محفوظ کر لیا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر اس کی نظر سامنے لگے والے ہال پر گئی۔ صبح کے چار بج رہے تھے، اس کی آنکھوں سے نیند اب بھی غائب تھی۔ بستر پر لیٹے ہوئے اس کا خیال تھا کہ شاید وہ صبح تک سوئیں پائے گی مگر پھر نہ جانے کس وقت نیند کی مہربان دیوی نے اسے اپنی بانہوں میں پناہ دے دی تھی۔

ابھی اس کی آنکھ کھلی تھی کہ اس نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

”زویا... زویا اٹھو بیٹا...“ دور سے آئی آواز

بات وہ کر رہا تھا جس نے عزت کے ساتھ اپنی عینی کی زندگی کو بھی چھین لیا تھا اور وہ بھی اس قدر تکلیف دہ اور ہشت کے عالم میں... اس کی بڑی طرح... وہ جھنجھوڑی سی لے کر رہ گئی۔ عینی کے الفاظ کی وارننگ سے یہ لگ رہا تھا کہ وہ اکثر اس سے بات کرتی ہوگی مگر وہاں صرف ایک چیٹ تھی۔ زویا کے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کا جواب چیٹ کے آخری جملے میں موجود تھا جس میں LOVE TO KILL نے عینی کو تاکید کی تھی کہ وہ اس کی اس چیٹ (کنٹیکٹ) کو پڑھنے کے بعد ڈیلیٹ (مٹانا) کر دے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ عینی پر بھی انگلی اٹھائیں۔ عینی نے لکھا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہے اور اس کی ہر چیٹ کو مٹا دیتی ہے مگر پتا نہیں کیوں... اس نے اس کی آخری چیٹ کو ڈیلیٹ نہیں کیا تھا۔

زویا کو اس شخص سے انتہائی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کس قدر چالاکی سے عینی کو اپنے جال میں پھنسا تھا اور کس قدر مکاری سے اپنے عیاذ و گمگن بنایا تھا اور وہ سادہ دل لڑکی اس کی کسی چال کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔

اس ایک چیٹ کے علاوہ اس کے پورے صفحے پر LOVE TO KILL کے حوالے سے کچھ بھی نہیں تھا۔

حتیٰ کہ وہ اس کے فرینڈز لسٹ پر بھی نہیں تھا۔ یقیناً اس نے عینی کو مارنے کے بعد اسے پوری طرح ہلاک کر دیا تھا تاکہ اگر کبھی کوئی عینی کا صفحہ کھول بھی لے تو اس سے اس کا تعلق نہ جوڑ پائے۔ یہ الگ بات ہے کہ عینی وہ آخری چیٹ نہیں مٹا پائی اور یوں حقیقت کھل کے سامنے آگئی تھی۔ زویا کو اب سو فیصد یقین تھا کہ یہ وہی مامک والا تھا جس نے اسپتال میں حملہ کیا تھا اور اب وہی اس کی پیغامات بھیج رہا تھا۔

وہ متاشا کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔

اور زویا یقیناً اس کا نشانہ تھی۔

اسے یہ سب ایس پی جعفر اور سب کو بتانا تھا شاید یہ سب تفتیش میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

اس نے عینی کے فیس بک پیج پر موجود چیٹ کو کالی کر کے ڈیلیٹ ٹاپ پر محفوظ کر لیا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر اس کی نظر سامنے لگے والے ہال پر گئی۔ صبح کے چار بج رہے تھے، اس کی آنکھوں سے نیند اب بھی غائب تھی۔ بستر پر لیٹے ہوئے اس کا خیال تھا کہ شاید وہ صبح تک سوئیں پائے گی مگر پھر نہ جانے کس وقت نیند کی مہربان دیوی نے اسے اپنی بانہوں میں پناہ دے دی تھی۔

ابھی اس کی آنکھ کھلی تھی کہ اس نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

”زویا... زویا اٹھو بیٹا...“ دور سے آئی آواز

مشکوک

پولیس نے ایک دیہاتی سے کہا۔ ”آپ کے ارد گرد اگر کوئی مشکوک شخص رہتا ہے تو پولیس کو فوری اطلاع کریں۔“

دیہاتی نے جواب دیا۔ ”میرا پڑوسی وقت پر دفتر جاتا ہے۔ کام ایمان داری سے کرتا ہے۔ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں۔ رشوت نہیں لیتا۔ جھوٹ نہیں بولتا اور ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ اس کو چیک کریں..... وہ مجھے پاکستانی نہیں لگتا۔“

زاہد صادق... لاہور

اپنا اور عینی کا فیس بک پیج.... کھولے گی۔ میں وہ ماسک دیکھنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ عینی کے ساتھ چیٹ اور زویا کے کس میں موجود پیج اور یہ سب کے سب بہت اہم ہیں اور وہ مسکاتے ہیں کہ اس فیس بک پیج سے اس کا آئی بی ایڈریس نکالا جائے ہم اس طرح اس تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”آپ کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں زویا کو کسی اور شہر اپنے عزیزوں کے پاس بھیج دوں، جب خطرہ کم ہو جائے تو اسے واپس بلایا جائے“ بابا نے پوچھا۔

”نہیں۔“ زویا اور اس بی بی ایک ساتھ بولے۔

”نہیں احمد صاحب، اس طرح آپ زویا کو مزید خطرے میں ڈال دیں گے۔ یہاں آپ اور ہم ہیں جو اس کی حفاظت کی کوشش کر رہے ہیں وہاں کسی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی اور یہ کوئی حل بھی نہیں ہے۔ اس کس میں آسیب گھر میں نہیں ہے کہ گھر بدل لیا جائے۔ یہاں آسیب اس کے پیچھے ہے اور میں اپنا خدشہ ظاہر کر چکا ہوں، ہمارا سامنا ایک نفسیاتی مریض سے ہے۔ خطرہ صرف اس کی گرفتاری یا موت کی صورت میں ہی مل سکتا ہے۔“

”میں اور ہم بہت خوفزدہ ہیں ایس بی صاحب۔“ احمد صاحب ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”زویا کو ذرا بھی کچھ ہو یہ ہم تصور میں بھی نہیں سوچنا چاہتے۔“

”میں سمجھتا ہوں... میں خود دو بیٹوں کا باپ ہوں اور زویا میری تیسری بیٹی ہے، میں اس کے تحفظ کے لیے ہر حد تک جاؤں گا۔“ ایس بی نے جواب دیا ”میں یہ نہیں کہہ

اپنے پلان پر دوبارہ نظر ثانی کرنا ہوگی۔“

”بھیل کیا کرنا ہوگا؟“ بابا سخت پریشان ہو گئے۔

”سب سے پہلے تو آپ یاد بھیجیے کہ ابھی یا پہلے نہیں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس میں زویا بھی شامل رہی ہو۔ کوئی دشمن یا کوئی ایسا شخص جس پر آپ کو شک ہو؟“

”نہیں مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں آ رہی اس بی بی...“ وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ ”ہماری کوئی ایسی دشمنی نہیں ہے۔ سیدھی سادی زندگی ہے... پتا نہیں یہ کون ہے جو میری بیٹی کا دشمن بن گیا ہے۔“

”آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، بس ہمیں بہت محتاط ہونا پڑے گا اور آپ اسکیلے نہیں ہیں ہمارا ڈیٹا مینٹ آپ کے ساتھ ہے اگر آپ جا میں گئے تو ہم آپ کے گھر پر سیکورٹی بھی لگا دیں گے۔“

”مکرم تک ایس بی بی؟“ ایس بی تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ کون ہے کہاں سے حملہ آور ہوگا؟“ آئی پولیس۔

آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر یاد نہیں کہ مجرم ہمیشہ کوئی نہ کوئی غلطی کرتا ہے اور آخر کار پکڑا جاتا ہے یہی قدرت کا قانون ہے، ہمیں بھی جلد ہی کوئی سراغ ملے گا... بس ہمیں اتنا محتاط کہ وہ زویا تک نہ پہنچ جائے۔“

”آپ کچھ غلط کہہ گئے ہیں ایس بی صاحب“ زویا کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔ ”وہ مجھ تک پہنچ جائے یا نہیں... یہ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر میں اس تک پہنچ کر رہوں گی۔“

”پاکل ہو مٹی ہو تم۔“ رخشندہ نے تڑپ کر سیٹی کو قھام لیا۔

”نہیں، ماما! میں سچ کہہ رہی ہوں میں کسی حد تک اس تک پہنچ سکتی ہوں۔“

اس کے اس انکشاف سے کمرے میں ایک لمحے کے لیے سکوت ساطاری ہو گیا۔

☆☆☆

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسی آئی ڈی سے تمہیں بھی پیغام بھیجے جارہے ہیں جس سے عینی سے بات کی جارہی تھی اور اس کا کوئی کچھ وہی ماسک ہے جو میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا؟“

ایس بی جعفر زویا کی پوری بات سن کر خوشی کے عالم میں بیٹھ سے نیچے اتر آیا تھا۔

”بہت بڑا سراغ ہے اور ہم اس کے ذریعے ہی اس تک پہنچ جائیں گے۔ باقر تم لپ ٹاپ لاؤ زویا بیٹی

کہ کس طرح آئی نے اس کے ہاتھ سے بے ہوش متاشا کا ہاتھ الگ کیا اور اسے سہارا دے کر کمرے سے باہر لے آئیں۔

☆☆☆

”سب کچھ اب زیادہ اچھل گیا ہے۔“ ایس بی جعفر ساری بات سن کر کچھ سوچتے ہوئے بولا ڈی ایس بی باقر متاشا کے کمرے سے نکل کر ان کو ایس بی جعفر کے کمرے میں لے گیا تھا۔ ایس بی اب خاصی بہتر حالت میں تھا۔ اس کی گردن پر بڑا بینڈج موجود تھا زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری چہرے پر عیاں تھی مگر وہ ذہنی طور پر بالکل مستعد تھا اور اس وقت اسپتال کے بیڈ کے سر ہانے کو خاصا بلند کروا کر کھانے کی سلائڈر میز کو درکنگ ٹیبل بنا کر دفتر سجائے بیٹھا تھا۔

”اب تو منظر کچھ یوں بن رہا ہے کہ اس کا اصل ٹارگٹ شروع سے ہی زویا تھی اس کے لیے اس نے عینی کو بھانسا تھا۔ اس سے محبت کا تعلق جوڑا تھا مگر اس کا نشانہ زویا ہی تھی جب وہ وہاں پہنچا تو زویا کو نہ پا کر اس کا دماغ محسوس کیا۔ ان دونوں بچیوں کو بھی شاہ شایب ہے کہ انہوں نے آخری دم تک دوستی نبھائی اور زویا کو فون نہیں کیا۔ اس نے متاشا کو زخمی کر کے ڈالا۔ عینی کو ڈرایا، دھمکایا، تشدد کیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شاید وہ وہیں تھا جب زویا اور احمد وہاں پہنچے اور اسے بھاگتا ہوا دیکھا۔ اگر یہ وہاں نہ پہنچتے تو وہ متاشا کو بھی قتل کر دیتے وہاں سے نکلتے۔“

”جی ہاں سر، ایسا ہی ہوا ہے کیونکہ جب ہم پہنچے تو وہ وہیں تھا، ہم نے اس کے بھاگنے کی آواز نہ سنی تھی۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں نے زویا کو اکیلے نہیں جانے دیا آخری لمحے میں مجھے خیال آیا کہ اندر اندر حیران رہا۔ وہ نہ نہ جانے کیا ہو گیا ہوتا۔“ احمد گویا لرز کر بولا۔

”سچ ہے جسے خدائے اے کون چکھے۔ زویا کو شام تک وہیں رکنا تھا مگر ماں کی بیماری کی وجہ سے جلد نکل آئی۔ دوسری بار وہ ایک گھنٹے بعد ہی کتابیں لینے جارہی تھی مگر اجازت نہ ملی اور تیسری بار جب وہ احمد کے ساتھ وہاں پہنچا اور احمد نے آخری لمحے میں اس کے ساتھ اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ قدرت نے ہر قدم پر زویا کا ساتھ دیا۔“ ایس بی بولا۔ ”مگر ایسا ہمیشہ ہو، یہ بھی ضروری نہیں ہے اگر اس کا نشانہ زویا ہے تو وہ کچھ نہیں ہے گا۔ اس طرح کے نفسیاتی مریض اپنے ٹارگٹ کو بھی نہیں بھولتے اور اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ زویا شاید ہی خطرے میں ہے۔ ہمیں

بار جو کرنے کو کہہ رہا تھا وہ منع کر رہی تھی۔“ وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولی۔ ”اس نے مار ڈالا۔ وہ گری، ہر طرف خون ہی خون تھا۔“

”کیوں؟ کیوں کیا اس نے یہ سب؟ کس لیے... متاشا یاد کرو... کیا تھا وہ؟ تم جانتی ہو اس کو؟ پہلے بھی دیکھا تھا؟“ ایس بی نے زری سے پوچھا۔

”نہیں... نہیں جانتی... میں دیکھا تھا مگر بہت بہت بُرا تھا۔“ وہ ایک ایک کر بولی۔ ”یعنی بہت پیچ رہی تھی میں کمرے سے بھاگ کر وہ میرے پیچھے آیا۔ اس نے میرے سر پر کچھ مارا... میں گرتی تھی... بہت درد تھا۔ بہت سخت درد... اب بھی ہورہا ہے... وہ کراہی... میں... میں اس چوٹ سے زمین پر گر گئی... میرا اعبر... میرا اعبر مڑ گیا تھا ہاتھ میں بھی چوٹ لگی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ عینی سے سخت کر آئے گا۔ پھر مجھے دیکھے گا۔ اور میرے سر پر پھر کچھ مارا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔“

”کیوں... وہ کیا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسے کیا چاہیے تھا بولو متاشا...“ ڈی ایس بی نے پوچھا۔

”بس آفیسر... اس سے زیادہ نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”صرف ایک سوال... بولو متاشا... ذہن پر زور دو، وہ کیا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسے کیا چاہیے تھا؟ عینی نے کیا کرنے سے انکار کیا تھا؟ اسے کیا درد تھا؟“ ڈی ایس بی کے مسلسل سوال متاشا کو بھیاں میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ آنکھیں خوف اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے جھلکی ہوئی تھیں۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا، اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی پھر اپنا لڑتا ہوا چوٹوں سے بھرا ہاتھ بلایا۔ اس کی انگلی کارن زویا کی طرف تھا۔

”وہ... وہ زویا کا پوچھتا رہا اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ وہیں چلی گئی ہے تو وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے عینی کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ وہ رورور بھی مچتی رہی تھی۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ زویا کے گھروں کو اسے اسے بھانے سے بلائے... یعنی منع کر دیا۔ اس... اس نے کہا کہ وہ زویا کو مرنے نہیں دے گی۔“ متاشا بے حال ہو گئی۔ اب اس سے بولا تک نہیں جا رہا تھا۔

”بس سب باہر چلیں۔“ ڈاکٹر نے تیزی سے آگے آتے ہوئے کہا۔

سب فوراً کھڑے ہو گئے مگر زویا، متاشا کا ہاتھ تھامے وہیں بے حس و حرکت بیٹھی رہی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا

جاسوسی ڈائجسٹ 248 جنوری 2016ء

www.pdfbooksfree.pk



پاکیزہ

ماہنامہ
کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں، بہار، خزاں کی... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی جنوری کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کرے بک کروالیں

حوصلے نے لے لی تھی۔ اس کے ساتھ گہرا دکھ تھا۔ یعنی اپنی جان دے کر بھی اس کی حفاظت کی بھی لاکھ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے کی قیمت پر نہیں چھوڑے گا مگر وہ زویا کو بلانے کا وقت کے لیے کئی گھنٹوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے آخری پوسٹ کوچ کر دکھایا تھا۔ تو زویا کے دم گھر تھرا اساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

مینی میں وعدہ کرتی ہوں وہ مرے گا ضرور پکڑا جائے گا میں بھی اس دوست کو کبھی نہیں توڑوں گی... وہ دل ہی دل میں بولی۔

رات وہ کافی جلد سوئے، لیے لیٹ گئی تھی۔ پچھلی رات کی نیند اور سارے دن کے اعصاب شکن انتظار نے یوں بھی اسے تھکا ڈالا تھا۔ رشتہ اس کے سونے تک وہیں بیٹھی رہی تھیں۔

صبح اس کی آنکھ کسی مسلسل آواز سے کھلی تھی۔ کہیں بہت دور کوئی بہت جانی پہچانی دھن بج رہی تھی پھر آہستہ آہستہ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اسے اس دھن کو شناخت کرنے میں ایک لمحہ لگا تھا۔ موسیقی خوبصورت سروں میں پیٹی برتھ ڈے نو پوٹکنار تھی۔ زویا نے سلیمز میں پاؤں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلی۔ ان کا لاؤنج گھر کے درمیان... پنا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہاں دن میں بھی لائٹ جلاتا پڑتی تھی۔ اس وقت لاؤنج کی لائٹ بند بھی شاید سب سو رہے ہیں۔ اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر سوچ دیا۔

تھک کی آواز کے ساتھ ہی کمراروشنی اور آوازوں سے بھر گیا تھا۔

”پتی تجھ ڈے نو یو زویا۔ سالگرہ بہت مبارک۔“ بابا نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

لاؤنج کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر رنگ برنگے حروف میں اس کے نام کے ساتھ سالگرہ مبارک تحریر تھا۔ شاید اسی لیے رشتہ اسے کمرے میں لے گئی تھیں۔ وہ مسکرائیں اور مہما کے گلے لگ گئی۔

وہ خود اپنی سالگرہ کو بھول گئی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل خوشی سے بھر گیا اسے اللہ نے ماں باپ، پیار کرنے والے بھائیوں کی شکل میں جو تحفہ دیا تھا وہ کیسے اس کا شکر ادا کر سکتی تھی؟ اس نے دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

پھر اس کے سینے میں درد کی لہری اٹھی تھی۔ یعنی اور

کو سزا مل سکتی ہے میرے اور منشا کے سر پر لٹکتی اس کو سزا سے نمٹا جاسکتا ہے آپ سوچے کیا میں ساری زندگی گھر کے اندر بیٹھی رہوں گی اور اس نے مینی کو تو اس کے اپنے گھر میں مار ڈالا تھا۔۔۔ ماما مجھے کچھ نہیں ہوگا، ایس بی انکل مجھ کہہ رہے ہیں... یہ بی بی میں نے بھی سوچا تھا۔۔۔ زویا ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ آپ سب کے ساتھ ہوتے، ایس بی انکل کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”جیتی رہو بیٹی۔“ ایس بی نے کہا۔ ”آپ سب ہم پر اعتماد کیجئے پلیز!“

”آپ کا پلان کیا ہے؟“ اصر نے پوچھا۔

”زویا اسے ملنے کے لیے بلائے گی اور پھر ہم اسے پکڑ لیں گے۔۔۔ یہ دیکھنے میں خاصا آسان اور سادہ لگ رہا ہے مگر جس قدر وہ چالاک ہے اس حساب سے ہمیں بہت محتاط رہ کر سب کچھ کرنا ہوگا۔“

”میں اسے کل ہی ملنے کو کہوں؟“ زویا نے پوچھا۔

”نہیں... اتنی تیز رفتاری اسے مشکوک کر دے گی تم صرف ملنے کے لیے رضا مندی کا اظہار کرو گی۔ اس کے بعد وہ کیا کہتا ہے کتنی جلدی ملنا چاہتا ہے، یہ سب اس پر چھوڑ دینا۔ اس کے پہلے پلان پر ہم منع کر دیں گے تاکہ اسے بالکل شک نہ ہو اور پھر ماں جا میں گئے مجھے کئی نا اور تم اس کو کوئی نتیجہ مجھ سے بات کیے بغیر نہیں سمجھو گی... سمجھتی نا؟“

”جی...“

”ہمیں مجبوراً یہ سب کرنا پڑ رہا ہے مگر میں تمہیں ذرا سے خطرے میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔“

زویا نے وہیں LOVE TO KILL کو ملنے کی بات نتیجہ سمجھا۔ انہوں نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ لاگ آف ہو گئی۔

اب اگلا نتیجہ اس کے جواب آنے کے کم از کم دو گھنٹے بعد دینا ہے تاکہ اسے تم پر شک نہ ہو۔“ ایس بی نے تاکید کرتے ہوئے کہا ”نتیجہ دیکھتے ہی تم مجھے بتاؤ گی۔“

”شک ہے ایس بی انکل... میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔۔۔ بس اسے پکڑا جانا چاہیے اسے نہایت سخت سزا ملنی چاہیے۔ شاید اس سے مینی کی روح کو سکون مل سکے۔“

شام تک اس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ رشتہ اسے لمحے بھر کو بھی تنہا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ وہ ان کے خوف کو سمجھ رہی تھی مگر عجیب بات یہ تھی کہ اب اسے ذرہ بھر بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ذرہ کی جگہ ایک عجیب بلکہ الگ قسم کے

سکتا کہ آپ بے فکر رہیں آپ کو کبھی بہت محتاط رہنا ہوگا۔ لیکن ہمیں کچھ بھی کر کے اس درندے کو پکڑنا ہوگا ورنہ وہ مزید نہ جانے کتنی مینی اور منشا کی جانوں سے کھیل جائے گا اور احمد صاحب ہر مینی اپنے باپ کو اور خاندان کو اتنی ہی بیماری ہوئی ہوگی جتنی آپ کے لئے زویا ہے۔“

”جی بابا... اور آپ یقین کریں کہ میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوں اب... ہاں مفروض ہوں مینی کے پیاری... بابا اس نے اتنا کچھ سہا مگر مجھے فون نہیں کیا... وہ کچھ کچھ جی کر وہ اس صورت میں ہم تینوں کو ختم کرے گا... بابا ہمیں اسے پکڑنا ہوگا۔“

”شکریہ زویا میں تمہاری ہمت کے لیے تمہارا مشکور ہوں... اس راستے میں ہمیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت پڑنے والی ہے۔“

LOVE TO KILL کی کوفو نو دیکھ کر ایس بی کا ہنرہ نفرت سے بھر گیا تھا۔

”یہ... یہ بی بی ہے وہ ماما کے جو اس نے پہن رکھا تھا۔ میں نے کہا تھا یا مجرم کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے اور وہ بی اس کے لیے کافی ہوئی ہے۔“ زویا نے اپنی آئی ڈی کھولی تو نتیجہ بس میں اس کا ایک اور پیغام موجود تھا۔

”دوست بنانے کا شکریہ... مگر دوست ملنے بھی تو ہیں۔“

زویا نے ایس بی کی طرف دیکھا، اس نے سر ہلایا پھر ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ”تم اس کو نتیجہ بھیج دیا کہ تم اس سے ملنا چاہتی ہو۔“

”آپ کے ذہن میں کیا ہے؟“ آئی نے پوچھا۔

”اس کا خاتمہ اور اس کے لیے ہمیں ہانکا لگانا پڑے گا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اور اس ہانکے میں آپ قربانی کا بکرا میری بیٹی کو بنا دیں گے، میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔“ رشتہ نے ہنسنے کے لیے لہجہ میں کہا۔

”زویا ہم بس کی بیٹی سے سزا دے رہے ہیں اور یہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ زویا کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے پاس اس سے بہتر یا قابل عمل پلان موجود ہے تو بتائیے۔“ ایس بی نے ان کی طرف دیکھا۔

”مجھے یہ نہیں معلوم مگر اس سب میں بہت خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ماما... مگر اس سب کے نتیجے میں سب کچھ شک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ پکڑا جاسکتا ہے۔ یعنی کے قاتل

ہوں جو بیچ میں کود جائے گا مگر مجھے میری بہن کے لیے اتنا کرنے دیجئے۔ میں ہیملٹ بہن لوں گا اور یوں میرا بیچنا جانا بھی ناممکن ہوگا۔

”ٹھیک ہے پر بہت محتاط رہنا ہوگا اسے شک نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔“ ایس بی نے باہل تا خواست اجازت دے ہوئے کہا۔

زویا پانچ میں پانچ بج کر پریسٹونٹ پہنچ گئی تھی۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی اس لیے سامنے موجود میز پر جا کر بیٹھ گئی۔ پروگرام کے مطابق اسے خود زویا سے رابطہ کرنا تھا۔ یہاں تنہا بیٹھ کر اسے تھوڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اسے تو اس شخص کا نام تک معلوم نہیں تھا جس سے ملنے وہ یہاں تک آئی تھی۔

دس منٹ کے انتظار کے بعد اسے ایک شاندار شخصیت کا مالک شخص اپنی طرف آنا نظر آیا۔ وہ کہیں سے بھی قاتل نہیں لگ رہا تھا۔

”ایلیکسیو زی... آپ زویا احمد ہیں؟“ وہ اس کے قریب پہنچ کر معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا۔

”جی... اور آپ...؟“

”میں وقاص کا دوست ہوں... جس کو آپ سے

اس کا موبائل، اس کی سم نہیں اس کی ہر حرکت کے بارے میں انفارمیشن دیتی رہے گی۔“ ایس بی جعفر نے بابا، اجڑ اور رخشندہ کو مشکل سمجھایا۔

زویا بالکل خوف زدہ نہیں تھی، ایک تو اس نے ڈراموں وغیرہ میں اس ساری اسٹریٹیژی کو کامیاب ہوتے دیکھا تھا دوسرے وہ اس شخص کو پکڑوانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

ملاقات کے لیے شام ساڑھے چار بجے کا وقت طے ہوا تھا اور پروگرام کے مطابق زویا کو چار بجے گھر سے نکلتا تھا۔ اس نے پریسٹونٹ تک رکشے کے ذریعے جانا تھا کیونکہ انہیں LOVE TO KILL کو یہی تاثر دینا تھا کہ وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملنے جا رہی ہے۔

”ٹھیک ہے، اسے جانے دیں، پولیس یقیناً ارد گرد ہوگی اور میں بھی موٹر سائیکل پر ٹھوڑے فاصلے پر وہیں رہوں گا۔ پہلے رکشے کے ساتھ اور پھر پریسٹونٹ میں۔“ اصرار بولا۔

”مگر...“ ایس بی نے کچھ کہنا چاہا۔

”پلیز ایس بی صاحب، یہ بات آپ کا ماننا ہوگی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”میں کوئی بے وقوف ہیر نہیں

مت کہنا اور یہ تحفہ بزرگ کی دعا ہے حفاظت کے لیے پہنے رکھنا۔“ ان جملوں کے ساتھ فون بند ہو گیا تھا۔

”جعفر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔“ بابا کے تبصرے کے بعد اسی موضوع پر گفتگو ہوئی ابھی تھی اس دوران ہی سب کے سامنے زویا نے LOVE TO KILL کے پیغام کا جواب دے دیا تھا۔

دوسری طرف مکمل خاموشی تھی لہذا وہ لاگ آؤٹ ہو گئی تھی۔ اب اسے صرف انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

ایس بی جعفر کا تحفہ خوب صورت سلور ٹاپس تھے ان میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ زویا کو وہ دیکھتے ہی پسند آئے تھے اور رخشندہ نے اسی وقت اس کی بالیاں اتار کر انہیں اس کے کانوں میں پہنا دیا تھا۔ زویا نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ یہ بالیاں ان کی اسی کا تحفہ تھیں اور وہ زویا کو انہیں اتارنے کی اجازت بہت مشکل سے دیتی تھیں۔

”جعفر بھائی نے کہا ہے کہ یہ حفاظت کے لیے ہیں۔ انہیں پہن لو زویا۔“

مال کا دل عجیب ہوتا ہے بچے کی حفاظت کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں آج کوئی یہ کہنا کہ ان کی بیٹی کی حفاظت کے لیے انہیں کتنا ہی مشکل کام کرنا ہے تو وہ کر جائیں، یہ تو صرف اپنی سن پسند بالیاں اتار کر نہیں پہناتا تھا۔

انسپیکٹر کی لائی سم کو رخشندہ کے فون میں ڈال دیا گیا تھا اور ایس بی کے مشورے کے مطابق زویا نے اس کا نمبر بھی LOVE TO KILL کو شیئر کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ پورا دن انتظار میں گزر گیا تھا۔ اگلی صبح فیس بک پر اس کا پیغام موصول ہوا تھا۔ جس میں اس نے زویا کو شام میں ساحل سمندر پر بنے ایک ریسٹورنٹ میں بلایا تھا۔

ایس بی کے کہنے کے مطابق زویا نے اس ملاقات کے لیے ہاں کر دی تھی۔

”مگر یہ اکیسے وہاں کیسے جائے گی؟“ رخشندہ اس پلان کو ماننے کے لیے بمشکل راضی ہوئی تھیں مگر اس مدد سے پرانہیں سخت اعتراض تھا۔ ”ایک طرف تو ہمیں اتنا محتاط رہنا ہے کہ ہم اسکول بھی اکیلا نہ بھیجیں اور اب اسی سے ملنے اتنی دور اکیلا بھیجتا؟“

”وہ صرف بظاہر اکیلی ہوگی، راستے میں اور ریسٹورنٹ میں بھی اس کے گرد ہمارے لوگ ہوں گے پھر

متاثر ہوگا۔ اس کی سالگرہ کی صبح اس کے گھر آتے تھے۔ اور وہ ان کے گھر جایا کرتی تھی۔ اب شاید کبھی بھی سب کچھ پہلے جیسا نہیں ہو سکتا، اور شاید یہ درد بھی ہمیشہ اسی طرح رہنے والا ہے، اس نے سوچا۔ دوپہر میں اس نے LOVETO KILL کا پیغام دیکھا۔

”میں تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہمیشہ سے یہ ہی میری آرزو تھی۔ آج کل سنی ہو؟ آج تو تمہاری سالگرہ بھی ہے نا؟ شام میں کہیں؟ جگہ ملے کر لیتے ہیں تم صرف ہاں کہو۔“

زویا کے منہ کو دیکھتے ہی اصرار نے ایس بی جعفر کا فون ملایا۔

”ہاں میں نے بھی ابھی میسج دیکھا ہے۔“ زویا کے ”ایف بی کا پاس ورڈ وہ کرشتر روز لے چکا تھا“ وہ صرف ایک لمبے کوآن لائن ہوا تھا، یوں لگتا ہے کہ یہ پیغام ابھی اس نے پہلے لکھا تھا بعد میں یہاں کا پی کیا ہے وہ توجہ بھیجے ہی آف لائن ہو گیا تھا وہ چیٹنگ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ بہت چالاک انسان ہے، اسے خطرہ ہوگا کہ کہیں کوئی اس طرح اسے ٹریس نہ کر لے۔ میں نے اسی لیے اس کے پیغام کا جواب نہیں دیا کہ کہیں لفظوں، انداز یا کسی بھی اور چیز سے وہ مشکوک نہ ہو، تم خود اس کے میسج کا جواب دو گی۔“

”کیا جواب دوں؟“ زویا نے پوچھا۔

”منہ کر دو، لکھ دو کہ آج ممکن نہیں ہے۔ گھر والوں کا پروگرام ہے اور یہ بھی لکھو کہ تم نے منہ کر کے سالگرہ پر موبائل لیا ہے اور تم اسے کل اپنا نمبر دو گی اور کل ہی ملنے کا پروگرام بھی بتاؤ گی۔“

”ٹھیک ہے... مگر میرے پاس موبائل نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”مل جائے گا، ابھی ہمارا ایک انسپیکٹر ایک سم دے کر جائے گا، اسے تم بھی موبائل میں لگا کر اپنے پاس رکھو گی۔ اس سے ہم اسے ٹریس کرنے کی کوشش کریں گے اور تم بھی ہمیں نظر آتی رہو گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ زویا بولی۔

”اور ہاں، سالگرہ مبارک، تمہارا تحفہ بھی ساتھ آ رہا ہے میں چاہوں گا کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تم اسے ضرور استعمال کرو۔“

”کیا چیز ہے؟“ زویا نے پوچھا۔ ”اور آپ نے خواہ مخواہ کیوں تکلیف کی۔“

”تم کو میں نے بتا دیا ہے اس لیے یہ بات آئندہ جاسوسی ڈائجسٹ 252۔ جنوری 2016ء

ہر شمارہ خاص نمبر

لیکن خاص نمبر کی بات ہی کچھ اور ہے

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری 2016ء

پراسرار نمبر

انتہائی چونکا دینے والے، حیرت زدہ اور لرزادینے والے واقعات

ایک ایسا شمارہ جسے آپ مجلد کر کر رکھنے پر مجبور ہو جائیں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرالیں

جاسوسی ڈائجسٹ 253۔ جنوری 2016ء

یہاں ملے آتا تھا۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس نے شانسی سے پوچھا۔

”جی ضرور۔“ تو اس کا نام وقاص ہے۔ اس نے سوچا۔ ”وہ خود نہیں آئے؟“

”نہیں، اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے اسپتال میں ہے وہ۔۔۔“

”اوہ۔۔۔ بہت افسوس ہوا۔“ زویا کچھ کچھ نہیں پاری تھی کہ اب کیا کرے۔۔۔ سارے وقت کے منافع ہونے کا افسوس الگ تھا اور اب پتا نہیں کب مل پاتا وہ؟

”جی۔۔۔ مگر وہ آج ہی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اسپتال میں تھوڑی بہت گفتگو ہو رہی تھی ہے نا۔۔۔ اگر آپ کو شکیں لگے تو میں آپ کو اسپتال لیے چلا ہوں۔“

زویا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے، ایک لمحے وہ اس کو دیکھتی رہی۔

”شاید آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے کوئی بات نہیں، میں چلتا ہوں۔“ وہ غصا ہونے لگا۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ وہ بالآخر بولی۔ ”میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔“ اس نے لمحے بھر میں فیصلہ کر لیا تھا۔ پولیس اور بھائی سب تو اس کے ساتھ تھے ایسے میں یہ چانس لینا اسے ٹھیک لگ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر چلیں۔“ اس نے کہا۔

زویا بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے پیچھے چلتے اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گونج رہا تھا۔ پولیس والے اور احمر اسے دیکھ رہے ہوں۔ ویسے تو وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے فون سے بھی اس پر نظر رکھی جا رہی ہے مگر پھر بھی اس کا دل ڈرم کی طرح بچ رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اسے ارد گرد کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ قافلے پر ہوں اس نے سوچا اور گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ کار اس کے پیچھے ہی چل پڑی تھی۔

☆☆☆

”یہ غلط ہوا ہے۔“ ایس پی جعفر نے اپنے ہاتھ پر دوسرے ہاتھ سے مکا مارتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر سامنے موجود کمپیوٹر کی اسکرین پر جمی تھی۔ جہاں ایک ہرا نقطہ سر کر رہا تھا یہ نقطہ درحقیقت زویا کا موبائل تھا جو ان کے سفر کی سمت اور پوزیشن بتا رہا تھا۔ ایس پی کے کان پر بلیو ٹوٹھ موجود تھا اور وہ مسلسل اس پر کسی کو ہدایات دے رہا تھا۔

”ٹھیک ہے اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دینا اور۔۔۔ احمر کہاں ہو؟ کیا وہ کار تہارہ کی نظر میں ہے؟ گڈ، مگر اس سے خاصے فاصلے پر رہنا، اس کو ہرگز شک نہیں ہوتا چاہیے۔ زویا اس کار میں ہے اور اس لڑکے کے بارے میں ہمیں اب کچھ نہیں معلوم۔۔۔ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ساری کیم بہت فاصلے سے پیچھے رہے گی۔ متبادل کے طور پر موبائل سے ٹریکنگ ہو رہی ہے کنٹرول روم آپ کے ساتھ ہے گا اور جہاں یہ کہیں گے لوکیشن بتادی جائے گی۔ آپ سب نے یہاں پہنچنا ہے۔ فی الحال دور سے چھپا کر رہیں اگر ممکن ہو۔“ سب کو ہدایات دے کر اس نے گہری سانس لی۔

”یہ شخص بہت زیادہ چالاک ہے ضرورت سے زیادہ۔۔۔ سب کچھ کے باوجود اسے شک تھا اس لیے اس نے جگہ بدل دی۔“ شکر ہے کہ انہوں نے پلان بی بھی موبائل کی صورت میں پہلے ہی شامل کر رکھا تھا ورنہ بہت مشکل پیش آتی۔ اس نے کان میں لگے بلیو ٹوٹھ کو آن کیا۔ اب وہ اس معاملے میں ذرا بھی غلطی یا کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”اسپتال کتنی دور ہے؟ ہم کافی آگے نہیں آگئے؟“ زویا نے پوچھا۔

”ہاں آ تو گئے ہیں مگر ابھی بھی حالات کنٹرول میں نہیں ہیں۔“ وہ شیشے میں دیکھ کر بولا۔

”کیا مطلب۔۔۔“ زویا نے چونک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں، اصل میں اسپتال میں وزیر کا وقت 6 بجے شروع ہو گا تو اسی لیے میں لبا چکر لے کر جا رہا ہوں وہیں یاد آ جاتا تو کچھ دیر وہیں بیٹھ جاتے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

زویا ہیکلے سے انداز میں مسکرائی۔ اس کا دل بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے بڑی غلطی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”وہ گاڑی ڈیفنس بلاک 8 سے گزر کر آگے بنی تھی سڑک کے درمیان۔۔۔ رک گئی ہے۔“ کنٹرول روم کا یہ پیغام پولیس ٹیم کی دونوں گاڑیوں اور احمر کے کانوں تک ایک ساتھ پہنچا تھا۔ وہ سب تیزی سے اسی طرف چل پڑے۔

سڑک خاصی ویران تھی اس جگہ پر رکنے کا سنگل خطرے سے کم نہیں تھا۔ ڈی ایس پی باقر اس ٹیم کے ساتھ موجود تھا اور تیزی سے اس طرف جا رہا تھا۔ چند لمحوں میں انہیں اپنے پیچھے سیاہ ہیملٹ میں موٹر سائیکل سوار بھی نظر آنے لگا تھا، اس کا مطلب تھا کہ احمر بھی وہاں پہنچ گیا ہے۔

”ہیلو۔۔۔ ہم ہمیں اس سڑک تک پہنچ گئے ہیں مگر یہاں کوئی کار نہیں ہے۔“ وہ مذکورہ سڑک پر پہنچ کر رک گئے تھے۔

”مگر وہ نہیں پر موجود ہیں شیشوں اسی جگہ پر نشانہ دی مل رہی ہے۔“ اسے جی جواب ملا تھا۔

ڈی ایس پی باقر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ وہاں دور دور تک کوئی بھی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کسی گاڑی یا شخص کے چھپنے کا امکان ہو۔ اس کے باہر نکلتے ہی احمر بھی اس کے قریب آ گیا۔

”ڈی ایس پی صاحب یہاں تو کار کا کچھ پتا نہیں ہے۔“ وہ خاصا گھبراہٹا ہوا تھا۔

”میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں، کنٹرول روم سے یہی بتایا جا رہا ہے کہ اسی سڑک پر نشانہ دی ہے۔“ وہ بولا اور آگے کی طرف چل دیا۔

سڑک پر خالی الذہنی کی کیفیت میں آگے بڑھتے ہی وہ ٹھٹھ کر رک گیا۔

اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔

وہ ہو گیا تھا جس کا خدشہ ہوتے ہوئے بھی وہ سب بہت چر امید تھے۔ احمر اس کے ساتھ ہی تھا۔ ڈی ایس پی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بھی گھبرا گیا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں اس نے بھی سامنے کی طرف دیکھا۔

جو منظر وہاں نظر آیا، اس نے اس کو بھی ساکت سا کر دیا تھا اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سامعوس ہوا۔ سڑک کے مین درمیان زویا کو دیا گیا موبائل پڑا تھا۔

☆☆☆

”تتم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ کیوں پھینک دیا میرا موبائل؟“ وہ بہت خوف زدہ تھی۔

”اس لیے کہ مجھے تم سے اب جو باتیں کرنی ہیں وہ صرف میرے اور تمہارے درمیان رہنی ہیں۔۔۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ موبائل اسے کسی اور تک پہنچا دیتا۔“ وہ مسکرایا۔

”پھر تم مجھ تک آجکی ہو اب تمہیں کس سے رابطہ کرنا ہے؟ لہذا موبائل بیکار تھا۔ اس لیے پھینک دیا۔“

”مگر۔۔۔ میں تو اسپتال جانا تھا؟“ وہ ہشمل بولی۔

”ہاں۔۔۔ مگر کیوں جانا تھا؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”LOEV TO KILL۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے وقاص سے ملنے۔۔۔“ وہ ہلکائی۔

”تو مل لو نا۔۔۔ میں ہی ہوں وقاص اور LOVE TO KILL“ وہ ہنسا۔

”تم۔۔۔؟“ زویا بھونچکا سی رہ گئی۔

”ہاں۔۔۔ میں ہی ہوں وہ زویا۔۔۔ جس سے ملنا تھا تم کو۔۔۔ اور جس کو ملنا تھا تم سے۔“

”تو پھر یہ ساری کہانی؟ وہ سب کیوں کیا تھا؟“

”وہ سب ضروری تھا، مجھے صرف تمہیں اپنے ساتھ لے کر جانا تھا اس لیے۔“

”مطلب؟“

”مطلب ہو سکتا ہے کہ تم اکیلی نہ ہو تیں۔ تمہارے آگے پیچھے پولیس یا کوئی ساتھ آتا۔۔۔ ویسے ایسا لگتا نہیں۔۔۔ مگر نامکن تو نہیں تھا نا۔“

”کیوں؟“ کیا کیا ہے ایسا تم نے؟“ زویا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”غلط کچھ نہیں کیا مگر لوگوں کو غلط یا صحیح کا فرق ہی تو نہیں معلوم۔“

”اور تمہیں معلوم ہے؟“ زویا نے بے اختیار پوچھا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”اسی لیے میں نے غلط کو تم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”تم۔۔۔ تم مجھے سے کیا چاہتے ہو؟“ زویا خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم کو میں یاد رہی؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔“ زویا بے ساختہ بولی۔

”مجھے یقین تھا مگر میں تمہیں جانتا ہوں اور کافی وقت سے تم سے ملنا چاہتا تھا۔“

”کیسے جانتے ہوئے مجھے؟“ زویا واقعی حیران رہ گئی۔

”یہ سال بھر پرانی بات ہے زویا، تم سب اپنے اسکول کے ساتھ پینک پر گئے تھے۔ یاد آیا۔۔۔ وہاں میں بھی تھا۔ تم مجھے ابھی لگی تھیں اس کے بعد میں تمہارے پیچھے چلا رہا تھا۔۔۔ تم نے مجھے ڈانٹا تھا اور پھر اپنی نیچر سے شکایت کر دی تھی۔۔۔ یاد آیا تم کو؟“

زویا کو واقعی وہ سب یاد آ گیا تھا۔ وہ جگہ کہہ رہا تھا مگر اسے اس کی شکل یاد نہیں تھی۔

”تم تو شکایت کر کے چلی گئیں تمہاری نیچر نے مجھے بہت ڈیل کیا۔ وہاں موجود لوگوں سے ڈیل کروایا۔۔۔ پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش بھی کی۔۔۔ جاتی ہو؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

”نہیں مجھے یہ سب نہیں معلوم۔۔۔ مگر کیا صرف اس بات پر میرے پیچھے لگ گئے تم نے مینی سے دوستی کی، اسے مار ڈالا۔۔۔ ناشا تو اس طرح زخمی کیا۔ صرف اس بات

پر...؟“ زویا جذباتی ہو کر بولی چلی گئی۔

”دیکھا ٹھیک تھا تا میرا شک، تم میرا شکار کرنے آئی تھیں... ہے نا... پولیس کو پیچھے لگا کر لائی ہو گی مگر تمہیں اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ نہ میرا پیچھا کر سکتے ہیں اور نہ مجھے پکڑ سکتے ہیں۔ جینئرس ہوں میں... جینئرس...“ وہ ہنس کر بولا۔

زویا سانس کی سیٹھی رہی۔ اس سے غلطی ہو چکی تھی۔ ”نہیں میں نے اس بات پر یہ سب نہیں کیا، اس بات پر میں صرف تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔ کیونکہ تم مجھے اچھی لگی تھیں۔ ان سب لڑکیوں سے... جنہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔

”تم نے مجنی کو کیوں مارا؟“ زویا بول اٹھی۔ ”کیونکہ وہ بھی ایسی ہی تھی۔ ان ہی لڑکیوں میں شامل، غلط۔ تم خود بتاؤ... ان جیسی بے حیا لڑکیوں کو جینے کا حق ہے۔“ ”تم یہ فیصلہ کرنے والے کون ہو؟ اور مجنی ایسی بالکل نہیں تھی؟“ وہ چلائی۔

”ایسی ہی تھی وہ... صرف دو دن لگے تھے مجھے اس کو اپنے پکڑ میں لانے کے لیے۔“ وہ نفرت سے بولا۔ ”اور وہ بھی پہلی نہیں تھی اس سے پہلے میں لاہور میں ایسی ہی دو لڑکیوں کو ٹریفک کے حادثے میں پنہن میں پہنچا چکا ہوں۔ اس میں کی تو غلطی بھی وہی تھی اسی لیے ذلیل ٹریفک ہوئی اسے۔“ وہ مسکرایا جیسے وہ سب یاد کر کے لطف اٹھا رہا ہو۔ ”میں نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ تمہیں فون کرے مگر وہ انکار کرتی رہی اور جب ہتھوڑا اس کے سر پر پڑا اور اس کا سرخ سرخ خون بہنا نظر آیا تو یقین جانو بہت لطف آیا مجھے۔“

”تم پاگل ہو، ذہنی مریض ہو... دوسروں کو تکلیف پہنچا کر تمہیں مزہ آتا ہے... میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“ زویا نے اس کا گلا پکڑ لیا تھا۔

اس اچانک حملے سے وہ گڑبڑا سا گیا تھا نتیجے میں گاڑی لہرا کر سڑک سے اتر گئی تھی۔ اس نے بمشکل اسے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے زویا کا ہاتھ موڑ کر اسے سیٹ پر دھکا دے دیا۔

”میں نہیں چھوڑوں گی تمہیں قاتل...“ زویا نے اس کے ہاتھ کو اتاروں سے جکڑ لیا۔

”تم شاید اتنی دیر بھی زندہ نہیں رہنا چاہتیں جتنی مہلت میں تمہیں دے رہا ہوں۔“ وہ اس کے منہ پر تھپڑ مار کر اسے دھکیلا ہوا بولا۔

زویا کا سر دروازے سے نکل آیا تھا۔ چہرے پر پڑنے والے زوردار جھٹنے نے اس کے حواس کمرے کر دیے تھے۔ وقاص نے اتنی دیر میں گاڑی ایک طرف روک لی تھی۔ ”میں نے تمہیں ان سب سے الگ سمجھا تھا اس لیے میں نے تمہارا پیچھا کیا۔“ یعنی سے بھی اس لیے دوستی کی کیونکہ تم سے رابطہ ناممکن تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑی تو مجھے غلط فہم کرنا پڑا۔ ادھر اور اکام مجھے سخت ناپسند ہے۔ دناشا کو میں ختم نہیں کر سکا اور اس کو ختم کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ اس نے میرا چہرہ دیکھ لیا ہے۔“

”میں نے بھی تو اب تمہارا چہرہ دیکھ لیا ہے۔“ زویا دھیرے سے بولی۔ ”ہاں، تم نے بھی دیکھ لیا ہے۔ موت کا چہرہ دیکھنے والے واپس نہیں آتے... معلوم ہے نا تم کو...؟“ وہ ہڈیانی ہنسی فہم کر بولا۔ ”تم بھی ان سب ہی جیسی ہو جیوٹی، مکار اور دغا باز تم نے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی، جیسی اس کی سزا تو ملے گی ہی... تم سے منہ کر میں اس دناشا کا کام بھی تمام کروں گا۔“

”پولیس تمہیں پکڑے گی تم ہی نہیں سکو۔“ زویا بولی۔ ”کیسے... ان کی ساری بھاگ دوڑ تمہارے ارد گرد تھی نا... اور اب وہ تمہیں بھی کھو چکے ہیں۔ کیسے پکڑیں گے وہ مجھے؟“

زویا خاموشی سے اس کی شکل دیکھتی رہی۔ ”نہیں ہے نا جواب... کیونکہ نہیں پکڑ سکتے۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”چلو اب باہر آ جاؤ۔“

”مجھے نہیں اترنا۔“ خوف اس کے رگ و پے میں اتر چکا تھا۔ وہ کہہ تو پا بلکل سچ رہا تھا۔ پولیس اور احمر سب اسے کھو چکے تھے۔ موبائل وہ بہت دور پیچھے کیس بیچک چکا تھا اور اب اس ویرانے میں اس نیم پاگل شخص کے ساتھ وہ اکیلی تھی جو اسے مار دینے کے لیے یہاں لایا تھا۔

”اترنا تو تمہیں پڑے گا۔“ وہ ٹھوم کر اس کی جانب والا دروازہ کھول ہوا بولا۔

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ ”کیونکہ یہ میرا کام ہے، تم جانتی ہو کہ ایسی ہی ایک لڑکی کی وجہ سے میرا پورا خاندان تباہ ہو گیا... بہت پیار کیا تھا میں نے اسے اور اس نے مجھے دھوکا دیا... مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ دکھ اور بدنامی نے میرے ماں باپ کی جان لے لی، باقی بچائیں تو میں نے جب یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میری جنگ غلط کے خلاف ہے۔ عورتیں غلط ہوتی ہیں، دھوکا دیتی

ہیں، بے وقوف بناتی ہیں جیسے تم نے بنایا۔“ وہ اسے گھسیٹ کر کار سے نکالتا ہوا بولا۔

”سب... سب ایسا نہیں کرتے۔ میری تو مجبوری تھی۔“ یعنی نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، وہ شاید تم سے پیار کرنے لگی تھی۔“

”جو اس مت کرو۔“ وہ اسے زمین پر پٹختے ہوئے بولا۔ ”نہیں تم غلط کر رہے ہو، خود غلط ہو، سر اسر غلط۔“

وہ یہ کہتے ہوئے زمین پر آگے کو سر کی اور کھڑی ہو کر تیزی سے سامنے کی جانب دوڑی، وہ بھی گالی دے کر اس کے پیچھے لپکا تھا۔ زویا جان لگا کر بھاگ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ تو اب یہ بھی سمجھ نہیں پارہی تھی کہ وہ کہاں ہے بس وہ دوڑے جا رہی تھی۔ اچانک اس کا پیار بھری ہوئی زمین پر اور پھر کسی پتھر پر پڑا وہ زور سے زمین پر گر گئی۔ اس سے قبل کہ وہ اٹھ پاتی وہ اس کے سر پر آ پہنچا تھا۔

”کیا سمجھ رہی تھیں تم؟“ وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”سچ جاؤ گی اس طرح بھاگ کر... نہیں سچ سکتیں میں LOVE TO KILL ہوں، یہی میرا شوق ہے اور یہی میرا کام... میں تمہیں ختم کر کے چھوڑوں گا۔“ مجھے ادھر سے کام سے نفرت ہے۔“ وہ اسے گھسیٹتا ہوا گاڑی کے پاس لایا اور اندر سے دھکی نکال کر اس کے پیرو باندھ دیے۔ زویا کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ ایک تو کرنے کی وجہ سے اسے سخت چوٹ لگی تھی پھر وقاص کے پتھر اور گھسیٹ کر اتنی دور لانے کی وجہ سے اس کی آواز تک نہیں نکلی پارہی تھی۔ وہ زمین پر بندھی پڑی تھی اور بے بسی سے وقاص کو گاڑی کی ڈکی سے ہتھوڑا نکالتے دیکھ رہی تھی۔

وقاص ہتھوڑا لے کر اس کی طرف مڑا، اس کی کی آنکھیں دھشت سے بھری ہوئی تھیں وہ اس وقت اتنا خوف ناک لگ رہا تھا کہ زویا نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں پھر اگلے لمحے ہی وہ چوکی اور زور سے چلائی۔

”کوئی مدد کرے میری... یہ مجھے مار ڈالے گا... پلیز میری مدد کرو۔“

”کوئی نہیں کرے گا مدد... سوائے میرے۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ”بہت درد ہو رہا ہے نا...؟ بس توڑا سا اور ہوگا پھر تمہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔“ وہ سفاکی سے ہنسا۔ ”سچ پوچھو تو تمہیں مار کر زیادہ اچھا نہیں لگے گا مجھے... مگر کیا کروں تم نے مجبور کر دیا۔ دھوکا دے کر یہاں تک آئیں۔“ جھوٹ بولے، اب مرنا ہی پڑے گا

دراز دست

”تمہیں...“ وہ ہتھوڑے کو دونوں ہاتھوں سے بلند کرتے ہوئے بولا۔

زویا پچھلی پچھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ موت اس کی آنکھوں کے سین سامنے تھی شاید ایک یا دو لمحوں کے فاصلے پر...“

اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لرز رہی تھی۔ اسے ماما، بابا، احمر اور سب کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ اس نے ہتھوڑے کو نیچے آتا دیکھا۔ اور کلہ پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ لمحہ بھر میں اسے ہلکے سے دھماکے اور ہتھوڑا گرنے کی آواز سنائی دی۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وقاص اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا سر سے بلند ہوتا ہوا ہتھوڑا اس سے ذرا فاصلے پر پڑا تھا۔

وقاص کی آنکھیں قدرے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بے ہوشی، دہشت اور تکلیف کے تاثرات نمایاں تھے۔

زویا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وقاص چند لمحے یو پی کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر گھٹنوں کے بل گرا اور اس کے پیروں میں ڈھیر ہو گیا۔ زویا خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ادھر پر دیکھا۔

سامنے ایس پی جعفر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ریوا اور تھا جس میں سے دھوکے کی ہلکی سی لکیر نکلتی رہی تھی، وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا، اس کے ساتھ دو پولیس والے تھے۔ جنہوں نے لمحہ بھر میں زویا کے پیروں پر ہتھوڑا کھول کر اسے کھڑا کر دیا۔

”شکر ہے آپ آ گئے۔“ زویا بمشکل بولی۔

”آپ کو کیسے پتا چلا... اس نے تو موبائل بھی بیچک دیا تھا۔“

”ہاں، میں نے کہا تھا نا کہ ہر پلان کا پلان بی ہوتا ہے۔ میرا پلان بی یہی تھا کہ میں مسئلہ تمہارے ساتھ رہوں۔“ ایس پی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”کیسے...؟“ زویا نے حیرت سے پوچھا۔

”ایسے...؟“ اس نے مسکرا کر زویا کے کان کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”ان بندوں میں مانیکر وٹون فٹ ہے

زویا جس سے میں تم دونوں کی ہر بات سن پارہا تھا اور اس میں جی پی ایس بھی موجود ہے یوں میں تم تک پہنچ گیا۔“

زویا جواباً بولے سے مسکرائی... اس بار اس کی مسکراہٹ میں زندگی تھی۔





اشارہ

کاشف زبیر

وقت کی بساط پر بعض لوگ اپنے آپ کو سب سے بڑا کھلاڑی سمجھتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ جب بازی پلٹتی ہے تو پھر ہر چال مات کی طرف لے جاتی ہے... دولت و انمول بختانوں پر فخر و غرور کے ساتھ بیٹھنے ایسے ہی شاطر کا عیار انہ کھیل... اس کا ہر دانش ٹھیک نشانہ پر بیٹھتا تھا... کامرائیوں اور کامیابیوں نے اسے خود سمر اور پٹ دھرم بنا دیا تھا... اس نے باریک بینی اور مشاہدات و تجربات کا نچوڑ اپنے اس آخری مقصد میں سمودیا تھا... لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ دولت و اقتدار کا نشہ دراصل ایک ایسا غیر مرئی رشتہ ہے جو دوسرے افراد کے خیالوں اور خواہشوں کو اس کی اپنی خواہشات اور سوچوں سے مربوط کر دیتا ہے...

آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا ستر ناقص، سرورق کی چار کہانی

ستاون سالہ شفیع اللہ شیخ سفید ترشی ہوئی داڑھی اور سلیقے سے بنے ہوئے بالوں کے ساتھ ایک مٹین اور چاذب نظر شخصیت کا مالک تھا۔ آٹھوں پر ریم لیس عینک تھی۔ متوسط قد و قامت تھی۔ وہ اس وقت گرے تھری پیرس سوٹ میں اپنے خاندان کے ہمراہ ناشتے کی میز پر تھا۔ مہمانی سے بنی اس بڑی میز کے گرد کم سے کم پچاس افراد کی گنجائش تھی اور اس پر درجنوں ڈشیں رکھی جا سکتی تھیں مگر فی الحال وہاں صرف آٹھ افراد تھے۔ شفیع اس کے دو بیٹے احر اور ظفر، ان کی بیویاں شرمین اور سونیا، شفیع کی بیٹیاں مونا اور رینا، آٹھواں فرد مونا کا شوہر باسط احمد تھا۔ باسط کا خاندان دوسرے شہر میں آباد تھا مگر مونا سے شادی کے بعد وہ اس شہر میں شفٹ ہو گیا تھا اور شفیع پتیلیں میں ہی رہتا تھا۔ تقریباً ڈھائی ہزار گز پر پنا ہوا یہ پتیلیں تین عمارتوں پر مشتمل تھا۔ مرکزی پتیلیں جو رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے ساتھ ہی گیسٹ ہاؤس کی عمارت تھی اور ایک طرف تقریبات کے لیے مخصوص پارٹی ہاؤس تھا۔

وہ آٹھوں شفیع اللہ کے خاندان کے افراد ہی نہیں بلکہ اس کی بہت بڑی بزنس ایسائر کے شراکت دار بھی تھے۔ ایس ایس گروپ کے متعدد کاروبار تھے۔ سینٹ اور اسٹیل ملز تھیں۔ ٹیکسٹائل کا بزنس بھی تھا۔ ہوٹلوں کی ایک چین تھی۔ سب سے نیا بزنس ہوٹل کا تھا مگر مختصر عرصے میں اس نے بھی خاصی ترقی کی تھی اور ملک میں اس چین کے چھ ہوٹل کھل چکے تھے۔ ساتویں ہوٹل کا آج کے دن افتتاح تھا جو دارالحکومت میں ایک پوش علاقے میں تعمیر ہوا تھا۔ کسی بزنس میں یہ سرمایہ کاریوں سے کم نہیں تھا۔ لیکن ایس ایس گروپ کا اصل بزنس ٹیکسٹائل اور اسٹاک تھے۔ شفیع نے آغاز ان ہی شعبوں سے کیا تھا۔ اس کا باپ شاہد احمد شیخ ایک اسٹاک بروکر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد شفیع نے ہوارے میں اس کی فرم مانگی تھی جو اس کے بہن بھائیوں نے بخوشی اس کے حوالے کر دی تھی۔

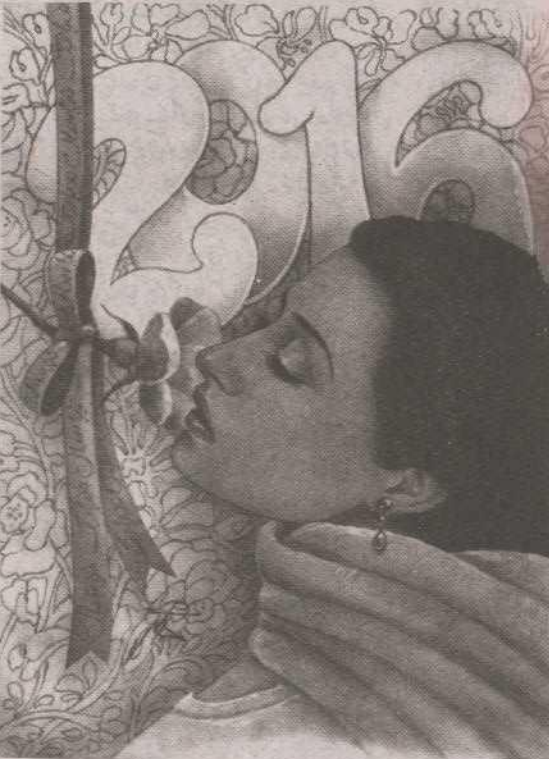
یہ ظاہر ہے ایک غلط فیصلہ تھا کیونکہ شفیع کے حصے میں اصل مالیت سے کم وراثت آئی تھی مگر چند سال بعد اس کے

بہن بھائی اس پر شک اور حسد کرنے لگے تھے۔ اسٹاک مارکیٹ میں ایس ایس بروکر کا ایک نام تھا اور جلد شفیع نے اس نیک نامی میں اضافہ کیا۔ لوگ آنکھ بند کر کے اس پر بھروسہ کرتے تھے اور اپنا سرمایہ اس کے حوالے کرتے تھے۔ ایمان داری اس ملک میں ایک برائی ہی تھی لیکن اس کے قدر دانوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس لیے جب اس نے اپنا بیک کھولا تو بغیر کسی کوشش کے اسے اکاؤنٹس ملنے لگے اور ایک سال میں بینک کے ابتدائی سرمائے سے چار گنا زیادہ رقم ڈیپازٹس میں آچکی تھی۔ اب ایس ایس بینک ایک نام بن گیا تھا جو اپنے کاروباری مفاد کے ساتھ ساتھ اپنے گاہکوں کے مفاد کا خیال بھی رکھتا تھا۔

شفیع اللہ نے ملک کو زرمبادلہ میں خود کفیل کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی اور بہت جلد اس میں بھی کامیاب رہا۔ اس کی اسکیم کے ذریعے زرمبادلہ کی صورت میں خطیر سرمایہ پاکستان آنے لگا۔

شفیع اللہ نے بینک کے بعد دوسرے کاروباروں کی طرف بھی توجہ دی۔ اس کے پاس اضافی سرمایہ تھا اور وہ اسے یوں استعمال کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی فائدہ ہو۔ اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ بٹنے کاروبار قائم کیے جائیں۔ شروع میں وہ اکیلا تھا پھر اس کے بیٹے شامل ہو گئے۔ بیٹیاں بڑی ہوئیں اور انہوں نے تعلیم مکمل کی تو وہ بھی بزنس میں شامل ہو گئیں۔ شفیع اللہ نے دوسرے کاروبار ان میں بانٹ دیے تھے مگر بینک اور اسٹاک فرم اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ احر اور ظفر اسٹیل، سینٹ اور ٹیکسٹائل دیکھتے تھے جبکہ مونا اور اس کا شوہر باسط چین ہوٹل بزنس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ رینا بھی پڑھ رہی تھی اور اس کا ایم بی اے کا آخری سمسٹر شروع ہونے والا تھا۔

دانیال اس کا یونیورسٹی فیلو اور منیجر تھا۔ یہ رشتہ ان کی پسند سے ہوا تھا۔ دانیال کا تعلق ایک تاجر



نے جانے سے پہلے اس کی شادی کر دینا مناسب سمجھا تھا۔ شفیع اللہ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کی بیوی سعیدہ سیدی سادی، گھر و شوہر میں خوش رہنے والی عورت تھی۔ وہ اس وقت بھی ویسی ہی رہی جب شفیع اللہ پر کلاس سے اچھے اعلیٰ طبقے تک پہنچ گیا۔ یہ وہ کلاس ہے جہاں آکر انسانی قدریں، سوچیں اور معیار بدل جاتے ہیں۔ جہاں انسان اپنے مذہب، تہذیب اور ثقافت سے برائے نام ہی متعلق رہ جاتا ہے۔ لیکن شفیع اللہ کے گھر کا ماحول تبدیل نہیں ہوا تھا کیونکہ سعیدہ نے اسے بدلنے سے انکار کر دیا تھا۔

شفیع اللہ نے بیوی کی رائے کا احترام کیا۔ وہ خود بھی اقدار پسند آدمی تھا مگر اسے زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا تھا۔ گھر کے حوالے سے مشکل پیش آئی تو اس نے گھر اور اپنی کاروباری زندگی دونوں کو الگ کر دیا۔ اس نے بھی گھر میں پارٹی نہیں دی۔ کسی ایسے فرد کو گھر مدعو نہیں کیا جس سے اس کا صرف کاروباری تعلق ہو۔ وہ جن پارٹیوں اور محفلوں میں جاتا تھا، سعیدہ نے ایک دو بار کے بعد وہاں جانے سے انکار کر دیا تو شفیع اللہ نے اسے مجبور نہیں کیا۔ سعیدہ نے خود کو گھر اور خاندان والوں تک محدود کر لیا تھا۔ اس کی ساری توجہ اپنے چار بچوں کی پرورش پر تھی اور نصف درجن نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے سارے کام خود کرتی تھی۔ شفیع اللہ بیٹوں کو بورڈنگ میں بھیجتا چاہتا تھا مگر سعیدہ نے اجازت نہیں دی۔ امر اور ظفر نے اپنے شہر کے اعلیٰ ترین اسکول میں تعلیم حاصل کی۔

اسکول کی تعلیم کے ساتھ ہی وہ گھر میں آنے والے ایک استاد سے دین کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے اور ان کی تربیت ان کی ماں نے کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جوانی میں بھی ان مشاغل میں نہیں پڑے جو ان کی کلاس کے نوجوانوں میں عام تھے اور جب وہ عملی زندگی میں آئے تب بھی انہوں نے اپنا کردار مضبوط رکھا تھا۔ سعیدہ نے ان کی تعلیم مکمل ہوتے ہی ان کی شادیاں کر دیں۔ اسی طرح مونا کی جیسے ہی تعلیم مکمل ہوئی اس کی شادی بھی کر دی گئی۔ سعیدہ کے نزدیک بچوں کو خرابی سے بچانے کا یہ سب سے موثر طریقہ تھا۔ رینا کا رشتہ بھی سعیدہ نے اپنی زندگی میں طے کر دیا تھا۔ اسے دانیال پسند آیا تھا مگر اسے رینا کی شادی کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ کچھ عرصے سے ہائی بلڈ پریشر کی مرلیفہ تھی دوای لیتی رہتی تھی مگر کبھی اسے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس دن اتوار تھا اور وہ سب ناشتے کی میز پر تھے کہ بات کرتے کرتے اچانک ہی سعیدہ جکڑ کر بچے کر پڑی۔ وہ بے ہوش

ہو گئی تھی۔ شفیع اللہ اسے اسپتال لے گیا۔

سعیدہ کو آئی سی یو میں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے اڑتالیس گھنٹے اہم قرار دیے مگر اسے چوبیس گھنٹے گزارنے کا موقع بھی نہیں ملا اور بے ہوشی کی حالت میں دوسرے برین ہمرج نے اس کی جان لے لی۔ شفیع اللہ کے لیے شریک حیات کی جدائی کا صدمہ سہنا آسان نہیں تھا۔ سعیدہ صرف چھپن برس کی تھی اور کھینچے میں اپنی عمر سے کم ہی لگتی تھی۔ شفیع اللہ نے سوچا بھی تھا کہ وہ بچوں اچانک اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا لیکن اس موقع پر رینا نے اپنے عمر اور بساط سے بڑھ کر باپ کو سہارا دیا۔ وہ پوچھو پرسی سے آنے کے بعد زیادہ وقت باپ کے ساتھ گزارتی تھی۔ اس کی دل جوئی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شفیع اللہ جلد تسکین گیا اور اپنے کاموں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

چند دن پہلے سعیدہ کی پہلی برسی تھی۔ یہ دن گھر والوں نے خود منایا تھا، انہوں نے سعیدہ کے لیے قرآن خوانی کی تھی۔ شفیع اللہ باقاعدگی سے ہر دوسرے ہفتے سعیدہ کی قبر پر جاتا تھا جبکہ بیٹوں نے ابتدائی چند مہینے کے بعد جانا چھوڑ دیا تھا مگر شفیع اللہ نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ فطری عمل ہے۔ انسان مرنے والوں کو جلد بھول جاتا ہے چاہے وہ اس کے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ بڑیاں بھی قبرستان نہیں گئی تھیں کیونکہ سعیدہ نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ وہ قبرستان یا اس کی قبر پر نہ آئیں۔ رینا ماں سے زیادہ نزدیک تھی اور وہ اس بابت بھی پر سب سے زیادہ روتی تھی۔ سعیدہ کی دوسری وصیت تھی کہ اس کی قبر بھی رکھی جائے اور اس پر کتبہ نہ لگایا جائے اگر وہ نشانی چاہتے تھے تو مندرنگ والا پتھر لگادیں۔ شفیع اللہ نے اس وصیت کو بھی پورا کیا تھا۔ رینا نے اپنی قبر پر کتبہ نہ لگایا تھا۔ وہ بے ہوشی کی موت نے شفیع اللہ کو کسی حد تک بدل دیا تھا۔ اس نے سعیدہ کے نام پر بے سہارا عورتوں کی مدد کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر شفیع اللہ کے سامنے ایک اُبلّا ہوا دسی انڈا، دو عدد شہد لگے تو س، ایک گلاس بالائی نکلا ہوا دودھ اور اس کے بعد کافی تھی۔ اس کا برسوں سے یہی معمول رہا تھا۔ اگرچہ میز پر کئی طرح کی چیزیں تھیں جو اس کے بچے شوق سے کھاتے تھے۔ جیسے طلوہ پوری، چنوں کا سناں، پائے اور کچلے، کئی طرح کے کیک وغیرہ۔ مگر شفیع اللہ کے

نزدیک یہ سب سلو پوائزن تھا جو آہستہ آہستہ انسان کی جان لے لیتا ہے۔ بہر حال یہ دوسروں کی چوائس تھی۔ شفیع اللہ کسی کی ذاتی زندگی میں ایک حد سے زیادہ دخل اندازی کا قائل نہیں تھا چاہے وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ کھانے پینے میں صرف رینا اس پر مبنی تھی۔ وہ ابھی سے صحت بخش چیزیں لیتی تھی، اگر کوئی دوسری چیز لیتی بھی تو بس کھنے کی حد تک۔ شفیع نے آخر میں کافی کا گک اٹھایا۔ اصرار نہ پوچھا۔ "پاپا بینک کے معاملے کا کیا ہوا؟"

"کون سے معاملے کا؟" شفیع اللہ نے انجان بن کر کہا حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ احمر کا اشارہ کس معاملے کی طرف تھا۔ اصرار نہ گہری سانس لی۔

"پاپا انجان مت بنیں، آپ جانتے ہیں میں ضیاحامد کی بات کر رہا ہوں۔"

"اس کا کیا ہوتا ہے۔ میں نے بتایا تو تھا کہ میں نے انکار کر دیا ہے۔"

"اس لیے کہ اب وہ اقتدار میں نہیں ہے۔" احمر کا لہجہ تیز ہو گیا۔

شفیع اللہ نے غور سے اسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو ایسا نہیں ہے، میں نے زندگی میں بھی ان سیاست دانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ نہ ان کے خوف سے اور نہ لالچ سے۔ ضیاحامد کسی زمانے میں میرا دوست بھی تھا۔ مگر میں نے کبھی اس بات کی پروا بھی نہیں کی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے یہ اسکیم خالص اپنے ملک اور اس کے لوگوں کی مدد کے جذبے سے شروع کی تھی۔ میں اسے ضیاحامد جیسے گندے انسان کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

ظفر، مونا اور دوسرے خاموش رہے تھے لیکن رینا نے باپ کی حمایت کی۔ "پاپا نے ٹھیک کیا، ایسے گھٹیا شخص کے لیے کچھ کرنے سے بہتر ہے کہ پاپا بینک ہی بند کر دیں۔"

ظفر نے پہلی بار زبان کھولی۔ "بات صرف بینک تک محدود نہیں رہے گی۔ ہمارا بیشتر کاروبار اسی شہر میں ہے اور یہاں وہ بہت مضبوط ہے۔ وہ چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

شفیع اللہ نے بیٹوں کی طرف دیکھا۔ "کیا تم لوگ خوفزدہ ہو؟"

"لازمی بات ہے پاپا۔ ظفر کے بجائے اس کی بیوی سونیا بولی۔ "وہ ہمیں تباہ کر سکتا ہے۔"

"کوئی کسی کو تباہ نہیں کر سکتا جب تک اوپر والا نہ

اشارہ

چاہے۔" شفیع اللہ نے جواب دیا۔ "وہ بھی وہ زیادہ عرصے یہاں رہنے والا نہیں ہے اور وہ جلد یہاں سے اپنا بور یا ستر گول کر لے گا۔"

"پاپا اکیلا بیٹھ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" اصرار نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا لیکن شفیع اللہ نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

"تیساری کمل ہے میں بارہ بجے روانہ ہوتا ہے۔"

آج دارالحکومت میں ان کے نئے ہوٹل کی افتتاحی تقریب تھی جس میں اعلیٰ سرکاری و سیاسی افراد کے ساتھ بڑی سیٹی کے خاص لوگ بھی شامل تھے۔ مونا نے کہا۔

"تیساری کمل ہے پاپا۔"

"تم دونوں کو وہیں ہونا چاہیے تھا۔" شفیع اللہ نے مونا اور باسط کی طرف دیکھا۔

"جی پاپا لیکن کل رات مونا کا چیک اپ تھا اس لیے ہم یہاں آ گئے اب آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

باسط کی بات پر مونا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ یہ اس کی پہلی خوش خبری تھی۔ اصرار کے دو بیٹے تھے اور ظفر کی ایک بیٹی تھی۔ مونا کو شادی کے دو سال بعد خوشخبری ملی تھی۔ شفیع اللہ کسرانے لگا پھر اس نے گھڑی دیکھی اور کافی کا گک رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "میں دفتر سے واپس آؤں گا۔ فاؤنڈیشن کا پیپر ورک فائل کرنا ہے۔"

رینا ابھی اور والد کو بریف کیں تھیں۔ ماں کے بعد باپ کو دفتر کے لیے رخصت کرنے کی ڈتے داری اس نے سنبھال لی تھی۔ وہ اسے چھوڑنے سے باہر پورج تک آئی جہاں اس کی سنے ماؤں کی بی بی ایم ڈیو کھڑی تھی اور ڈرائیور کی وردی میں نور علی موجود تھا۔ وہ صرف ڈرائیور ہی نہیں شفیع اللہ کا باڈی گارڈ بھی تھا اور اس نے دو مواقع پر اپنی جان کی بازی لگا کر اسے محفوظ رکھا تھا۔ ایک بار ڈاکو اسے اغوا کرنے آئے تھے اور دوسری بار ٹارگٹ کلرز نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے واقعے میں نور علی شدید زخمی ہوا تھا۔ اگر شفیع ملک کے بہترین اسپتال میں اور بہترین طبی سہولتوں کے ساتھ اس کا علاج نہ کرتا تو شاید اس کا بچنا مشکل ہوتا۔ اس کے بعد سے نور علی اس کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گیا تھا۔ وہ ہر جگہ اس کے ساتھ ہوتا تھا اور شفیع اللہ کے واقف کار مذاق میں اسے اس کا ہزارا درجہ دیتے تھے۔

دوسرے دولت مندوں کی طرح شفیع اللہ بھی اب بلٹ پروف گاڑی استعمال کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ جدید

تھی اور ان کی مدد سے قریب ویران ملک منتقل کی جارہی تھی۔
رقم کی منتقلی کا ایک راستہ بینکنگ چینل بھی تھا مگر مرکزی بینک کی سخت نگرانی اور قوانین کی وجہ سے یہ راستہ بھی مشکل ہو گیا تھا۔ جب تک بینک کی اعلیٰ ترین اختیارات اس کام میں ملوث نہ ہو۔ اس کے ایک ماہر مالیات نے اسے ایس ایس بینک کی رقم منتقلی کی اسکیم کی طرف توجہ دلائی۔ اگرچہ اسے بیرون ملک سے رقم منگوانے کے لیے شروع کیا گیا تھا مگر اس کے توسط سے بڑے پیمانے پر رقم بیرون ملک ٹرانسفر بھی کی جاسکتی تھی۔ شیخ اللہ نے یہ اسکیم اس کے دور حکومت میں وزارت خزانہ کو پیش کی تھی مگر اسے انکار کر دیا گیا کیونکہ اس وقت ضیا حاد اس اسکیم کی افادیت کا درست اندازہ نہیں کر پایا تھا۔

ضیا، شیخ اللہ سے اچھی طرح واقف تھا اور وہ ان چند افراد میں سے تھا جن سے ضیا شدید نفرت کرتا تھا۔ اس لیے انہیں کہہ وہ ملک کے ان چند بڑے سرمایہ داروں میں سے تھا جس نے ضیا کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا اور اس کے دور حکومت میں اپنے سارے بٹے پروجیکٹ روک دیے تھے کیونکہ وہ رشوت دینے اور بدعنوان لوگوں سے ہاتھ ملانے کو تیار نہیں تھا بلکہ اس نفرت کی وجہ خاصی پرانی تھی۔ اس کی جڑیں زمانہ طالب علمی میں ملتی تھیں۔ دونوں یونیورسٹی فیلو تھے۔ اگرچہ شیخ الگ تھے مگر ان میں اچھی سلام دعا تھی۔ لیکن جب دونوں نے طلبہ سیاست میں حصہ لیتا شروع کیا تو وہ آپس میں حریف بن گئے اور ضیا کو اولین شکست شیخ اللہ کے ہاتھوں نصیب ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ زیادہ مقبول ہے اور شیخ اللہ سیدھا سلاک تھا مگر جب نتیجہ آیا تو شیخ اللہ طلبہ یونین کا صدر بن گیا تھا۔ اس دن سے وہ ضیا سے نفرت کرنے لگا تھا۔ جب وہ اقتدار میں آیا اور اس نے اپنے طور پر شیخ اللہ پر احسان کرنے کی کوشش کی۔ یعنی اسے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہا تو اس نے انکار کر کے اسے دوسری شکست دی تھی۔ ضیا کے خیال میں وہ شیخ اللہ کی مدد سے بہت بڑی رقم کما سکے گا مگر وہ نہ کما سکا اور اس کے بعد وہ ضیا کا ناچندیدہ ترین آدمی بن گیا۔

بہر حال اب ضیا کا مفاد اڑنے آ رہا تھا اور اس نے ایک مشترکہ جاننے والے کے توسط سے شیخ اللہ سے رابطہ کیا۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ ضیا کو اسی کی امید تھی۔ اس نے اپنے مالی شیرے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ نہیں مانے گا۔ اس لیے اس نے متبادل پلان پر پہلے ہی عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ معاملہ بہت بڑی رقم کا تھا اور یہ دو

اجتناب کے نتیجے میں الیکشن کا عدم قرار پائے اور نئے سرے سے الیکشن ہوئے جس میں ضیا کی پارٹی نے بھرپور حصہ لیا اور اپوزیشن کی جماعت کے بعد دوسری بڑی جماعت بن کر سامنے آئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہاں سال بعد دوبارہ عام انتخابات ہوئے تو ضیا کی پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی اور بننا کسی کی مدد کے حکومت بنائی۔ ضیا وزیر اعظم بن گیا۔ یہاں سے اس نے اپنا اصل شیعہ شروع کیا۔ اس نے نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے مال کماتا شروع کر دیا۔ شروع کے ایک سال تو وہ محتاط رہا اور اپنی ساکھ کی فکر بھی کرتا رہا لیکن جیسے جیسے معاملات پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، اس کی کرپشن کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔

منتخب نمائندوں اور مخلص پارٹی سیاست دانوں کے بجائے اس نے اپنے آس پاس ایسے لوگ جمع کر لیے جو خود بھی کرپٹ تھے اور اس کی مدد بھی کرتے تھے۔ حکومت کے آخری سالوں میں ضیا کی حکومت پر بے شمار الزامات لگے۔ اس کی بدعنوانی کی داستانیں سامنے آئیں کہ اس کے وفادار ساتھیوں کے لیے اس کا دفاع کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ پارٹی مخلص لوگوں سے خالی ہونے لگی۔ ورکرز پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پانچ سال بعد جب الیکشن ہوئے لگے تو ضیا کیلئے مختلف حلقوں کے لیے امیدوار تلاش کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ الیکشن کی نگرانی عدلیہ اور فوج کر رہی تھی اس لیے دھاندلی کی بہت مشکل ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ضیا کی پارٹی کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ مشکل چند حلقوں میں کامیابی حاصل کر سکی تھی۔ ضیا کی سابق پارٹی ایک بار پھر اقتدار میں آگئی تھی۔

نئی آنے والی حکومت بدترین اقتصادی حالات سے نمٹ رہی تھی۔ جو ضیا کے دور کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی مگر ساتھ ہی وہ ضیا کے خلاف کیمپ کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے گرد گھیراؤ بگڑ رہا ہے۔ وہ اپنے بھائی بچوں کو اور بیشتر اہل شہر پہلے ہی ملک سے باہر بھیج چکا تھا جب وہ خود اقتدار میں تھا۔ اب یہاں سے اپنے باقی رہ جانے والے اثاثے منتقل کر رہا تھا۔ اس نے اربوں نہیں کھریوں روپے جمع کر لیے تھے۔ دوران اقتدار تو اسے مشکل پیش نہیں آئی مگر اب اسے اندازہ ہوا کہ بڑا اقتدار تو اسے یہ کام آسان نہیں۔ مئی ٹرانسفر پر نہ صرف ملک میں بلکہ ملک سے باہر بہت سی پابندیاں تھیں۔ جہاں رقم منتقل کی جاتی وہاں بھی اس سے سوال کیا جاتا۔ ضیا نے مالیاتی ماہرین کی ایک ٹیم جمع کی ہوئی تھی جو اس کے لیے راستے تلاش کر رہی

لگا لیتا تھا جس سے اس کی شخصیت کی دلکشی بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت تاثرات سے قطع نظر وہ اچھا اور خوش رو لگ رہا تھا۔ اس نے جام سے ہلکی سی چمکی لی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ وقت بہت سستی سے گزر رہا تھا۔ دن کا دوسرا پہر شروع ہونے والا تھا، گیارہ بج کر باؤن منٹ ہو رہے تھے مگر وہ جب گھڑی کی طرف دیکھتا تو اسے لگتا کہ سوئیاں اسی جگہ رک گئی ہیں۔

زمانہ طالب علمی سے وہ سیاست کے چکر میں پڑ گیا تھا اور اس نے اس میدان میں بہت دیکھے بھی کھائے تھے۔ مگر باریل گیا اور اس کی زندگی کے چار سال سے کچھ اوپر کا وقت جیل میں گزرا تھا مگر اس نے یہ وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اس نے اسے استعمال کیا۔ اس نے جیل میں رہ کر ماسٹر کیا اور ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اپنے سیاسی نظریات کچھ اس انداز میں بیان کیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کتاب نو جوان طبقے میں مقبول ہوتی گئی اور جب اسے جیل سے رہائی ملی تو اس کے استقبال کے لیے ہزاروں افراد کا ہجوم سینٹرل جیل کے باہر موجود تھا۔ اس وقت تک وہ ایک مقبول سیاسی جماعت کا مقامی لیڈر تھا۔ مگر اس استقبال نے ضیا کا ذہن بدل دیا اور اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ میدان سیاست میں ہمیشہ دوسروں کا محتاج رہے گا۔ اپنی سیاسی زندگی سے اس نے ایک ہی سبق سیکھا تھا کہ اگر طویل مدتی فائدہ نظر آ رہا ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے بھی مت چوک چاہے عارضی نقصان کیوں نہ ہو۔

ضیا نے اپنی پارٹی چھوڑنے کا اعلان کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی پارٹی نے عوام کے لیے کچھ نہیں کیا تھا اس لیے وہ پارٹی چھوڑ رہا ہے۔ حالانکہ اس کی پارٹی کی حکومت پر گرفت نہایت مضبوط تھی۔ ضیا کا پارٹی چھوڑنا یہ ظاہر خسارے کا سودا تھا۔ اس نے اہم ترین صوبے میں آنے والے الیکشن سے پہلے غلطی طر پر پارٹی کو منظم کیا اور دیوانے تلاش کیے جو نظریات کے نام پر سیاست کی بجائی کا ایندھن بنتے ہیں اور ان دیوانوں نے دیوانہ وار کام کر کے چند سالوں میں اس کی پارٹی کو گھر گھر پہنچا دیا۔ الیکشن ہوئے اور سابق حکومت اپنی ناقص کارکردگی کے باوجود دھاندلی کے بل بوتے پر الیکشن جیتنے میں کامیاب رہی۔ ضیا کی پارٹی نے اس میں حصہ نہیں لیا لیکن جب بارے والوں نے دھاندلی کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کی تو اس نے پوری شدت سے اس میں حصہ لیا اور میڈیا کی توجہ حاصل کر لی۔

ترین گاڑی اس نے خاص طور سے اجازت لے کر اور بہت ہنگامے دماؤں باہر ملک سے منگوائی تھی۔ گھر سے نکلے ہوئے جدید ترین بلٹ پروف جیکٹ پہنتا تھا۔ اسے اسلحہ اچھا نہیں لگتا تھا مگر اس نے ایک چھوٹا سا پگنل لیا تھا اور اس کا لائسنس بھی بنوایا تھا۔ نشانے بازی میں نور علی اس کا استاد تھا۔ اب اگر موقع آتا تو وہ پستول اعتماد سے استعمال کر سکتا تھا۔ ”پاپا۔“ رینا نے جھجک کر کہا۔ ”دانی بھی ساتھ جائے گا۔“

شیخ اللہ ٹھکا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”شیوڑ کیوں نہیں بیٹا، سواری کہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ کیا آپ نے اسے مدعو کیا ہے؟“

”جی پاپا۔“ رینا خوش ہو گئی۔ ”میں نے آپ کی طرف سے ہی انوائٹ کیا ہے۔“

”گڈ گرل۔“ شیخ اللہ نے اس کا سر چومنا اور گاڑی کی عقبی نشست پر آگیا اور نور علی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ جب گاڑی وسیع و عریض شیخ عیسیٰ سے نکل رہی تھی تو وہ ضیا حاد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ضیا حاد، شیخ اللہ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے چہرے پر بکر دورت اور نفرت کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ اس برائے سفید فرنیچر والے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اس نے خود بھی سفید سوٹ پہنا ہوا تھا۔ تقریباً بیس فٹ طویل اور پندرہ فٹ چوڑے اس کمرے میں بڑا لیڈر صوفیٹ تھا، دیوار قاتین، شیشے کی تہزیں سب سفید تھیں۔ دیواروں کا رنگ بھی سفید تھا۔ ایک طرف کی پوری دیوار شیشے کی تھی مگر اس کے آگے سفید ہی پردے تھے۔ ضیا اس ماحول کا ایک حصہ لگ رہا تھا۔ واحد شے جو سفید نہیں تھی وہ سامنے بوتل میں موجود رینگین پانی تھا۔ اس رینگین پانی کا کچھ حصہ ایک دودھا شیشے والے بلوریں جام میں تھا۔ اس کے اثرات ضیا کی آنکھوں سے جھلک رہے تھے مگر وہ نشے میں نہیں تھا۔

ضیا حاد سرخ و سفید رنگت اور دلکش نقوش والا آدمی تھا اس کی عمر پچیس کے آس پاس تھی مگر اس نے خود کو اتنا سنبھال کر رکھا تھا کہ وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ کسی قدر ورزشی جسمات پر ہر لباس اچھا لگتا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ اور مختصر بالے بال گردن سے نیچے آ رہے تھے، نفاس سے ترشی ہوئی موچیں۔ اس کی آنکھوں کا اصل رنگ براؤن تھا مگر وہ باہر جاتے ہوئے لائٹ براؤن مکر کے لینس

ارب ڈالر کے مساوی رقم تھی۔ اگر یہ نکل جاتی تو ضیاع فکر ہو کر یہاں سے جاسکتا تھا۔ خاصے غور و خوض کے بعد اس نے سال بھر پہلے ایک منصوبہ تیار کیا تھا۔ بلکہ اس پر ابتدائی کام بھی مکمل کر لیا تھا۔ جب شفیع اللہ نے اس سے تعاون سے انکار کیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو پلان میں عمل درآمد کا سکل دے دیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اب شفیع اللہ اس کا کام کرے گا۔ اس بار وہ انکار کی جرأت نہیں کرے گا۔ تمام کام بہت صفائی سے ہوا تھا اور اس کا یقین اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اس نے شام کی فلائٹ سے سیٹ بک کرائی تھی۔ فلائٹ بیرون ملک کی تھی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاتا۔ اس کے پیچھے صرف یہ ایک گولی اور چند معمولی سے اثاثے رہ جاتے جن کی اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔

☆☆☆

شفیع اللہ اپنے دفتر میں تھا۔ آنے والے دنوں میں اس کے بینک کی مزید چھ شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہونے جارہی تھیں کیونکہ زرمبادلہ اسکیم کی وجہ سے بینک کا بزنس تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بینک کے اکاؤنٹ ہولڈرز کو اس اسکیم کے تحت باہر سے زرمبادلہ منگوانے پر خصوصی رعایت دی جا رہی تھی اس لیے اکاؤنٹ کھلوانے کی رفتار میں تیزی آئی تھی اور مزید برائچوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ بینک کا ہیڈ آفس شہر کے مرکزی بزنس ایریا میں ایک چھ منزلہ بلڈنگ میں تھا۔ اس میں بینک نے برابر والا انٹریہ یاؤں ہزار گز کا پلاٹ خرید لیا تھا اور اب اس پر بلند ترین بلڈنگ کی تیاری کا منصوبہ تھا جس میں نہ صرف اس میں بینک کا ہیڈ آفس بلکہ بہت سے دوسرے کاروباری اور مالیاتی اداروں کے دفاتر بھی قائم ہوتے۔ بزنس کے لحاظ سے موجودہ عمارت اب کم پڑنے لگی تھی۔

بینک میں بینک کا وہ مرکزی کمپیوٹر سسٹم تھا جو قوم کی آن لائن منتقلی کرتا تھا۔ یہ سسٹم نہ صرف ساری دنیا کے مالیاتی مراکز سے رابطے میں رہتا تھا بلکہ اس میں بینک کی تمام برانچوں، اسے ای ایئر اور مرکزی ڈیٹا کا دوسرے اسے ای ایئر سے بھی رابطہ رکھتا تھا۔ اس سے بینک کے کسٹمر کو بہترین سروس ملتی تھی اور اس میں بینک کا ریکارڈ کا تھا اس کا اسے فی ایم لنک بھی ڈاؤن نہیں ہوتا تھا جسے اس کی اسے فی ایم مشینیں بھی کیش سے خالی نہیں ہوتی تھیں۔ کسی بھی اسے فی ایم کے کم یا چوری ہونے کی صورت میں ایک فون کال پر گاہک صرف تین منٹ میں اپنا کارڈ بلاک کر سکتا تھا۔ اگر اس کے باوجود کارڈ نہیں استعمال کر لیا جاتا تو بینک انشورنس

کی مدد سے گاہک کا نقصان پورا کرتا تھا۔ بینک میں کسٹمرز کے لیے یہ ساری سہولتیں شفیع اللہ نے ذاتی دلچسپی سے مہیا کی تھیں جو عام طور سے دوسرے بینک نہیں دیتے تھے۔

سعدیہ کے نام سے جو فاؤنڈیشن وہ قائم کر رہا تھا، اس کا خاکہ اس نے تیار کر لیا تھا۔ اس کے تحت ہر سال دو سو بے سہارا عورتوں کو منتخب کیا جاتا۔ انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے ان کے پس منظر اور تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے تعلیم و تربیت دلائی جاتی اور پھر انہیں اس میں گروپ میں نوکری مہیا کی جاتی یا انہیں کاروبار کرا دیا جاتا۔ آج شفیع اللہ اسی سلسلے میں کاغذی کارروائی کو ختمی صورت دینے جا رہا تھا۔ اس نے فاؤنڈیشن کے لیے این جی او کے ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں۔ گیارہ بجے شفیع اللہ ان کے ساتھ میٹنگ سے فارغ ہو کر ہیڈ آفس سے انٹرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ راستے میں اس نے احمر کال کی اور پوچھا کہ وہ لوگ انٹرپورٹ پہنچے یا نہیں۔ احمر نے بتایا کہ وہ سب روانہ ہو چکے ہیں اور سڑاڑے گیارہ بجے تک وہ انٹرپورٹ پہنچ جائیں گے۔

☆☆☆

رینا نے کار گیٹ کے سامنے روکی اور ہارن دیا تو کوشی کے اندر سے دانیال برآمد ہوا۔ اس نے ایک چھوٹا سا ہینڈ کیڑی اٹھا رکھا تھا، وہ اس نے عقبی نشست پر چھینکا اور خود فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔ رینا نے اسے دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔ دانیال ٹھوٹھ کر کے بالوں، صاف رنگت اور اچھے نقوش والا نوجوان تھا۔ گول سیاہ فریم والی عینک اس کی خوش روئی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ جینز اور پوری آستین کی ٹی شرٹ کے ساتھ اس نے براؤن جوکرز جینز رکھے تھے۔ رینا ہنسی۔ ”کسی ریس میں حصہ لینے جا رہے ہو؟“

دانیال نے نیچے دیکھا اور مسکرایا۔ ”جلدی میں یہی دستیاب ہوئے تھے۔ گھر میں صرف ماما کو بتایا ہے وہ تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ اگر تم اندر آؤ تو وہ اتنی آسانی سے جانے نہیں دیتیں۔“

”مجھے ماما بہت اچھی لگتی ہیں مگر اس وقت ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رک سکتی۔ میں بارہ بجے تک انٹرپورٹ پہنچتا ہوں۔“

”تم نے اگلے سے پوچھ لیا تھا کہیں بے عزتی نہ ہو جائے؟“

”پاپا نے ویلکم کہا ہے۔“ رینا نے کہا اور موبائل نکال

کر شفیع اللہ کو کال کی۔ ”پاپا آپ کہاں ہیں... ہاں میں دانی کو لے کر پہنچ رہی ہوں۔“

☆☆☆

انٹرپورٹ پہنچ کر نو علی نے کار مرکزی زمین کی طرف لے جانے کے بجائے اس کا رخ ہینڈلر کے مین گیٹ کی طرف کر دیا۔ گیٹ پر مخصوص پاس رکھانے پر گاڑی کو اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ مگر اندر آ کر نو علی نے گاڑی ایک طرف روک لی۔ شفیع اللہ کو باقی افراد کا انتظار تھا۔ وہی انہیں اندر لے جاسکتا تھا کیونکہ مخصوص پاس صرف ایک ہی تھا۔ چند منٹ بعد وہ سب بھی آگئے اور شفیع اللہ انہیں اندر لے گیا۔ گاڑیوں کا یہ قافلہ انٹرپورٹ کے لیے مخصوص ہینڈلر سے ذرا فاصلے پر بھی طیاروں کے ہینڈلر تک پہنچا۔ ایک ہینڈلر میں شفیع اللہ کا ذاتی جیٹ طیارہ سینا سیٹیشن تھری موجود تھا۔ اس نے پانچ سال پہلے یہ طیارہ ایک آسٹریلین ٹورفرم سے خریدا تھا۔ طیارہ اندر سے مل آ رہا تھا۔

دو جیٹ اینجن والا یہ طیارہ دنیا کے چند سب سے زیادہ استعمال ہونے والے بزنس جیٹ میں سے ایک ہے۔ اس کے کشادہ کیمین کی آرائش استعمال کے لحاظ سے کی جاسکتی تھی۔ عام طور سے دو پائلٹس کے ساتھ گیارہ مسافر بھی اس میں سفر کر سکتے ہیں۔ جبکہ ایک فضائی میزبان کی مچائش بھی ہوتی ہے۔

بزنس کے سلسلے میں شفیع اللہ اور اس کے خاندان کے افراد کو بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا تھا خاص طور سے اندرون ملک وہ زیادہ سفر کرتے تھے۔ قومی انٹر لائن اور نجی انٹر لائن کا حال برا تھا۔ فلائٹ سیٹی اور پابندی اوقات قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ ایسے میں یہ پرائیویٹ جیٹ ان کی کلاس کی بزنس ٹیلی کے لیے نامزد ہو گیا تھا۔ دو تجربے کار پائلٹس کے ساتھ ایک فضائی میزبان بھی اس طیارے کے عملے میں شامل تھی لیکن اس سفر کے لیے شفیع نے اسے لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی البتہ طیارے کے دونوں پائلٹس کپٹن زوہیر صدیقی اور اس کا ماتحت مشتاق حسن موجود تھے۔ وہ کئی ٹھنڈوں سے یہاں موجود تھے اور ان کی آمد سے پہلے طیارے کی مکمل چیکنگ کر چکے تھے۔ اس چیکنگ میں طیارے کی مشینری کا مکمل چیک شامل تھا۔ شفیع اللہ سیرجی کے پاس پہنچا تو اندر سے کپٹن صدیقی نمودار ہوا۔

”ویلم آؤ بورڈر۔“

”شکریہ۔“ شفیع اللہ نے اوپر آتے ہوئے کہا۔

”سب ٹھیک ہے نا؟“

اشادہ

”بالکل سر...“ کپٹن صدیقی کا کپٹ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”ہم پانچ منٹ میں پرواز کریں گے۔“ شفیع اللہ کے پیچھے باقی سب تھے۔ ظفر کے بعد دانیال اندر آیا۔ اس نے گاڑی سے اترنے کے بعد شفیع اللہ سے ہاتھ ملایا تھا۔ البتہ دوسروں کی طرف اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ باقی سب اسے زیادہ پسند نہیں کرتے ہیں۔ اسی لیے اسے بھی ان کی پروا نہیں تھی۔ اس کے پیچھے رینا بھی اور اس نے آتے ہی بائیں طرف کی فرنٹ سیٹ پر قبضہ کر لیا کیونکہ یہاں سے نیچے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ عقبی نشستیں زیادہ تر پروں کے ساتھ تھیں اور ان سے نیچے کا منظر اتنا واضح نہیں دکھائی دیتا تھا۔ پچھلی بار جب تمام خواتین شاپنگ کے لیے وہی جگہ میں ٹو مونا نے اس سیٹ پر قبضہ کر لیا اور اس پر دونوں بیٹوں میں لڑائی ہوئی تھی۔ یہ مشکل سونیا اور شرمین نے ان کی صلح کرائی تھی۔ آج رینا نے شاید اسی کا بدلہ لیا تھا۔ پیچھے آئی مونا نے احتجاج کیا۔ ”یہ ایمانی ہے۔“

”پہلے آئیے پہلے پاپے۔“ رینا ہنسی۔

آخری آدمی کے اندر آتے ہی کو بائٹ مشتاق حسن نے ہینڈلر شفیع کر سیرجی اور دروازہ اندر کر لیا۔ اسے لاک کر کے وہ کاپٹ کی طرف بڑھ گیا جو پروں کے پیچھے تھا۔ تمام افراد کے بیٹھے ہی لیپٹن صدیقی نے طیارے کے جیٹ اینجن اشارت کر دیے اور بائیں دونوں پریٹ ہٹلٹس باندھ لینے کی ہدایت کی۔ سب اپنی سیٹ ہٹلٹس باندھنے لگے۔ ان کے پاس مختصر ہینڈلر کی تھے جو مخصوص خانوں میں رکھ دیے گئے تھے۔ طیارہ ٹیکسی کرتا ہوا ہینڈلر سے باہر آیا۔ کپٹن صدیقی انٹرپورٹ کنٹرولر کو اپنا فلائٹ پلان بتا کر اس سے اجازت لے چکا تھا۔ اس نے ٹیک آف کی اجازت مانگی اور اسے ٹی سی کی ہدایت پر طیارے کو مخصوص رن وے کی طرف لے گیا۔ رن وے پر آتے ہی طیارے نے رفتار بکڑی۔

چھتیس ہزار فٹ کے فلائٹ لیول پر آنے کے بعد طیارے کی پرواز ہموار ہو گئی۔ کپٹن صدیقی نے سیٹ ہٹلٹ کھول لینے کا اعلان کیا۔ شفیع اللہ نے سیٹ ہٹلٹ کھولتے ہوئے طیارے کے باہر دیکھا۔ آسمان صاف تھا اور کہیں کہیں بادل تھے۔ البتہ دارالحکومت کے آس پاس بھی بارش جاری تھی مگر موسم بہت خراب نہیں تھا۔ سامنے میز پر تھراپاس تھے جن میں چائے اور کافی تھی۔ اسی طرح بیک اسٹیکس تھے وہ جو چاہتے خود سے لے سکتے تھے مگر فی الحال

کسی کاموڈ نہیں تھا۔ تقریباً سب نے اپنے موبائل نکال لیے تھے یا آپس میں بات کر رہے تھے۔ شیخ اللہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے لپ ٹاپ پر کچھ چیزیں چیک کر لے۔ اس نے بریف کیس سے مختصر سی اپیل کی انٹریک نکالی۔ یہ جدید ترین لپ ٹاپ کسی فائل سے زیادہ موٹا نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے شیخ اللہ اسے کھول کر دیکھ رہا تھا۔

”پاپا آج نیواپنا ٹائٹ بھی ہوگی۔“
”سو واٹ؟“ شیخ اللہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہوٹل میں اس کی تقریب ہوگی؟“
اس نے ٹیلی میں سر ہلایا۔ ”تم جانتی ہو میں ایسی تقریبات کا قائل نہیں ہوں۔“
”بزئس کے پوائنٹ آف ویو سے یہ اچھی بات ہوتی۔“ باسل نے آہستہ سے کہا۔

”برخوردار میرے نزدیک سب کچھ بزئس ہی نہیں ہے۔“ شیخ اللہ نے جواب دیا اور لپ ٹاپ میز پر رکھا لیکن اس بار بھی اسے کھولنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے موبائل نے تیل ہی نہ تھی۔ شیخ اللہ نے موبائل اٹھایا۔ اس پر ایک ایجنسی نمبر آ رہا تھا اور وہ ایجنسی نمبر سے کال ریسیو نہیں کرتا تھا اس لیے اس نے کال کاٹ دی۔ فوراً ہی ریناکے موبائل کی تیل بجی اور اس نے ایجنسی نمبر کے باوجود کال ریسیو کر لی اور پھر موبائل شیخ اللہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”پاپا کوئی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

اس نے موبائل لے کر نمبر دیکھا اور اس کی پیشانی پر شکن آگئی۔ یہ وہی نمبر تھا۔ ”ہیلو کون بات کر رہا ہے؟“
”اہم بات یہ نہیں ہے کہ کون بات کر رہا ہے۔“
دوسری طرف سے مشینی سی آواز آئی۔ ”اہم بات یہ ہے کہ وہ کیا بات کر رہا ہے؟“

”اوکے، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”شیخ صاحب۔“ مشینی انداز میں آواز سنائی دی۔
”تم اپنے سینا جیٹ طیارے میں سطح زمین سے چھتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہو۔ ایسے میں اگر طیارے میں موجود بم پھٹ جائے تو یقیناً تم سب کے ہتھیارے اڑ جائیں گے۔“

شیخ اللہ کا دل ایک لمحے کو رکنا گرجب وہ بولا تو اس کا لہجہ نارمل تھا۔ ”بات واضح نہیں ہے۔“
”میں واضح کرتا ہوں۔ طیارے کے عقبی حصے میں جہاں آخری نشست ہوتی ہے۔ اس وقت وہاں نشست نہیں

ہے۔ فرش پر موجود خانہ کھولو گے تو تمہیں ایک باکس ملے گا۔ باکس کا صرف ڈھکن کھولنا۔ اسے خانے سے نکالنے کی کوشش مت کرنا ورنہ عمل اجتماعی خودکشی کہلائے گا۔ میں دو منٹ بعد تمہارے نمبر پر کال کرتا ہوں۔“

شیخ اللہ نے موبائل ریناکے طرف بڑھا دیا جو غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ جاننے میں ناکام رہی کہ کال کرنے والا کون تھا اور اس نے پاپا سے کیا بات کی تھی۔ وہ اٹھ کر کیمین کے آخری حصے کی طرف بڑھا۔ پردہ ہٹا کر دواش روم کے پاس سے گزر کر وہ آخری حصے میں آیا۔ یہاں فرش میں چوکور آہنی جالی والی پیلیس فرش میں نصب تھیں۔ انہیں اسکرول کی مدد سے بند کیا گیا تھا مگر جہاں آخری نشست ہوتی ہے وہاں کا ایک خانہ پنا اسکرول کے تھا۔ اس نے کھٹکوں کے تیل جھکتے ہوئے احتیاط سے اس کی فلاوی جالی اٹھائی۔ اندر سرخ رنگ کا آئینس جیسا پلاسٹک کا باکس تھا۔ شیخ اللہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر رک گیا۔ اگر کال کرنے والے نے غلط بیانی سے کام لیا اور اس میں موجود بم ڈھکن کھولنے ہی پھٹ جائے تو؟ مگر اس صورت میں اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم تو ٹائم کے لحاظ سے بھی بلاسٹ کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بھی ممکن تھا وہ اس کے ساتھ ٹیل رہا ہو۔ ان سب کی موت کا انتظام وہ اس کے ہاتھ سے جانتا ہو۔ بہر حال اسے تصدیق تو کرنی تھی۔ کسی قدر شکش کے بعد اس نے ہمت کر کے اللہ کا نام لے لیں کا ڈھکن کھول لیا اور کچھ نہیں ہوا۔ بکس میں موجود بم سامنے آ گیا تھا۔

یہ عام بم نہیں تھا بلکہ جدید قسم کا بم تھا جس میں دو مختلف محلول الگ الگ شفاف ٹیوبس میں تھے۔ اگر انہیں تیسری خالی ٹیوب میں کس کر دیا جاتا تو بس ایک چنگاری کی دیر ہوتی اور بم پھٹ جاتا۔ تاروں کے مجھے تھے اور جدید ڈیجیٹل سرکٹ تھا جو بم کے فنکشن کو کنٹرول کرتا ہے۔ ایک طرف اسکرین تھی اور اس کے نیچے چھوٹا سا نمبرک پیڈ تھا جس پر ایک سے لے کر صفر تک ہندسے تھے اور ایک ٹین انٹر کا تھا۔ اسکرین کے اوپر ہی حصے پر ہندسے چمک رہے تھے۔ یہ نامرکھا جو دو گھنٹے اور پندرہ منٹ کا وقت ظاہر کر رہا تھا۔ ہرگز رتے لمحے وقت میں کمی ہو رہی تھی۔ شیخ اللہ اس چیز کا مایہ نہیں تھا لیکن اس کی چھٹی جس نے بتایا کہ بم نہ صرف اصلی ہے بلکہ نہایت مہلک ہے۔ یہ اس طیارے کے کمرے کے کمرے کے دیے کے لیے کافی تھا۔ موبائل نے تیل دی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔
”یہ سب کیا ہے، تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟“

”سر میں نے کیا کیا ہے؟“ دوسری طرف سے اس کی سکرین پر روئی کی آواز آئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے نمبر دیکھا ہی نہیں تھا۔ بم کی موجودگی نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”سوری میں کوئی اور سمجھا تھا۔ تم نے کیوں کال کی ہے؟“

”سر آپ اپنی پوائنٹ بی بھول گئے۔“
”اسے اپنی تحویل میں رکھو میں واپسی پر لے لوں گا۔“ شیخ اللہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اسے خیال آیا اگر واپسی ہوئی تو۔۔۔ اب اس نے خود ہی نمبر لایا جس سے کال آ رہی تھی۔ دوسری تیل کے ساتھ ہی کال ریسیو کر گئی۔
”تم نے دیکھ لیا ہوگا؟“ مشینی آواز والے نے کہا۔
یقیناً وہ کوئی وائس چیجر استعمال کر رہا تھا۔

”ہاں، تم کیا چاہتے ہو؟“
”مگد، ٹو دی پوائنٹ بات کرنے والے لوگ مجھے پسند ہیں اور میں خود بھی اسی طرح بات کرنا پسند کرتا ہوں۔“
پیل میں تمہیں کچھ پوائنٹس بتا دوں تاکہ تم خودکشی سے بچ سکو۔ اول یہ بم دس ہزار فٹ کی بلندی پر آتے ہی خود کار انداز میں اپنی ویٹ ہو جاتا ہے۔“
”یہ نام تم ہے؟“ شیخ اللہ نے بم کی طرف دیکھا۔
”اس پر اسٹاپ واضح آ رہی ہے اور وقت دو گھنٹے بارہ منٹ رہ گیا ہے۔“

”بالکل دو گھنٹے بارہ منٹ بعد یہ بم بلاسٹ ہو جائے گا۔ وراصل یہ ملی فنکشن بم ہے۔ تم اسے کمپیوٹرائزڈ بم بھی کہہ سکتے ہو۔ اب اگر طیارے نے ہائٹ لوڈ کی اور دس ہزار فٹ سے نیچے آیا تب بھی بم بلاسٹ ہو جائے گا۔ بم کو بکس سے باکس کو خانے سے نکالنے کی کوشش کا بھی بالکل یہی نتیجہ نکلے گا۔“

شیخ اللہ کا ذہن اب صورت حال جان کر سوچنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا، اس نے سوال کیا۔ ”اسے ڈی ایٹنی ویٹ کرنے کا طریقہ؟“

”ایک مخصوص کوڈ جو نمبرک پیڈ پر لپٹ کر دیا جائے گا اور بم ڈی ایٹنی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔“ بولنے والے کا انداز ڈرامائی ہو گیا۔ ”اس کوڈ کی ایک قیمت ہے جو تم ادا کر سکتے ہو، کیا تم ادا کرنا پسند کرو گے؟“
شیخ اللہ اس سوال کے مکند جواب پر غور کرنے لگا۔

اشارہ

معاملہ صرف اس کی بلکہ اس کے پورے خاندان کی زندگی کا تھا۔ وہ ان کے لیے ذرا بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو تاوان؟“
”نہیں تم سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔“
”کیسا کام؟“

”تم اپنے لپ ٹاپ سے اپنے بینک کے کمپیوٹر سے رابطہ کرو گے۔ میں تمہیں کچھ مخصوص اکاؤنٹس اور ان کے پین نمبرز بتاؤں گا۔ تم ان اکاؤنٹس میں موجود رقم اپنے بینک کے ذریعے میرے بتائے ہوئے بین الاقوامی اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کرو گے۔ جب یہ کام ہو جائے گا تو میں تمہیں ڈی ایکٹو کوڈ بتا دوں گا۔ ایک بات اور واضح کر دوں۔ اپنی طرف سے کوئی ٹکا مت لگانا کیونکہ غلط کوڈ انٹر کرنے کی صورت میں ہم بلاسٹ ہو جائے گا۔“

”رقم کی بیرون ملک منتقلی کون سا مشکل کام ہے جس کے لیے تم نے یہ سب کیا ہے؟“
”مشینی آواز والا نہنا۔“ اگر مشکل نہ ہوتا تو میں تم سے کہتا۔ تمام اکاؤنٹس مقامی ہیں۔ اگرچہ ڈالر میں ہیں۔ لیکن ان سے ڈالر بیرون ملک منتقل نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ تمہارے بینک کا سرور یہ کام آسانی سے کر سکتا ہے کیونکہ وہ بین الاقوامی سسٹم سے منسلک ہے۔“
”یہ کام آسان نہیں ہے۔“

”بہت آسان ہے، اگر تم ابھی سے شروع کر دو۔ واضح رہے کہ اکاؤنٹس کی تعداد ایک سو پچاس ہے اور جن اکاؤنٹس میں رقم ٹرانسفر کرنی ہے، وہ پہلے ہی ان میں ایڈ ہیں۔ ان کی تعداد بھی ایک درجن ہے۔“
”ایک سو پچاس اکاؤنٹس۔“ شیخ اللہ کی پریشانی بڑھ گئی۔ ”میں یہ کام آتی جلدی نہیں کر سکتا۔“

”تمہارے پاس دو گھنٹے اور دس منٹ ہیں۔“ مشینی آواز والے نے کہا۔ ”جتنا وقت تم فضول میں ضائع کرو گے، وہ تمہیں موت کے قریب لے جائے گا۔ اپنا ای میل چیک کرو۔ اس میں تمہارے لیے ایک گفت بھی ہے۔“

کال کاٹ گئی تھی اور شیخ اللہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہ کام آسان نہیں ہے، اسے جلد از جلد سب کرنا ہوگا۔ وہ سب سے پہلے کاک پیٹ میں آیا اور اس نے جھک کر کیمپین صدیقی کے کان میں صورت حال واضح کی۔ کیمپین صدیقی تجرے کار یا ٹک تھا۔ اس کے پاس فلائنگ کاتیس سالہ تجربہ تھا۔ وہ ہر قسم کی صورت حال میں طیارہ اڑا سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں۔“

کیا جاسکتا ہے؟

”بالکل۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بہ شرط کہ معلوم ہو جائے کہ وائس چیئر سوئفٹ ویئر کون سا ہے۔ ویسے اس قسم کے سوئفٹ ویئر بہت زیادہ نہیں ہیں عام قسم کا وائس چیئر ہے تو اس کا توڑ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ اب اس کی کال آئے تو آپ وائس ریکارڈ کر لیجئے گا۔“

احمر، ظفر اور باسط کاک پٹ میں تھے بلکہ اس کے دروازے پر جمع تھے کیونکہ کاک پٹ میں گھنٹا نہیں بھنی۔ احمر اور ظفر کے اصرار پر کیپٹن صدیقی نے ان سے کہا۔ ”جب تک شفیع صاحب نہیں کہیں گے میں کنٹرول ٹاور کو نہیں بتا سکتا۔“

ظفر واپس آیا اور اس نے شفیع اللہ سے کہا۔ ”پاپا کیپٹن سے کہیں کہ وہ کنٹرول کو اطلاع کر دے۔“

شفیع اللہ نے کہا۔ ”میں نے اس بارے میں غور کیا ہے، بہتر ہوگا کم اس معاملے میں ذرا صبر سے کام لیں۔“

شرین، سونیا اور مونا اپنی نشستوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ رینا اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ظفر نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔ ”پاپا ہمارے پاس ایک گھنٹا اور پچاس منٹ کا وقت رہ گیا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اتھارٹیز ہماری مدد کر سکیں گی۔“ شفیع اللہ کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”وہ ایک گھنٹا اور پچاس منٹ میں اس شخص تک پہنچ کر اس سے کہنا کارہ کرنے والا کوڑے لے سکیں گی۔ نہیں، ہمیں اس صورت حال سے خود ہی نمٹنا ہوگا۔“

احمر بھی کاک پٹ کی طرف سے آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پاپا اس کے پیچھے فیا حامد ہی ہے اور وہ اپنا مطالبہ پورا کر کے بھی درست کوڈ نہیں بتائے گا۔“

رینا بولی۔ ”ہاں پاپا ہم اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کرنا ہوگا۔“

”مثلاً ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”پاپا اگر ہم ویڈیو میں یہ سب بیان کر کے اور فیا حامد کے نام کے ساتھ اپنے کسی جاننے والے کو بھیج دیں تو اس کے خلاف یہ اہم ثبوت بن جائے گا۔ کم سے کم وہ بھی آسانی سے نہیں بچے گا۔“ رینا نے آئینہ یاغیش کیا جو شفیع اللہ کو اچھا لگا۔

وہ اسے لے کر اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ شفیع اللہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے گا؟ اگر کنٹرول ٹاور کو اس واقعے کے بارے میں بتایا جائے تب بھی وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا امکان بہت کم تھا کہ کال کرنے والے کا سراغ لگایا جاسکے۔ وہ یقیناً کوئی ایسی سم استعمال کر رہا تھا جس سے اس کی طرف اشارہ بھی نہ جاسکے اور وائس چیئر کی وجہ سے اس کی آواز اتنی بدل چکی تھی کہ اسے آلات کی مدد سے بھی شناخت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کال کرنے والا یقیناً لوکیشن بھی بدل رہا ہوگا تاکہ قانون نافذ کرنے والے اس تک نہ پہنچ سکیں۔ شفیع اللہ جانتا تھا کہ اس ملک میں قانون کے محافظ نہ تو اتنے تربیت یافتہ ہیں اور نہ ہی ان کے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ وہ ہمنوں اور گھنٹوں کی دلوں میں بھی جرم کرنے والے تک پہنچ سکیں۔

اسے اطلاع تو دینی تھی لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اس صورت میں کہیں اس کا وقت نہ ضائع ہو جو وہ اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی بچانے میں استعمال کر سکتا ہے۔ وہ ہم لگنے والے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فرض کر لیا جائے کہ وہ اپنا کام بھی کر والیتا ہے اور اسے درست کوڈ نہیں بتاتا (فیا حامد ایسا ہی کرتا) تب وہ اسے کس طرح مجبور کر سکتا ہے کہ وہ درست کوڈ بتائے۔ سوچتے ہوئے اسے اکاؤنٹس کا خیال آیا اور اس نے دانیال سے کہا کہ وہ اکاؤنٹس نمبر والی ای میل کو اسے فارورڈ کر دے۔ دانیال نے مشکل سے پندرہ سیکنڈ میں یہ کام کر دیا۔ کی بورڈ پر برق رفتاری سے چلتی اس کی انگلیاں دیکھ کر شفیع اللہ نے دل ہی دل میں تسلیم کیا کہ وہ اس رفتار سے یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو کی بورڈ پر ایک دو انگلیوں سے ٹاپ کرتا تھا، اس طرح ٹاپ کرنا کہ انگلیاں نظری نہ آئیں اسے نہیں آتا تھا۔ دانیال اسی طرح ٹاپ کر رہا تھا۔ ای میل جاتے ہی اس نے موبائل پر بینک کے اکاؤنٹ ہولڈرز کے ریکارڈ کے شعبے کے انچارج حمید الدین سے رابطہ کیا۔

”ایک ای میل تمہارے آفیشل میل پر فارورڈ کی ہے اس میں موجود اکاؤنٹس ہولڈرز کی پروفائلز چیک کرو اور اکاؤنٹس کی ٹرانزیکشن ہسٹری دیکھو۔ میں آدھے گھنٹے بعد دوبارہ کال کرتا ہوں۔“

ایس ایس بینک کی درجنوں برانچز زر مبادلہ میں اکاؤنٹس رکھتی تھیں اور ایسے اکاؤنٹس کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ اس لیے ان ڈیڑھ گھنٹے میں اس کی طرف کس کا دھیان جاسکتا تھا، کال کر کے اس سے پوچھا۔ ”اسمارٹ فون میں جو وائس چیئر ہوتے ہیں ان کی تبدیلی شدہ آواز دوبارہ تبدیل

کیا۔

کیونکہ ہم لگانے والے نے اس حوالے سے انہیں کوئی دھمکی نہیں دی تھی اس لیے شفیع اللہ نے انہیں اجازت دے دی۔ ”تم لوگ اپنے طور پر جو چاہو کرو میری توجہ جی الجال اس کے مطالعے پر ہے۔ میرے نزدیک ہماری ایک یہی لائف لائن ہے۔“

دو منٹ بعد ظاہر نے اسے اطلاع دی۔ ”سرور تیار ہے سر لیکن یہ صرف آپ کے لیپ ٹاپ کو قبول کرے گا۔ مجھے اس تک رسائی دیں۔“

شفیع اللہ نے لیپ ٹاپ بینک سرور سے شیئر کیا اور ظاہر نے اس میں سیٹنگ کر دی۔ اس نے کہا۔ ”سر اب آپ سرور تک عمل ایکسپیر کر سکتے ہیں۔“

اس نے چیک کیا۔ سرور اسے مکمل رسائی دے رہا تھا۔ اس نے پہلے ایک بینک اکاؤنٹ اوپن کیا۔ یہ کامیابی سے مکمل کیا۔ اس اکاؤنٹ میں ایک کروڑ اور بارہ لاکھ ڈالرز کی رقم موجود تھی۔ دانیال غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ یہ رقم منتقل کر رہے ہیں؟“

”ہاں، اسی شرط پر ہم ڈی ایٹھ کوڑے ملے گا۔“ دانیال نے اگلا سوال کیا۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ رقم کی منتقلی ایک مخصوص مدت بعد ریورس ہو جائے۔“

شفیع اللہ کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے ظاہر سے پوچھا اور اس نے کہا۔ ”ہمارے سسٹم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، لیکن ہم شامل کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”ہمیں بینکوں کو درخواست بھیجنی ہوگی کہ اگر رقم ایک خاص مدت میں اکاؤنٹ سے نہ نکالی جائے تو وہ ریورس ہو جائے گی۔“

”اس کام میں کتنی دیر لگے گی؟“

”یہ بات بین الاقوامی بینکنگ کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں۔“

دانیال سب سن رہا تھا، اس نے شفیع اللہ سے کہا۔ ”انکل آپ یہ کام کریں اور رقم کی منتقلی مجھے کرنے دیں۔ میں زیادہ تیزی سے یہ کام کر لوں گا۔ آپ یہ کام تیزی سے نہیں کر رہے ہیں۔“

شفیع اللہ نے اسے گھورا۔ ”کوئی گریڈ ہوئی تو...“

”نکلنے کی صورت میں یہ فوراً بلاسٹ ہو جائے گا۔ یہ بات ہم لگانے والے نے بتائی ہے۔“

”یہ سب ان لوگوں کی غفلت کا نتیجہ ہے۔“ ظفر نے برہمی سے کاک پٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا فیصلہ زمین پر اترنے کے بعد ہی کیا جاسکے گا۔“ شفیع اللہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”فی الجال ہماری ساری توجہ اس پر ہوئی چاہیے کہ کسی طرح اپنی جان بچا لیں۔“

”ہم لگانے والا کیا چاہتا ہے؟“ دانیال نے پوچھا۔

”ہاں یہ کام کا سوال ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے بتائے کچھ اکاؤنٹس سے رقم بیرون ملک بینک کے سسٹم کے ذریعے منتقل کروں۔ اس سسٹم کے تحت اکاؤنٹس سے اکاؤنٹس میں فوری رقم منتقل کی جاسکتی ہے اس کے علاوہ پورے ملک میں کوئی ایسا سسٹم نہیں ہے۔ تب ہی اس نے طیارے میں ہلکا کر اسے ہائی جیک کر لیا ہے۔“

”یہ کیا ہے پاپا؟“ رینا نے تصویر کی طرف اشارہ کیا جو اب بھی تھی۔

”یہ بھی اسی نے بھیجی ہے۔“ شفیع اللہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کہنا یہ یکٹ ہے۔“

”یہ اُسی کا کام ہے۔“ ظفر نے کہا۔ وہ ٹپل رہا تھا اور بار بار اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

”فیا حامد کا۔“ احمر نے اس کی تائید کی۔ ”پاپا سے کہا تھا اس سے مت انھیں۔ انجام دیکھ لیا نا۔“

”وہ کینہ پرور آدمی ہے۔“ باسط بولا۔ ”جس کا دشمن ہو جائے اسے بھی معاف نہیں کرتا ہے۔“

”تم سب خاموش ہو گے کیا؟“ شفیع اللہ نے تیز لہجے میں کہا اور موبائل اٹھالیا۔ اس نے ظاہر کو کال کی۔ ”کام ہو گیا؟“

”دو منٹ اور سر۔“ اس نے ہتھی لہجے میں کہا۔

”کمانڈر آسان نہیں ہیں۔“

”اوکے دو منٹ اور۔“ اس نے زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا اور موبائل رکھ دیا۔ مونا نے کہا۔

”پاپا ہمیں اتھارٹیز کو اطلاع دینی چاہیے۔ وہ ہمیں بچانے کے لیے کچھ تو کریں گے۔“

شفیع اللہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ اس صورت حال میں زمین سے کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔“

”پھر بھی اطلاع تو دینی چاہیے۔“ باسط نے اصرار

موتانے گھبرا کر کہا اور وہ ہنسی ہو گئی۔ ”مجھے اپنے بچے کی فکر ہے۔“

باسط اس کے پاس چلا آیا۔ ”فکرمات کرو کچھ نہیں ہوگا۔“

رینا جو دانیال کے ساتھ تھی، وہ بھی بہن کے پاس چلی آئی اور اسے قہقہے دینے لگی۔ ظفر اور احمد بھی اپنی بیویوں کے پاس تھے۔ شفیع اللہ ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے کوئی زیادہ فکر مند نہیں تھا اور وہ سب کے لیے فکر مند تھا۔ اگر اسے فکر نہیں تھی تو اپنی ذات کی نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنا وقت گزار چکا تھا اور اب اسے ان کے لیے سوچنا تھا۔ اس کی کل کمائی بھی اولاد کی تھی۔ وہ ان کے بدلے یہ فحش مرنے کو تیار تھا مگر اپنی زندگی میں انہیں مرتے دیکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ضیا حامد اسے بھی پسند نہیں رہا تھا۔ یونیورسٹی کی دوستی بھی محدود مدت کے لیے تھی۔ پھر جب وہ اقتدار میں آیا تو شفیع اللہ نے اس سے دور رہنے کی پوری کوشش کی۔ ضیا نے خود اس سے رابطہ کیا تھا۔ شفیع اللہ نے اسے انکار کیا تھا اور جب تک وہ اقتدار میں رہا شفیع اللہ اپنے اور اپنے خاندان کی سلامتی کے حوالے سے فکر مند رہا تھا۔ اس دور میں وہ خود بھی محتاط رہا تھا اور بچوں کو بھی محتاط رہنے پر مجبور کیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس ملک میں چند ہزار میں مارگٹ کلر مل جاتا ہے جو کسی بھی شخص کو سہ آسانی نشاندہ بنا سکتا ہے۔ صرف زندگی و موت پر پختہ ایمان ہی اسے ترک وطن سے روکے ہوئے تھا۔ یہ پانچ سال اس نے بہت مشکل سے گزارے تھے۔ پھر ضیا حامد کی پارٹی کو الیکشن میں بدترین شکست ہوئی اور وہ ایوان اقتدار سے رخصت ہوا تو شفیع اللہ کے ساتھ بہت سے دوسرے افراد نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ یہ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ ضیا حامد اس وقت وار کرے گا جب شفیع اللہ کے خیال میں وہ اس قابل نہیں رہا تھا۔ شاید یہ اس کی بھول تھی۔ وہ اب اقتدار میں نہیں تھا مگر اس کے پاس ذرائع کی کمی نہیں تھی۔ اس نے بہت صفائی سے شفیع اللہ کے طیارے میں ہم نصب کر دیا تھا۔ وہ کاک پٹ تک آیا اور اس نے جیٹا بارکپٹن صدیقی سے پوچھا۔

”ہم کیسے آن بورڈ ہوا؟“

”سرمہار کام پرواز سے پہلے ان تمام فکشنز کو چیک کرنا ہوتا ہے جن پر پرواز کا دار و مدار ہوتا ہے۔“

صدیقی نے جواب دیا۔ ”ہم عام طور سے سین کو سرسری سا

کرنے والا کوڑے لگا۔“

شیر شاہ نے معاملے کے قانونی پہلوؤں کی بات کی۔

”ایسا کر کے تم ایک مجرم کی مدد کرو گے۔“

”یہ کام میں اپنے لیے کر رہا ہوں اگرچہ جانتا ہوں کہ یہ سنگین جرم ہے۔“

شفیع اللہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں لسٹ ای میل کر رہا ہوں۔“

وہ واپس سین میں آیا اور اس نے دانیال سے لسٹ شیر شاہ کے ای میل پر فارورڈ کرانی۔ اس وقت تک دانیال تیس اکاونٹس کی رقم فرانسفر کر چکا تھا۔ یہاں اس کی مجبوری تھی کہ بیک سرور ایک وقت میں ایک ہی اکاونٹ کو آپریٹ کرنے کی اجازت دے رہا تھا۔ وہ اکاونٹ پر لاگ ان کرتا اور رقم فرانسفر کر کے منتقلی مکمل ہونے کے پیغام کا انتظار کرتا اور پھر اس اکاونٹ کے لاگ آف ہوتے ہی دوسرا اکاونٹ کھولتا تھا۔ ایک اکاونٹ وہ تیس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں آپریٹ کر رہا تھا۔ رینا اس کے پاس کھڑی نوٹ کر رہی تھی کہ وہ کتنے اکاونٹ آپریٹ کر کے رقم منتقل کر چکا ہے۔

آنے سے پہلے شفیع اللہ نے ہم کا نام دیکھا تھا اور اس کی مناسبت سے اپنی کھڑی میں وقت دیکھ کر یاد کر لیا تھا۔ کھڑی کے مطابق ہم دو بج کر ستائیس منٹ بعد بھٹ جاتا اور اس وقت ایک بجتے میں آٹھ منٹ تھے۔ گویا ان کے پاس بچاؤ کے منٹ رہ گئے تھے۔ چاروں خواتین وید یو تیار کر چکی تھیں مگر انہوں نے اسے آگے فارورڈ نہیں کیا تھا۔ شفیع اللہ نے انہیں شیر شاہ سمیت چار مختلف ای میل ایڈریس دیے کہ وہ وید یو ان پریسل کر دیں۔ ان میں ایک ای میل اس کا بھی تھا۔

”پاپا میں سوچ رہی ہوں اپنی فرینڈز کو بھی بھیج دوں۔“

رینا نے کہا۔

”ہرگز نہیں، یہ بات جتنے کم لوگوں کے علم میں آئے، اتنا بہتر ہوگا۔“

شفیع اللہ نے منع کیا۔ ”اگر بات قبل از وقت مکمل گئی تو ضیا حامد پر پھر کر دیا وہ جاے گا کہ وہ ہمیں درست کوڈ دے بلکہ اس صورت میں وہ اگر درست کوڈ دے رہا ہوگا تب بھی رک جائے گا۔“

”پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

ظفر نے کہا۔ ”ہمیں یہ وید یو بچا کر رکھنی ہیں۔ ہم انہیں ایسے پرسنز کو بھیج سکتے ہیں جو انہیں اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ وہ انہیں بعد میں متعلقہ حکام تک پہنچا سکتے ہیں۔“

”اللہ نہ کرے، یہ تم بعد کی بات کیوں کر رہے ہو۔“

کام کا آغاز کر دو اور جب تک کام مکمل نہ ہو جائے سیٹ سے مت اٹھنا۔“

”میں سمجھ گیا سر۔“

شفیع اللہ نے کال کاٹ کر موبائل فون سے ہم کی کئی تصاویر لیں اور انہیں شیر شاہ کے موبائل نمبر پر وائس آپ کر دیا۔ اتفاق سے شیر شاہ بھی اس کا یونیورسٹی فیلو رہا تھا اور طلبہ سیاست میں وہ بھی سرگرم تھا۔ یونیورسٹی کے بعد اس نے سیاست کو ہی پیشہ بنایا کیونکہ اس کا خاندان سیاسی تھا۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد ان کا آپس میں رابطہ کم ہو گیا تھا مگر وقفوں سے رابطہ یا ملاقات بھی ہوتی رہی تھی۔ شفیع اللہ نے کال کی مگر شیر شاہ نے کال دی۔ وہ ہمیں مصروف تھا۔ لیکن شفیع اللہ کے لیے تو یہ زندگی و موت کا مسئلہ تھا اس نے پھر کوشش کی اور اس بار شیر شاہ نے کال ریسپونڈ کر لی۔ ”یار شیخ میں ایک اہم میٹنگ میں ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں لیکن میں زمین اور آسمان کے درمیان موت کے گھبرے میں ہوں۔“

شفیع اللہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں ایک ہم کی تصاویر وائس آپ کی ہیں جو میرے طیارے میں نصب ہے، اسے دیکھ لو میں ایک منٹ بعد پھر کال کرتا ہوں۔“

ہم کے لفظ نے شیر شاہ کو چھٹکا دیا۔ اس نے تیزی سے کہا۔ ”کال مت کاٹنا۔“

شفیع اللہ انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے شیر شاہ لائن پر تھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ ہم ہی ہے؟“

”اس قسم کا بھونڈا مذاق کون کرتا ہے؟“

شفیع اللہ نے جواب دیا۔ ”ویسے زیادہ بہتر ماہرین ہی بتا سکتے ہیں۔ مجھے تو یہ ہم ہی لگ رہا ہے۔“

”مجھے پوری بات بتاؤ۔“

شفیع اللہ نے کم سے کم الفاظ میں شیر شاہ کو ساری کہانی سنائی۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا کیونکہ اس نے ضیا حامد کا نام لیا پھر شیر شاہ نے کہا۔

”ڈرتے دار کو بعد کے لیے چھوڑو، ابھی تم سب کو بچانا اہم ہے۔“

”نمبر نوٹ کر لو جس سے مجھے دوبار کال آئی ہے۔ میں وہ لسٹ بھی تمہیں ای میل کر رہا ہوں جس سے رقم بیرون ملک فرانسفر کی جاتی ہیں۔“

نمبر نوٹ کر کے شیر شاہ نے پوچھا۔ ”کیا تم رقم فرانسفر کرو گے؟“

”مجبوری ہے اسی صورت میں مجھے ہم ڈی اکیٹو

کہا۔“

لیکن ہم یہ دھمکی اسے کوڈ لینے کے وقت دے سکتے ہیں اس سے پہلے یہ بیکار ہوگی۔“

”پاپا وزیر داخلہ شیر شاہ آپ کے اچھے دوست ہیں۔“

احمر نے کہا۔ ”آپ ان سے رابطہ کیوں نہیں کرتے؟“

”یہ خیال بھی اچھا ہے، لیکن میں پہلے ایک اور کال کرنا پسند کروں گا۔“

”تم کی منتقلی شروع ہو گئی ہے۔“

دانیال نے کہا۔ اس کی انگلیاں بہت تیزی سے لپ ٹاپ پر چل رہی تھیں اور وہ بہت تیزی سے ایک بعد ایک اکاونٹ کھول کر اس سے رقم ہٹاتے ہوئے اکاونٹ میں فرانسفر کر رہا تھا۔ طریقہ آسان تھا۔ دوسری طرف رینا نے وید یو والے آئیڈیلے پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ پہلے خواتین یہ کام کر رہی تھیں۔ سب کے پاس اسمارٹ فونز تھے جو عملی درجے کی وید یو بھی بنا سکتے تھے اور تیز انٹرنیٹ کے ذریعے اس وید یو کو فوری بھیجیں بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ وہ سب اپنی وید یو بناتے بول رہی تھیں اور وہاں اچھا خاصا شور تھا۔ اس لیے شفیع اللہ اٹھ کر طیارے کے عقبی حصے میں آیا اور اس نے..... بین الاقوامی بینکنگ کے ماہر رشید امجد کو کال کی۔ اس نے کال ریسپونڈ کی۔

”میں سر؟“

”رشید میں کچھ بین الاقوامی اور غیر ملکی بینکوں کے نام بتا رہا ہوں تم ان سے رابطہ کر کے فرانسفر کی ہوئی رقم کم سے کم مدت میں ریورس کرنے کے معاہدے کی بات کر دو۔“

رشید امجد کی قدر حیران ہوا۔ ”لیکن کیوں سر؟“

”پہلے تم یہ کام کر لو اور مجھ کو کہ یہ ہماری اور بینک کی زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔“

شفیع اللہ نے کہا اور اسے بینکوں کے نام بتائے۔ رشید انہیں نوٹ کر لیا۔

”سرمہار و پور پوچھیں میں خاصی دیر لگے گی کیا براہ راست بات کی جاسکتی ہے؟“

”ہائیکل اور اگر اس کام میں تاخیر ہو تو مخصوص اکاونٹس کی بات بھی کرنا کہ ان میں آنے والی رقم واپس ہو سکے۔ مگر یہ سب انتہائی رازداری سے ہونا چاہیے۔ تم آگے اکاونٹس کی بات بھی رازداری کی شرط پر کر دو گے۔“

”سرمہنی لاؤنگ یا دہشت گردی کی فنانس کا حوالہ دیا جا سکتا ہے؟“

”کرپشن اور منی لاؤنگ کا حوالہ دے سکتے ہو۔“

شفیع اللہ نے سوچ کر کہا۔ ”تم سب چھوڑ کر اسی وقت سے

کر رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ یون گھنے میں وہ ٹرانسفر مکمل کر لے گا۔ ٹرانسفر شروع ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ شیخ اللہ نے دوسرے موبائل سے رشید امجد کو کال کی۔ اس نے کہا۔ ”سر میری نصف درجن ٹینکوں کے صدور سے بات ہوئی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ باقاعدہ معاہدے کے تحت ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ صرف زبانی کلامی کہنے پر وہ کسی بھی اکاؤنٹ سے رقم ریورس نہیں کر سکتے ہیں۔“ شیخ اللہ مایوس ہوا۔ ”گو یا انہوں نے انکار کر دیا ہے؟“

”تقریباً ایسا ہی ہے سر۔“ رشید امجد نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”سر آپ جانتے ہیں ٹینکوں کی اولین ترجیح ان کے کسٹمرز ہوتے ہیں، وہ ان کے مفاد کو نقصان پہنچانے نہیں تو کسٹمرز بھاگ نہیں جائیں گے۔“

شیخ اللہ کی مایوسی اس حوالے سے بھی تھی کہ اگر ضیا حامد نے غلط کوڈ بتایا اور ہم بلاست ہو گیا یا سرے سے کوڈ ہی نہیں بتایا تو وہ اس کے باوجود بیچ کر نکل جائے گا۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر اسے روکنا مشکل تھا۔ باقی سب اپنی نشستوں پر خاموش اور مایوس بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے سے ہونے اور آنکھیں آنے والے دقت کے اندیشوں سے جھلک رہی تھیں۔ شیخ اللہ انہیں تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے پاس سلی کے لیے بھی الفاظ نہیں تھے۔ جو اس کے بس میں تھا، وہ کر رہا تھا۔ اس نے اڑتے طیارے کے باہر روشن آسمان اور کہیں کہیں نظر آتے روٹی جیسے بادلوں کی طرف دیکھا۔ شاید کچھ دیر بعد وہ یہ سب دیکھنے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس نے اپنی زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کیا تھا، کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اس نے اپنی ذمہ داریاں پورے ایمان کے ساتھ ادا کی تھیں۔ اس نے ٹیکس کا ایک روپیہ بھی چوری نہیں کیا تھا۔ کسی عام آدمی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی بلکہ ہمیشہ ان کے کام آنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے ساتھ ایسا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے تقریباً پورے خاندان کے ساتھ نقض میں بھر جاتا اور ضیا حامد جیسے بدعنوان اپنی کالی کمانی اس کی مدد سے بیرون ملک منتقل کر کے آرام سے یہاں سے چلے جاتے اور باقی زندگی عیش و آرام سے گزارتے۔ یہ کسی نا انصافی تھی۔ تیل نے اسے چونکا یا اس کے موبائل پر ابھی نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کرنے سے پہلے وائس ریکارڈنگ آن کر دی تھی۔ دوسری طرف سے وہی شیخ آواز آئی۔ ”تم نے کام شروع

نے شہیر شاہ کو یہ نہیں بتایا کہ ان ٹینکوں سے ٹرانسفر ریورس کرنے کی بات کی جا رہی ہے۔ بات کرتے ہوئے اس نے گھڑی دیکھی۔ ”یہ سب بعد کی باتیں ہیں اصل بات یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف تراسی منٹ رہ گئے ہیں۔“

”میں سول ایوی ایشن والوں سے بات کر رہا ہوں۔“ انفرورس کو بھی پیغام بھیجا ہے کہ وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکتے ہیں تو نکالیں۔“

شیخ اللہ سمجھ رہا تھا کہ مسئلہ کا حل شاید کسی کے پاس نہ ہو سوائے اس کے جس نے یہ ہم لگا یا تھا۔ اس نے کال کاٹ کر حمید الدین کو کال کی۔ ”تم نے اکاؤنٹس چیک کر لیے؟“

”جی سر۔“ حمید الدین نے کہا۔ ”یہ سارے اکاؤنٹس دو ہفتوں کے درمیان کھولے گئے ہیں۔ تمام میں اکاؤنٹ ہولڈرز کا پتا دور دراز قصبوں اور اندرون صوبے کا ہے۔ تمام اکاؤنٹس ایک ہزار ڈالرز سے کھولے گئے۔ اس کے بعد ان میں وقفے وقفے سے نقد رقم جمع کرائی جاتی رہی۔ کسی بھی اکاؤنٹ سے کوئی رقم نہیں نکالی گئی۔ کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر نے چیک کیب کی درخواست نہیں دی۔ ایک بار اکاؤنٹ کھولنے کے بعد کسی بھی شخص نے اپنی برانچ کا وزٹ نہیں کیا۔ تمام اکاؤنٹس ایسی برانچز میں کھولائے گئے جو چھوٹے شہروں میں ہیں۔“

”گوتم نے تقریباً تمام ہی سوالوں کے جواب دے دیے جو میں پوچھتا چاہتا تھا۔ ایک سوال ہے ان میں سے کوئی غیر ملکی ہے؟“

”نہیں تمام مقامی لوگ ہیں۔“ حمید الدین نے تصدیق کی۔ ”صورت سے یہ بہت نیچے طبقے کے افراد لگ رہے ہیں جن کے لیے شاید مقامی کرنسی میں اکاؤنٹ کھولنا بھی ممکن نہ ہو۔“

”اکاؤنٹس میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ رقم کتنی ہے؟“

”کرور ڈالرز سے کم کسی اکاؤنٹ میں نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ ماؤنٹ ایک کرور ڈالز تائیس لاکھ ڈالرز کا ہے۔“

یہ سن کر شیخ اللہ حیران و پریشان ہو گیا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نظام حکومت کا خمیہ زوال پڑ رہا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ وقت ملک و قوم سے زیادہ اپنے بارے میں سوچنے کا ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اس کے مطابق آخرت منٹ باقی رہ گئے تھے۔ گو یا زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔

وہ دانیال کے پاس آیا۔ وہ جتنی تیزی سے رقم ٹرانسفر

انتظار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہائی جنیکر سے جب ہی بات ہو سکتی تھی جب وہ خود رابطہ کرتا۔ دانیال اپنے کام میں لگا ہوا تھا اور اس نے پچاس اکاؤنٹس سے رقم آگے ٹرانسفر کر دی تھی۔ دس منٹ ہو گئے تھے اور وہ حمید الدین کو کال کرنے جا رہا تھا کہ شہیر شاہ کی کال آنے لگی۔ شیخ اللہ کو خیال آیا کہ اس نمبر کو فری رہنا چاہیے۔ ہائی جنیکر کسی وقت بھی کال کر سکتا ہے، اس نے کال ریسیو کی اور شہیر شاہ سے کہا۔

”نیک نمبر نوٹ کر لو اب اس پر کال کرنا۔“

شہیر شاہ نے نمبر نوٹ کیا اور اس پر کال کی۔ شیخ اللہ نے دوسرا موبائل نکال کر کال وصول کی۔ شہیر شاہ نے کہا۔ ”میں نے اپنے جھگے کے ماہرین کو دکھایا ہے اور انہوں نے اسے ایک خطرناک اور جدید ترین بم قرار دیا ہے جسے ناکارہ بنانا بہت ہی مشکل ہے۔“

”فون نمبر کا کیا ہوا؟“

”یہ کسی اکرم انصاری کے نام پر ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔“

”بیچارہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔“

”پولیس کی گاڑی تو تفتیش سے چلتی ہے۔“

”لوکیشن نکالی ہے؟“

”اس میں کچھ وقت لگے گا۔“

شیخ اللہ نے کہا۔ ”فی الحال میں نہیں جانتا کہ ضیا حامد کو بیچ کیا جائے۔ بات قبل از وقت مہل تھی تو وہ ہمیں درست کوڈ نہیں دے گا۔ حفظہ مقدم کے طور پر ہم نے ویڈیو میں یہ سارا واقعہ بیان کر کے اور ضیا حامد کو اس کا ڈسٹے دار قرار دے کر مختلف جگہوں پر ای میل کر دی ہے، ان میں سے ایک تمہارا بھی ہے۔“

”یہ تم نے اچھا کیا ہے۔“ شہیر شاہ نے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس کی سمجھ نہ ہو۔“

”انٹرویو پر ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا ہے مگر اسے ریہرسل قرار دیا ہے۔ خوش قسمتی سے اگلے دو گھنٹے تک کوئی پرواز نہیں جارہی ہے اور آنے والی پروازوں کو موسم کی خرابی کا کہہ کر دوسرے انٹرویو کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس وقت انٹرویو تمہارے لیے بالکل فری ہے۔“

”تم کچھ بارے میں کسی سے بات کی ہے۔ جن ٹینکوں میں یہ رقم جا رہی ہے، وہ سب جنوبی امریکا کے ملکوں میں ہیں اور وہاں ایسے ٹینکوں کی بھرمار ہے کیونکہ کوئی مرکزی مالیاتی پالیسی نہیں ہے۔“ شیخ اللہ نے کہا لیکن اس

چیک کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ہم کہاں سے اور اسے کیوں چیک نہیں کیا جا سکا۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ شیخ اللہ اسے طیارے کے عقبی حصے میں لایا اور بم کا دیدار کرایا۔ ”کیا اس جگہ کو چیک کرنا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے؟“

”کیپٹن صدیقی نے نفی میں سر ہلایا۔“ سر طیارے کے یہ حصے صرف اوور ہالنگ اور صفائی کے دوران ہی چیک ہوتے ہیں۔“

”صفائی کسی کی ذمہ داری ہے؟“

”آف کورس پیئنگر کے عملے کی، ہم پیئنگر کی فیس ادا کرتے ہیں اس میں طیارے کی دیکھ بھال اور صفائی بھی شامل ہے۔“

شیخ اللہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”جب یہ پیئنگر کے عملے میں سے کسی کا کام ہے؟“

”کیپٹن صدیقی نے ہم دیکھا۔“ کوئی فرد اسے نصب نہیں کر سکتا ہے، یہ کام یقیناً کسی ماہر نے کیا ہے لیکن اسے یہاں تک لانے کا ڈسٹے دار یقیناً عملے کا کوئی فرد یا افراد ہیں۔“

شیخ اللہ سوچ رہا تھا کہ اس کے بارے میں بعد میں تفتیش کی جا سکتی ہے۔ پہلا مرحلہ تو جان پہچانے کا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”فیوئل کی کیا پوزیشن ہے؟“

”ہم نے مکمل اندھن کے ساتھ پرواز کی تھی۔“

کیپٹن صدیقی نے فیوئل میٹر پر نظر ڈالی۔ ”اس وقت بھی طیارے میں گنجائش کا چوتھائی فیصد اندھن ہے۔“

”طیارہ اس فیوئل کی مدد سے کتنی دیر پرواز کر سکتا ہے؟“

”اس رفتار سے کم سے کم دو گھنٹے۔“ کیپٹن صدیقی نے جواب دیا۔ ”یہ اس رفتار سے ہے اگر اسے کم کر دیا جائے تو ہم سوا دو گھنٹے سے زیادہ وقت پرواز کر سکتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں، جلد از جلد وارنٹکومنٹ پہنچنے کی کوشش کرو، کسی صورت میں شاید ہمیں فوری لینڈنگ کرنا پڑے۔“ شیخ اللہ کہتے ہوئے باہر آیا اور اس نے مفروضہ ہائی جنیکر کا نمبر ملایا مگر وہ بند جا رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ہم لگائے والا معمولی آدمی نہیں تھا اور اس کی ہر پہلو پر نظر تھی، اس نے یقیناً موبائل نمبر کے بارے میں بھی سوچا ہوگا۔ یقیناً اس کے پاس ایسے ہی نمبر ہوں گے جو اس سے متعلق نہیں ہوں گے۔ اب وہ کسی نئے نمبر سے رابطہ کرے گا۔ شیخ اللہ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کے پاس

”ٹھیک ہیں۔ کھیل رہے ہیں۔“
 ”تم لوگوں کے لیے ایک خوش خبری ہے۔“ ضیا حامد نے کہا۔ ”میں آج رات کی فلائٹ سے روانہ ہو رہا ہوں کل کسی وقت تمہارے پاس ہوں گا۔“
 ”ریلی۔“ سمیرا نے سچ باری۔
 ”ہاں۔“ ضیا نے کہا۔ ”لیکن بچوں کو مت بتانا ان کے لیے سر پرانز ہوگا۔“
 سمیرا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے پوچھا۔
 ”دوسرے معاملات کا کیا ہوا جن کی وجہ سے تم رکے ہوئے تھے؟“
 ”ان ہی کے ششپہر تو میں آ رہا ہوں۔“
 ”کب کی فلائٹ ہے اور یہاں کب تک پہنچ جاؤ گے؟“
 ”آج رات کی ہے لیکن کنکٹنگ فلائٹ ہے، میرا خیال ہے دس بارہ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔“

☆☆☆

سمیرا نے کال ختم ہونے کے بعد ظہیر کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر ایک چادر تلے تھا۔ کچھ دیر پہلے سمیرا بھی اسی چادر تلے اس کے پاس تھی مگر موبائل کی کال سننے اسے مرکز اس جہازی سائز بیڈ کے دوسرے کنارے تک آنا پڑا تھا۔ اس کا موبائل سائز ڈرائز پر تھا۔ کمرائٹم تاریک تھا مگر روشنی اتنی ضروری تھی جو سمیرا کی بے لباہی کو واضح کرتی۔ ضیا حامد کی کال اور اس کی آمد کی خبر بچوں کے لیے سر پرانز ہونے ہو۔ سمیرا اور ظہیر الدین چودھری کے لیے ضرور سر پرانز تھے۔ سمیرا نے موبائل رکھ کر ظہیر سے کہا۔ ”وہ آ رہا ہے، کل کسی وقت یہاں پہنچ جائے گا۔“

ظہیر نو جوان لڑکا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی اور وہ اسپین میں آٹوموبائل انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ اس کا تعلق ایک جاگیر دار گھرانے سے تھا اور اس کی سمیرا سے ملاقات اسپین میں ہی ہوئی تھی۔ سمیرا پہلی ملاقات میں اس پر فدا ہو گئی، وہ تھا بھی مردانہ وجاہت کا نمونہ۔ مگر سمیرا کے مقابلے میں سادہ تھا۔ اس لیے سمیرا کو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنے جال میں پھنسانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ جب سمیرا کی اس سے ملاقات ہوئی تو وہ سیاحت کے لیے یہاں آئی تھی۔ پھر اس نے ضیا کو بھجور کر کے یہیں اپنی مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ان کا تعلق گزشتہ دو سال سے بہ خیر و خوشی چلا آ رہا تھا کیونکہ ضیا کو حکومت اور درحقیقت کرپشن سے فرصت نہیں تھی جو وہ اپنی

شفیع اللہ سے رابطہ کر رہا تھا۔ یہ ایک طاقتور ڈیجیٹل ٹرانسمیشن سسٹم تھا۔ جو بین سیل کے دائرے میں بہ خوبی کام کرتا تھا۔ اس کا سیکرٹری ایک گاڑی میں شہر کا چکر لگا رہا تھا اور اس کے پاس مختلف موبائلز سمیں تھیں۔ وہ کال ملاتا اور موبائل کو ٹرانسمیٹر سے منسلک کر دیتا۔ یہ سسٹم اس طرح کام کرتا تھا کہ سننے والے کو شہر بھی نہیں ہوتا کہ کال کسی ذریعے سے اس تک آرہی ہے۔ ضیا اپنی کوئی میں موجود تھا اور ٹرانسمیٹر اس کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ کال آنے کی صورت میں اسے ہاتھ بھی نہیں ہلانا پڑتا تھا۔ جب وہ کال کرنے کا مقصد کرنے کو کہتا تو اس کا سیکرٹری جو سن رہا ہوتا تھا، وہ کال ملاتا یا منقطع کر دیتا تھا۔ منصوبہ ضیا نے بنایا تھا مگر سارا کام اس کے آدمیوں نے کیا تھا اور بہت صفائی سے کیا تھا۔ اس نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا جو اس کی نشان دہی کر سکتا۔

دوا رب ڈالرز کچھ ہی دیر میں ان بینک اکاؤنٹس میں پہنچ جاتے جہاں سے وہ انیس بہ آسانی نکلا سکتا تھا۔ یہ سارے بینک جنوبی امریکا کے ایک ملک کے ایک ہی شہر میں تھے اور آنے والے دن میں اس کے آدی چند گھنٹوں میں یہ رقم نکلا لیتے۔ ضیا کے بیوی اور بچے اسپین میں تھے۔ کل تک وہ بھی ان کے پاس پہنچ جاتا۔ اس کی بیوی سمیرا تباہی ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور ضیا نے اسی وجہ سے اس سے شادی کی تھی۔ اسے سیاست میں اپنے سسرال سے بہت سپورٹ ملتی تھی، خاص طور سے اسٹیبلشمنٹ سے اس کے روابط انہوں نے ہی کرائے تھے اور اسی وجہ سے وہ اقتدار کی آخری سیڑھی تک پہنچا تھا۔ نہایت سین اور دلکش سمیرا میں اس سے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں بھی اس نے خود کو اتنا سنچال کر رکھا ہوا تھا کہ تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ سمیرا سے اس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ وہ بچپن سے زیادہ تر باہر رہے تھے۔ بیوی بچوں کا خیال آیا تو اس نے ٹرانسمیٹر کا مانگ آف کرتے ہوئے موبائل سے سمیرا کو کال کی۔ اس نے کال کچھ دیر بعد ریسیو کی اور مرسٹن لہجے میں بولی۔

”ضیا کیسے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں، کیا ہوا تمہارا سانس کیوں پھولا ہوا ہے؟“

”بچوں نے تھکا دیا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم لان میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔“

”بچے کیسے ہیں؟“

”تم مان کیوں نہیں لیتے کہ تم میرے رحم و کرم پر ہو؟“
 ”اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ ہمارے نصیب میں ایسی موت لکھی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟“
 ”تم نصیب کے قائل ہو؟“
 ”شاید تم نہیں ہو لیکن جلد قائل ہو جاؤ گے جب موت کا فریضہ تم سے ملے آئے گا۔“
 ”جی بات ہے، مجھے ان باتوں پر یقین نہیں ہے۔“
 ”میں جانتا ہوں اگر تمہیں یقین ہوتا تو تم اس حد تک نہ گرتے کہ اپنا وہ سارا بیج تباہ کر لیتے جو تم نے اس ملک کے کروڑوں لوگوں کے ذہنوں میں بنایا تھا۔ ضیا تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے اس ملک کی سیاست اور اچھے سیاست دانوں کو کتنا نقصان پہنچایا ہے اب لوگ شاید ہی کسی سیاست داں پر اعتماد کریں۔“

”عوام۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”اس ملک کے لوگ اسی قائل ہیں کہ انیس میرے جیسے حکمران ملیں۔“
 ”دیکھا جائے تو تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو جیسے لوگ ہوتے ہیں اس ملک کے حکمران بھی دیے ہی ہوتے ہیں۔“
 ”خیر چھوڑو یہ ایک بلی بحث ہے، یہ بتاؤ کہ میرا تحفہ کیا لگا؟“

”تم نے ایک دن پہلے ہی بیج دیا۔“
 ”ہاں کیونکہ شاید کل میرے پاس وقت نہیں ہوگا۔“
 ”یاشا میں ہی نہیں ہوں گا۔“
 ”تم زیادہ ہی مایوس ہو رہے ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں بیجے گا چاہے اس وقت میں نہیں ہوں۔“
 ”مجھے یقین نہیں ہے۔“

”اوکے لیکن اس یقین کی بنیاد پر ٹرانسفر مت روکنا۔“

”میرا خیال ہے نصف سے زیادہ رقم جا چکی ہے۔“
 شفیع اللہ نے ادنیٰ کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا کر اس کی بات کی تصدیق کی گئی۔ ”میں نے کہا تھا کہ یقین مجھے تم پر نہیں بلکہ اپنے اللہ پر ہے۔ باقی دی دے اگر میں ابھی ٹرانسفر روک دوں تو؟“

”تو تم اس چانس سے محروم ہو جاؤ گے جو میں تمہیں دوں گا۔ میں اب آدھے گھنٹے بعد رابطہ کروں گا۔ مجھے امید ہے اس وقت تک ٹرانسفر کا کام مکمل ہو جائے گا۔“

☆☆☆

ضیا حامد بے حد خوش تھا۔ وہ ایک خاص سسٹم کی مدد

”کر دیا ہے؟“
 ”یقیناً اور تم نے چیک کر لیا ہوگا؟“
 ”ہاں لیکن ابھی تک صرف چالیس فیصد رقم آئی ہے۔“
 ”یہ کام آسان نہیں ہے ایک ایک اکاؤنٹ اوپن کر کے رقم ٹرانسفر کرنا پڑ رہی ہے۔ تصدیق میں بھی کچھ وقت لگتا ہے مگر اتنا وقت نہیں ہے کہ تصدیق کے لیے اکاؤنٹ اوپن رکھا جائے۔ سرور ایک وقت میں ایک اکاؤنٹ اوپن کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔“
 ”خیر ابھی خاصا وقت ہے۔“
 ”تمہارے کام کے لیے۔“ شفیع اللہ نے تلی سے کہا۔ ”ہمارے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔“
 ”مشقی آواز نے تہمت لگا جو کالوں کو بہت برا لگا تھا۔“
 ”فکرمت کرو جیسے ہی ساری رقم منتقل ہوگی، میں تمہیں کوڈ بتا دوں گا۔“

”کیا ضمانت ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے؟“
 شفیع اللہ کے اس سوال کے جواب میں وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”کوئی ضمانت نہیں ہے، تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔“
 ”اعتبار اور تم پر۔“ شفیع اللہ نے تلخ لہجے میں کہا۔
 اس نے پھر کمرہ قہقہہ لگایا۔ ”اس کا مطلب ہے تم مجھے جانتے ہو؟“

”میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب تمہیں کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ لوگوں نے اب جا کر تمہیں جانا ہے، تمہارا اصل روپ میں نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔“
 ”دیکھا جائے تو تم نے بھی مجھے نہیں جانا ہے ورنہ مجھے یوں ہلکا نہ لیتے۔“

”میں نے تمہارے معاملے میں کبھی خود پر بھروسا نہیں کیا مجھے ہمیشہ اوپر والے پر بھروسہ رہا ہے۔ اب بھی میں اسی پر ایمان رکھتا ہوں۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے مجھے یقین ہے تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش ضرور کرو گے۔“
 وہ صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ”فرض کرو میں تمہیں غلط کوڈ دے دوں یا سرے سے کوڈ ہی دوں تو تم کیا کر لو گے۔ اول تو ہم ٹھیک جینے منٹ بعد پھٹ جائے گا اور اگر اس پر ٹائمز نہ بھی لگا یا جاتا تب بھی دس ہزار فٹ کی بلندی سے پینچے آتے ہی یہ پھٹ جاتا۔ یعنی تمہارے پاس پینچے کی کوئی راہ نہیں ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ شفیع اللہ کا لہجہ پست ہو گیا۔

تمام رقم ٹرانسفر ہو چکی ہے مجموعی رقم دوارب ستر لاکھ اور اسی ہزار ڈالر ہے۔ زیورچ سے تصدیق آگئی ہے۔“

”شکر ہے۔“ شفیع اللہ نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

زیورچ میں عالمی مالیاتی نظام کے سرورز تھے جن کے ذریعے دنیا بھر میں رقم آن لائن منتقل کی جاتی تھیں۔ بنیادی طور پر یہ نظام ان بڑے دولت مندوں کے لیے تحقیق کیا گیا تھا جو اربوں ڈالر کے اکاؤنٹس رکھتے تھے اور ان کے مختلف ملکوں میں کاروبار تھے۔ انہیں فوری رقم منتقلی کی ضرورت پڑتی تھی۔ کاروبار سے زیادہ یہ ٹیکس بچانے کے لیے بنایا جانے والا سسٹم تھا۔ مختلف ممالک کی ٹیکس پالیسی بدلتی رہتی ہیں اور ٹیکس کم اور کمزور زیادہ ہو جاتے ہیں۔ دولت مند اپنی رقم فوری ان ملکوں میں منتقل کر لیتے ہیں جہاں انہیں کم سے کم ٹیکس دینا پڑے۔ اسی کی دہائی میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ترقی کے ساتھ یہ سسٹم وجود میں آیا اور اب یہ سالانہ کئی سو کھرب ڈالر کی منتقلی کرتا تھا۔ اس رفتار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

اب پینتیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ شفیع اللہ نے ان دونوں نمبروں پر کال کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ ضیا کو بتا سکے کہ رقم ٹرانسفر ہو گئی ہے مگر دونوں نمبر بند جا رہے تھے۔ اس نے آدھے گھنٹے بعد کال کرنے کو کہا تھا اور آدھا گھنٹا ہو گیا تھا۔ شفیع اللہ بے چین تھا کہ وہ کال کرے اور ہم کو ڈی ایکوئٹر نہ والا کوڈ بتائے۔ اس کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے چونک کر دیکھا۔ مگر یہ شیر شاہ کی کال تھی۔ اس نے بے دلی سے کال ریسپونڈ کی۔ ”ہیلو“

”کال کا سراغ لگایا گیا ہے مگر یہ شہر کے اتنے مختلف حصوں سے کی گئی ہے کہ لگ رہا ہے کال کرنے والا گاڑی میں گھوم رہا ہے۔“

”میرا ادھی ہے کہ ضیا حامد اس دوران میں تمہیں اپنے گھر میں لگے گا اور اس کے پاس ثبوت بھی ہوگا کہ وہ گھر سے نہیں نکلا۔“

”نی الحال ہم اسے نہیں جھپٹ سکتے۔“

”اس کے بارے میں چیک کر کہ آج یا کل کسی فلائٹ سے وہ بیرون ملک تو نہیں جا رہا ہے؟“

”وہ جا رہا ہے۔ میں پہلے ہی چیک کر چکا ہوں۔ آج رات آٹھ بجے کی ایک پرواز بذریعہ مل ایئر اور ترکی اسے اٹین لے جائے گی۔ اس کی بیوی اور بچے وہیں ہیں۔“

”جب اس پر بھی یقین نہ کر لو کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہاں

”مجرم بھی وہ جو یہاں سے نکل جائے۔“ ظفر نے مایوسی سے کہا۔ ”وہ بہت گھٹیا اور سفاک آدمی ہے۔“

”وہ کتنا ہی سفاک اور ظالم ہو جائے۔ بہر حال اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔“

”پاپا ہمارے بچے کا کوئی امکان نہیں ہے۔“ احمر نے بھی مایوسی سے کہا۔

”میرے بچو... اگر تم لوگ اس حد تک مایوس ہو چکے ہو تو بہتر نہیں ہوگا کہ اس کے سامنے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ لو جس کے پاس جانے والے ہو۔“

شرمین اور مونارو نے گئے۔۔۔۔۔ ”پلیز پاپا ایسی بات مت کریں۔“

”یہ باتیں تمہارے شوہر پہلے ہی کر رہے ہیں۔“ شفیع اللہ نے جیسے لہجے میں کہا۔ ”مگر ہے ہم بچ جاؤں اور ممکن ہے نہ بچ سکیں۔ اگر بچ گئے تو ہمارے لیے ایک بقی ہوگا۔ انسان دنیاوی لحاظ سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے، موت کے سامنے وہ اتنا ہی بے بس ہوتا ہے جتنا کہ کوئی حقیر سا کیڑا ہو سکتا ہے۔“

”پاپا کیا یہ ان باتوں کا وقت ہے؟“ احمر نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

”ان ہی باتوں کا وقت ہے۔“ شفیع اللہ مسکرایا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ”ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ نہ زہر نہ ہتا اور نہ مر جانا۔“

”ضیا حامد کے بس میں تو ہے۔“ ظفر تکی سے بولا۔

”استغفر اللہ۔“ شفیع اللہ نے بے ساختہ کہا۔ ”وہ ہم سے زیادہ بے بس ہے۔ اپنے نفس کا غلام بنا ہوا ہے۔“

دانیال نے کی بورڈ کا آخری بین دبایا اور اعلان کیا۔ ”ٹرانسفر مکمل ہو گیا ہے۔ تمام اکاؤنٹس سے رقم ان ایک درجن اکاؤنٹس میں جا چکی ہے۔“

شفیع اللہ نے لیپ ٹاپ لے کر چیک کیا اور پھر طاہر کو کال کی۔ ”تصدیق کر کہ رقم ٹرانسفر ہو چکی ہے۔“

”سر میں ہاتھ کے ہاتھ تصدیق کرتا جا رہا ہوں۔ آخر کے ایک درجن اکاؤنٹس رہ گئے ہیں بس ان کی تصدیق باقی ہے۔“

”تم کرو میں لائن پر ہوں۔“

دانیال نے اس سے کال ریکارڈنگ مانگی جو اس نے اس کے موبائل پر اسے بول تو تھ کر دی۔ دانیال اسے چیک کرنے میں لگ گیا۔ دو منٹ بعد طاہر نے تصدیق کی۔ ”سر

سے کال ریسپونڈ گئی مگر ریسپونڈ کرنے والے نے کچھ نہیں کہا۔ سمیرا بولی۔ ”میں آج دوپہر پانچ پر تم سے اپنا مل میں مل گئی۔“

جملہ مکمل کرتے ہی اس نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

رینا، دانیال کے نزدیک کھڑی تھی اور اس کی نظر لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھی۔ دانیال آخری چند اکاؤنٹس سے رقم ٹرانسفر کر رہا تھا درمیان میں اس نے رک کر صرف ایک گلاس پانی پیا تھا۔ رینا نے اسے اتنی ڈرک کا کہا مگر اس نے منع کر دیا۔ رینا سوچ رہی تھی اس نے شفیع اللہ کے پاس آکر کہا۔ ”پاپا اس نے کیا کہا ہے؟“

”اس کا کہنا ہے کہ وہ مجھے ایک چانس دے گا۔“

”پاپا وہ دھوکا دے رہا ہے۔“

”شاید لیکن جب اس نے چانس والی بات کی تھی تو مجھے لگا کہ وہ بچ بول رہا ہے۔“

”پاپا اس کا بھیجا ہوا کارڈ مجھے عجیب لگ رہا ہے۔ آخر اسے نیوا ایئر کارڈ بھیجے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں بھی نہیں سمجھ سکا اس نے اسے گفٹ قرار دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اس نے ایک دن پہلے بھیج دیا ہے تو اس نے...“ شفیع اللہ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ ضیا کے الفاظ دہرا کر یہاں خوف نہیں پھیلاتا چاہتا تھا مگر دیکھتا تھا تھی اس نے آہستہ سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کل ہم نہیں ہوں گے؟“

شفیع اللہ نے محبت سے اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا اور بولا۔ ”میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہماری زندگی باقی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔“

رینا نے جھک کر اس کے شانے سے سر نکال دیا۔ ”پاپا مجھے مرنے سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ڈر اس بات سے لگ رہا ہے کہ آپ سب بھی...“ رینا کی آواز گھٹ گئی۔ وہ رونے لگی۔ ”شفیع اللہ اس کا سر جھٹکنے لگا۔

ظفر کھڑا ہو گیا۔ ”پاپا ہم کچھ نہیں کر سکتے؟“

”ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ شفیع اللہ نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔

”وہ اپنا کام کر کے نکل جائے گا۔“ احمر نے تکی سے کہا۔

”اور کبھی پکڑ میں نہیں آئے گا۔“ ہاسٹ نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ ”اس ملک میں کسی بڑے مجرم کو پکڑنے کا رواج نہیں ہے۔“

بیوی کے شب و روز پر غور کرتا۔ بچے زیادہ تر زور ڈنگ میں ہوتے تھے اس لیے سمیرا اور ظہیر کو گھل گھلنے کا پورا موقع ملا تھا۔ اب ضیا کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ درحقیقت اس کی سیاست ختم ہو گئی تھی اور وہ جلد یہاں آنے والا تھا۔

دونوں ہی آنے والے وقت سے پریشان اور ایک دوسرے کے لیے بے تاب تھے اس لیے ظہیر بچوں کے دلا میں ہوتے ہوئے اس سے ملنے پہنچ گیا۔ یہ دلا جنوبی ایشین کے سمندر کے نزدیک ایک پہاڑی پر تھا۔ یہاں سے نہ صرف آس پاس کا منظر واضح نظر آتا تھا بلکہ دور سمندر کی نیلی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ ظہیر ایک گھنٹا پہلے آیا تھا۔ سمیرا اس سے ملاقات کے معاملے میں بہت محتاط تھی اسی لیے بچوں کو ڈرائیور کے ہمراہ سیر پہنچ دیا تھا اور خود یہاں ظہیر کے ساتھ بیڈروم میں تھی۔ ان کا وقت بہت سرمستی میں گزر رہا تھا مگر ضیا کی کال نے سادازہ کر کر کر دیا۔ بہر حال ضیا کی آمد ظہیر کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ سمیرا کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ میں گئی پھر اس نے سائڈ پر پڑا ہوا گاؤں اٹھا کر پینتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم کچھ عرصے نہیں مل سکیں گے۔“

ظہیر بے تاب ہو گیا۔ ”اس لیے کہ وہ آجائے گا؟“

”ہاں اس لیے بھی۔“ سمیرا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”آج کے بعد جب تک میں نہ رابطہ کروں، تم مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

ظہیر نے حسرت سے اسے دیکھا۔ ”میں تم سے اتنے دن دور کیسے رہوں گا؟“

”رہنا پڑے گا۔“ سمیرا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”اس کے بعد ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔“

ظہیر چونکا۔ ”کیا تم ضیا سے طلاق لے لو گی؟“

سمیرا نے ظہیر کے گال پر ہاتھ پھیرا۔ ”تم اس کی فکر مت کرو۔ ویسے بھی دو مہینے بعد تمہارے پیارے بچے نہیں ہوتے تم ان کی تیاری کرو۔ اس بار سسٹر میں رہے تو ایسا نہ ہو کہ تمہارے گھر والے تمہیں واپس بلا لیں۔“

بادلی ناخواستہ ظہیر وہاں سے رخصت ہوا تھا۔ باہر شدید سردی تھی۔ برف باری ہوئی تھی مگر زیادہ برف نہیں گر چکی تھی۔ سورج بلند ہو گیا تھا مگر اس کی کرنیں حدت سے خالی تھیں۔ زیتون اور نارنگی کے درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی ظہیر کی کارولا سے نکل گئی تو سمیرا نے گہری سانس لی اور شال لپیٹتے ہوئے ٹیکس سے اندر آئی۔ اس نے موبائل اٹھا کر ایک نمبر ملا دیا۔ دوسری بیل کے ساتھ ہی دوسری طرف

سے جا رہا ہے۔ وہ کچھ عرصے بعد یہاں کی شہریت بھی چھوڑ دے گا۔

”شاید ایسا ہی ہو۔“ شیر شاہ نے اس کی تائید کی۔

”کیا تم ٹرانسفر ہو چکی ہے؟“

”ہاں ہو چکی ہے۔“ شفیع اللہ نے کہا۔ ”اب مجھے اپنی فکر ہوتی ہے۔“

”میں ہم کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ شفیع اللہ نے کہا۔ ”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے یہ کام کسی نے مجھ سے جبراً کرایا ہے۔ مجھ پر الزام لگ سکتا ہے کہ رقم اصل میں

میں نے خود ٹرانسفر کی ہے اور اپنی گردن بچانے کے لیے ہم کا چکر چلایا ہے۔“

شیر شاہ نے اسے تسلی دی۔ ”ان لوگوں کو پکڑا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اکاؤنٹ کھلوائے تھے، وہ انہیں گمے کہ اکاؤنٹ اصل میں کس کے تھے؟“

”مشکل ہے کہ ان میں سے کوئی ہاتھ آئے اور اگر فرض کرو کہ کوئی ہاتھ آیا اور اس نے ضیاء حامد کے خلاف بیان

دیا تو کیا اس کی کوئی حیثیت ہوگی۔ کوئی عدالت اس بنیاد پر ضیاء حامد کو طلب کرے گی اور اگر کیا تو کیا وہ پیش ہو جائے گا؟“

شیر شاہ نے اعتراف کیا۔ ”یہ سب بہت مشکل ہے لیکن ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔“

”دوسری طرف رقم منتقل ہو چکی ہے اور وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے نکال لی جائے گی اس لیے اس کی واپسی کا بھی

سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔“

”یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا، سب سے پہلے ہم کو ناکارہ بنانا ہے۔“

”اس کے لیے کوڑا چاہیے اور اس نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا ہے۔ اس نے دوسری بار جس نمبر سے رابطہ کیا تھا،

اب وہ بھی بند ہے۔“

شیر شاہ چونکا۔ ”اس نے کسی اور نمبر سے بھی رابطہ کیا تھا۔ تم نے مجھے بتایا نہیں۔“

”کیا فائدہ...؟“

”فائدہ نقصان کا بتا تو چیک کرنے پر پتا چلے گا۔“ شیر شاہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”مجھے نمبر دو اور اب وہ

جس نمبر سے بھی کال کرے، وہ فوری مجھے دے، ہم اب فوری موبائل لوکیشن نکال رہے ہیں۔ کسی بھی معاملے میں یہ سوچ کر مت رہو کہ اس کا کیا فائدہ؟“

شفیع اللہ نے اسے دوسرا نمبر دیا۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی تیل بجی اور پھر انجینی نمبر آ رہا تھا۔ اس نے شیر شاہ کو یہ نمبر بھی لکھوا دیا۔ ”میرا خیال ہے یہ وہی ہے اب تم خاموش رہو۔“ شفیع اللہ نے کہا اور واکس ریکارڈر آن کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ”یہ تم ہو؟“

”ہاں یہ میں ہوں۔“ شفیع اللہ نے تصدیق کی۔

”رقم پہنچ گئی ہے، میں نے تصدیق کر لی ہے۔“

”تب مجھے ہم ڈی اے کیلنک کرنے کا کوڑا بتاؤ۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر مکرر وہی آواز میں ہنسا۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں کوڑا دے دوں گا؟“

”نہیں۔“ شفیع اللہ نے صاف گوئی سے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں ہے کہ تم کوڑا دو گے اور نہ یہ یقین ہے کہ اگر دیا تو وہ

ٹھیک ہوگا۔“

”درست کہا اس لیے میں تمہیں کوڑا نہیں بلکہ اشارہ دوں گا۔ اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ تم اسے سمجھتے ہو یا نہیں۔“

”کیسا اشارہ؟“

”یہ ظاہر مشکل ہے لیکن درحقیقت بہت آسان ہے۔ ہم کو ڈی اے کیلنک کرنے والا کو تمہارے پاس ہے اور یہ آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہے۔“

”آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہے۔“ شفیع اللہ نے اس کے الفاظ دہرائے۔ ”لیکن کہاں ہے؟“

اسے قہقہہ سنائی دیا۔ ”مجھے تمہیں سمجھنا ہے اور اسی پر تمہاری اور تمہارے خاندان کی زندگی کا دار و مدار ہے۔“

”ضیاء حامد میری بات سنو۔“ شفیع اللہ نے کہنا چاہا مگر دوسری طرف سے کال کٹ گئی تھی۔ اس نے نمبر ملایا مگر نمبر

بند جا رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران سب ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور جیسے جیسے شفیع اللہ بات کر رہا تھا، ان کے چہرے مر جھاتے جا رہے تھے۔ ظفر نے مردہ لہجے میں کہا۔

”اس نے انکار کر دیا؟“

”تقریباً۔“ شفیع اللہ نے موبائل میز پر بیٹھ دیا۔ ”وہ کہہ رہا ہے کہ کوڑا ہمارے پاس ہے اور آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہے۔“

”ہمارے پاس کہاں ہے۔“ باسط بولا۔ ”وہ بکواس کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔“

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“ احمر تند اور گستاخانہ لہجے میں بولا۔ شفیع اللہ نے کونکھ کر کہہ دیا۔

”احمر بھائی،“ رینا بولی۔ ”یہ آپ باپا سے کیسے بات

کر رہے ہیں۔“

”تو کیسے بات کروں۔“ احمر چلایا۔ ”اگر باپا اس آدمی سے نہ سمجھتے تو آج ہمیں یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ شفیع اللہ نے کہا۔ ”وہ بہر صورت ہمیں ٹارگٹ کرتا اس لیے نہیں کہ اسے مجھ سے دشمنی ہے بلکہ اسے اپنی بلیک بنی ملک سے باہر لے جانی تھی۔“

”پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں، اس وقت پورے ملک میں صرف ایس ایس پیٹک ہی یہ کام کر سکتا ہے۔“

”تب اس نے کوڑا کیوں نہیں بتایا؟“ ظفر نے تلخی سے کہا۔ ”پاپا کو چاہیے تھا کہ اس سے بارگنگ کرتے کسی طرح سے ضمانت حاصل کرتے کہ وہ کام ہو جانے کے بعد

کوڑا دے گا۔ اس جیسے آدمی پر تو ایک روپے کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔“

”میں کیسے بارگنگ کرتا۔ اگر وہ ضیاء حامد ہونے سے انکار کر دیتا تو اس سے کیسے منوایا جاتا۔“

”اس نے اشارہ دیا ہے اور ہمیں اشارہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ یہ وقت الزامات اور بحث میں گزار دیا جائے۔“ رینا بولی۔ ”اگر آپ لوگ کوئی مدد نہیں کر سکتے تو

خاموش تو بیٹھ سکتے ہیں۔“

”تلاش کرلو۔“ باسط نے طنز کیا۔ ”آخری وقت ذرا معروف گزر رہے گا۔“

مونا اور شرمین رونے لگی تھیں۔ رینا نے شفیع اللہ کو دیکھا۔ ”پاپا ہمیں سوچنا ہوگا۔ ہمارے پاس ایسی کون سی چیز ہے جس میں آٹھ ہندسے خفیہ آتے ہیں۔ جس سے یہ ہم ڈی اے کیلنک ہو سکتا ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ شفیع اللہ نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ اسے صورت حال اور ہم کی موجودگی نے اتنا پریشان نہیں کیا تھا جتنا کہ اپنے بیٹوں اور داماد کے بچوں نے دھکی کیا تھا۔ وہ اسے الزام دے رہے تھے۔ دانیال خاموش تھا کہ فی الحال وہ اس خاندان کا مکمل نمبر نہیں تھا۔ ایسے میں صرف رینا اس کی حمایت کر رہی تھی۔ رینا اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

”پلیز پاپا ٹرائی اٹ۔“

دانیال بھی پاس آ گیا۔ ”وہ چیز ایسی ہے کہ ضیاء بھی اس کے بارے میں جانتا ہے۔“

”وہ کیسے جان سکتا ہے؟“ شفیع اللہ نے پوچھا۔

”مثال کے طور پر وہ آپ کا سیل نمبر جانتا ہے۔“

”اس طرح تو وہ ہمارے چہرے کے بارے میں

اشارہ

جان سکتا ہے۔“ باسط طنز پر لہجے میں بولا۔ ”جیسے اس طیارے کا سیریل نمبر یا پرواز کا... کوڑا یا پھر کسی کا بھی موبائل نمبر۔“

ظفر اور احمر کا رویہ دانیال سے سر دھانکیں باسط...

اسے باقاعدہ تاپند کرتا تھا اور اس نے بھی اپنی تاپندیدگی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسے وقت بھی وہ دانیال کی مخالفت سے باز نہیں آیا تھا۔ دانیال نے کہا۔ ”میں صرف

مثال دے رہا تھا ورنہ موبائل نمبر کو ڈسیت کیا رہ ڈیٹس کا ہوتا ہے اور بغیر کوڑا کے آٹھ ڈیٹس کا۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ وہ کوئی موبائل نمبر ہو سکتا ہے کیونکہ یہاں اتنے

موبائل ہیں کہ وہ چاس والی بات نہیں ہو سکتی ہے۔“

شفیع اللہ نے اشتر کام پر کینٹن صدیقی سے طیارے کا سیریل نمبر معلوم کیا تو وہ چندہ ڈیٹس والا نکلا اور اس میں

انگریزی کے الفاہیٹ بھی تھے۔ فلائٹ نمبر چھوٹا تھا۔ گویا یہ دونوں چیزیں بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ شفیع اللہ نے گھڑی دیکھی تو

چوبیس منٹ رہ گئے تھے۔ کینٹن صدیقی نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ وہ دارالحکومت کے ایئر پورٹ کے پاس ہیں۔ وہ

ایئر ٹیکسٹروں سے مسلسل رابطے میں تھا اور اس کی ہدایت کے مطابق طیارے کو ایک بڑے دائرے میں لا رہا تھا

جہاں وہ مخصوص حساس علاقوں سے بھی دور رہے۔ رینا بھی دانیال اور شفیع اللہ کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔

”پاپا جن اکاؤنٹس سے رقم ٹرانسفر کی گئی ہے کیا ان میں سے کوئی ہو سکتا ہے یا جن اکاؤنٹس میں رقم گئی ہے؟“

شفیع اللہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دونوں میں سے کوئی بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ سب سولہ ڈیٹس والے نمبرز ہیں۔“

”ہمیں کوئی ٹھیک آٹھ ڈیٹس والی چیز تلاش کرنی ہے۔“ دانیال نے کہا۔ ”اور وہ ایک ہی ہو۔“

مگر ذہن پر زور دینے کے باوجود کوئی ایسی چیز سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ظفر نے شفیع اللہ سے کہا۔ ”آپ شیر شاہ

سے بات کریں کہ وہ اب براہ راست ضیاء سے بات کرے اور کسی طرح اس سے کوڑا حاصل کرے۔“

”تمہارے خیال میں ضیاء اتنا احمق ہے کہ ملک کا وزیر داخلہ اس سے کوڑا مانگے اور وہ دے کر اپنی گردن

چھنالے۔“

”تب ہم کیا کریں کیا، ایسے ہی مر جائیں۔“ احمر پھر چلایا۔

”اگر وقت آسکے تو شیر شاہ کیا کوئی ہمیں بچائیں

سکتا ہے۔“ شفیع اللہ نے سکون سے کہا۔ ”اپنے حواس بحال رکھو اور آنے والے وقت کا ہمت سے سامنا کرو۔ رونے دھونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔“

دانیال دوبارہ اپنے موبائل فون میں لگ گیا مگر شاید اس سے مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے شفیع اللہ سے اس کا لپ ٹاپ مانگا۔ وائس ریکارڈنگ اس میں بلو تھ سے منتقل کی اور پھر مشینی آواز کو اپنی اصل صورت میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ مختلف سوفٹ ویئر آزمایا مگر ہر بار کچھ سچے نہ کرتے تھے۔ ان ہی کی مدد سے تبدیل شدہ آواز کو واپس اپنی اصل صورت میں لایا جاسکتا تھا۔ شفیع اللہ فکری تجویز پر سوچ رہا تھا۔ اس نے شیر شاہ سے رابطہ کیا اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی واپس ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تمہارے طیارے میں پیرا شوٹ ہیں کیا تم لوگ ان سے جپ نہیں کر سکتے؟“

”پیرا شوٹ نہیں ہیں اور اگر مل بھی جائیں تب بھی ہمیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”میں ضیا سے بات کرتا ہوں۔“

”کر لو لیکن شاید اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔“ شفیع اللہ نے کہا۔ ”وہ اقرار کر کے بھٹن نہیں جائے گا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔“

”مرضی تمہاری۔“ شفیع اللہ نے کہا۔

☆☆☆

ضیا خوش تھا اور اسی خوشی میں اس نے نیا جام بنایا تھا۔ عام طور سے وہ دن میں نہیں پیتا تھا۔ وہ سورج غروب ہونے کے بعد پیتا تھا مگر آج پی رہا تھا۔ شفیع اللہ سے بات کر کے وہ زیادہ خوش تھا۔ اس نے جس اشارے کی بات تھی وہ درست تھا لیکن اسے یقین تھا کہ شفیع اللہ یا کوئی دوسرا اس اشارے تک نہیں پہنچ سکے گا۔ ہم مقررہ وقت پر بلاٹ ہو جائے گا اور تم کی منتہی ہمیشہ کے لیے ایک راز بن جائے گی۔ اس کا ارمان تھا کہ شفیع اللہ نے کسی کو اس کے بارے میں بتا دیا ہو لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے جن ڈیڑھ سو افراد کی مدد سے اکاؤنٹ کھلوائے تھے ان میں سے بیشتر جعلی پتے رکھتے تھے اور ان کے شناختی کارڈز کی مدد سے بھی ان کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اگر وہ مل بھی جاتے تب بھی وہ ضیا کو نہیں جانتے تھے۔ وہ سب نچلے طبقے کے جاہل اور عام سے افراد تھے جنہیں معاوضے پر استعمال کیا گیا تھا۔ وہ چیک اور زر مبادلہ اکاؤنٹس کے

بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ان سے کام لینے والے درمیان کے لوگ پہلے ہی ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ ضیا حامد نے ایک سال پہلے ہی رقم کی منتقلی کی بلانگ کر لی تھی۔ ڈالرز وہ دوران اقتدار حاصل کر چکا تھا کیونکہ اس کے بعد اسے ڈالرز مشکل سے ملے۔ پھر اس نے اقتدار کے دوران ہی بڑی رقم منتقل کر دی تھی۔ جو اب بے نام اکاؤنٹس میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ دو ارب ڈالر زرہ کئے تھے جو اس نے یوں منتقل کئے۔ رات کو اس کی فلاح تھی لیکن اس کے ملازموں حدیہ کے سیکریٹری کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ باہر جانے والا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ جن کپڑوں میں تھا وہی میں اٹھ کر چل پڑتا۔ چند دن پہلے اس نے سرکاری سیکیورٹی بھی واپس کر دی تھی جو اسے سابق وزیر اعظم ہونے کی حیثیت سے دی گئی تھی۔ اس کے پاس چھ گاؤں پر مشتمل ذاتی سیکیورٹی بھی اور یہ سب تجربے کا راز تھے۔ مزید ایک ہفتے سے وہ کوئی سے نہیں نکلا تھا اور اس نے کسی سے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔ اس کا سیکریٹری آنے والوں اور آنے والی کالز پر یہی جواب دے رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا کہا ہے۔

اس نے نکت ایک ٹریولر ایجنسی سے حاصل کیا تھا۔ مگر نکت بنانے والے کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ سابق وزیر اعظم ضیا حامد ہے۔ یہ آن لائن نکت تھا اور آن لائن ہی اس کی ادائیگی کی گئی۔ اس کے پاسپورٹ پر ایجنٹ کا ملٹی پل ویزا لگا ہوا تھا۔ جب تک وہ انٹرنیٹ پر نہیں پہنچتا کسی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اس کو بھی کی مالت تقریباً ایک ارب روپے بھی اور اتنی ہی مالیت کی اس کی دوسری پراپرٹی اور اثاثے تھے۔ مگر یہ اس کی ملک سے باہر موجود دولت کا عشر عشر بھی نہیں تھے۔ اس نے چند سال پہلے سیرا کے کینے پر ایجنٹ میں جو دلا لیا تھا، اس کی مالیت ہی پینتالیس ملین ڈالر تھی۔ ایسی کئی جامد ادیں وینا کے کئی حصوں میں تھیں اس لیے وہ بے فکری سے کوئی اور دوسرے اثاثے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار تھا۔ ممکن ہے بعد میں اسے موقع ملتا اور وہ واپس آتا تب انہیں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا سیکریٹری اور چند ملازمین دیکھ بھال کے لیے کافی تھے۔ اگر اس پر کیسوں کی وجہ سے یہ اثاثے ضبط بھی ہو جاتے تو اسے پروا نہیں تھی۔

شفیع اللہ سے بات کر کے وہ یہ سوچ کر محفوظ ہو رہا تھا کہ وہ اور اس کے بچے پاگلوں کی طرح ہم کو ڈی ایکٹر کرنے والے کو ڈ کی تلاش میں ہوں گے اور انہیں وہ نہیں ملے گا۔

اس بارے میں اسے پورا یقین تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ طیارے کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا بلکہ شاید کوئی بھی نہ دیکھ سکے۔ طیارہ فضا میں ہی پھٹ جائے گا اور شاید ان لوگوں کے معمولی لٹھڑے ہی دستیاب ہوں گے۔ اس کام کے لیے ضیا حامد نے ایک بڑے دہشت گرد گروپ کی خدمات حاصل کی تھیں جو بم دھماکوں اور بموں کی تعصیب کا ماہر تھا۔ یہ ہم جو اس گروپ کے ماہرین نے تیار کیا تھا، اسے لگنے سمیت ایک ملین ڈالر میں پڑا تھا مگر اس کے نزدیک یہ سودا بہت سستا ثابت ہوا تھا خاص طور سے اس صورت میں جبکہ وہ دو ارب ڈالرز بیرون ملک منتقل کر چکا تھا۔

دوسرا مرحلہ انہیں بینکوں سے نکلوانے کا تھا۔ اس کا اقدام بھی مکمل تھا۔ ضیا کے آدمی لاٹینی امریکا کے ایک ملک کے اس شہر میں تھے جہاں ان تمام بینکوں کی بڑی برانچز موجود تھیں۔ اس وقت وہاں رات تھی لیکن چند گھنٹے بعد دن نمودار ہوتا اور اس کے آدمی ان بینکوں میں پہنچ جاتے۔ وہاں وہ کیس لے کر انٹرنیٹ پر پہنچتے اور ایک ٹھیک طیارہ انہیں لے کر سویٹزر لینڈ روانہ ہو جاتا۔ جب تک طیارہ وہاں پہنچتا، ضیا بھی سویٹزر لینڈ پہنچ جاتا اور اس کے بعد ہی رقم اپنے خفیہ بینک اکاؤنٹس میں جمع کر دیتا۔ ان سب کاموں کے لیے اسے بہت ذہنی ورزش کرنا پڑی تھی اور اس نے یہیں بیٹھ کر یہ سارے انتظامات کیے تھے۔ بہت بڑی رقم خرچ کی تھی جو کاموں کے ذمے داروں اور ضانیوں کی جیبوں میں گئی تھی۔ جہاں بد عنوان حکام تھے ان کو خریدا تھا اور جہاں وہ خرید نہیں سکا تھا وہاں مافیا کی مدد حاصل کی تھی۔ بالآخر وہ کامیاب رہا تھا۔

اب چند گھنٹے باقی تھے اور پھر وہ یہاں سے نکل جاتا۔ موبائل کی بیل جی تو اس نے چونک کر دیکھا اور پھر نمبر دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل آگئے۔ یہ شیر شاہ کا نمبر تھا۔ اس نے دل میں کہا ہات اس تک پہنچ گئی ہے اور کال ریسیو کی۔ ”کیا حال ہیں شاہ صاحب آج کیسے یاد آئی اس پرانے دوست کی۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے کیوں کال کی ہے۔“ شیر شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ وہ حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

”میرے فرشتوں کو بھی علم۔۔۔“

”ضیا میں اس وقت ملک کا وزیر داخلہ یا تمہارا سیاسی حریف نہیں ہوں۔ میں تمہارا ہی یونیورسٹی فیلو ہوں جس کے

اشارہ

ساتھ تم کینے میری مین گپ شپ کرتے تھے۔ ہمارا ایک دوست اور بھی تھا اور آج وہ تمہاری وجہ سے مشکل میں ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ ضیا نے اداکاری جاری رکھی۔

”پلیز ضیا مجھے مجبور مت کرو کہ میں وزیر داخلہ بن جاؤں۔ اس صورت میں میں تم سے کسی اور طرح بات کروں گا۔“

”کس طرح بات کرو گے؟“

”تم جانتے ہو ہر انسان میں کمزوریاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔“ شیر شاہ نے غمی خیز انداز میں کہا۔

”اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو مجھے تسلیم ہے لیکن تم ثابت نہیں کر سکو گے۔“

”ضیا کمزوریاں صرف انسان میں نہیں، ان سے متعلقہ افراد میں بھی ہوتی ہیں۔“

اس بار ضیا چونکا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں جو کہنا چاہتا ہوں، اس کی ایک قیمت ہے۔ کیا تم وہ ادا کرو گے؟“

”کیا تم جو کہنا چاہتے ہو، اس کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے؟“

”ہاں، دس جیتے جاگتے انسانوں کی زندگی۔“

”جو تم بتاؤ گے کیا اس کی اتنی قیمت ہوگی؟“

”ہاں تم میری زبان پر بھروسہ کر سکتے ہو۔“ شیر شاہ نے کہا۔ ”میں جو بگوں گا ثبوت کے ساتھ کہوں گا۔ تمہاری آنکھیں مکمل جائیں گی۔“

ضیا حامد کی نظر دیوار پر لگی وال کلاک پر جمی ہوئی تھی، دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے گویا سترہ منٹ باقی تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور پہلی بار تھیوڈر ہو رہا تھا۔ شیر شاہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تمہارے پاس اور ان دس لوگوں کے پاس وقت کم ہے تم جتنی جلدی فیصلہ کرو تمہارے لیے کسی اتنا ہی بہتر ہو گا۔ کم سے کم مسلسل دھوکا کھانے سے بچ جاؤ گے۔“

”شیر شاہ تم بلف کر رہے ہو۔“ ضیا نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

”اگر میں بلف کر رہا ہوتا تو تم اس لہجے میں یہ بات نہ کہتے۔“ شیر شاہ نے کہا۔ ”ضیا پلیز اسے سفاک مت بنو۔ تم جو کر چکے ہو، وہ کم سے کم اس معاملے میں تمہیں نہیں گھسیٹا جائے گا میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”گویا دوسرے معاملات میں گھسیٹا جائے گا۔“

”ہاں اور وہ پہلے سے جاری ہیں تم جانتے ہو حکومت

کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ واک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

شفیع اللہ نے سرتمام لیا۔ ”وہ بکواس کر رہا ہے دھوکا دے رہا ہے۔ اس اشارے کا کوئی مطلب نہیں ہے اور وہ بعد میں تم سے وعدے کی پابندی کا مطالبہ کرے گا۔“
”وہ صرف اسی صورت میں رعایت کا مستحق ہوگا جب تم لوگ بیچ جاؤ۔ ورنہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ڈال دیا جائے گا۔“
”وہ آج ہی نکل جائے گا۔“

”میں نے بتایا تھا کہ رات آٹھ بجے ایک غیر ملکی ائر لائن سے اس کی سیٹ بکی ہے۔“ شیر شاہ نے کہا۔ ”اس کا پتا یوں چلا ہے کہ ضیاء حامد کے نام سے ایک غیر ملکی ائر لائن کا ٹکٹ لے لیا گیا ہے اور ادا ایگنی ضیاء حامد کے ایک اکاؤنٹ سے ہوئی ہے۔ اسے روکنے کے لیے سری تیار کی جارہی ہے۔“

”یعنی ہم قربان ہوئے تو وہ روک لیا جائے گا۔“
شفیع اللہ نے کہا۔

رینا اور دانیال سر جوڑے شفیع اللہ کے الفاظ پر غور کر رہے تھے۔ ہم کی اسٹاپ واپس پانچ منٹ سے بچے آچکی تھی اور ہرگز رتے سیکنڈ وہ موت کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ رینا کہہ رہی تھی۔ ”ننداز کا اشارہ ہے۔ اس نے پاپا کو ای کارڈ بھی بھیجا تھا ننداز کا۔“ وہ کہتے ہوئے اچانک پڑ جوش نظر آنے لگی۔ ”اس کا اشارہ نئے سال کے ہندسوں کی طرف تو نہیں ہے تصویر میں دیکھو کتنے ہندسے نظر آرہے ہیں؟“

دانیال نے لیپ ٹاپ پر کارڈ اوپن کیا اور اس میں نظر آنے والے ہندسے دیکھے۔ ”لیکن یہ تو چار ہندسے ہیں کوڑا آٹھ ہندسوں کا ہوتا ہے۔“

رینا مایوس ہوئی تھی۔ ”ہاں یہ تو ہے۔“
دانیال تصویر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ رینا نے زبردستی سکرا کر کہا۔ ”اب یہ لڑکی اتنی خوب صورت بھی نہیں ہے تم اسے ہی گھورتے رہو۔“

دانیال کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسٹاپ واپس پر اب تین منٹ اور چالیس سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ شفیع اللہ شیر شاہ سے کہہ رہا تھا کہ ان کی موت کی کلی ذمہ داری ضیاء حامد پر عائد ہوگی اور اسے عدالت میں لانا حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔ دانیال نے اچانک کہا۔ ”سنو اگر دن اور ہمیں بھی ملا لیں تو کتنے ہندسے ہوں گے؟“

رینا بھی اچھل پڑی۔ ”آٹھ... ہاں آٹھ ہندسے ہوں گے۔“

کیمین بلندی پر پریشر انڈ ہوتا ہے نیچے آنے پر اس کا لیول خود بخود نارمل ہو جاتا ہے۔ یوں تمہیں کہ اس کا دباؤ برقرار نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ صرف آکسیجن لیول اور درجہ حرارت بڑھایا جاسکتا ہے یا کم کیا جاسکتا ہے۔ مکمل پریشر انڈ جبر صرف خلا میں جانے والے طیاروں یا لڑاکا طیاروں میں ہوتے ہیں۔ اس جیسے عام طیاروں میں یہ سہولت نہیں ہے۔“

دوسری طرف شفیع اللہ، دانیال اور رینا ہم کے پاس موجود تھے۔ دانیال ہم کا معائنہ کر رہا تھا اور اس نے نیٹ پر ایسے ہموں کی تصاویر دکھائی تھیں۔ مگر ان میں سے کوئی ہم ان سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ کسی فیکٹری میں نہیں بننے والے بلکہ انہیں باہرین انفرادی طور پر تیار کرتے ہیں۔ ہاں ان میں استعمال ہونے والے پارٹس فیکٹری میڈ تھے مگر یہ مختلف مقاصد کے لیے بنائے جاتے تھے اور مجرم ذہن والے انہیں ہم سازی میں استعمال کرتے ہیں۔ شفیع اللہ نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔“

رینا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پاپا کیا ہم...“
رینا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ شفیع اللہ کے موبائل کی بیل بجی تھی۔ شیر شاہ کال کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور بے تابی سے بولا۔ ”ضیاء سے بات ہوئی اس نے کیا کہا ہے؟“

”ہاں بات ہوئی ہے لیکن اس نے کھل کر جواب نہیں دیا۔“ شیر شاہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”بہم ہی بات کی ہے۔“

”وہ کھل کر بات کرنے والا آدمی بھی نہیں ہے۔“
شفیع اللہ نے ٹٹی سے کہا۔ ”کیا کہا ہے اس نے؟“
”میں نے اسے ایک آفر کی تھی جو اس نے قبول کر لی اور اس کے جواب میں اس نے کہا کہ نیا سال آنے والا ہے اور اس میں یقیناً بہت سے لوگوں کے لیے زندگی ہوگی اور بہت سے لوگوں کے حصے میں موت ہوگی۔“

شفیع اللہ نے دہرایا۔ ”نیا سال آنے والا ہے اس میں بہت سے لوگوں کے لیے زندگی اور بہت سے لوگوں کے لیے موت ہوگی۔ یہ کس قسم کا اشارہ ہے۔ اس غیبت آدمی نے کوڈ کیوں نہیں بتایا۔“

”انتابھی میں نے اس سے یہ مشکل اگوا یا ہے۔ اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اسے چھوٹ دوں گا۔“

اور احتساب کے ادارے تمہارے خلاف کام کر رہے ہیں لیکن یہ معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کی میں ضمانت دے سکتا ہوں۔ سادہ سی بات ہے کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہاں جو راز میں بتاؤں گا، وہ تمہارے لیے نہایت اہم ہے۔“

ضیاء نکلتی میں جھلا ہو گیا۔ ایک طرف وہ کسی صورت شیر شاہ کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا مگر دوسری طرف شیر شاہ کی بات نے اسے شدید قسم کے تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ خاص طور سے دھوکا کھانے والی بات نے اس کے اندر کیمین ڈیرا جمایا تھا۔ ضیاء ایسا آدمی نہیں جو اپنے اندر غش پالتا۔ وہ سوچ رہا تھا اور بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ شیر شاہ نے اب تک جس طرح بات کی تھی۔ اس نے کھل کر بات بھی نہیں کی تھی مگر سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اگر یہ اس کا جال ہوتا تب بھی وہ اس طرح اس کا جواب دینا چاہتا تھا کہ وہ ہنسنے نہیں۔ اب دس منٹ سے کم وقت باقی رہ گیا تھا۔ ضیاء نے آہستہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”شہا جی تم جانتے ہو کہ میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور اس عزت کی وجہ بھی ہے۔ تم نے اپنے کردار سے یہ عزت کمائی ہے اس لیے تم پر اعتماد نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مگر تم نے جو بات کہی ہے اور جو چاہا ہے، اس کے جواب میں میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نیا سال آنے والا ہے اور اس میں یقیناً بہت سے لوگوں کے لیے زندگی ہوگی اور بہت سے لوگوں کے لیے موت ہوگی۔“

شیر شاہ الجھ گیا۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو، میں تم سے جو کہہ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

”میں نے جواب دے دیا ہے۔“ ضیاء نے کہا۔

”اب اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“
”ضیاء یہ اشارہ بہت بہم ہے۔“
”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

طیارہ دارالحکومت کے انٹرپورٹ کے اوپر تھا اور تقریباً تیس ہزار فٹ کی بلندی پر چکر لگا رہا تھا۔ ظفر کیمین صدیقی کے پاس تھا اور اس سے ممکنہ امکانات پر بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ طیارہ زمین تک پہنچ جائے اور اس کا کیمین پریشر اتنا ہی رہے جتنا کہ دس ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر ہوتا ہے۔“
کیمین صدیقی نے ٹٹی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے،

سکتے۔

ضیا حامد جو اب تک پرسکون تھا، یہ سن کر چراغ یا ہو گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہے، مجھے جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟“

”سر میں جانتا ہوں، آپ اس ملک کے ایکس پرائم فٹنر ہیں۔“ آفیسر نے غل سے کہا۔ ”میں آپ کو وہی بات کہہ رہا ہوں جو میرا ریکارڈ بتا رہا ہے۔“

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے روکنے کی۔“ ضیا حامد نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی اوپر بات کرتا ہوں۔ آج رات ہی تمہاری نوکری سے چھٹی ہو جائے گی۔“

ضیا حامد ایگریشن آفیسر کے سامنے فصد دکھا رہا تھا مگر اس سے دور بیٹے ہی اس کے چہرے پر بخت توشیح کے آثار نظر آنے لگے اور اس نے شیر شاہ کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی تو ضیا حامد اس پر برس پڑا۔ اس نے دلی آواز لیکن آتش نشاں لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم میرے ساتھ ایسا کرو گے؟“

”میں نے کیا، کیا ہے؟“ شیر شاہ نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

”میں یہاں انرپورٹ پر کھڑا ہوں اور ایک دو ٹکے کا ایگریشن آفیسر مجھے بتا رہا ہے کہ مجھ پر تین بے میں باہر نہیں جاسکتا۔ اس کتے کے بچے نے...“

”مانڈیو لیونگٹن... وہ ایک معزز سرکاری افسر ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا ہے۔ اسے تنخواہ سرکاری خزانے سے ملتی ہے اور اس نے سرکاری خزانے کو لوٹ کا مال نہیں سمجھا۔“

شیر شاہ کے کھرے لہجے پر ضیا حامد دب گیا تھا۔ ”اوکے... وہ ایک معزز سرکاری افسر ہے اور میں اس ملک کا ذلیل سابق وزیر اعظم ہوں تمہارا وعدہ کیا ہوا؟“

”میں نے تمہیں تمہاری زندگی سے متعلق اس راز سے آگاہ کر دیا جو تم سے بھی چھپا ہوا تھا۔ مگر اس بارے میں مجھے افسوس ہے۔“ شیر شاہ نے سکون سے کہا۔ ”یہ وعدہ یوں مشروط تھا کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا تو تمہیں باہر جانے دیا جائے گا۔“

”میرے خلاف ایسا کون سا ثبوت مل گیا ہے جو میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کر دیا گیا ہے؟“

”ثبوت بہت واضح اور ناقابل تردید ہے۔“ شیر شاہ کا لہجہ بھی خیر ہو گیا۔

”کیسا ثبوت؟“ ضیا حامد پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

”میں تمہارا عکس گزار ہوں۔“ شفیع اللہ سنجیدگی سے بولا۔ ”تم بے فکر ہو کوئی بات ایک آؤٹ نہیں ہوگی۔“

وہ سب زمثل کی طرف آگئے۔ یہ بات اب تک میڈیا کے علم میں نہیں آئی تھی اس لیے وہاں خاصا سکون تھا۔ اندر آتے ہی شفیع اللہ نے اپنے اہل خانہ اور دونوں پائلٹس کو سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔

خاص طور سے ضیا حامد کا اس سلسلے میں کوئی ذکر نہیں آتا چاہیے۔ اس کی قسمت کا فیصلہ وفاقی تفتیشی اداروں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ شیر شاہ نے اسے تسلی دہی کی کہ رقم کی منتقلی کا الزام اس پر نہیں آئے گا اور اگر ضرورت پڑی تو اس معاملے میں انٹرپول کی مدد لی جائے گی۔ وہ لوگ انرپورٹ سے روانہ ہوئے تو مطمئن اور خوش تھے۔ رینا اور دانیال ایک ہی گاڑی میں تھے اور شفیع اللہ کا لپ ٹاپ دانیال کے پاس تھا۔ وہ اس میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے انرفون کان سے لگا رکھا تھا۔ رینا نے اسے ہلا کر پوچھا۔ ”اب کیا کر رہے ہو؟“

دانیال نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر انرفون کا ایک سر رینا کے کان سے لگا دیا تھا۔ ”ذرا سنا۔“

رینا نے سنا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

☆☆☆

ضیا حامد انرپورٹ کی طرف رواں تھا۔ اس کا قافلہ پانچ گاڑیوں پر مشتمل تھا جن میں سے تین ایک جیسی لکٹوری بلٹ پروف ویم پروف کاریں تھیں اور ان کے سیاہ شیشوں کے پیچھے یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ ضیا حامد کس گاڑی میں ہے۔ آگے ایک طاقتور لینڈ کروزر تھی جس میں تین مسلح محافظ تھے جبکہ عقب میں بھی ایسی ہی ایک لینڈ کروزر تھی اور اس میں بھی تین محافظ تھے۔ کچھ دیر بعد یہ قافلہ شہر کی سڑکوں سے ہوتا ہوا انرپورٹ پہنچا اور وہاں ضیا حامد محافظوں کے گھیرے میں زمثل کے داخلی دروازے تک آیا مگر یہاں اس کے گاڑیوں کو روک دیا گیا کہ کسی غیر متعلق شخص فرد کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ضیا حامد اڑ جاتا اور اپنے محافظوں کو اندر ساتھ لے کر جاتا۔ مگر اس وقت اس نے خاموشی سے یہ بات مان لی اور محافظوں کو وہیں چھوڑ کر وہ زمثل میں داخل ہوا اس کے پاس صرف ایک بریف کیس تھا۔ اس نے اپنا ٹکٹ دکھا کر انٹرلن کاؤنٹر سے اصل ٹکٹ حاصل کیا اور پھر ایگریشن پہنچا تو اس کا پاسپورٹ دیکھتے ہی وہاں موجود افسر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”سوری سر آپ پر پابندی ہے آپ باہر نہیں جا

وہ اچھ کر بے ساختہ شفیع اللہ سے لپٹ گیا اور رینا ان دونوں سے لپٹ گئی۔ شفیع اللہ بول نہیں رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو تھے باقی سب چلا رہے تھے اور درہے تھے۔ پھر دوسرے بھی وہاں آگئے۔ ظفر اور احمر باپ اور دانیال سے لپٹے تھے۔ ان کے آتے ہی رینا جلدی سے الگ ہو گئی تھی اور اب جھپٹ رہی تھی کہ وہ باپ کے ساتھ ساتھ دانیال سے بھی لپٹ لیتی تھی۔ شفیع اللہ نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل کان سے لگا لیا اور دوسری طرف موجود شیر شاہ سے کہا۔ ”ہم ڈی ایکنٹی ویٹ ہو گیا ہے۔“

”شکر خدا کا۔“ شیر شاہ نے سکون کا سانس لیا۔

”اس کا مطلب ہے ضیا نے ٹھیک اشارہ دیا تھا۔“

”ہاں اس نے ٹھیک اشارہ دیا تھا۔“

”اب مجھے اس سے کیا ہوا وعدہ بھنا پڑے گا۔“

شیر شاہ بولا۔ ”مگر خدا کی قسم مجھے یہ وعدہ بھنا کر خوشی ہوگی کیونکہ تم سب کی زندگیاں محفوظ رہی ہیں۔“

”ہاں زندگی کے کم سے کم ایک موقع پر وہ وعدہ خلاف ثابت نہیں ہوا۔“ شفیع اللہ نے کہا۔ ”میں پاکستان لینڈنگ کا کہتا ہوں۔“

شفیع اللہ کا کپٹ میں آیا جہاں کیپٹن صدیقی اور کو پائلٹ مشتاق بھی خوش تھے۔ انہوں نے سن لیا تھا۔ شفیع اللہ نے کہا۔ ”لینڈنگ کی تیاری کرو۔ میں جلد از جلد نیچے بیچ کر سجدہ شکر بجالانا چاہتا ہوں۔“

چند منٹ بعد طیارہ دارالحکومت کے انرپورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ وہاں ہنگامی صورت حال سے نشینے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ فائر فائٹرز اور ایسوی۔ایس بھی موجود تھیں۔ طیارہ میں زمثل سے ذرا فاصلے پر رکا اور کتے ہی مشتاق نے اس کا دروازہ کھول دیا۔ اگرچہ ہم ڈی ایکنٹیو ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود اس کی دہشت کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب غلت میں نکلے تھے سب سے آخر میں شفیع اللہ باہر آیا تھا، اس نے اصرار کر کے صدیقی اور مشتاق کو بھی باہر جانے پر مجبور کیا تھا اور پھر خود باہر آکر ٹارک پر ہی سجدہ شکر ادا کیا۔ دارالحکومت پولیس کے اہلیت دستے نے طیارے کو گھیر لیا تھا اور ہم ڈی ایکنٹیو کے باہرین بھی موقع پر موجود تھے۔ شفیع اللہ اور باقی ابھی وہیں تھے کہ اندر سے شیر شاہ آگیا۔ وہ شفیع اللہ کے گلے لگا۔ اس نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ”مبارک ہو لیکن جو ہوا وہ میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔ یہ بات اپنے آپ کو لو کہیں سمجھا دینا۔“

”یعنی زیروون زیروون نو زیروون سکس۔“

”یہی ہو سکتا ہے۔“ رینا نے کہا اور باپ سے بولی۔

”پاپا فیمل گیا ہے۔“

شفیع اللہ چونکا تو رینا اسے جلدی جلدی بتانے لگی۔

شفیع اللہ نے کہا۔ ”مجھے میں آ رہا ہے لیکن اگر کوڈ غلط نکلا تو...“

”تب بھی ہمارے پاس دو منٹ کا وقت رہ گیا ہے۔“ دانیال نے اسٹاپ واچ کی طرف اشارہ کیا جس میں وقت اب دو منٹ سے نیچے آگیا تھا۔ دانیال کا مطلب تھا کہ اگر کوڈ نہ ملایا گیا یا غلط ملایا گیا تب بھی دو منٹ بعد ہم پھٹ جائے گا۔ شفیع اللہ نے سوچا اور سر ہلادیا۔

”کوشش کرنے میں حرج نہیں ہے ممکن ہے کوڈ درست ہو اور ہم فٹ جا سکیں۔ غلط کوڈ لگنے کی صورت میں بھی...“

دانیال نے سر ہلایا اور ہم پر جھک گیا اس نے ایک بار فور سے کی پیڈ کا معائنہ کیا اور پھر ہچکچاتے ہوئے صفر دیا، پھر ایک اور اس کے بعد اس نے نئے سان کی پہلی تاریخ انٹر کر دی۔ وقت ایک منٹ سے نیچے آگیا تھا۔ اس دوران میں باقی سب کیمین میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے اور سیٹ بیٹ باندھ لی تھی۔ مٹی جسے میں صرف شفیع اللہ، دانیال اور رینا تھے۔ وقت تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ تیس سیکنڈ رہ گئے تھے پھر تیس سیکنڈ رہ گئے تو دانیال نے شفیع اور رینا کی طرف دیکھا اور دلی ہی دل کلمہ شریف پڑھتے ہوئے اس نے انٹر کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اسٹاپ واچ اب مشکل ڈیجٹ میں رہ گئی تھی۔ نو... آٹھ... سات... چھ... پانچ... چار... تین... اور دانیال نے بٹن دبا دیا۔ شفیع اللہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کے کان دھماکے کے خنجر تھے۔

مگر دھماکا نہیں ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اسٹاپ واچ ایک کے ہندسے پر پرکھی ہوئی تھی رینا اور دانیال سانس روک کر اسے دیکھ رہے تھے جیسے یہ ایک ہی جمل پڑے گی اور وقت صفر ہو جائے گا۔ ان کی زندگی کا وقت بھی صفر ہو جائے گا۔ لیکن جب تک آدی کا وقت نہ آئے اس کی زندگی کی گھڑی صفر تک نہیں آسکتی۔... اچانک رینا کو احساس ہوا کہ ہم ڈی ایکنٹی ویٹ ہو گیا اور اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ یہ مسرت بھری اور خوشی کی چیخ تھی مگر کیمین کے اگلے جسے میں اسے کسی اور معنی میں لیا گیا وہاں خواتین نے ہسٹریائی انداز میں چیخا شروع کر دیا۔ پھر دانیال چلا یا۔

”ہم فٹ گئے۔“

چاہتی تھی مگر ضیاء نے اسے روک دیا کہ کہیں اس کے خلاف جیسی کسی قسم کی انکوائری شروع ہو جائے اور وہ وہاں پھنس جائے۔ سمیرا کو یہ بات بھی ہنسنے نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے کہ موبائل کی نسل بنی۔ اس نے دیکھا تو ریمین کی کال کی تھی۔ سمیرا کی پیشانی پر شکنیں آ گئیں۔ اس نے کال ریسپونڈ کی اور بولی۔

”کہو۔“

”میں ملتا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”ڈیل مل نہیں ہوئی ہے۔“

”وجہم جانتے ہو۔“

”سب ڈیل ختم ہو گئی۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”اگر تم ڈیل آگے بڑھانا چاہتی ہو تو مجھ سے ملو اور نئے سرے سے ڈیل کرو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو۔“

”ہاں۔“ سمیرا نے کہا۔ ”اوکے تم مجھ سے سائیڈز میں ملو۔“

”ریمین نے پوچھا۔ ”کب؟“

”آج شام۔“

سائیڈز نامی تفریح گاہ ضیاء حامد کے ولا سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر سمندر کے ساتھ ایک بلند پہاڑی تھی جس سے سمندر کا منظر بہت دور تک دکھائی دیتا تھا۔ گرمیوں میں یہاں بہت رش ہوتا تھا لیکن سردیوں میں یہ جگہ ویران پڑی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سمیرا نے وہاں کارروئی تو اسے دور تک کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ ریمین کنارے کی ریٹنگ سے لگا کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ کسی قدر سانسو لے رہا تھا اور موٹے نقوش والا آدمی تھا مگر اس قسم کے لوگ انجین میں عام تھے اس لیے وہ غیر متوجہ نہیں لگتا تھا۔ سمیرا نے لائٹ کوٹ پہنا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ چلی فضا میں آتی ہی سردی سے کانپ اٹھتی تھی۔ ریمین اسے دیکھ کر حرکت میں نہیں آیا اور مجبوراً اسے ہی اس کی طرف جانا پڑا تھا۔ سمیرا نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں ڈیل واپس کرنا چاہتا ہوں۔“

سمیرا کو جھکا لگا۔ ”لیکن تم نے تو کہا تھا۔“

”وہ مجھیں یہاں بلانے کے لیے کہا تھا۔“ ریمین نے سگریٹ کا آخری ٹپس لے کر اسے پیچھے اچھال دیا اور اپنے کوٹ میں ہاتھ ڈالا تو سمیرا... خوف زدہ ہو گئی تھی مگر جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک لفافہ تھا۔ وہ اس نے سمیرا کی

☆☆☆

آج ضیاء حامد کی عدالت میں اولین پیشی تھی اور اس پر کیس کا باقاعدہ آغاز تھا۔ ٹی وی چینل اس کی عدالت آمد اور وہاں سے روانگی کی لائیو کوریج کر رہے تھے۔ ضیاء حامد کو میڈیا سے بات کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی لیکن اس کے وکلاء کے پیشل کے سربراہ اور سرکاری وکیل دونوں نے اپنی اپنی کامیابی کے متضاد دعوے کیے تھے۔ اس کے بعد قانونی ماہرین چینل پر لائیو اپنی رائے پیش کرنے لگے اور سب کا کہنا تھا کہ محض ثبوت کی موجودگی میں ضیاء حامد کا بری ہونا بہت مشکل تھا۔ سمیرا نے ریمونٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ ضیاء حامد کی گرفتاری نے اس کا سارا پروگرام تباہ کر دیا تھا۔ ضیاء حامد کی متوقع آمد سے پہلے وہ اسپتال نامی کلچوری ریسٹوران میں جس شخص سے ملتی تھی اس کا تعلق افریقہ سے تھا مگر وہ صورت سے افریقی نہیں لگتا تھا۔ ریمین جوت نامی یہ شخص کرائے کا قال تھا اور سمیرا نے اسے ضیاء کے لیے ہانڈ کیا تھا۔ مگر ضیاء یہاں آمد سے پہلے گرفتار ہو گیا تھا۔

سوئزر لینڈ سے ضیاء حامد کے وکیل جاز شیور نے اسے کال کر کے اطلاع دی تھی کہ جوتنی افریقہ سے آنے والی رقم رک تھی کیونکہ بینکوں کو ضیاء حامد کی کال نہیں ملتی تھی اور اس کے بغیر وہ اتنی بڑی رقم کیش نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ رقم وہیں پھنس کر رہ گئی تھی۔ سمیرا پریشان تھی کیونکہ یہاں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ اسے ماہانہ اخراجات کی رقم بھی جاز شیور سے ملتی تھی۔ اگر ضیاء جاتا تو سب اس کا ہو جاتا۔ سب نفع اس کے اثاثوں کا بڑا حصہ سمیرا کے نام آ جاتا مگر اب وہ بھی خالی ہاتھ تھی۔ بچے دو دن پہلے سوئزر لینڈ جا چکے تھے۔ سمیرا ان کی ماں تھی مگر ضیاء کے حکم پر ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اب جاز شیور نے سنبھال لی تھی اور سمیرا کو مطلع کر دیا تھا کہ اب اس معاملے میں اس کا کوئی کردار نہیں رہا تھا۔ جب جاز شیور نے اسے کال کر کے یہ بتایا تو اس کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

اس کی تقریباً روز ہی ضیاء سے بات ہو رہی تھی اور اس نے اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں پائی تھی۔ مگر سمیرا جانتی تھی کہ ضیاء کتابی ادا کا ہاتھ اپنے ظاہر سے اپنے باطن کی ذرا بھی جھلک نہیں دیتا تھا۔ اس کے وکیل کا رویہ اصل صورت حال کی عکاسی کر رہا تھا۔ ظہیر نے اس سے رابطہ کیا تھا مگر اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ فی الحال اس سے ملاقات کرے۔ ممکن طور پر وہ بھی میڈیا کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی اور ایسے میں کوئی اسکینڈل اسے تباہ کر سکتا تھا۔ وہ ملک جانا

کچھ سادہ لباس افراد کو اندر آتے دیکھا۔ ان میں سے جو آگے تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”مسٹر ضیاء حامد، میں الف آئی اے آفیسر ہوں اور آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ مردہ قدموں سے ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اگلے دن صبح کے وقت وہ شیر شاہ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ الف آئی اے کے ہیڈ آفس کے اس کمرے میں صرف وہ اور شیر شاہ تھے۔ اس کے سامنے معقول قسم کا خاشا تھا۔ مگر اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ شیر شاہ اسے بتا رہا تھا کہ اگر پورٹ بیٹنگ کے وہ ملازمین پکڑے گئے تھے جنہوں نے ہم لگانے والوں سے تعاون کیا تھا اور اب ان کی تلاش جاری تھی جنہوں نے ہم لگایا تھا۔ اس نے آخر میں کہا۔ ”کیا تم اپنی پوزیشن سمجھ رہے ہو؟“

ضیاء حامد نے سپاٹ لمبے میں کہا۔ ”میں عدالت اور قانون کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”یعنی تم مشکل میں پڑنا چاہتے ہو۔“

اس بار ضیاء حقارت سے مسکرایا تھا۔ ”قانون میرا کیا بگاڑے گا میں بہترین وکیلوں کا پورا پیشل کروں گا جو قانون اور عدالتوں کو ٹھکانا جانتے ہیں۔“

”جب بھی تم اس ایک وکیل کا مقابلہ نہیں کر سکو گے جو کیس کو طول دے گا۔“ شیر شاہ کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”اگر حکومت کسی ٹیس کا فیصلہ نہ چاہے تو تم سوچ سکتے ہو کہ وہ اسے کب تک پہنچ سکتی ہے۔ تم جانتے ہو کیونکہ تم حکومت کر چکے ہو۔“

ضیاء حامد نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ...“

”ہم بھی اس کیس کا فیصلہ نہیں چاہیں گے اور تم اس وقت تک جیل میں رہو گے جب تک موجودہ حکومت ہے۔ اس کے بعد بھی تمہاری بریت کے امکانات بہت کم ہیں۔“

ضیاء کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ اس نے نہایت سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”دو ارب ڈالر دی واپسی۔“ شیر شاہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کیس سے بریت کی اور باہر جانے کی یہ قیمت ہے۔ جلد فیصلہ مت کرو تمہارے پاس بہت وقت ہے۔“

مجھے ہی شیر شاہ کمرے سے نکلا، ضیاء حامد کا چہرہ تشویش زدہ ہو گیا۔

”تم میرے ساتھ کھل رہے ہو؟“

”ثبوت تم نے خود چھوڑا، حالانکہ تم نے بہت پلاننگ سے کام لیا۔“ شیر شاہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتا ہوا بولا۔ ”مگر آدمی کتنا ہی ذہین اور چالاک کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں مار کھا جاتا ہے۔“

”پلیز میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔“ ضیاء حامد نے گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹے بعد فلائٹ تھی اور آدھے گھنٹے پہلے طیارے کے دروازے بند ہو جاتے۔ وہ اب وزیر اعظم کو تکیا خاص آدمی بھی نہیں تھا جس کے لیے طیارہ انتظار کرتا۔ ”تم مجھ سے صاف بات کرو یا مجھے جانے کی اجازت دو۔“

”میں صاف بات ہی کر رہا ہوں۔“ شیر شاہ نے کہا۔ ”اگر تم غلطی نہ کرتے تو اس وقت ملک سے باہر جا رہے ہوتے۔ مگر اب اس کا بھی بہت زیادہ امکان ہے کہ تمہارا آخری وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے آئے۔ کیونکہ تم پر بہت سنگین الزامات ہیں اور ان کی سزا عام طور سے بیس سال سے تمام عمر کی قید ہوتی ہے اگر تمہیں سزائے موت نہ ہوئی تو۔ باقی دی وے کیا تم اپنے کانوں سے ثبوت سننا چاہو گے؟“

ضیاء حامد اب تک سوچ میں تھا کہ اس نے ایسا کون سا نشان چھوڑا ہے اور جب شیر شاہ نے سننے کی بات کی تو اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ وائس چیئر کی مدد سے آواز بدل کر بات کر رہا تھا اور اس طرف اس کا حسیان نہیں گیا کہ آواز کو دوبارہ اصل حالت میں بھی لایا جاسکتا ہے۔ شیر شاہ نے غصہ کہا تھا۔ بہت ذہین اور چالاک آدمی بھی غلطی کر جاتا ہے۔ ”تت... تمہارا اشارہ میری آواز...؟“

”اب تم نے درست پہچانا۔“ شیر شاہ نے جواب دیا۔ ”دیے تم نکل بھی جاتے تو کوئی فائدہ نہیں تھا، تمہیں انٹر پول کی مدد سے واپس لایا جاتا۔“

”پلیز... پلیز۔“ ضیاء حامد سب بھول کر التجا پر اتر آیا۔ ”تمہیں پرانے تعلق کا واسطہ مجھے یہاں سے نکلنے دو۔“

”مجھے افسوس ہے ضیاء تم نے جو فاصلہ پوئی تھی، اس دنیا کی حد تک اسے کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔“ شیر شاہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ضیاء حامد نے موبائل کی طرف دیکھا اور زیر لب ایک گندی سی گالی دی۔ اس فلائٹ کے تمام ہی مسافر انگریزین سے فارغ ہو کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف جا چکے تھے۔ صرف وہی باقی رہ گیا تھا۔ ضیاء حامد کچھ دیر سوچتا رہا پھر وہ مردہ قدموں سے باہر کی طرف بڑھتا تھا کہ اس نے

طرف بڑھا دیا۔ ”یہ تم نے جو رقم ایڈوائس دی تھی۔“
 سمیرا نے لفاظی لے کر پرس میں ڈال لیا۔ ”اگر پھر تمہاری ضرورت پڑے۔“
 ”اب نہیں پڑے گی۔“ ریمین نے عجیب سے لہجے میں کہا تو سمیرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اسی لمحے ریمین کا ملاحظہ گھونسا اس کے منہ پر لگا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گری گئی۔ سمیرا کا سر چکر ا رہا تھا۔ ریمین اس کی طرف جھکا اور اس کا پرس کھولتے ہوئے اندر سے لفاظی نکال لیا۔ ”تم مجھے اتنی بچھری ہو۔ تم نے جس شخص کے لیے مجھے ہانک لیا تھا اس کے وکیل نے مجھے زیادہ قیمت پر ہانک کر لیا۔“
 ”فیو...“ سمیرا نے بہ مشکل کہا۔
 ”ہاں، اس نے تمہارے لیے ایک پیغام بھی دیا ہے، آخری پیغام۔“
 ”کیسا پیغام؟“
 ”اس نے کہا ہے کہ اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں اس لیے تمہاری آنکھیں اب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔“
 ”خدا کے لیے نہیں۔“ سمیرا نے اٹھنے کی کوشش کی تو ریمین نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔
 ”خدا کا نام مت لو کیونکہ آج کل ہم بہت سے غلط کام خدا کے نام پر ہی کر رہے ہیں۔“ ریمین نے کہتے ہوئے اچانک ہی اسے اٹھا کر رینگ کے دوسری طرف چھینک دیا۔ سمیرا کے منہ سے چیخ نکلی تھی جو پہلی چٹان سے ٹکرائی تھی رک گئی اس کے بعد اس کا جسم سیڑیوں فٹ چٹانوں سے لپکتا اور ٹکراتا ہوا گر رہا۔ آخر میں وہ سمندر کے جھاگ اڑاتے پانی میں جا گری تھی۔ اس کا پرس وہیں رینگ کے پاس پڑا رہ گیا تھا۔ ریمین نے اس کا موبائل نکالا اور اس میں سے اپنی کال کا ڈیٹا ڈیلیٹ کر کے اسے واپس پرس میں رکھ دیا۔ چند لمحے بعد وہ وہاں سے جا رہا تھا۔ کچھ دور نکلنے کے بعد اس نے موبائل نکال کر کسی کو کال کی اور صرف ایک جملہ کہا۔ ”کام ہو گیا ہے۔“
 ☆☆☆
 فیاض حامد جیل کی کونھری میں تھا۔ یہ صرف نام کی کونھری تھی ورنہ اسے وہاں ہر سہولت میسر تھی۔ اس میں موبائل بھی شامل تھا۔ اس کے موبائل نے وہ خبریں سنیں تو اس نے اٹھا کر اسکرین دیکھی۔ جائز شیور کا نام دیکھ کر اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے صرف ایک جملہ کہا گیا۔ ”کام ہو گیا ہے۔“
 فیاض حامد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس نے

اپنے مقامی وکیل کو کال کی اور اس سے کہا۔ ”میں شیر شاہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اسی شام وہ وزارت داخلہ کی عمارت کے ایک کمرے میں شیر شاہ کے سامنے تھا اسے یہاں تک چپکے سے لایا گیا تھا اور ریکارڈ کے مطابق وہ ابھی جیل میں ہی تھا۔ فیاض حامد نے اس کے سامنے بیٹھے ہی کہا۔ ”میں راضی ہوں۔“
 ”مذللین ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ شیر شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کچھ نئے واقعات ہوئے ہیں جو ہمارے علم میں بھی آگئے ہیں۔“
 فیاض حامد چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

جواب میں شیر شاہ نے ایک لفاظی اس کے سامنے ڈال دیا۔ فیاض حامد نے اسے کھولا تو اس میں چند تصویروں تھیں اور ان تصویروں میں ریمین سمیرا پر حملہ کرتے اور پھر اسے نیچے پھینکتے ہوئے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ فیاض کو لگا جیسے اسے ہارٹ ایک ہو رہا ہے اور اس نے ایک جنون کے عالم میں تصاویر پھاڑ دیں۔ شیر شاہ سکون سے بیٹھا رہا۔ فیاض کسی دردندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ ”تم نے مجھے ڈبل کر اس کیا۔“

”تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اصل میں اس میں ایک اور منصب کا وفادار ہوں۔ اس لیے کام کی بات کرو۔“
 ”وہ بھی تم کرو۔“ فیاض نے ہر لیے لہجے میں کہا۔
 ”اگر ایجن کی پولیس کے ہاتھ یہ تصاویر چند دوسری معلومات کے ساتھ پہنچ جائیں تو انہیں قاتل اور تمہارے وکیل تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس کے بعد بات تم تک آئے گی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ کس چکر میں پڑ جاؤ گے۔“

”مجھے قیمت بتاؤ۔“ فیاض نے میز پر مٹکا مارا۔
 ”قیمت؟“
 ”زیادہ نہیں، تم نے جتنا کمایا ہے اس کا صرف اتنی فیصد دے دو اور پیش کرو۔“

فیاض کے چہرے پر نفرت بھرے تاثرات ہو گئے تھے۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ کامیاب ہو جاؤ گے؟“
 ”نہیں۔“ شیر شاہ کھڑا ہو گیا۔ ”لیکن کھیل دلچسپ ہو گا۔ دیکھتے ہیں جیت کس کی ہوتی ہے۔“
 فیاض اسے جاتا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر وہ جیت بھی گیا تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا؟

کیا کرے بہتر کیا!

Famous Urdu Novels

Free pdf Library



Care Heel Cream



نیو نیل بریٹمنٹ

اپنی پوٹھریوں کو دیکھ کر کیا کر سکتے ہیں؟

ہر وقت وائٹ انور پر وائٹ کالین جیل لٹھلا دے۔ یہ جیل سولہ گرام اور ایک سیلینڈر ہے۔
 پناہ گزینان سولٹ اینڈ نیو نیل